محمود الفتاویٰ

جلد چہارم

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ

ترتیب

مفتی عبدالقیوم راجکوٹی

ناشر

مکتبۂ انور

محمود نگر متصل جامعہ ڈابھیل

تفصیلات

نام کتاب:...................................محمود الفتاویٰ جلد چہارم

ازقلم:...................حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

(صدر مفتی دارالافتاء جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل)

ترتیب:...............مفتی عبدالقیوم راجکوٹی (معین مفتی دارالافتاء جامعہ ڈابھیل)

کمپوزنگ:.................................مفتی محمد امین پنیلا (راجستھان)

(مدرس مدرسہ جامعہ محمودیہ دیتانی، باڑمیر، راجستھان)

صفحات:...۸۵۵

سن طباعت:..............................رجب المرجب ۱۴۳۲ھ جون ۲۰۱۱ء

ناشر:..............................مکتبۂ انور، محمودنگر، نزد جامعہ ڈابھیل

(M:99246,93470)

ملنے کے پتے:

ادارۂ صدیق ڈابھیل

(99133,19190/ 99048,86188)

فہرست

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	عرض مرتب	۳۳
۲	گرامی نامہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم	۳۶
۳	تقریظ: شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم	۳۶
۴	تقریظ: حضرت مولانا سید مصلح الدین احمد بڑودوی القاسمی دامت برکاتہم	۳۸
۵	تقریظ: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم	۴۵
۶	گرامی نامہ حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی دامت برکاتہم	۴۶
۞	**كتاب الإيمان والعقائد**	٤٩
۷	عقائد شیعہ اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشیں	۵۱
۸	تقدیر پر ایمان لانے کی حقیقت	۶۲
۹	جہالت سے کلمۂ کفر بولنے سے کفر	۶۵
۱۰	ایک آدمی کے فعل سے دوسرا کافر نہیں ہوتا	۶۸
۱۱	تعویذ کے ایک مسئلہ میں سعودی سلفی گروہ کی جانب سے حضرت تھانویؒ کی تکفیر	۶۹
۱۲	ایک فلمی گانا ”تجھ میں رب دکھتا ہے الخ“ گانے کا شرعی حکم	۸۲
۱۳	ہرے رام، ہرے کرشن، جے شیو شنکر گانے کا حکم	۸۳
۱۴	”نمسکار، باپا سیتا رام“ کہنے کا حکم	۸۳
۱۵	”منافقانہ حرکتیں“ کہنے سے منافق کہنا لازم نہیں آتا	۸۷

۱۶	قبر پر سجدہ و بوسہ	۹۰
۱۷	دوسرے سے مدد لینا شرک نہیں	۹۱
۱۸	رات کو جھاڑو دینا	۹۲
۱۹	''نبی کی ہڈی کے ذریعہ بارش برسنے والے واقعہ'' اور ''تمام انبیاء قبر میں زندہ ہیں'' کے عقیدہ میں تضاد	۹۲
۲۰	بی بی امّاں مرشدہ کا دجل وفریب، علم غیب کا دعوی، بھیس بدلنے کا اختیار، زیارت قبور کے لیے جانا اور اجنبی کے جھوٹے کا حکم شرعی	۹۴
۞	**باب احکام التبلیغ**	۞
۲۱	یہ بھی احکام شرع کی تبلیغ ہے	۱۰۵
۲۲	مروجہ تبلیغ شریعت کی نظر میں	۱۰۵
۞	**باب البدعات والرسوم**	۞
۲۳	محرم کی بدعات کے لیے ورگنی (چندہ) دینا	۱۰۷
۲۴	مروجہ مجالس میلاد	۱۰۹
۲۵	مروجہ مجالس میلاد اور نیاز میں چندہ دینے کا حکم	۱۱۱
۲۶	بدعت سے بچنے پر مالی جرمانہ	۱۱۴
۲۷	شادی میں سہرا باندھنا	۱۱۶
۲۸	مرد کے لیے مہندی لگانا	۱۱۷
۲۹	دولہا کو اونٹ پر بٹھانے کی رسم	۱۱۷

۳۰	پیپٹھی لگانا	۱۱۷
۳۱	شادی میں روپیہ دینے کی رسم (نیوتہ)	۱۱۸
۳۲	ایک دوسرے کی بہن سے آپسی نکاح	۱۱۸
۳۳	لڑکی کے عوض پیسہ لینا	۱۱۹
۳۴	پتنگ کی رسم	۱۱۹
۳۵	لکھوٹی، پتہ اور کرکٹ کھیلنا	۱۱۹
۳۶	شادی کے بعد مصافحہ ومعانقہ کرنا	۱۲۰
۳۷	نماز کے بعد مصافحہ	۱۲۰
۳۸	نماز کے بعد مصافحہ بدعت ہے	۱۲۲
۳۹	اجتماعی ایصالِ ثواب سے بچنے کا طریقہ	۱۲۲
۴۰	رسم قرآن خوانی	۱۲۶
۴۱	اجتماعی ایصالِ ثواب	۱۲۷
۴۲	کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنے کا ثبوت نہیں	۱۲۸
۴۳	اہل میت کی دعوت کھانا ناجائز ہے	۱۲۹
۴۴	گیارہویں، بائیسویں، رجب، محرم اور شب برأت کے ساتھ چندناجائز کام ورسومات	۱۳۱
۴۵	بارات میں دولہے کے ہاتھ میں کنگنا اور کٹیار دینا	۱۳۲
۴۶	تعزیت کے اجتماع میں علماء اور عورتوں کی شرکت	۱۳۲
۴۷	اذان کے وقت انگوٹھے چومنا	۱۳۸

۴۸	قبر پر اذان دینا	۱۳۹
۞	**کتاب العلم**	۱۴۱
۴۹	فتویٰ دینے کا حق کس کو ہے؟	۱۴۳
۵۰	مجتہد فیہ امر کے متعلق فتویٰ کے منکر کا حکم	۱۴۴
۵۱	واقعۂ کربلا کی حقیقت	۱۴۵
۵۲	یزید کی شخصیت کی تحقیق میں پڑنا	۱۴۹
۵۳	دروس التاریخ کی ایک عبارت کا حل	۱۵۱
۵۴	امام ابوحنیفہؒ کے تابعی ہونے کا ثبوت	۱۵۱
۞	**باب مایتعلق بالقرآن**	۞
۵۵	"یھدی بہ کثیرا ومایضل" میں ادغام	۱۵۳
۵۶	آیت درود اور درود میں وصل	۱۵۳
۵۷	نابینا کے قرآن پڑھنے کے لیے مخصوص تحریر کا حکم	۱۵۴
۵۸	قرآن کریم کی آیات ورکوعات کی تعداد ورسم عثمانی کی رعایت	۱۵۵
۵۹	بوسیدہ قرآنی اوراق کو دفن کرنا	۱۶۷
۞	**باب مایتعلق بالحدیث**	۞
۶۰	حنفی کا شوافع کی حدیثوں پر عمل کی خواہش کرنا	۱۶۸
۶۱	"المؤمن في المسجد كالسمك في الماء" اور "الفاسق في السوق كالطير في القفص" حدیث کی تحقیق	۱۶۸

٦٢	ایک درود شریف کی تحقیق	١٦٩
۞	**کتاب السلوک والإحسان**	١٧١
٦٣	مرشد کے پانچ شرائط، مرشد کا مرید ہ کے گلے ملنا	١٧٣
٦٤	لفظ عشق ومحبت کا استعمال	١٧٤
٦٥	کسی عمل کے ثواب پر خوشی حظ نفس نہیں	١٧٨
٦٦	مصلح سے اصلاحی تعلق اور حضوری	١٨٠
٦٧	سلب خلافت کے بعد بیعت کرنا	١٨٢
٦٨	دین ودنیا کا فرق	١٨٣
٦٩	حال طاری ہونا حق کی دلیل نہیں	١٨٧
۞	**کتاب الطهارة**	١٨٩
٧٠	سنن وضوء کا پورا کرنا ضروری ہے چاہے جماعت ختم ہو جائے	١٩١
۞	**کتاب الصلاة**	١٩٥
٧١	قبلہ سے ٢٧/درجہ انحراف کی وجہ سے جماعتِ ثانیہ کے داعی کا حکم	١٩٧
٧٢	ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھنا	١٩٨
٧٣	قطرہ روکنے کی غرض سے عضو مخصوص کو باندھ کر نماز پڑھنا	١٩٩
٧٤	مذی کو روک کر نماز پڑھنا	٢٠٠
٧٥	نماز میں ستر کا حصہ کھلنے پر ناظر ومنظور کی نماز کا حکم	٢٠٠
٧٦	امام کی اقتداء کی نیت ضروری ہے	٢٠١

۷۷	معذور شخص کے لیے ٹیبل وغیرہ پر سجدہ کرنے کا حکم	۲۰۱
۷۸	"هم عن صلوتهم" کی جگہ "هم صلوٰتهم" پڑھنا	۲۱۶
۷۹	"فاقرة" کی جگہ "فراق" پڑھنا	۲۱۷
۸۰	"وتواصوا بالصبر" پھر "وتواصوا بالحق" پڑھنا	۲۱۷
۸۱	زلۃ القاری کے اصول کے مراجع	۲۱۷
۸۲	گھر پر رہ کر امام کی اقتداء کرنا	۲۱۸
۸۳	امام سے پہلے رکوع، سجدے میں چلے جانا	۲۱۹
۸۴	فرض قرأت کے بعد فاحش غلطی سے نماز کا فساد	۲۲۱
۸۵	سلام پھیرنے کا مسنون طریقہ	۲۲۱
۸۶	نماز میں گھڑی دیکھنا	۲۲۳
۸۷	ناپاک رومال جیب میں رکھ کر نماز پڑھا دی	۲۲۳
۸۸	نماز میں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال اور اس کی حفاظت کرنا	۲۲۴
۸۹	حرمین شریفین میں عورتوں کا جماعت کی نماز میں شریک ہونا	۲۲۶
۹۰	ٹیپ کی قرأت پر سجدۂ تلاوت، ٹیپ کی اذان ناکافی ہے	۲۲۷
۹۱	اذان واقامت سے پہلے تعوذ وتسمیہ پڑھنا	۲۲۸
۹۲	غیر مؤذن کا اقامت کہنا	۲۲۹
۹۳	چین والی گھڑی پہن کر نماز پڑھنا	۲۲۹
۹۴	کویت پر حملہ میں قنوت نازلہ پڑھنا	۲۲۹

۹۵	خانۂ کعبہ وغیرہ کی تصویر والے مصلے پر نماز پڑھنا	۲۳۰
۹۶	ایک رکن میں بار بار کھجلانا	۲۳۱
۹۷	آیت چھوڑنے سے نماز میں نقص نہیں آتا	۲۳۲
۹۸	مکروہ وقت میں سجدۂ تلاوت	۲۳۳
۹۹	قعدہ کرنے نہ کرنے میں امام ومقتدی کے مابین اختلاف، کس کا قول معتبر ہے؟	۲۳۳
۱۰۰	نوافل کی جماعت جہراً قرأت کے ساتھ	۲۳۴
۱۰۱	دیر سے رمضان کا ثبوت ہوا، وتر کا اعادہ نہیں	۲۳۵
۱۰۲	نماز کا وقت ہونے کے بعد پانچ منٹ کی تاخیر	۲۳۵
۱۰۳	شوافع کے یہاں نماز مغرب سے پہلے دو رکعت	۲۳۶
۱۰۴	چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت ملا دی یا قعدہ اولیٰ بھول گیا یا دوسری کے بعد کھڑا ہو گیا، مسلک شافعی میں نماز کا حکم	۲۳۷
	مسائل الصفوف	
۱۰۵	نمازی کے سامنے سے گزرنے کی حد	۲۴۰
۱۰۶	محراب حائل ہو تو پہلی صف کونسی شمار ہوگی؟	۲۴۰
۱۰۷	صفوں کی درستگی کے دو طریقے	۲۴۱
۱۰۸	جگہ کی تنگی کی وجہ سے ترچھی صفوں کی گنجائش	۲۴۵
۱۰۹	امام اور منبر کے درمیان ایک مصلی کی جگہ خالی رکھنا	۲۴۸
	مسائل سجدۂ سہو	

۱۱۰	تیسری رکعت میں بھول کر بیٹھنے سے سجدۂ سہو	۲۴۹
۱۱۱	قعدۂ اولی میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھ لی	۲۴۹
۱۱۲	وتر کے بعد قعدۂ اولیٰ میں سورۂ فاتحہ پڑھ لینا	۲۵۰
۱۱۳	قعدۂ اولیٰ کے ترک اور تیسری رکعت میں قعدہ کرنے پر سجدۂ سہو	۲۵۰
۱۱۴	نفل نماز میں بھی سجدۂ سہو واجب ہے	۲۵۱
	مسائل امامت	
۱۱۵	حرام کمائی سے دعوت کھانے والے امام کی امامت	۲۵۲
۱۱۶	غیر منتشر آلہ والے کی امامت	۲۵۲
۱۱۷	حرام خور اور کاذب کی امامت	۲۵۳
۱۱۸	ناپسند امام کی امامت	۲۵۴
۱۱۹	ٹی وی دیکھنے والے کی امامت	۲۵۵
۱۲۰	پتہ کھیلنے اور ٹی وی دیکھنے والے کی امامت	۲۵۶
۱۲۱	فاسق کی امامت	۲۵۶
۱۲۲	مودودی امام کی امامت	۲۵۶
۱۲۳	غیر مقلد کی اقتداء میں نماز پڑھنا	۲۵۷
۱۲۴	بدعتی کی اقتداء میں نماز پڑھنا	۲۵۸
۱۲۵	طامع دنیا بناوٹی شافعی کی اقتداء میں نماز کا حکم	۲۵۹
۱۲۶	شافعی المسلک کی جماعت ثانیہ میں حنفی کی شرکت	۲۶۰

۱۲۷	نماز عید، شافعی امام کی اقتداء میں	۲۶۵
۱۲۸	سات ماہ میں پیدا ہونے والے کی امامت	۲۶۷
۱۲۹	نصف آستین کا کرتہ پہن کر نماز پڑھانا	۲۶۷
۱۳۰	کفریہ عقیدہ رکھنے والے بریلوی کے پیچھے نماز	۲۶۸
۱۳۱	بریلوی عقائد والے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا	۲۷۰
۱۳۲	تارک فجر کی امامت	۲۷۱
۱۳۳	دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے والے کی امامت	۲۷۲
۱۳۴	ناحق قتل کرنے والے اور منکر قرآن کی امامت	۲۷۲
	مسائل تراویح	
۱۳۵	تراویح پر اجرت کا حیلہ	۲۷۴
۱۳۶	تراویح پر اجرت	۲۷۵
۱۳۷	تراویح پر اجرت اور حیلہ	۲۷۷
۱۳۸	تراویح پڑھانے والے کے لیے چندہ	۲۷۹
۱۳۹	تراویح میں سامع ضروری نہیں	۲۸۰
۱۴۰	تراویح میں ختم قرآن کی شرعی حیثیت	۲۸۰
۱۴۱	تراویح میں بیس رکعات کا ثبوت	۲۸۰
۱۴۲	تراویح کی تین رکعت پڑھادی	۲۸۳
۱۴۳	ہاؤس کی تراویح میں عورتوں کی شرکت	۲۸۳

۞	**مسائل مسافر**	۞
۱۴۴	شرعی مسافت	۲۸۵
۱۴۵	سفر میں نماز قضاء ہونے کا خوف ہوتو ٹرین چھوڑ دے	۲۸۵
۞	**مسائل نماز جمعه**	۞
۱۴۶	جمعہ کے بعد کی سنت نہ پڑھی ہوتو بھی جمعہ کی نماز ہو جائے گی	۲۸۶
۱۴۷	اردو میں خطبہ	۲۸۶
۱۴۸	خطبہ ختم ہونے سے پہلے کھڑے ہونے والوں کو بٹھا دینا	۲۸۶
۱۴۹	خطبۂ جمعہ میں بنات مکرمات رضی اللہ عنهن کا ذکر مبارک	۲۸۷
۱۵۰	بڑی مسجد میں جمعہ کے روز احتیاط الظہر پڑھنا	۲۸۸
۞	**مسائل عیدین**	۞
۱۵۱	عیدین میں زائد تکبیر کہہ دی	۲۹۰
۱۵۲	نماز عیدین میں پانچ تکبیرات زوائد کہنا	۲۹۰
۱۵۳	عیدین میں جماعت ثانیہ کا حکم	۲۹۱
۱۵۴	آبادی میں مسجد کے باہر نماز عید ادا کرنا	۲۹۲
۞	**باب احکام الجنائز**	۞
۱۵۵	قبر پر نماز جنازہ کب تک پڑھ سکتے ہیں؟	۲۹۴
۱۵۶	جنازہ کی نماز میں ثناء کا ثبوت	۲۹۴
۱۵۷	رضا خانی سے مقابلہ کرنے میں مر گیا وہ شہید ہے	۲۹۶

۞	**كتاب الزكوة**	۲۹۷
۱۵۸	مرغیوں پرزکوٰۃ	۲۹۹
۱۵۹	سادات کوزکوٰۃ وصدقات دینا	۳۰۰
۱۶۰	سونا ادھار خریدنے پرزکوٰۃ	۳۰۱
۱۶۱	زکوٰۃ وغیرہ کے وکیل کارقم زکوٰۃ کواپنے استعمال میں لانا	۳۰۱
۱۶۲	بیوی کی زکوٰۃ بیوی ہی ادا کرے	۳۰۲
۱۶۳	آرڈر پر کام لینے والا زکوٰۃ کیسے ادا کرے؟	۳۰۳
۱۶۴	زکوٰۃ دکان پر یا مال پر؟	۳۰۴
۱۶۵	حاجت مند کے لیے دی ہوئی رقم خود رکھنا	۳۰۴
۱۶۶	مستحق کوزکوٰۃ میں پنکھا دے کر وقف کروانا	۳۰۵
۱۶۷	شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی نے اپنی بہن کو کچھ رقم دی توزکوٰۃ کس پر واجب ہے؟	۳۰۵
۱۶۸	زکوٰۃ سے تنخواہ دینا	۳۰۶
۱۶۹	مدرسہ کے طلباء کوزکوٰۃ دی جائے	۳۰۷
۱۷۰	چندہ کی رقم ملکیت کی صورت میں مہتمم استعمال کرسکتا ہے؟	۳۰۸
۱۷۱	زکوٰۃ کی ادائیگی میں قرض لیے ہوئے سرسوں کا دام کس دن وضع کرے؟	۳۰۸
۱۷۲	مبیع کی قسط وار وصولی کی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی	۳۰۹
۱۷۳	زکوۃ کی رقم پر مالکانہ قبضہ شرط ہے، جمہور فقہاء کا اتفاق، اسکول کی فیس میں زکوۃ کی رقم صرف کرنا	۳۱۰

۱۷۴	سفرائے مدارس کو زکوٰۃ دینے کی مقدار	۳۱۳
۱۷۵	زکوٰۃ میں بیچنے کی قیمت کا اعتبار ہے	۳۱۵
	کتاب الصوم	۳۱۷
۱۷۶	انجکشن سے فساد روزہ کا شبہ	۳۱۹
۱۷۷	روزہ کے کفارے میں گھر کے ملازم کو آزاد کرنا	۳۲۰
۱۷۸	ہاتھ سے منی خارج کرنا مفسد صوم ہے	۳۲۰
	مسائل رویت ہلال	
۱۷۹	دوربین سے رویتِ ہلال	۳۲۲
۱۸۰	غائبانہ خبروں سے اور ہوائی جہاز میں اڑ کر رویتِ ہلال کا شرعی حکم	۳۲۴
۱۸۱	رؤیتِ ہلال کے ثبوت میں آلات رصدیہ اور فلکی حساب معتبر نہیں	۳۲۵
۱۸۲	چاند کی شہادت فلکی حسابات کی بنیاد پر رد کرنا اور روزہ کی قضاء نہ کرنا	۳۵۷
۱۸۳	چاند کے فیصلہ میں اختلاف کی صورت میں نماز عید میں تعدد واعتکاف کا حکم	۳۶۲
۱۸۴	ثبوتِ ہلال کی بابت مرکز اسلام پر اتحاد کا جھنڈا گھاڑنے کی ناکام کوشش فلکیاتی حساب کی بنیاد پر ''جمِ غفیر'' کی شرط میں کمی بیشی انگلینڈ میں غیر سعودیہ کی رؤیت کے قائلین کا طریقۂ کار، کیا نبوی طریقہ کے خلاف ہے؟	۳۶۷
۱۸۵	**مسائل اعتکاف**	
۱۸۶	معتکف کا پانی گرم ہونے تک ٹھہرنا، مسجد کے باہر ٹھہرنا، ناپاک کپڑا دھونا، غسل جمعہ کے لیے نکلنا	۳۸۷

۱۸۷	بیڑی پینے سے روکنے پر اعتکاف چھوڑ دیا، گنہگار کون ہوگا	۳۸۸
۱۸۸	معتکف کا غسل کے لیے نکلنا	۳۸۹
۱۸۹	معتکف کا نماز جنازہ کے لیے نکلنا	۳۸۹
۱۹۰	معتکف کا بیڑی پینے کے لیے نکلنا	۳۸۹
۱۹۱	بقعۂ مدخولہ میں اعتکاف	۳۹۰
❖	**کتاب النکاح**	۳۹۱
۱۹۲	کم سے کم مہر	۳۹۳
۱۹۳	دوسرا نکاح کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا	۳۹۳
۱۹۴	ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی	۳۹۴
۱۹۵	غیر کفو میں نکاح	۳۹۵
۱۹۶	بدچلن عورت سے جبراً نکاح کرنا	۳۹۶
۱۹۷	بوری شیعہ سے نکاح کرنا	۳۹۸
۱۹۸	عدت میں شوہر اول سے نکاح کرنا	۳۹۸
۱۹۹	خفیہ نکاح کے بعد علی الاعلان دوسرا نکاح	۴۰۰
۲۰۰	موعود نکاح کی شرعی حیثیت	۴۰۰
۲۰۱	علاج کے ذریعہ خون جاری کرکے نکاح ثانی کرنا	۴۰۱
۲۰۲	ممسوسہ کی بیٹی سے نکاح	۴۰۲
۲۰۳	منکوحہ سے نکاح حرام ہے	۴۰۶

۲۰۴	مجلس نکاح میں تحریر سے نکاح	۴۰۷
۲۰۵	نکاح پر معلق طلاق سے بچنے کا حیلہ	۴۰۹
۲۰۶	نکاح فضولی	۴۰۹
۲۰۷	مہر کی معافی کے بعد بیوی پاگل ہوگئی	۴۱۰
۲۰۸	مطلقہ کی اولاد کا نکاح سابق شوہر کی اولاد سے	۴۱۱
۲۰۹	منکوحہ کے نام کے ساتھ کس کا نام لکھا جائے؟	۴۱۲
	مسائل حرمت مصاہرت	
۲۱۰	خسر کی ناپاک نظر سے بچاؤ کی خاطر الگ مکان میں رہنا	۴۱۴
۲۱۱	اپنی بیٹی سے زنا کرنا	۴۱۴
۲۱۲	بہو کو چھونے سے حرمت مصاہرت	۴۱۶
	كتاب الطلاق والعدة	۴۱۹
۲۱۳	عورت ناجائز تعلقات رکھتی ہو تو شوہر کیا کرے؟	۴۲۱
۲۱۴	’’تو چلی جا مجھے نہیں چاہیے‘‘ کہنا	۴۲۲
۲۱۵	ماں کے گھر جانے پر طلاق کو معلق کرنا	۴۲۲
۲۱۶	’’جب بھی شادی کروں تو طلاق‘‘ کہنا	۴۲۳
۲۱۷	’’تو دوسرا شوہر تلاش کر لینا‘‘ لکھنا	۴۲۵
۲۱۸	’’طلاق دیدوں گا‘‘ دھمکی ہے	۴۲۶
۲۱۹	شوہر کی اجازت کے بغیر لڑکی میکے آگئی، فریقین کیا کریں؟	۴۲۷

۲۲۰	میاں بیوی میں تعلقات نہ ہونے کا اثر رشتۂ نکاح پر	۴۲۸
۲۲۱	جبراً طلاق کی قسم کا حکم	۴۲۸
۲۲۲	جبراً تحریری طلاق	۴۲۹
۲۲۳	حمل ساقط کرانے والی بیوی کو طلاق دینا	۴۳۰
۲۲۴	حاملہ کو طلاق دینے کا عمدہ طریقہ	۴۳۳
۲۲۵	حالت حمل میں طلاق دینا	۴۳۴
۲۲۶	طلاق دینے کے بعد شوہر انکار کرے تو کیا حکم ہے؟	۴۳۴
۲۲۷	طلاق کی شرط پر حلالہ	۴۳۶
۲۲۸	طلاق کی شرط پر حلالہ	۴۳۶
۲۲۹	وقوع شرط کے بعد منسوبہ پر طلاق واقع نہیں ہوتی	۴۳۸
۲۳۰	کورے اسٹامپ پیپر پر دستخط سے طلاق	۴۳۹
۲۳۱	وقوع طلاق میں اضافتِ معنویہ کافی ہے	۴۴۰
۲۳۲	انسداد طلاق کے لیے کمیٹی بنانا	۴۴۱
۲۳۳	ڈرانے کے لیے طلاق نامہ لکھوانے سے طلاق	۴۵۳
۲۳۴	زبردستی طلاق کا حکم	۴۵۵
۲۳۵	بیوی کو تنگ کرنے والے سے خلاصی کی صورت	۴۵۵
۲۳۶	شرابی شوہر سے خلاصی کی صورت	۴۵۶
۲۳۷	خلع	۴۵۷

۲۳۸	حاملہ کی عدت	۴۵۸
۲۳۹	بعد طلاق عدت کی رقم واپس کردے تو شوہر کیا کرے؟	۴۵۹
۲۴۰	شوہر کا انتقال سابق وطن میں ہوجائے تو عدت کہاں گزارے؟	۴۶۰
۲۴۱	دو بچوں کو دودھ پلانے کی مدت	۴۶۰
۲۴۲	بچوں کی پرورش کا حکم	۴۶۲
۞	**كتاب البيوع**	٤٦٥
۲۴۳	مرغیوں کی بیع وزناً اور عدداً میں تطبیق	۴۶۷
۲۴۴	مرغیوں کی کھاد کی بیع	۴۶۸
۲۴۵	ایجاب وقبول کے بعد قانونی کاروائی سے پہلے زمین بیچنا	۴۶۸
۲۴۶	زندہ جانور وزن کر کے بیچنا	۴۷۰
۲۴۷	مٹی کا تیل زیادہ دام سے بیچنا	۴۷۰
۲۴۸	ٹی وی اور ریڈیو کی بیع کے حکم میں فرق	۴۷۱
۲۴۹	بیع فاسد کے ثمن کو قرض میں شمار نہیں کرسکتے	۴۷۲
۲۵۰	مشترکہ ملکیت میں بیع اور وصیت	۴۷۳
۲۵۱	تمباکو کے اصلی ڈبہ میں نقلی مال فروخت کرنا	۴۷۸
۲۵۲	کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت	۴۷۹
۲۵۳	عقد مزارعت میں یوریا کھاد کی شرط لگانا	۴۸۳
۞	**احکام سود**	۞

۲۵۴	سود کی حرمت	۵۹۵
۲۵۵	سود کی رقم سود میں دینا	۵۹۶
۲۵۶	یونٹ ٹرسٹ میں رقم جمع کرنا	۵۹۶
۲۵۷	بیمہ کی رقم	۵۹۷
۲۵۸	مقروض کو سودی رقم دینا	۴۹۸
۲۵۹	لون کی رقم لینا	۴۹۸
۲۶۰	دکان کا بیمہ کرانا	۴۹۹
۲۶۱	سودی رقم کا مصرف	۴۹۹
۲۶۲	سودی رقم کا مصرف	۵۰۰
۲۶۳	سود کا مصرف	۵۰۱
۲۶۴	سبسڈی لینا	۵۰۲
۲۶۵	سبسڈی والی لون لینا	۵۰۲
۲۶۶	سودی رقم سے کتاب خرید کر غیر مسلم کو دینا	۵۰۳
۲۶۷	بیمہ کمپنی سے کمیشن لینا	۵۰۴
۲۶۸	بینک کے سیونگ کھاتہ میں سود وصول کرنے کے لیے رقم جمع کرنا	۵۰۵
۲۶۹	قرض کی ادائیگی میں زیادتی سود ہے	۵۰۶
۲۷۰	سودی رقم سے ہاؤس ٹیکس بھرنا	۵۰۷
۲۷۱	مکان خالی کرانے کے لیے سودی رقم کرایہ دار کو دینا	۵۰۷

۲۷۲	سودی رقم سے بیت الخلاء بنانا	۵۰۸
۲۷۳	ایضاً	۵۰۹
۲۷۴	سودی رقم سے بیت الخلاء بنانا	۵۱۰
۲۷۵	حکومتی ادارہ انسٹی ٹیوٹ سے سودی قرض لینا	۵۱۰
۞	**كتاب الوكالة**	۵۱۵
۲۷۶	وکیل بالشراء کا مؤکل مدیون پر ظلم درظلم کرنا	۵۱۷
۲۷۷	وکیل مؤکل کے خلاف تصرف کا خود ذمہ دار ہے	۵۲۴
۞	**كتاب الإجارة**	۵۲۵
۲۷۸	مریض کو حکیم تک پہنچانے کی دلالی لینا	۵۲۷
۲۷۹	سودی کاروبار پر مشتمل تنظیم میں ملازمت کرنا	۵۲۷
۲۸۰	شراب بیچنے والے کو ہوٹل کرایہ پر دینا	۵۲۸
۲۸۱	عقد اجارہ کے بغیر پیشگی اجرت کے جواز کا حیلہ	۵۲۹
۲۸۲	عملیات کی فیس لینا	۵۳۲
۲۸۳	پڑوسی کو تکلیف پہنچانے والے شخص کو مکان کرایہ پر دے تو مالک مکان گنہ گار ہوگا	۵۳۳
۲۸۴	ہاؤسنگ سوسائٹی میں مالک مکان سے نون او کیوپیشن (non occupation) چارج لینا جائز ہے	۵۳۳
۞	**كتاب الشركة والمضاربة**	۵۴۵
۲۸۵	چچا بھتیجا میں مشترکہ کاروبار کی تقسیم	۵۴۷

۲۸۶	مشترکہ زمین بیچ دی، شریک کیا کرے؟	۵۵۱
۲۸۷	معاملۂ مضاربت اور اجارہ میں خلط ملط	۵۵۳
۲۸۸	سونے میں عقد مضاربت	۵۵۳
۲۸۹	عقد مضاربت میں رب المال کے لیے سیل پر نفع کا دارومدار	۵۵۵
۲۹۰	تجارت کے لیے رقم دے کر متعین نفع لینا	۵۵۸
	کتاب الوقف	۵۵۹
۲۹۱	موقوفہ زمین میں تصرف	۵۶۱
۲۹۲	موقوفہ زمین کی بیع کرنا	۵۶۱
۲۹۳	وقف کی بنجر زمین بیچنا	۵۶۲
۲۹۴	درگاہ کے ڈبہ کی رقم کا مصرف	۵۶۴
۲۹۵	جنازہ کے چندے کی باقی رقم کو کیا کرے؟	۵۶۶
۲۹۶	چندہ میں دینے کے لیے دی گئی رقم کا اپنی ذات پر استعمال	۵۶۷
	مسائل مدارس	
۲۹۷	زبردستی چندہ لینا	۵۶۸
۲۹۸	مدرسہ کے لیے خریدی ہوئی زمین میں، زمین کے بدلے زمین لینے کی نیت کا اعتبار نہیں	۵۶۸
۲۹۹	دستور کے خلاف ممبران مدرسہ کا انتخاب کرنا	۵۷۲
۳۰۰	بانیٔ مدرسہ کا ممبران کو رکنیت سے معزول کرنا	۵۷۳

۳۰۱	مدرسۃ البنات کے صدر صاحب کی طالبات کے ساتھ ناجائز حرکتیں	۵۷۵
۳۰۲	طلباء کی تعزیر کی حد	۵۹۴
۳۰۳	جرمانہ کی رقم کا مدرسہ میں استعمال	۵۹۵
۳۰۴	تارک صلوٰۃ مہتمم و متولی کو برطرف کرنا	۵۹۶
۳۰۵	متولی کیسا ہو؟	۵۹۶
۳۰۶	امام و مدرس کی ماہانہ تنخواہ کی مقدار	۵۹۸
۳۰۷	غریبوں کی امداد کی غرض سے چندہ کر کے کسی ادارہ میں لگانا	۵۹۹
	مسائل مساجد	
۳۰۸	جانب غرب میں واقع دکانوں پر توسیع مسجد	۶۰۱
۳۰۹	مسجد کو رنگین بلب سے سجانا	۶۰۶
۳۱۰	مسجد کے تہہ خانہ میں کمرے بنا کر کرایہ پر دینا	۶۰۷
۳۱۱	مسجد کا حصہ اسکول میں دینا	۶۰۷
۳۱۲	مسجد کا متولی معاوضہ لے سکتا ہے؟	۶۰۹
۳۱۳	مسجد میں چوری سے بجلی چلانے اور نماز پڑھنے کا حکم	۶۱۰
۳۱۴	غیر مسلم کی رقم مسجد میں لینا	۶۱۰
۳۱۵	مسجد کی بجلی کا استعمال کب تک کرے؟	۶۱۱
۳۱۶	صحن مسجد میں گھومنا	۶۱۲
۳۱۷	مسجد کے لیے دی گئی زمین فروخت کرنا	۶۱۲

۳۱۸	کیا صحن مسجد کا حصہ ہے؟	۶۱۴
۳۱۹	مسجد کی حفاظت میں لڑ نا مرنا	۶۱۴
۳۲۰	ایک مسجد کی رقم دوسری مسجد میں استعمال کرنا	۶۱۵
۳۲۱	مسجد کا پانی امام اپنی ضروریات میں خرچ کرسکتا ہے؟	۶۱۶
۳۲۲	مسجد کے پترے بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں لگانا	۶۱۶
۳۲۳	بالائی حصہ میں مسجد، نیچے مکان، دکان وغیرہ	۶۱۷
۳۲۴	مسجد کی زمین میں مدرسہ بنانا، واجب التملیک رقوم، خاص مد کی رقوم اور رقومِ ہدیہ کا مصرف	۶۲۱
۳۲۵	مسجد کا سامان ذاتی کام میں استعمال کرنا	۶۲۴
۳۲۶	احاطۂ مسجد کے مختلف حصوں کے مختلف نام، مسجد کی حدود کو ممتاز کرنے کا حق کس کو ہے؟	۶۲۴
۳۲۷	سوسائٹی کی زمین پر مسجد کا بور اور اس کا پانی مسجد اور سوسائٹی میں استعمال کرنا	۶۳۱
۞	**مسائل قبرستان**	۞
۳۲۸	قدیم قبرستان میں سائیکل کی دکان کھولنا	۶۳۴
۳۲۹	قبرستان کو اسکوٹر رکھنے کی جگہ بنانا	۶۳۴
۳۳۰	قبرستان میں مسجد بنانا	۶۳۵
۞	**کتاب الھبة**	۶۳۹
۳۳۱	ہبہ میں قبضہ ضروری ہے، قبضہ دشوار ہو تو کیا کریں، حدیث ”لا تصح الهبة الا مقبوضة“ کی تحقیق	۶۴۱

۳۳۲	سودی آمدنی والے کا ہدیہ لینا	۶۵۳
۳۳۳	لڑکوں کو جائیداد دینے کے بعد واپس لینا	۶۵۴
۳۳۴	مشترک دکان کے منافع کا ہبہ درست نہیں	۶۵۷
۳۳۵	ہبہ میں بیوی کو محروم کرنا	۶۶۰
۳۳۶	مسجد کے مدرس کو حسن سلوک کے طور پر کچھ رقم دی، اس کو لینا کیسا ہے؟	۶۶۱
۞	**كتاب الضمان**	۶۶۳
۳۳۷	مستعمل چپل کا ضمان	۶۶۵
۳۳۸	کرایہ کے برتن ٹوٹنے پر ضمان	۶۶۵
۳۳۹	مودَع کے ترکہ سے ودیعت کا ضمان	۶۶۶
۳۴۰	نشہ کرنے والے شخص کا مال رضامندی کے بغیر اس کی اولاد کو دینا	۶۷۰
۞	**كتاب اللقطة**	۶۷۳
۳۴۱	لقطہ کی تشہیر کا طریقہ	۶۷۵
۳۴۲	مدفون خزانہ کا استعمال	۶۷۷
۞	**كتاب الأضحية**	۶۷۹
۳۴۳	پورے خاندان کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی	۶۸۱
۳۴۴	بکرے کی قربانی میں شرکت پر مشتمل ایک مباحثہ کا جواب	۶۸۴
۳۴۵	قربانی کے شرکاء گوشت کس طرح تقسیم کریں؟	۶۸۷
۳۴۶	قربانی اور زکوٰۃ کا نصاب	۶۸۹

۳۴۷	حضور ﷺ کی طرف سے قربانی اور گوشت کا حکم	۶۸۹
۳۴۸	ایک سال سے کم بالغ بکرے کی قربانی	۶۹۰
۳۴۹	ایک ہی جانور میں قربانی اور عقیقہ کرنا	۶۹۱
۳۵۰	فاسد بیع کے ذریعہ خریدی گئی گائے کی قربانی	۶۹۱
۳۵۱	فقہ شافعی میں جس نے اپنی قربانی نہ کی ہو، اس کا مرحوم والدین کی جانب سے قربانی کرنا	۶۹۲
۳۵۲	ایضاً	۶۹۳
۳۵۳	کتے نے کاٹ لیا ہو ایسی گائے کی قربانی	۶۹۵
۳۵۴	مقروض پر قربانی	۶۹۶
۳۵۵	چرم قربانی کی قیمت مسجد میں استعمال کرنا	۶۹۷
۳۵۶	مرحوم کے لیے قربانی کی چند صورتیں	۶۹۷
۳۵۷	مشترکہ کاروبار میں قربانی کس پر واجب ہے؟	۶۹۹
۳۵۸	چرم قربانی کا مصرف	۶۹۹
۳۵۹	چرم قربانی کا مصرف	۷۰۰
۳۶۰	چرم قربانی کا مصرف	۷۰۰
۳۶۱	چرم قربانی کا مصرف	۷۰۲
۳۶۲	چرم قربانی وغیرہ کی قیمت تعمیر مسجد وغیرہ میں صرف کرنا	۷۰۲
۳۶۳	عقیقہ میں ولیمہ کا حصہ	۷۰۳

۳۶۴	بڑے جانور میں دو کا عقیقہ	۷۰۳
۳۶۵	قربانی میں عقیقہ کا حصہ	۷۰۴
	کتاب الحظروالإباحة	۷۰۵
۳۶۶	ضرورت کی وجہ سے مرغیوں کی چونچ کاٹنا	۷۰۷
۳۶۷	کشیدہ کاری میں جاندار کی تصویر بنانا	۷۰۸
۳۶۸	کعبہ کے فوٹو میں انسانوں کی تصویر ہو تو رکھنا کیسا ہے؟	۷۰۹
۳۶۹	قبر کی تصویر لینا	۷۱۰
۳۷۰	بوری شیعہ کو سلام کرنا	۷۱۰
۳۷۱	ہر سلام کے ساتھ مصافحہ کرنا	۷۱۱
۳۷۲	ذکر و تلاوت میں مشغول شخص کو سلام و مصافحہ کرنا	۷۱۲
۳۷۳	بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا	۷۱۳
۳۷۴	بچہ کی برابر پرورش نہ کرنے کے خوف سے عزل کرنا	۷۱۳
۳۷۵	ضبطِ تولید شریعت کی نظر میں	۷۱۵
۳۷۶	ضبطِ تولید کا حکم	۷۱۶
۳۷۷	بذریعۂ آپریشن بچہ دانی نکال دینا	۷۱۷
۳۷۸	کمزوری کی وجہ سے مانع حمل طریقہ کا استعمال	۷۱۸
۳۷۹	حیض بند ہونے کی عمر، حصول اولاد کے لیے معالجہ کیا جائے نہ کہ مبالغہ	۷۱۸
۳۸۰	حصولِ اولاد کے لیے رحم میں کیپسول رکھنا	۷۲۲

۳۸۱	حصولِ ولد کے لیے مادۂ منویہ شرمگاہ میں رکھوانا	۷۲۲
۳۸۲	ریش بچہ کا حکم	۷۲۳
۳۸۳	ڈاڑھی کتروانا	۷۲۴
۳۸۴	مختون کی ختنہ	۷۲۵
۳۸۵	حرام کمائی والے کی دعوت قبول کرنا	۷۲۵
۳۸۶	دعوت میں دوست کو شریک کر دیا تو کیا حکم ہے؟	۷۲۶
۳۸۷	میوزک والی گھڑی پہننا	۷۲۷
۳۸۸	نوکر سے پردہ	۷۲۸
۳۸۹	کولگیٹ وغیرہ میں حرام چربی کی آمیزش	۷۲۸
۳۹۰	کولگیٹ میں خنزیر کی چربی کی آمیزش	۷۲۹
۳۹۱	محمد نام رکھنے کی فضیلت	۷۲۹
۳۹۲	نومسلم کے ساتھ سیٹھ کا نام لگانا	۷۳۱
۳۹۳	خسر کو باپ کہنا	۷۳۱
۳۹۴	عرفی عالم واصطلاحی عالم	۷۳۴
۳۹۵	لفظ مولانا اور مولوی کا مطلب واستعمال	۷۳۷
۳۹۶	سینٹ کا استعمال	۷۳۹
۳۹۷	عورتوں کی آواز ٹیپ میں سننا	۷۴۰
۳۹۸	لوٹ کھسوٹ کا مال جائز نہیں	۷۴۱

۳۹۹	دعابرائے سفر	۷۴۱
۴۰۰	آپسی تعاون کی سوسائٹی (اسکیم)	۷۴۲
۴۰۱	خودرو جڑی بوٹی اور درخت دوسرے کی زمین سے لینا	۷۴۶
۴۰۲	چغل خور بیوی کو میکے جانے سے روکنا	۷۴۷
۴۰۳	ہوائی جہاز کا گوشت اور سبزی وغیرہ کھانا	۷۴۹
۴۰۴	کھانا کھانے کے درجات کی شرعی حیثیت	۷۵۰
۴۰۵	بیوی کا دودھ پینا	۷۵۳
۴۰۶	ساڑھی پہننا	۷۵۳
۴۰۷	منسوبہ لڑکی سے خط وکتابت	۷۵۴
۴۰۸	بلڈ بینک میں خون لینا دینا از روئے فقہ حنفی وشافعی	۷۵۶
۴۰۹	انجکشن کے ذریعہ جانور سے دودھ و بچہ حاصل کرنا	۷۶۱
۴۱۰	مشینی ذبیحہ کا حکم	۷۶۱
❖	**كتاب السياسة**	۷۶۵
۴۱۱	احیاء خلافت کی سعی	۷۶۷
۴۱۲	کمیونزم پارٹی کے ساتھ راہ ورسم رکھنا	۷۷۰
۴۱۳	حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی کا حکم	۷۷۳
❖	**متفرقات**	❖
۴۱۴	تشبہ بالکفار کی چند صورتیں	۷۷۴

۴۱۵	اہل علم کے لیے امر منکر سے بچنا مؤکد ہے	۷۷۴
۴۱۶	امر خیر پر خود عمل نہ کرنا دوسروں کو ترغیب دینا	۷۷۴
۴۱۷	مدرسہ کے حق میں مضر فعل کرنے پر مدرس کو الگ کرنا	۷۷۴
۴۱۸	حکم شرعی کی خلاف ورزی پر بیٹے سے قطع تعلق	۷۷۵
۴۱۹	قومی دھارے پر بہنے کا الزام	۷۷۵
۴۲۰	سنیچر کی تعطیل میں یہود سے تشبہ ہے	۷۸۲
۴۲۱	اس زمانہ میں کسی کو غلام باندی بنانا	۷۸۲
۴۲۲	باندیوں کا رواج کب ختم ہوا؟	۷۸۳
۴۲۳	ماءزمزم کافر کو دینا	۷۸۴
۴۲۴	کافر کو زمزم کا پانی دے سکتے ہیں	۷۸۴
۴۲۵	احرام کی چادر کو کیا کرے؟	۷۸۴
۴۲۶	بیوہ عورت شادی کرے تو جنت میں کس کو ملے گی؟	۷۸۴
۴۲۷	کیا غوث پاک پیدائشی حافظ تھے؟	۷۸۶
۴۲۸	بیوی کو راضی رکھے یا ماں کو؟	۷۸۶
۴۲۹	شوہر کا پسندیدہ لباس پہننا	۷۸۷
۴۳۰	مظلومہ بیوی کو ماں کے ساتھ رکھنا	۷۸۷
۴۳۱	بیوی سے دو سال دور رہنا	۷۸۸
۴۳۲	آپسی تنازع دور کرنے میں مصالحت	۷۸۹

۴۳۳	عورت کے ارتکاب زنا میں شوہر پر گناہ ہے؟	۷۹۴
۴۳۴	کسی کے نام محمد پر درود شریف کی علامت لگانا	۷۹۵
۴۳۵	کلمۂ ترضی کا استعمال ائمۂ اربعہ پر	۷۹۶
۴۳۶	کلمۂ ترضی وترحم کا استعمال	۷۹۶
۴۳۷	درود تاج اور درود لکھی کا ورد	۷۹۷
۴۳۸	حضور ﷺ کی قبر مبارک پر غلاف	۷۹۷
۴۳۹	ورکروں کو تنخواہ دے کر قرض سے وصول کرنا	۷۹۸
۴۴۰	نقول فتاویٰ کے رجسٹر کا مالک کون؟ مفتی یا مدرسہ؟	۷۹۹
۴۴۱	ٹال مٹول کرنے والے مدیون کے مال سے چوری کرنا	۸۰۱
۴۴۲	مرتد بعد اسلام مرا، کیا وہ معصوم ہے	۸۰۱
۴۴۳	جماعت اسلامی کا رکن شریعت کی نظر میں	۸۰۲
۴۴۴	دھوکہ بازی سے سرکاری راحت حاصل کرنا حرام ہے	۸۰۳
۴۴۵	خوش عیش زندگی بسر کرنا جبکہ غرباء کا بمشکل گزارہ ہوتا ہو	۸۰۴
۴۴۶	تعویذ باندھنا	۸۰۵
۴۴۷	ڈاڑھی مونڈنے والے حجام کو دودھ بیچنا	۸۰۵
۴۴۸	درزی کا غیر شرعی لباس بنانا	۸۰۶
۴۴۹	ذاکرین کے مجمع میں زور سے تلاوت کرنا	۸۰۷
۴۵۰	سوئے ہوئے شخص کے پاس زور سے تلاوت کرنا	۸۰۷

۴۵۱	نومولود کے کان میں نہلا کر اذان کہے	۸۰۷
۴۵۲	کرکٹ اور فٹ بال خریدنا	۸۰۸
۴۵۳	سرکاری بے کار عمارت میں دینی تعلیم	۸۱۴
۴۵۴	معتوہ (کم فہم، ملی جلی باتیں کرنے والے شخص) کے تصرفات کا شرعی حکم	۸۱۵
۴۵۵	تقلید کیوں ضروری ہے؟	۸۲۲
۴۵۶	جس دعوت میں ناچ گانا ہو اس میں شرکت	۸۲۵
۴۵۷	بس اور ریلوے کے ٹکٹ فروخت کرنا	۸۲۶
۴۵۸	سالگرہ منانا	۸۲۸
۴۵۹	نماز میں قدم سے قدم ملانا	۸۲۹
۴۶۰	ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا	۸۲۹
۴۶۱	تراویح کی بیس رکعات کے ثبوت پر رسائل علماء	۸۲۹
۴۶۲	ممبران بلڈنگ سے لیٹ فیس لینا جائز نہیں	۸۳۷
	کتاب الفرائض	۸۳۹
۴۶۳	میراث سے جہیز کا سامان وضع کرنا	۸۴۱
۴۶۴	دینِ مہر ترکہ کو محیط ہو تو میراث تقسیم نہ ہوگی	۸۴۱
۴۶۵	والد کے ساتھ رہنے سے ترکہ کا استحقاق	۸۴۳
۴۶۶	اپنے حصۂ میراث سے دستبردار ہو جانا	۸۴۳
۴۶۷	تقسیم میراث کا رواج نہ ہو تو جائیداد استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟	۸۴۴

۴۶۸	ورثاء میں نابالغ ہوں تو متروکہ جائیداد میں کون کونسی اشیاء استعمال کرسکتے ہیں؟	۸۴۵
۴۶۹	خدمت کرنے والوں کے لیے رکھے ہوئے حصہ میں میراث	۸۴۶
۴۷۰	مرحوم کے حقیقی بھائی کی موجودگی میں بہن کی اولاد میراث نہیں پاتی	۸۴۶
۴۷۱	حرمتِ مصاہرت سے محرّمہ کی عدتِ وفات و میراث کا حکم	۸۴۸
۴۷۲	مرحوم کے بیمہ کا روپیہ کہاں خرچ کرے؟	۸۵۰

عرضِ مرتّب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین، و علیٰ کل من تبعھم بإحسان الیٰ یوم الدین.

اما بعد:

مخدومنا حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری صاحب دامت برکاتہم کے فتاویٰ ''محمود الفتاویٰ'' کے نام سے تین جلدوں میں دو سال پہلے طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئے، جنہیں اہل علم وارباب فتاوی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اردو و گجراتی کے مختلف جرائد و رسائل میں تبصرے بھی شائع ہوئے۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ.

اسی سلسلہ کی یہ چوتھی جلد ہے، اس جلد میں بھی طہارت سے لے کر فرائض تک کے فتاویٰ شامل ہیں۔ شروع کی جلدوں میں تقاریظ لکھوانے کا بچند وجوہ اہتمام نہیں کیا گیا، البتہ چوتھی جلد میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مفتی صاحب کے استاذ محترم مولانا سید مصلح الدین صاحب دامت برکاتہم (شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الاسلام ڈیوزبری، انگلینڈ) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہم (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی) کی تقاریظ اور مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی مدظلہ (صدر مفتی دار الافتاء دار العلوم کنتھاریہ بھروچ و شیخ الحدیث جامعہ علوم القرآن جمبوسر) کا گرامی نامہ شامل اشاعت ہیں۔ اول الذکر بزرگ نے تقریظ کے ساتھ ایک گرامی نامہ احقر کے نام تحریر فرمایا تھا، شروع میں اسے بھی تبرکاً درج کر دیا ہے۔

قارئین سے دعاء کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مساعی کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس مفید سلسلہ کو آگے بڑھانے کی سعادت بخشے، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کے سایۂ عاطفت کو صحت و عافیت کے ساتھ تا دیر قائم و دائم فرمائیں اور ان کے تفقہ و معارف کو جاری رکھیں۔ آمین!

چوتھی جلد کی تیاری میں دار الافتاء کے دو طالب علم مولوی معاذ بمبوی اور مولوی بشیر احمد احمد آبادی سلمہما کا تعاون برابر شامل رہا، مفتی روح الامین صاحب سورتی زید مجدہم (حضرت کے فتاویٰ کے محرِّر) نے از اول تا آخر پروف کی درستگی کا کام بہ حسن وخوبی انجام دیا؛ نیز مفتی ابوبکر صاحب پٹنی زید مجدہم (استاذ جامعہ ڈابھیل) نے محمود الفتاویٰ جلد اول تا ثالث کی طباعت اور جلد رابع کی سیٹنگ وطباعت کے مراحل میں حصہ لے کر احسان فرمایا، اللہ تعالیٰ ان تمام کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرما کر مزید خدمات علمیہ و دینیہ کے لیے موفق فرمائیں۔ آمین! فقط

احقر: عبد القیوم راجکوٹی

معین مفتی دار الافتاء جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

گرامی نامہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی

(بنام مرتب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر مکرم جناب مولانا عبدالقیوم راجکوٹی صاحب حفظکم اللہ تعالیٰ ورعاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ اور ''محمودالفتاویٰ'' کی تین جلدیں موصول ہوکر باعث ممنونیت ہوئیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیراً. آپ نے یہ جلدیں مرتب کرکے بہت مفید خدمت انجام دی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین۔ حسب ارشاد چند سطور لکھ کر ارسال کررہا ہوں۔

آپ نے حضرت والد صاحبؒ کے گرامی ناموں کا ذکر فرمایا کہ وہ آپ نے مفتی اسماعیل بسم اللہ کی سوانح حیات میں شامل کئے، اگر یہ سوانح چھپ گئی ہو تو براہِ کرم وہ بھی ارسال فرمادیں اور بندہ کا جو خط اس سلسلے میں آنجناب کے پاس محفوظ ہے تو اس کی ایک نقل بھی، آج کل میں اپنے پچھلے کاغذات کو ترتیب دے رہا ہوں ان میں یہ خط مجھے نہیں ملا۔

دعاؤں کا سخت محتاج ہوں۔ حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہم اللہ کی خدمت میں اس ناکارہ کا سلام اور دعا کی درخواست پیش فرمادیں۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ، ۴/۴/۱۴۳۱ھ

تقریظ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔ امابعد!

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری (امد اللّٰہ تعالیٰ عمرہ فی عافیۃ سابغۃ) ہمارے دور کے علماء واہل فتویٰ میں ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کا وجود ملت کا گرانقدر اثاثہ ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری قدس سرہ کی روحانی اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ کی علمی تربیت سے انہیں علم اور روحانیت دونوں کے کمالات سے حصۂ وافر ملا ہے، وہ عرصۂ دراز سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں فتوی کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں، ان کے فتاوی پر مشتمل تین جلدیں ''محمود الفتاویٰ'' کے نام سے شائع ہوئی ہیں، جس میں تمام فقہی ابواب سے متعلق ان کے اہم اردو فتاوی کو یکجا کر دیا گیا ہے، گجراتی فتاوی اس کے علاوہ ہیں، بندہ کے پاس یہ جلدیں مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی نے ارسال فرمائیں تو سرسری نظر سے دیکھنے پر ہی اندازہ ہوا کہ ان میں علم اور فقہ کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے، اندازِ فکر واستنباط اپنے اکابر کا ہم رنگ ہے، تفصیلی مطالعہ تو وقت چاہتا ہے؛ لیکن بندہ نے اسے ان کتابوں میں شامل کرلیا ہے

جس سے حسب ضرورت وقتاً فوقتاً استفادہ کیا کرتا ہوں، امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مجموعہ علماء اور عوام دونوں کے لیے نافع ہوگا، اللہ تبارک وتعالیٰ اسے شرفِ قبولیت عطا فرما کر حضرت مولانا مدظلہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنائیں۔ آمین

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۴/ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

تقریظ

حضرت مولانا سید مصلح الدین احمد بڑودوی القاسمی
شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الاسلام ڈیوزبری مرکز - یوکے - انگلینڈ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذي اصطفىٰ.

یوں تو آئے دن اتنے علمی و عملی فتنے ظاہر ہورہے ہیں کہ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس کس کا جواب دیا جائے اور کس کس کی طرف توجہ کی جائے؟ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

فتنوں کا ایک سیلاب ہے کہ امنڈتا چلا آرہا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاکر رکے گا، کہیں تعمیر نو کے نام پر تخریب دین ہے، کہیں عقائد اسلامیہ پر گلے ہیں، کہیں احکام شرعیہ سے انکار ہے، کہیں انکار سنت پر زور ہے، کہیں تحریف قرآن کا فتنہ ہے، کہیں جواز سود و تحلیل خمر کے فتوے ہیں، کہیں رقص وسرور کو جائز کرنے کے لیے تحقیقات ہورہی ہیں، کہیں سلف صالحین سے بدظن کرنے کی مذموم کوششیں ہورہی ہیں، کہیں اسلامی نظام کی ناکامی کے دلائل پیش کئے جارہے ہیں ۔

مصائب شتى جمعت في مصيبة ولم يكفها حتى قفتها مصائب

کتنے منتشر مصائب ایک مصیبت میں آکر جمع ہوگئے اور اس پر یہی بس نہیں بلکہ روزنئی نئی مصیبتیں رونما ہورہی ہیں۔

ان فتنوں اور حملوں کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام ایک ایسا جامع وکامل دین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں کو حاوی اور شامل ہے، دین اسلام ان

تمام خصوصیات وکمالات کا حامل ہے، جو سابقہ سماوی ادیان میں موجود تھیں، اسی طرح ان تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں سے مبرّا ومنزہ ہے، جو دوسرے مذاہب اور خوساختہ ادیان میں تھیں اور ہیں؛ اس لیے ہر مذہب وملت اور دین نے بجا طور پر دین اسلام کو اپنا مقابل وحریف سمجھ کر اس کی راہ روکنے کی کوشش کی۔

اسلامی دعوت کے آغاز سے ہی دین اسلام پر باطل کی طرف سے ہر قسم کی یورش ہوتی رہی اور ہر دور میں ہر طرف سے اس پر طرح طرح کے وار کیئے گئے: مگر چونکہ دین اسلام تا قیامت بہ حیثیت دین باقی رہنے اور تمام ادیان پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے، اس لیے مخالف کی مخالفت اس کی راہ روک نہ سکی؛ چنانچہ اہل اسلام نے منشأ خداوندی کی تکمیل میں اس کی حفاظت، دفاع اور نشر واشاعت کے لیے ہر محاذ پر ہر طرح کی قربانیاں دے کر اسلام کی حفاظت، دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا، اس کے لیے مسلمانوں نے کبھی جان ومال کا نقصان اٹھایا، تو کبھی دین وایمان پر وار سہے، دشمنوں نے کبھی سیف وسنان کی بارش کی، تو کبھی قلم وزبان سے زہر افشانی کی، بہر کیف مسلمانوں پر اس عنوان سے سخت سے سخت مشکلات اور کٹھن گھڑیاں آئیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مسلمانوں کی قربانیوں کی بہ دولت دین الٰہی کی شمع بہ دستور تاباں وفروزاں رہی۔

علماء امت کے ذمہ جہاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں، وہاں عصر حاضر کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی بھی انہی کے ذمہ ہے کہ موجودہ دور کے تمدن وتہذیب نے جو نت نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں ان پر غور کر کے ان کا حل تلاش کیا جائے، آج

کل کا نیا طبقہ اپنی ناواقفیت کی بناء پر اس خیال خام میں مبتلا ہے کہ اسلام کا قدیم نظام یا قدیم اسلامی فقہ موجودہ معاشرہ کی مشکلات کے حل کرنے کے لیے ناکافی ہے؛ لیکن اگر ذرا غور کیا جاوے تو بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے نظام کے دو حصے ہیں: ایک حصہ وہ ہے جو قرآن وسنت کی صریح نصوص سے ثابت ہے، یہ تمام تر اس علیم وقدیر اور حکیم وخبیر رب العالمین کا ابدی اور دائمی قانون ہے جس کا علم بھی ہر شیء کو محیط ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ قیامت تک جو آنے والی نسلیں ہیں ان میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہوں گی، اور اس کی قدرت بھی کامل ہے؛ چنانچہ اس نے اپنے علم محیط اور قدرت کاملہ سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام روحانی امراض کے لیے ایسا نسخۂ شفا اتارا ہے کہ جس میں نہ کسی ترمیم واصلاح کی گنجائش ہے، نہ کسی ادنیٰ سی تبدیلی کی۔

دوسرا حصہ وہ ہے جو علماء امت اور مجتہدین عظام نے قرآن کریم وسنت نبویہ سے استخراج واستنباط کر کے مرتب فرمایا ہے، اس کے مختلف مراتب اور مختلف ادوار ہیں۔ معاملات اور معاشرت میں بہت سے احکام ایسے بھی ہیں کہ جن کا تعلق اس عہد سے تھا مجتہدین امت کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ پہلے ہی سے ایسے اصول وقواعد مرتب فرما گئے ہیں کہ، تا قیام قیامت آنے والے اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقعہ ملتا رہے گا، اور ان ہی اصول وقواعد کی روشنی میں آئندہ ہر قسم کی مشکلات حل ہو سکیں گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت علماء امت کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے اپنے اپنے زمانہ میں ''اجناس''، ''واقعات'' اور ''نوازل'' کے عنوان سے روزمرہ کے نت نئے پیش آنے والے مسائل کو یکجا کیا اور پھر قدیم فقہ

اسلامی کی روشنی میں ان کو حل کیا، ٹھیک اسی طرح موجودہ فقہاء بھی جدید نوازل وواقعات کا حل قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں تلاش کریں اور اس قسم کے مسائل کے مفصل جوابات امت کے سامنے پیش کر کے امت مسلمہ کے دیندار طبقہ کو مطمئن فرمائیں اور جدید نسل کو باور کرائیں کہ دین اسلام میں ہر وقت کے صحیح تقاضے کو پورا کرنے کی کامل صلاحیت موجود ہے اور شریعت اسلامیہ زمان ومکان کی قیود سے بالاتر ہے۔

اہم فقہی مسائل بالخصوص جدید فقہی مسائل کا حل امت مسلمہ کی ہر وقت اور ہر لمحہ بنیادی ضرورت رہی ہے؛ کیونکہ ''فقہ'' عملی زندگی کے احکام وآداب کا عنوان ہے اور ہر لمحہ مسلمانوں کے ساتھ یہ ضرورت لاحق ہے، اس اہم ضرورت کی تکمیل بھی توجہ طلب امر ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: ﴿فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون﴾ ''پس پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے''۔ اسی طرح ارشاد نبوی ہے: ''انما شفاء العي السوال'' لاعلم کی شفاء سوال کرنے اور پوچھنے میں ہے۔ بلا شبہ اہل علم کا منصب اگر متلاشیان علم کی علمی ضرورت کو پورا کرنا اور پیاس بجھانا ہے، تو لاعلموں کا فرض ہے کہ وہ بھی اپنی علمی تشنگی حضرات اہل علم کے پاس جا کر دور کریں۔

دیکھا جائے تو سوال وجواب اور استفتاء وفتویٰ مذکورہ بالا اسی اہم بنیادی دینی ضرورت کی تکمیل اور قرآن وسنت کے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ہدایات اور ان کے جاں نثاروں کی اپنے ہادی ورہبر کی تعلیمات کو دل وجان سے عزیز رکھنا اور جی جان سے ان پر عمل کرنا اسی

کا نتیجہ ہے، قرآن کریم کی تفسیر وتشریح اور ذخیرۂ احادیث کی شکل میں تعلیمات نبوت کا مجموعہ بھی اسی کی عملی شکل ہے، اسلامی فقہ کا ذخیرہ بھی اسی سوال وجواب اور استفتاء وفتویٰ کی مدون شکل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیوں سے مسلمانوں نے اپنی روزمرہ زندگی کے مسائل اپنے دور کے اکابر اہل علم اور ارباب فتویٰ کے سامنے رکھے اور انہوں نے قرآن وسنت، اجماع امت، قیاس واجتہاد سے انہیں حل فرمایا، زمانۂ قدیم کے ضخیم فتاویٰ ہوں یا دور حاضر کے ارباب فتاویٰ کی علمی کاوشیں، سب اسی ضرورت کی تکمیل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور سے لے کر آج تک کی تاریخ اس کی شاہد عدل ہے کہ، جب کبھی بھی کسی عالم دین نے کوئی دینی درسگاہ قائم کی، تو عامۃ المسلمین کی اس بنیادی ضرورت کے تحت اس نے ایک دارالافتاء بھی قائم کیا جو مسلمانوں کے روزمرہ مسائل کا شرعی اور فقہی حل بتلائے، پھر ان علماء امت میں سے تقویٰ وتدین کے اعتبار سے جو جتنا قدآور تھا مسلم عوام کا اسی قدر اس کی طرف رجوع ہوا، یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر علماء کے فتاویٰ کا مجموعہ پینتیس سے چالیس جلدوں تک جا پہنچا۔

چنانچہ اسی گراں قدر زریں سلسلہ کی ایک کڑی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، نوساری، گجرات، انڈیا کا ''دارالافتاء'' ہے جو بحمد اللہ اپنے آغاز سے تا حال ہندوبیرون ہند مسلمانوں کے اعتقادی، معاشرتی اور معاشی مسائل میں ان کی دینی رہنمائی کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔

حضرت مولانا احمد خانپوری صاحب بہ حیثیت صدر مفتی:

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا احمد بزرگ سملکیؒ، حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہ ڈابھیلیؒ، حضرت مفتی اسماعیل گورا راندیریؒ، حضرت مفتی اسماعیل کچھولوی صاحب زید مجدہ؛ یکے بعد دیگرے ان علمی شخصیات نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے دارالافتاء کی مسند صدارت کو زینت بخشی ہے، اور ابھی پچھلے پچیس چھبیس سال سے مولانا احمد خانپوری حفظہ اللہ تعالیٰ صدر مفتی کی حیثیت سے اس شعبۂ افتاء کی خدمات انجام دے رہے ہیں، مفتی احمد صاحب کے قلم سے اس طویل عرصہ میں ہزارہا فتاویٰ صادر ہوئے، ان میں سے بعض فتاویٰ ہفتہ واری اخبار ''امید'' سورت، ماہنامہ بیان مصطفےٰ وغیرہ مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے، اب یہ فتاویٰ مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی معین مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک کی تقدیم وترتیب سے ''محمود الفتاویٰ'' کے نام سے اردو اور گجراتی زبان میں منظر عام پر آگئے ہیں، اردو میں چار جلدیں اور گجراتی میں دو جلدیں طبع ہوچکی ہیں، ان فتاویٰ کے مستند ومعتبر ہونے کے لیے صاحب فتاویٰ کا نام نامی کافی ہے۔

حضرت مولانا احمد خانپوری صاحب:- خانپور، ضلع بھروچ، گجرات، انڈیا کے باشندے ہیں اور ایک تجربہ کار، سنجیدہ، کہنہ مشق، بالغ نظر مفتی ہیں، قرآن کریم، حدیث وفقہ پر عمیق نظر رکھنے والے بڑے صاحب قلم عالم دین ہیں، اسلامک فقہ اکیڈمی ''ادارة المباحث الفقهية'' کے متعدد فقہی اجتماعات وسمیناروں میں مختلف موضوعات پر ان کے تحریر کردہ مقالے پڑھے جاتے رہے ہیں اور طبع بھی ہوچکے ہیں، علاوہ ازیں سالہا سال سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آپ کا حدیث وفقہ کا

تدریسی سلسلہ بھی جاری ہے، بخاری شریف بھی فی الحال زیر تدریس ہے، آپ فقیہ الزمن حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ قدس سرہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، عوام وخواص کی ایک کثیر تعداد کا اصلاحی تعلق آپ سے ہے۔

شوال ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں دارالعلوم اشرفیہ راندیر، سورت میں بہ طور مدرس احقر کا تقرر ہوا، یہ مولانا احمد خانپوری صاحب کی طالب علمی کا ابتدائی دور تھا، انہوں نے درجۂ عربی دوم کی سب کتابیں مجھ سے پڑھی ہیں، ذہانت، ذکاوت، قوت حافظہ کے ساتھ ساتھ صلاح وتقویٰ، مطالعہ وتکرار، نماز باجماعت کی پابندی، اسباق میں بلا ناغہ وقت کی پابندی کے ساتھ شرکت اور استاذ کی تقریر کو بہ غور سننا، اساتذہ کا ادب واحترام، ان کی خدمات، تواضع انکساری، ملنساری وغیرہ اوصاف۔ جو حصول علم کے لیے نہایت ضروری، اور کسی بھی علمی وعملی کمال کے حصول کے لیے اساس وبنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا احمد خانپوری صاحب کی ذات گرامی بچپن اور طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان کی حامل تھیں۔

بہرحال دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ موصوف کے فتاویٰ اور دیگر جملہ دینی وعلمی خدمات کو قبولیت سے نوازے اور ان کے ظاہری وباطنی فیض کو عام وتام فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔ والسلام

سید مصلح الدین احمد بڑودوی القاسمی

خادم حدیث نبوی جامعہ تعلیم الاسلام ڈیوز بری مرکز۔ یوکے۔

۱۵/ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۴/ جون ۲۰۱۰ء پنجشنبہ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور صاحب نظر فقہاء میں ہیں، علم و تحقیق کے ساتھ ساتھ دعوت و اصلاح اور تعلیم و تدریس سے آپ کا شبانہ روز کا تعلق ہے، استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی کے تربیت یافتہ اور حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ کے معتمد، نیز حلقۂ علماء کی محبوب شخصیت ہیں۔ راقم الحروف نے ان کے فتاویٰ کے مجموعہ ''محمود الفتاویٰ'' کا مطالعہ کیا ہے، بہت خوب فتاویٰ ہیں: تحقیق کے اعتبار سے بھی، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی، اور اعتدال کے پہلو سے بھی، خاص کر نئے مسائل اچھی خاصی تعداد میں آ گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اس کی مزید جلدیں آ جائیں، مفتی صاحب کا سایہ عاطفت تادیر امت پر قائم رہے، اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ان سے نفع پہنچے۔

(مولانا) خالد سیف اللہ

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد)

۱۹/ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۳/ فروری ۲۰۱۱ء

گرامی نامہ

حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی دامت برکاتہم

(خادمِ حدیث جامعہ جمبوسر، خادم دارالافتاء دارالعلوم کنتھاریہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً:

محترم مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی زید مجدہ العالی و فضلہ الغالی

(مرتب محمود الفتاویٰ)

السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ

ناکارہ خیریت طرفین کا طالب ہے، امید ہے آپ بخیریت وعافیت ہوں گے۔

دیگر عرض اینکہ مؤرخہ ۴/ اگست بروز سہ شنبہ ۱۲/ شعبان ۱۴۳۰ھ بمقام جامعہ جمبوسر، پیر طریقت حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے محمود الفتاویٰ کی تین جلدیں بطور ھدیہ سنیہ عنایت فرمائیں، جس کو آپ محترم نے حسن وخوبی کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔ تقبل اللہ منکما و شکر سعیکما الجمیل.

فتاویٰ کے اس قابل قدر قیمتی مجموعہ کو حاصل کر کے اور اس کو دیکھ کر بندہ کو غیر معمولی مسرت حاصل ہوئی، باوجود اس کے کہ بندہ کئی روز سے علیل چل رہا تھا، مگر مارے خوشی اور شوق کے اسی وقت پہلی جلد کے مقدمہ کا ادھر اُدھر سے طائرانہ مطالعہ کیا اور بعدہ الحمدللہ تعالیٰ پورا مقدمہ اطمینان سے پڑھا اور کچھ فتاویٰ کا بھی مطالعہ کیا۔

آپ محترم نے مبسوط مقدمہ تحریر فرما کر بغیر کسی غلو و مبالغہ کے حضرت مفتی

صاحب دامت برکاتہم اور ان کے فتاویٰ کا حقائق پر مبنی تعارف اور حضرت والا کا قابلِ تقلید ماضی وحال پیش فرمایا ہے، اور فتاویٰ کے مجموعہ کی ترتیب پر اس مقدمہ نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ احقر نے اپنی طالب علمی کے دور سے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو- جبکہ آں محترم دار العلوم اشرفیہ راندیر میں عربی چہارم و پنجم پڑھتے تھے- دوام و استقامت کے ساتھ علمی، عملی، اخلاقی اعتبار سے صاف ستھری روش کا رہرو دیکھا، جو آج گجرات و بیرون گجرات بلکہ بیرون ہندانہی پہلوؤں سے امتِ مسلمہ کے معروف رہبر و مقتدا ہیں، فن فقہ، حدیث شریف و افتاء کے استاذ ماہر ہونے کے ساتھ وسعتِ ظرفی، متعلقین حضرات کی تربیت اور رجال سازی کی مخلصانہ فکر وسعی یہ حضرت والا کا خاص امتیازی وصف رہا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اگر یوں کہا جائے کہ حضرت والا نے بہت سے افراد کو دھکّے دے دے کر ہندوستان کے حضرات اکابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اور بڑے بڑے اداروں سے جوڑا ہے اور نا اہلیت کے اعتراف کے باوجود بڑی بڑی اہم ذمہ داریوں کے لیے آگے بڑھایا ہے تو بلا مبالغہ یہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے اور ان کے عالی ظرف کی خورد نوازیاں ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی کے فتاوی کے متعلق بندہ جیسے ہیچ مداں کا کچھ کہنا یا لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے؛ البتہ اس کو پڑھنے والا اس بات کا اعتراف کرے گا کہ اس میں حضراتِ سلف صالحینؒ کے فتاوی کی طرح قدامت کا استناد اور حوادث ونوازل کا اجتہاد جھلکتا ہے۔

آپ محترم نے مقدمہ میں حضرت مفتی صاحب کے طریقۂ افتاء اور تدریبِ

افتاء کے منہج کو اور اس کے اصول زریں کو تحریر فرما کر طبقۂ اہل علم کے لیے عموماً اور شعبۂ افتاء سے متعلق حضرات کے لیے خصوصاً بہت ہی مفید، قابل مطالعہ و لائق عمل مواد جمع فرما دیا ہے، جس سے اہل علم ہمیشہ مستفید و مستفیض ہوتے رہیں گے۔ اخیراً بندہ دعاء کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خواص وعوام کو محمودالفتاویٰ سے دینی رہبری حاصل کرنے کی توفیق عنایت فرمائیں اور حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے سایۂ عاطفت کو عافیت کے ساتھ امت پر تادیر قائم و باقی رکھ کر آپ کے علمی واصلاحی فیوض کو جاری وساری رکھیں اور آپ محترم کی اس سعی ثمین کو شرف قبولیت سے نوازیں اور اس قیمتی مجموعہ کی قدردانی کرتے ہوئے اور اپنی سعادت سمجھتے ہوئے اس کی طباعت اور اشاعت میں مالی وغیرہ تعاون پیش کرنے والے حضرات کو دارین میں بہترین بدلہ عنایت فرمائیں۔ آمین یا رب **العالمین و صلی اللہ علی النبی الکریم.**

العبد اسماعیل عفی عنہ بھڑکودروی
خادم حدیث جامعہ جمبوسر
خادم افتاء دارالعلوم کنتھاریہ
۱۸/شعبان ۱۴۳۰ھ
10/8/2009

کتاب الإیمان والعقائد

عقائد شیعہ اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشیں

سوال: امسال ماہِ محرم کے موقعہ پر شیعہ فرقہ کے رہنما، جسے وہ لوگ (وڈا مُلّا) کہتے ہیں، سورت آئے، اور دس دن تک ان کے پروگرام ہوئے، اس موقعہ پر ہمارے بعض اداروں نے اپنے مکان کرایہ پر ان کو دیے، اور بعض مسجدوں کے برتن بھی ان لوگوں کو کرایہ پر دیے گئے، بعض مسلم اخباروں نے ان کی تعریف کی اور مسلمانوں کے کچھ لیڈر استقبال کے لیے ایئرپورٹ گئے، اور ان کے وڈا ملا کا استقبال کیا، شیعوں کے عقائد صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق نہایت گندے اور خراب ہیں، اور ان لوگوں کے پروگراموں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخیاں اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر سب وشتم ہوتا ہے؛ چنانچہ سالِ گذشتہ اسی محرم الحرام کے موقعہ پر بمبئی میں ان کے اسی وڈا ملا نے خلیفۂ اول، افضل امت، سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں سخت گستاخی کی تھی، ایسے لوگوں کو ان کے اپنے مذہبی پروگراموں کے موقعہ پر اپنے مکان اور مسجد کے برتن کرایہ پر دینا، ان کا تعاون شمار ہوگا یا نہیں؟ اور ان کو کرایہ پر دینے میں شرعی قباحت ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں گے۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

روافض کے جو فرقے اس وقت دنیا میں موجود ہیں، ان میں فرقۂ اثنا عشریہ کو تعداد اور بعض دوسری حیثیتوں سے امتیاز اور اہمیت حاصل ہے، اسی کی ایک شاخ داؤدی بھی ہیں، جن کے مذہبی رہنما ''وڈا ملا'' ہیں، اسلام کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں اور فتنوں میں بعض فتنے انتہائی شدید اور خطرناک تھے؛ مگر ان میں بھی روافض کا فتنہ سب سے زیادہ

خطرناک ثابت ہوا، اس فرقہ کو جب بھی موقعہ ملا اس نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اس فرقہ کو بعض اوقات اقتدار بھی ملا تو اس نے اس موقعہ پر بھی بھرپور فائدہ اٹھایا، بیت اللہ پر حملہ کیا، حجر اسود کو اٹھا کر لے گئے، مسلمانوں کا قتل عام کیا، علماء کو شہید کیا، اسلام کے ساتھ شیعوں کا رویہ کیا رہا؟ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے:

الرافضة يوالون أعداء الدين: الذين يعرف كل أحد معاداتهم من اليهود والنصارى والمشركين مشركي الترك، ويعادون أولياء الله الذين هم خيار اهل الدين، وسادات المتقين، وهم الذين أقاموه، وبلغوه، ونصروه، ولهذا كان الرفضة من أعظم الأسباب في دخول الترك الكفار إلى بلاد الاسلام، وأما قصة الوزير ابن العلقمي وغيره كالنصير الطوسى مع الكفار وممالاتهم على المسلمين فقد عرفها الخاصة والعامة، وكذلك من كان فهم بالشام ظاهروا المشركين على المسلمين، وعاونوا هم معاونة عرفها الناس، وكذلك لما انكسر عسكر المسلمين لما قدم غازان ظاهروا الكفار النصارى وغيرهم من اعداء المسلمين، وباعوهم اولاد المسلمين بيع العبيد، واموالهم، وحاربوا المسلمين محاربة ظاهرة، وحمل بعضهم رأية الصليب، وهم كانوا من أعظم الأسباب في استيلاء النصارىٰ قديما على بيت المقدس الخ (منهاج السنة ٤/١٠١)

یعنی روافض ہمیشہ یہود، نصاریٰ، تاتاری، مشرکین وغیرہ؛ دشمنان اسلام کا

ساتھ دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ان مخلص بندوں سے بغض وعداوت رکھتے ہیں جو اعلی درجہ کے دین دار اور متقیوں کے سردار تھے، اور دین کی تبلیغ اور نصرت اور اسے قائم کرنے والے تھے، تاتاری کفار کے اسلامی ملکوں میں راہ پانے میں سب سے زیادہ دخل ان روافض ہی کا تھا، ابن العلقمی اور نصیر طوسی وغیرہ کی دشمن نوازی اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشیں اب ہر خاص وعام کو معلوم ہو چکی ہیں، شام میں جو روافض تھے انھوں نے بھی کھلم کھلا کافروں کا ساتھ دیا تھا، اور غازان کی آمد پر جب لشکرِ اسلام کو شکست ہوئی اس وقت عیسائیوں اور دیگر اسلام دشمن طاقتوں کی انھوں نے پوری مدد کی تھی، یہاں تک کہ مسلمانوں کی املاک اور ان کے بچوں کو ان کے ہاتھوں غلاموں کی طرح فروخت کیا تھا، اور مسلمانوں سے علانیۃً جنگ کی تھی؛ بلکہ ان میں سے بعض نے تو صلیبی جھنڈا بھی بلند کیا تھا، اور گذشتہ دور میں عیسائیوں کے بیت المقدس پر قبضہ میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس طرز عمل کے علاوہ شیعوں اور روافض کے عقائد کا ان ہی کی کتابوں سے مطالعہ کیا جائے، تو روز روشن کی طرح بات عیاں اور واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں، ان کا دین ومذہب ایک الگ اور خود ساختہ ہے، جو اسلام کے بالکل متوازی اور اسلام سے متصادم ہے؛ مگر آج تک عوام مسلمان اس فرقہ کو اسلام ہی کا ایک فرقہ سمجھتے ہیں، اور حنفی مالکی شافعی حنبلی کی طرح اسے بھی ایک مسلک سمجھتے ہیں؛ حالانکہ اس فرقہ کے عقائد ومسلمات کو پڑھ کر اس خیال کی تردید ہوتی ہے، بات یہ ہے کہ اس فرقہ نے ہر دور میں تقیہ کا سہارا لیا اور ہمیشہ اس کے فتنے ان کا الحاد وزندقہ اور اس کے کفریات تقیہ کی سیاہ چادر میں چھپے رہے۔

(تنبیہ): تقیہ ان کے دین کا جزء ہے، تقیہ کا معنی ہے جھوٹ بولنا، نفاق سے کام لینا، کسی کو دھوکہ دینا وغیرہ ان کے مذہب میں تقیہ جائز ہی نہیں؛ بلکہ بہت بڑا ثواب ہے، جو آدمی نفاق سے کام نہیں لیتا وہ بے دین ہے، اصولِ کافی کی روایت ہے: "لا دین لمن لا تقیة له" اور ایک روایت میں ہے: "لا إیمان لمن لا تقیة له" یعنی جو شخص لوگوں کو دھوکہ نہیں دیتا، وہ بے دین اور بے ایمان ہے۔ (از احسن الفتاویٰ ۱/ ۹۵،۹۶) ان کے عقائد کی تفصیل کا اس وقت موقعہ نہیں؛ البتہ ان کے چند اصول حسب ذیل ہیں:

(۱): نظریۂ امامت: شیعہ مذہب کی اصل الاصول بنیادعقیدۂ امامت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی جانب سے انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا جاتا تھا، اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بعد اماموں کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا جائے گا، وہ شیعہ عقیدہ میں نبی کی طرح ہر غلطی سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں، ان پر وحی نازل ہوتی ہے، ان کی اطاعت ہر بات میں نبی کی طرح فرض ہے، وہ نبی کی طرح احکامِ شریعت نافذ کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قرآن کریم کے جس حکم کو چاہیں منسوخ یا معطل بھی کر سکتے ہیں، گویا اسلامی عقیدہ میں جو مفہوم، جو حیثیت اور جو مرتبہ ایک مستقل ایک صاحبِ شریعت نبی کا ہے، ٹھیک وہی مفہوم، وہی حیثیت اور وہی مرتبہ شیعوں کے نزدیک "امام معصوم" کا ہے۔

شیعوں کا یہ "نظریۂ امامت" آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کے خلاف ایک بغاوت اور اسلام کی ابدیت کے خلاف ایک کھلی سازش ہے، یہی وجہ ہے کہ دورِ قدیم سے لے کر مرزا غلام احمد قادیانی تک، جن جن لوگوں نے نبوت و رسالت کے جھوٹے دعوی کئے،

انھوں نے اپنے دعووں کا مصالحہ شیعوں کے ''نظریۂ امامت'' ہی سے مستعار لیا ہے، شیعہ مذہب کا ''نظریۂ امامت'' فطری طور پر غلط تھا، یہی وجہ ہے کہ شیعہ مذہب بھی اس کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکا؛ بلکہ اس نے ''اماموں'' کا سلسلہ بارھویں امام پر ختم کر کے اسے (۲۶۰ھ) میں کسی نا معلوم غار (سرّ مَن رائٰی کے غار) میں ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا، آج ان کو ساڑھے گیارہ صدیاں گزرتی ہیں، مگر کسی کو کچھ خبر نہیں کہ بارھویں امام کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں؟ ...... یہ عقیدہ یہودیوں نے آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت پر ضرب لگانے اور امت میں جھوٹے مدعیانِ نبوت اور امامت کا چور دروازہ کھولنے کے لیے گھڑا ہے، غور فرمایئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ تک چھ صدیوں کا کامل عرصہ گزرتا ہے؛ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہادی مبعوث نہیں کیا جاتا، ادھر جب ختم نبوت کا آفتاب (ﷺ) قیامت تک کی ساری دنیا کو منور کرنے کے بعد رخصت ہوتا ہے، تو شیعہ عقیدہ کے مطابق خدا ایک دن کا ایک لمحہ کا وقفہ بھی نہیں کرتا؛ بلکہ فوراً ایک ''امام معصوم'' کو کھڑا کر کے اسے شریعت محمد یہ کے حلال وحرام کو بدلنے اور قرآن کو منسوخ کرنے کے اختیارات دے دیتا ہے، اور پھر ایک نہیں لگاتار (بارہ امام) اسی شان کے بھیجتا رہتا ہے، اور جب اسلام پر اڑھائی صدیوں کا مایۂ ناز دور گزر جاتا ہے تو خدا یکا یک اماموں کا سلسلہ بند کر دیتا ہے؛ بلکہ بارہواں امام جو بھیجا جا چکا تھا، اسے بھی دو سال ہی کی عمر میں ہمیشہ کے لیے غائب کر دیتا ہے، کیا ایک ایسا شخص جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت ونبوت پر ایمان رکھتا ہو، جس کے نزدیک اسلام مٹنے، بدلنے اور مسخ ہونے کے لیے نہیں؛ بلکہ قیامت تک اپنی اصلی حالت میں باقی رہنے اور چمکنے کے لیے آیا ہو، وہ

شیعوں کے ’’نظریۂ امامت‘‘ کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت کرسکتا ہے؟

(۲): شیعوں کا دوسرا سب سے بڑا اصول صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض وعداوت ہے:
شیعوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، وہ نعوذ باللہ اس فعل کی وجہ سے سب کے سب کافر اور مرتد ہوگئے تھے؛ کیونکہ انھوں نے امام معصوم یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، ان میں بھی حضرات شیخین (سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کے بارے میں تو ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ (معاذ اللہ) نہ صرف یہ کہ کافر ومنافق تھے؛ بلکہ اگلی امتوں اور اس امت کے خبیث ترین کافروں فرعون، ہامان، نمرود، ابولہب، ابوجہل؛ سے بھی حتی کہ شیطان مردود سے بھی بدتر درجہ کے کافر تھے، اور جہنم میں سب سے زیادہ عذاب ان ہی دونوں پر ہے، اور یہ کہ ان دونوں کی بیٹیاں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویاں: حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما) بھی العیاذ باللہ منافقہ وکافرہ تھیں، اور اپنے باپ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے کہنے سے ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دے کر شہید کردیا، استغفر اللّٰہ، ثم استغفر اللّٰہ، والعیاذ باللّٰہ شیعوں کا یہ عقیدہ جس قدر باطل اور غلط ہے، اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، اس عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف لانا نعوذ باللہ بالکل لغو بیکار اور بے سود ثابت ہوا، اسلام کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کے لیے آیا ہے، مگر شیعہ عقیدہ یہ کہتا ہے کہ بالکل غلط، اسلام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک دن بھی آگے نہیں چلا؛ بلکہ وہ پوری کی پوری جماعت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس سال کی مسلسل محنت کے بعد تیار کی تھی، اور

جن کو اپنے درمیان اور آنے والی امت کے درمیان واسطہ بنایا تھا، وہ آنحضرت ﷺ کی رحلت کے دن ہی نعوذ باللہ مرتد ہوگئی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعہ مذہبِ اسلام کی نفی کا نام ہے، یعنی اگر شیعہ عقیدہ صحیح ہے، تو اسلام معاذ اللہ غلط ہے، اور اگر اسلام حق ہے، تو شیعہ مذہب کے غلط اور باطل ہونے میں کسی عاقل کو شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

شیعہ مذہب نے آنحضرت ﷺ کے رفقاء اور آپ ﷺ کے جانشینوں پر حملہ کر کے خود اسلام اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ایک ایسا حملہ کیا ہے، جس کی مثال انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے، تفسیر مظہری میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے استاد امام شعبیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر یہودیوں سے پوچھو کہ تمھاری امت میں سب سے افضل لوگ کون ہوئے؟ تو وہ فوراً کہیں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفقاء اور ان کے صحابی، اور اگر عیسائیوں سے پوچھو کہ تمھاری جماعت میں بزرگ تر کون لوگ ہیں؟ وہ فوراً بول اٹھیں گے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری؛ لیکن اگر شیعوں سے پوچھو کہ امت محمدیہ (ﷺ) میں سب سے بدترین مخلوق کون ہے؟ تو ان کا جواب ہوگا محمد ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم۔ نعوذ باللہ، استغفر اللہ؛ بہرحال شیعوں کا نظریۂ امامت اگر آنحضرت ﷺ کی نبوت کے خلاف ایک بغاوت تھا، تو ان کا نظریۂ تبرّا خود آنحضرت ﷺ کی نبوت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے، اور کوئی شخص جو آنحضرت ﷺ پر ایمان رکھتا ہو یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ آپ ﷺ کی تیار کی ہوئی پوری جماعت، آپ ﷺ کے آنکھیں بند کرتے ہی نعوذ باللہ گمراہ اور مرتد ہوگئی تھی۔

(۳) شیعوں کا تیسرا عقیدہ اول الذکر دونوں عقیدوں سے بدتر؛ مگر دو اور دو چار کی طرح اول الذکر عقیدوں کا لازمی نتیجہ ہے، اور وہ ہے تحریفِ قرآن، مسلمان تو

مسلمان آج تک کسی بد سے بدتر کافر کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے نام سے جو مقدس کتاب محفوظ چلی آتی ہے، اور جس کے ہر زمانہ میں ہزاروں نہیں، لاکھوں حافظ موجود رہے ہیں، وہ ٹھیک وہی کتاب نہیں جو مسلمانوں کو رسول اللہ نے دی تھی، لیکن آفریں ہے شیعہ مذہب کے موجدوں کو انھوں نے یہ عقیدہ بھی شیعوں سے منوالیا، شیعہ مذہب کہتا ہے کہ قرآن کریم جو موجودہ شکل میں مسلمانوں کے پاس ہے، یہ وہ اصل قرآن نہیں جو محمد ﷺ کو دیا گیا تھا، بلکہ صحیفۂ عثمانی ہے، ''اصلی تے وڈا قرآن'' (اصلی وہ بڑا قرآن ہے جو) بارہویں امام کے ساتھ کسی نامعلوم غار میں دفن ہے۔ (اختلاف امت اور صراط مستقیم از ۱۸ تا ۲۳ بتغییر یسیر)

شیعوں کے ان عقائد کی وجہ سے تمام علمائے اسلام نے ان کو کافر و مرتد قرار دیا ہے، ماضی قریب میں اس سلسلہ میں ایک تفصیلی فتوی ہند و پاک و بنگلہ دیش کے علماء کے دستخط سے شائع بھی ہو چکا ہے، خود آپ کے استفتاء میں ''وڈا املا'' کا سالِ گزشتہ محرم الحرام کا عمل بھی تحریر ہے، اور یہ ایسی معروف و مشہور بات ہے جس سے تمام اخبار بین حضرات بخوبی واقف ہیں، اب ایسی شخصیت کی آمد پر ان کا استقبال اور اظہار مسرت؛ نیز ان کے مذہبی پروگراموں کے لیے جو ظاہر ہے کہ ان کے انہی باطل عقائد و نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے ہوتے ہیں؛ بلکہ امسال ان پروگراموں کا سلسلہ بمبئی سے سورت اسی لیے منتقل کیا گیا ہے کہ گزشتہ سال کے واقعہ سے بمبئی کے مسلمان چونک گئے ہیں، اور امسال کے پروگراموں پر ان کے تعاقب کا قوی خدشہ تھا، اس لیے اس سے بچنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے یہ لوگ اس سلسلہ کو سورت میں لے آئے؛ تاکہ ان کی شرارتوں پر پردہ

پڑا رہے، ایسے موقعہ پر اسلامی غیرت وحمیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ سورت کے مسلمان اس سلسلہ کی سورت میں منتقلی پر ہی اپنے غم وغصہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے، چہ جائے کہ اپنے اداروں کی عمارتوں کو کرایہ کے لالچ میں ان کے حوالہ کررہے ہیں، اور لیڈر حضرات ووٹ کے لالچ میں اور اپنی لیڈری چمکانے کے لیے استقبال کررہے ہیں، فإلى الله المشتكى.

یہ یادرہے کہ ''وڈا ملا'' کی سورت میں آمد کسی سیاسی پروگرام کے ماتحت نہیں تھی؛ بلکہ خالص مذہبی پروگرام کی غرض سے تھی، اس لیے شرعی طور پر ان کے استقبال یا اس پروگرام میں کسی بھی نوع کا تعاون جائز نہیں ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ (سورۂ مائدہ آیت۲) یعنی گناہ اور زیادتی (کی باتوں) میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو۔ ''تفسیر روح المعانی'' میں آیت کریمہ: ﴿فلن اکون ظهيرا للمجرمين﴾ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار؟ یہاں تک کہ وہ لوگ جنھوں نے ظالموں کے دوات، قلم کو درست کیا ہے، وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کرکے جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔ (معارف القرآن ۳/۲۵)

یہ یادرہے کہ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ظلم کا اطلاق تمام گناہوں پر ہوتا ہے، حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من وقر صاحب بدعة، فقد أعان على هدم الاسلام. (مشکوٰۃ شریف ۳۱) یعنی جس نے کسی صاحبِ بدعت کی توقیر وتعظیم کی، اس نے (گویا تمام اہل) اسلام کے نیست ونابود کرنے پر تعاون کیا، آج کل استقبال تعظیم وتوقیر کی غرض سے ہی کیا جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں ایران کی شیعی حکومت کے باطل پروپیگنڈہ نے مسلمان نوجوانوں کے دل ودماغ کو متأثر کیا ہے، ایسے وقت ان لوگوں کے ساتھ اس طرح کا تعاون اور رابطہ عوام مسلمین کے دین وایمان کے لیے مہلک ہے، شیعوں کے یہاں محرم الحرام کی مجالس ان کا مذہبی شعار سمجھی جاتی ہیں، جن میں وہ گوناگوں خرافات کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کے اس مذہبی شعار کی ادائیگی کے لیے مکان مہیا کرنا، کس قدر خطرناک ہے؟ اس کا اندازہ ہر باحمیت وباغیرت مسلمان بہ آسانی لگا سکتا ہے، خصوصاً اگر ادارہ کا یہ مکان اگر مخصوص کام کے لیے وقف ہو تو وقف کرنے والے کے مقرر کردہ شرائط کے خلاف اس کو استعمال کرنا، یعنی کرایہ پر دینا تو عام حالات میں بھی درست اور جائز نہیں ہے۔

آیتِ کریمہ: ﴿وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ (سورۂ ہود ۱۱۳) کی تفسیر میں ابن جریرؒ نے فرمایا ہے کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو۔ ابوالعالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو۔ جابر بن زیدؒ فرماتے ہیں کہ رکون (جو آیت میں مذکور ہے) کا مطلب ہے مداہنت برتنا، یعنی ان کے کفریات پر انکار نہ کرنا۔ (تفسیر قرطبی ۹/۱۰۸)

آگے تفسیر فرماتے ہوئے علامہ قرطبیؒ رقمطراز ہیں: "وإنها دالة على هجران أهل الكفر، والمعاصي من أهل البدع وغيرهم" یعنی اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے۔ (بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے) (معارف القرآن ۳/۶۷۳)

مدینہ منورہ میں یہود کے جو قبائل آباد تھے، ان میں ایک بنو قینقاع تھا، ان کے

ساتھ نبی کریم ﷺ کا معاہدہ تھا کہ ہم آپس میں جنگ نہیں کریں گے، اور ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد بھی نہیں کریں گے، ان لوگوں نے بعد میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی، اور اس کو توڑ دیا، اس وقت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے (جن کے ان کے ساتھ تعلقات تھے) ان کی اس شرارت اور غدر کو دیکھ کر ان کے ساتھ جو تعلقات تھے تمام یکسر ختم فرما کر ان سے بیزاری کا اعلان فرمایا۔ (فتح الباري ۷/۲۶۵) اس وقت قرآن پاک کی آیت ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ نازل ہوئی۔ (روح المعانی ۶/۱۵۷)

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ اس واقعہ سے استنباط فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں: کہ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے جیسے اللہ اور رسول (ﷺ) اور عباد مومنین کی محبت ضروری ہے، اسی طرح اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے دشمنوں سے عداوت ونفرت، بیزاری اور برأت کا اعلان بھی ضروری ہے۔ (سیرۃ المصطفیٰ ۲/۱۷۰)

شیعوں کی مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور عداوت ڈھکی چھپی نہیں ہے، یہ لوگ مسلمانوں کے حقیقی خیر خواہ نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بیوقوف بنا کر نقصان پہنچائیں، اور دینی ودنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں، ان کی آرزو یہ ہے کہ مسلمان تکلیف میں رہیں، اور کسی نہ کسی تدبیر سے انہیں دینی یا دنیوی نقصان پہنچے، جو دشمنی یا ضرر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت زیادہ ہے؛ لیکن بسا اوقات عداوت وغیظ وغضب سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا بھی ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا پتہ دیتی ہے۔ ارشاد ربانی: ﴿لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ

بَـدَتِ الْبَـغْـضَـاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ أَكْبَر﴾ الخ کے مصداق ہیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ:العبداحمدعفی عنہ خانپوری،۸/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح:عباس داؤدبسم اللہ عفی عنہ

تقدیر پرایمان لانے کی حقیقت

سوال: ایک مسئلہ میں میری ذہنی پریشانی کودورکیجئے اوروہ یہ ہے، ویسے بحمداللہ پچیس سال سے دعوت وتبلیغ ہی میں لگا ہوا ہوں؛ عرض یہ ہے کہ قرآن پاک کوحق تعالیٰ نے دنیا بنانے سے ہزاروں سال قبل لکھا تو جو واقعات قرآن میں لکھے ہیں، اس کواسی طرح کرنا تھا، پھرجس کے بارے میں کفرطے کردیااورقرآن کے لکھے ہوئے کے مطابق اس کودنیامیں وجودکیا،تو پھرانسان اللہ کی ناراضگی میں کیوں؟اور یہ تو ہونہیں سکتا کہ قرآن شریف میں جوضابطہ مقررکیا تواس کےخلاف تو ہوہی نہیں سکتا،بہت سی حدیثوں میں سنا ہے کہ بچہ کی پیدائش کے وقت یا وہ ابھی پیٹ میں ہےاورلکھ دیا جاتا ہے کہ سعید ہوگا یا بدبخت اس میں دماغ الجھارہتا ہے۔

اس ضمن میں بہت کچھ کہنا ہے،بس صرف اشارہ کیا ہے،اس لیے آپ میرے بوجھ ذہن کودورفرمائیں؛ کیونکہ دین کی محنت کرنا ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱): شرعی نظر میں مسئلہ تقدیر کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے ایمان باللہ اورایمان بالرسول کی طرح ایمان بالتقدیرکوبھی اسلام کاایک رکن لازم

قرار دیا ہے، گویا جو شخص تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور اس کے رسول پر بھی ایمان نہیں رکھتا؛ چونکہ اس مسئلہ کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اور حسیات میں جہاں نظائر نہیں ملتے، عقل اپنا ہی حکم مقدم رکھتی ہے، اسی لیے شریعت نے یہ تعلیم فرمائی ہے کہ جو مجھ کو تسلیم کر چکا ہے اس کو میرا حکم ماننا ہوگا، اور یہی ایمان بالتقدیر ہے، آخر جنت ودوزخ کو کس نے دیکھا؛ بلکہ خدا تعالیٰ کی ذات کو کس نے دیکھا، یہ تمام حقائق غیب ہیں، یہاں جو شخص محض انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کر چکا ہے بس وہی مومن ہے، اور جس نے راہِ انحراف اختیار کی وہ دوسری طرف شمار ہوتا ہے۔ (ترجمان السنۃ)

قضاء وقدر میں گفتگو کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے آں حضرت ﷺ کو فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ: جس شخص نے تقدیر کے مسئلہ میں ذرا بھی زبان ہلائی، قیامت میں اس کی اس سے باز پرس ہوگی، اور جس نے کوئی گفتگو نہیں کی اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ (ابن ماجہ شریف)

قضاء وقدر میں بحث ومباحثہ کرنے سے گریز کرنا چاہئے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس باہر تشریف لائے، اس وقت ہم تقدیر کے مسئلہ میں بحث کر رہے تھے، اس پر آپ کو اتنا غصہ آیا کہ آپ کا چہرۂ مبارک مارے غصہ کے سرخ ہوگیا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ کے رخساروں میں انار کا عرق نچوڑ دیا گیا ہے، فرمایا کیا تم کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے، یا میں اسی کے لیے تمھارے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں؟ خوب یاد رکھو! تم سے پہلی امتوں نے جب اس بارے میں جھگڑے نکالے تو وہ برباد کر دی گئیں، اس لیے میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم ہرگز اس بارے میں

بحث وتمحیص نہ کرنا۔ (ترمذی شریف)

قضاء وقدر کے فیصلے پر رضا مندی ضروری ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت کی علامت ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تقدیر کے فیصلے پر راضی ہو جانا آدمی کی سعادت کی دلیل ہے، اور اس کی بدبختی کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نیکی کی توفیق مانگنا چھوڑ دے، اور تقدیر کے فیصلہ پر ناراض ہونا تو اس کی انتہائی بدبختی کا ثبوت ہے۔ (ترمذی شریف)

اس لیے آپ اللہ تعالیٰ سے نیکی کی توفیق مانگنے کے ساتھ ساتھ جو وساوس آپ کے دل ودماغ میں ابھرتے رہتے ہیں، ان سے حفاظت کی اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے رہیں، اس مسئلہ میں آپ جتنا غور وفکر کریں گے، اسی قدر الجھاؤ بڑھے گا، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں بحث وتمحیص سے منع فرمایا ہے، بقول حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمہ اللہ ''یہاں ممانعت اس لیے نہیں کہ درحقیقت یہاں کچھ پانی مرتا ہے؛ بلکہ دریا میں جہاں پانی زیادہ گہرا اور خطرناک ہوتا ہے، وہاں ہر شفیق ناآموزوں کو تیراکی سے روکا ہی کرتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن		کہ جاہا سپر باید انداختن

(ترجمان السنۃ)

مرقات شرحِ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حقیقتِ تقدیر کے متعلق سوال کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اندھیرا راستہ ہے، اس پر قدم نہ رکھو، اس شخص نے پھر پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گہرا سمندر ہے اس میں داخل نہ ہونا،

اس نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بھید ہے، جو تجھ پر پوشیدہ ہے اس کی تفتیش میں نہ پڑنا۔ آخر میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ نے فوائد قرآن کریم میں آیت کریمہ ﴿ولا یظلم ربك احدا﴾ (الکھف) کی تفسیر فرماتے ہوئے مسئلۂ تقدیر کا جو حل تحریر فرمایا ہے، وہ پیش کرتا ہوں ممکن ہے آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے، فرماتے ہیں: ''رب جو کرے وہ ظلم نہیں، سب اسی کا مال ہے، پر ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا، بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا، اور جو کہے (یعنی اعتراض کرے) گناہ میں ہمارا کیا اختیار ہے؟ سو (یہ) بات نہیں (ہے) اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے، اور جو کہے قصد بھی اسی نے دیا، تو قصد دونوں طرف لگتا ہے، اور جو کوئی کہے اسی نے ایک طرف لگا دیا، سو بندہ کی دریافت سے باہر ہے، بندہ سے معاملہ ہوتا ہے اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسی کو جو اس سے بدی کرے یہ نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور؟ اللہ نے کرا دیا'' (ماخوذ از ترجمان السنۃ ۲/۱۱۔ ایم ایچ سعید، کراچی) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

جہالت سے کلمۂ کفر بولنے سے کفر

سوال: بعض جاہل مسلمان کلمۂ کفر بک دیتے ہیں، اور انہیں نہیں معلوم رہتا کہ یہ کلمۂ کفر ہے، ایسی صورت میں کیا انہیں تجدید ایمان کے ساتھ تجدید نکاح کی بھی تلقین کرنی چاہیے، اور یہ کہ تجدید نکاح ان کو بھی لازم ہوگا؟

''رسم المفتی'' میں پڑھا تھا کہ جس مسئلہ میں علماء دین میں سے کسی ایک عالم کا تکفیر کے متعلق اختلاف ہو تو کفر کا فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ فقط انتہی کلامہ۔ ''مالا بد منہ''

میں لکھا ہے بعض علماء کے نزدیک جہالت عذر ہے۔فقط انتہی کلامہ۔

کیا اس اصول کے پیش نظر جو مسلم لوگ جہالت کی وجہ سے کلمہ کفر زبان سے نکال دیتے ہیں، ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی؟ اور ان کو تجدید نکاح کا لازمی حکم نہیں ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس آدمی نے مزاح اور ٹھٹھا کی غرض سے کلمۂ کفر اپنی زبان سے نکالا تو وہ بالاتفاق سب کے نزدیک کافر ہے، اور جس آدمی نے خطا (بولنا کچھ اور چاہتا تھا اور کلمۂ کفر زبان سے نکل گیا) اور اکراہ (کسی کی دھمکی اور جبر کی وجہ) سے کلمۂ کفر کہا ہے تو بالاتفاق کافر نہیں ہوگا، اور جس آدمی نے اس کو کلمہ کفر جانتے ہوئے عمداً کہا ہے تو سب کے نزدیک کافر ہو جائے گا، اور جس آدمی نے کلمہ کفر اپنے ارادہ اور اختیار سے کہا؛ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کفریہ کلمہ ہے، تو اس کے کافر ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، شامی میں ہے۔ ثم قال فی البحر: "والحا صل ان من تكلم بكلمة الكفر هازلاً أو لاعباً كفر عند الكل، ولا اعتبار باعتقاده كما صرح فی الخانية، ومن تكلم بها مخطئاً او مكرهاً لا يكفر عند الكل، ومن تكلم بها عامداًعالماً كفر عند الكل، ومن تكلم بها اختياراًجاهلاًبانها كفر ففيه اختلاف." اھ (شامی ۳/۳۱۲)

''مالا بدمنہ'' میں ہے: ''اگر جاہلے کلمۂ کفر گفت ونمی داند کہ ایں کلمۂ کفر است بعضے علماء گفتہ اند کہ کافر نہ شود، وجہل عذر است، وبعضے گفتہ اند کہ کافر شود جہل عذر نیست''۔ (ص/۱۳۸)

''شامی'' میں علامہ حصکفیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جو (قول یا فعل) بالاتفاق

موجب کفر ہو، اس سے اس کے تمام اعمال اور نکاح باطل ہو جاتا ہے، اور جس (قول یا فعل) کے کفر ہونے میں علماء کا اختلاف ہو، وہاں پر اس کے مرتکب کو توبہ واستغفار اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا، اس پر علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: کہ یہ حکم احتیاطی ہے۔

(قوله لا يفتى بكفر مسلم امكن حمل كلامه على محمل حسن) ظاهره انه لا يفتى به من حيث استحقاقه للقتل، ولا من حيث الحكم ببينونة زوجته، وقد يقال المراد الاول فقط؛ لان تأويل كلامه للتباعد عن قتل المسلم بان يكون قصد ذلك التأويل وهذا لا ينافى معاملته بظاهر كلامه فيما هو حق العبد وهو طلاق الزوجة، وملكها لنفسها بدليل ما صرحوا به من انهم اذا اراد ان يتكلم بكلمة مباحة، فجرى على لسانه كلمة الكفر خطاءً بلا قصد لا يصدقه القاضى؛ وان كان لا يكفر فيما بينه وبين ربه تعالىٰ فتأمل ذلك، وحرره نقلاً: فانى لم أر التصريح به، نعم سيذكرالشارح انما يكون كفر اتفاقاًيبطل العمل والنكاح، وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبةوتجديد النكاح. اه. وظاهره انه امر احتياط، ثم ان مقتضى كلامهم ايضاً انه لا يكفربشتم دين مسلم أي لايحكم بكفره لامكان التأويل، ثم رأيته فى جامع الفصولين، حيث قال بعد كلام اقول: وعلى هذا ينبغى ان يكفر من شتم دين مسلم؛ ولكن يمكن التأويل بان مراده اخلاقه الرديئة ومعاملته القبيحة، لا حقيقة دين الاسلام، فينبغى ان لا يكفر حينئذ. والله تعالىٰ اعلم. اه. واقره فى نور العين ومفهومه انه لايحكم بفسخ النكاح وفيه

البحث الذی قلناه، واما امره بتجدید النکاح فهو لا شك فيه احتياطاً نصوصاً في حق الهمج الارذال الذين يشتمون بهذا الکلمة فانهم لا يخطر على بالهم هذا المعنى اصلاً. (شامی ۳/ ۳۱۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۹/ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

ایک آدمی کے فعل سے دوسرا کافر نہیں ہوتا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع دین مندرجۂ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمرو سے کہا کہ تو یہ کام جو کررہا ہے مشرکوں جیسا ہے، یا یوں کہا کہ تو مشرک کی طرح کھلی ہوئی باتوں پر ہٹ دھرمی دیے ہوئے ہے، اور تو مجھ سے بلا وجہ جھگڑا کررہا ہے تو کیا ان دونوں صورتوں میں زید کے کہنے کی وجہ سے عمرو کافر ہوگیا؟ جب کہ زید کی نیت محض تشبیہ تھی۔

نوٹ: اسی مسئلہ پر دو قبیلہ میں زبردست جھگڑا ہوگیا ہے، اور یہ فتویٰ ہم نے ہر جگہ سے طلب کیا ہے، آپ سے جہاں تک ہوسکے جلد جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زید کے ان کلمات کی وجہ سے عمرو کافر نہیں ہوا، یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی ایک آدمی کے قول یا فعل کی وجہ سے کوئی دوسرا کافر نہیں ٹھہرتا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تعویذ کے ایک مسئلہ میں سعودی سلفی گروہ کی جانب سے حضرت تھانویؒ پر تکفیر کا حکم

از مرتب: عبدالقیوم راجکوٹی

سوال: گرامی قدر بخدمت عالی جناب حضرات مفتیان کرام دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد آداب وتسلیم بصد تکریم گزارش ہے کہ جنوبی افریقہ میں سعودی سلفی گروہ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ پر کفر کا فتوی لگایا ہے۔ یہ سعودی سلفی گروہ کہتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اعمال قرآنی'' میں جو یہ لکھا ہے کہ ولادت کی سختی اور تکلیف دور کرنے کے لیے اور ولادت کو آسان بنانے کے لیے عورت اپنی بائیں ران پر سورۂ انشقاق کی دو آیتوں کا تعویذ باندھ لے، یہ قرآن کریم کے ساتھ سخت گستاخی ہے اور اس کا تعلیم کرنے والا کافر ہے۔

مؤدبانہ عرض ہے کہ حضرات مفتیان کرام اس بہتان وتکفیر کا مفصل و مدلل جواب ارسال فرما کر اہل السنّت والجماعت کے متبعین اور علماء دیوبند کے معتقدین کو شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ فقط والسلام۔

مستفتی: ہارون ابراہیم عفی عنہ

۲۸/صفر ۱۴۳۲ھ مطابق ۲/فروری ۲۰۱۱ء

Email: haroone@gmail.com

Fax: 0027 16 590 2280

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آیات قرآنیہ کے ذریعہ علاج معالجہ جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ.

(سورة بنی اسرائیل: ۸۲)

ترجمہ: ''اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے''۔

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''بعض علماء کے نزدیک قرآن جس طرح امراض باطنہ کی شفاء ہے امراض ظاہرہ کی بھی شفاء ہے۔ کہ آیات قرآن پڑھ کر مریض پر دم کرنا اور تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا امراض ظاہرہ کے لیے بھی شفاء ہوتا ہے۔

روایات حدیث اس پر شاہد ہیں۔ تمام کتب حدیث میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث موجود ہے کہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت سفر میں تھی، کسی گاؤں کے رئیس کو بچھو نے کاٹ لیا تھا، لوگوں نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ آپ اس کا کچھ علاج کر سکتے ہیں؟ انہوں نے سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا، مریض اچھا ہوگیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا تذکرہ آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس عمل کو جائز قرار دیا۔

اسی طرح دوسری متعدد روایات حدیث سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوّذات پڑھ کر دم کرنا ثابت ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ سے معوّذات اور دوسری آیات قرآن کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرنا، لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے''۔ (معارف القرآن: ۵/۵۱۰)

قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ مذکورہ آیت میں ''ماھو شفاء'' کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''وقيل من للتبعيض، والشفاء الشفاء من الأمراض الظاهرة، و المراد من بعض القرآن ماهو يشفى السقيم كالفاتحة و نحوها و هو المعنى بقوله ﷺ عليكم بالشفائين العسل و القرآن.''(التفسير المظهرى: الاسراء:۵/۴۸۳، مطبوعه: ندوة المصنفين)

تفسیر اضواء البیان میں ہے:

''(ماهو شفاء) يشمل كونه شفاء للقلب من أمراضه كالشك و النفاق وغير ذلك وكونه شفاء للأجسام اذا رقى عليها به.'' (اضواء البيان:۳/۱۸۱، مطبوعه: دار الفكر بيروت)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تحریر بالا میں حدیث شریف اور آثار صحابہ کا حوالہ دیا ہے، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

حدثنا موسى بن اسمعيل، قال: حدثنا ابو عوانة عن ابى بشر عن ابى المتوكل عن ابى سعيد رضی اللہ عنہ ان رهطاً من اصحاب رسول الله ﷺ انطلقوا فى سفرة سافروها؛ حتى نزلوا بحى من احياء العرب، فاستضافوهم، فابوا ان يضيفوهم فلدغ سيد ذلك الحى، فسعوا له بكل شىء لاينفعه شىء، فقال بعضهم لو اتيتم هؤلاء الرهط الذين قد نزلوا بكم لعله ان يكون عند بعضهم شىء، فاتوهم فقالوا: يا ايها الرهط ان سيدنا لدغ فسعينا له بكل شىء لاينفعه شىء فهل عند احد منكم شىء؟ فقال بعضهم: نعم! و اللّٰه انى لراقٍ ولكن

والله قد استضفناكم فلم تضيفونا فما انا براقٍ لكم حتى تجعلوا لنا جُعلا، فصالحوهم على قطيع من الغنم فانطلق فجعل يتفل و يقرأ الحمد لله رب العلمين حتى لكأنما نشط من عقال فانطلق يمشى مابه قَلَبة قال فأوفوهم جعلهم الذى صالحوهم عليه، فقال بعضهم اقسموا فقال الذى رقى لاتفعلوا حتى نأتى رسول الله ﷺ فنذكر له الذى كان فننظر ما يأمرنا فقدموا على رسول الله ﷺ فذكروا له، فقال: وما يدريك انها رقية أصبتم اقتسموا واضربوا لى معهم بسهم. (بخاری شریف:۲/۸۵۵)

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

(۱)حدثنا عبيد الله عن حسن عن جعفر عن ابيه انه كان لايرى بأساً ان يكتب القرآن فى اديم ثم يعلقه.

ترجمہ: ''جعفر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ وہ چمڑے میں قرآن کریم کو لکھ کر اس کو لٹکانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے''۔

(۲)حدثنا عبدة عن محمد بن اسحاق عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ اذا فزع احدكم فى نومه فليقل اعوذ بكلمات الله التامات من غضبه و سوء عقابه و من شر عباده و من شر الشياطين وما يحضرون. فكان عبد الله يعلمها ولده من ادرك منهم و من لم يدرك كتبها وعلقها عليه.

ترجمہ: ''عمرو ابن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہوئے کہتے

ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی پر نیند میں گھبراہٹ طاری ہو، پس چاہیے کہ وہ یہ دعاء پڑھے: أعوذ بكلمات الله التامات من غضبه و سوء عقابه ومن شر عباده ومن شر الشياطين وما يحضرون. پس حضرت عبداللہ اپنی بالغ اولاد کو یہ دعا سکھلاتے تھے اور جو نابالغ ہوتی تو یہ دعا لکھ کر بطور تعویذ اس پر لٹکا دیتے تھے"۔

(۳) حدثنا عبد الرحيم بن سليمان عن اسماعيل بن مسلم عن ابن سيرين انه كان لا يرى بأساً بالشيء من القرآن.

ترجمہ: "ابن سیرینؒ سے منقول ہے کہ وہ قرآن میں سے کسی چیز کے ذریعہ دعا وغیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے"۔

(٤) حدثنا يحى بن آدم قال حدثنا حسن عن ليث عن عطاء قال لا بأس أن يعلق القرآن. (مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الطب، باب: ۲۱، جلد: ۱۲، ص: ۸٤، ۸۵)

ترجمہ: "حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ قرآن کو بطور تعویذ لٹکائے جانے میں کوئی حرج نہیں"۔

نصوص بالا سے معلوم ہوا کہ آیات قرآنیہ کے ذریعہ رقیہ (تعویذ) میں کوئی حرج نہیں، بلاشبہ جائز ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم رقمطراز ہیں:

"تعویذ کے ذریعہ علاج کرانا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ تعویذ میں جو کلمات لکھے جائیں ان کے معنی معلوم ہوں، اور ان میں کوئی بات مشرکانہ نہ ہو مثلاً آیات قرآنی پر مشتمل تعویذ میں کچھ حرج نہیں ہے، سعودی عرب کے بعض علماء تعویذوں کی ممانعت کے

بارے میں جو احادیث پیش کرتے ہیں ان سے مراد ایسے تعویذ ہیں جن میں مشرکانہ باتیں ہوں، یا جن کو اللہ تعالیٰ کے بجائے بذات خود شافی سمجھا جائے؛ ورنہ آیات قرآنی کا دم کرنا آں حضرت ﷺ سے اور تعویذ لکھ کر پلانا یا لٹکانا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین سے ثابت ہے"۔ (فتاویٰ عثمانی:۱/۳۱۰)(تكملة فتح الملهم، كتاب الطب، كتابة التعويذات:٤/٣١٧)

غیر مقلدین اور سلفی حضرات کے مقتداء حضرات بھی آیات قرآنیہ کے ذریعہ علاج کو جائز لکھتے ہیں۔

ان کے پیشوا شیخ عبد الرحمٰن مبارک پوریؒ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

وفی الحدیث جواز الرقیة بشیء من کتاب الله تعالیٰ ویلحق به ما کان من الدعوات المأثورة أو مما یشابهها. (تحفة الأحوذی بشرح جامع الترمذی: ٢٢٨/٦)

ان کے مستند عالم، عمدۃ المحدثین، زبدۃ المحدثین نواب صدیق حسن خان صاحبؒ اپنی تصنیف "کتاب التعویذ" میں لکھتے ہیں: "من کتب سورة الهود ووضعها عنده لم یعمل فیه السلاح ویکون منصوراً ویهاب منه اعداءه."

ترجمہ: جو شخص سورۂ ھود لکھ کر اپنے پاس رکھے اس پر ہتھیار مؤثر نہ ہوں گے۔ اور ایسا شخص مدد کیا ہوا ہوگا، اور اس کے دشمن اس سے خوف زدہ رہیں گے۔

خان صاحب آگے ایک خاص قسم کے بخار سے نجات کے لیے ایک عمل بتلاتے ہیں:

وطریقتها ان یغتسل المحموم اولاً ثم یکتب بالخشب بذراعه الایمن "لا اله الا الله" وبذراعه الایسر "محمد رسول الله" وعلی ساقه الیمنی

"جبريل" وعلى ساقه اليسرى "ميكائيل" وعلى شقه الايمن "اسرافيل" وعلى شقه الايسر "عزرائيل" اذا فعل هذا برأ من هذه الحمى عاجلاً جداً. (كتاب التعويذ:٤٥، بحواله: وقفة مع اللامذهبية: ١٦٨، ١٦٩)

ترجمہ: علاج کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً بخار زدہ شخص غسل کرے، پھر لکڑی کے ذریعہ دائیں کلائی پر "لا الٰہ الا اللہ" اور بائیں کلائی پر "محمد رسول اللہ"، داہنی پنڈلی پر "جبرئیل" اور بائیں پنڈلی پر "میکائیل"، داہنے پہلو پر "اسرافیل" اور بائیں پہلو پر "عزرائیل" لکھے۔ یہ کام کر لینے کے بعد بہت جلد بخار سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔

ولادت کی سہولت کے لیے آیات قرآنیہ کے ذریعہ ایک علاج شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے، ابن تیمیہؒ کے اقوال وفتاویٰ سلفی حضرات کے یہاں نہایت ہی قابل اعتماد و مستند سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ ابن تیمیہؒ سے بجنسہ عبارت نقل کی جاتی ہے:

ويجوز ان يكتب للمصاب وغيره من المرضى شيئاً من كتاب الله وذكره بالمداد المباح ويغسل ويسقىٰ، كما نص على ذلك احمد وغيره، قال عبد الله بن احمد: قرأت على ابى، ثنا يعلى بن عبيد، ثنا سفيان، عن محمد بن ابى ليلىٰ، عن الحكم، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس قال: اذا عسر على المرأة ولادتها فليكتب: بسم الله لااله الا الله الحليم الكريم، سبحان الله رب العرش العظيم، الحمد لله رب العالمين ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا﴾[النازعات: ٤٦]، ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

[الأحقاف: ٣٥]. قال أبى: ثنا أسود بن عامر باسناده بمعناه، وقال: يكتب فى اناء نظيف فيسقى، قال ابى: وزاد فيه وكيع: فتسقى وينضح ما دون سرتها، قال عبد الله: رأيت أبى يكتب للمرأة فى جامٍ أو شيء نظيف.

وقال أبو عمرو محمد بن احمد بن حمدان الحيرى: أنا الحسن بن سفيان النسويّ، حدثنى عبد الله بن أحمد بن شبوية، ثنا على بن الحسن بن شقيق، ثنا عبد الله بن المبارك، عن سفيان، عن ابن أبى ليلىٰ، عن الحكم، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس قال: اذا عسر على المرأة ولادها فليكتب: بسم الله لااله الا الله العلى العظيم لا اله الا الله الحليم الكريم، سبحان الله وتعالىٰ رب العرش العظيم و الحمد لله رب العالمين. ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا﴾[النازعات: ٤٦] ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [الأحقاف: ٣٥]. قال على: يكتب فى كاغدة فيعلق على عضد المرأة، قال على: وقد جربناه، فلم نر شيئاً اعجب منه، فاذا وضعت، تحله سريعاً، ثم تجعله فى خرقة او تحرقه. آخر كلام شيخ الاسلام ابن تيمية قدس الله روحه، ونوّر ضريحه. (مجموعة الفتاویٰ لابن تيميةؒ: ٣٦/١٠، ٣٧)

ترجمہ: مصیبت زدہ یا اور کسی بیماری میں مبتلاء شخص کے علاج کے لیے جائز ہے کہ کتاب اللہ یا ذکر اللہ میں سے کوئی چیز پاک اور مباح سیاہی کے ذریعہ لکھی جائے اور اسے دھو کر اس کا پانی اسے پلایا جائے، جیسا کہ امام احمدؒ اور دیگر ائمہ نے اس کی صراحت

کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن احمدؒ (مراد صاحب زادۂ امام احمد بن حنبلؒ) نے فرمایا: کہ میں نے اپنے والد کے سامنے سند کے ساتھ یہ حدیث پڑھی: ثنا یعلی بن عبید، ثنا سفیان، عن محمد بن ابی لیلیٰ، عن الحکم، عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس قال: جب عورت کی ولادت میں دشواری ہو تو اسے چاہیے کہ وہ لکھے: بسم اللہ لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم، سبحان اللہ رب العرش العظیم، الحمد للہ رب العالمین ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا﴾ [النازعات:۴۶] ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [الاحقاف: ۳۵] اس پر میرے والد صاحب نے فرمایا: کہ ہمیں اسود بن عامر نے اپنی اسناد سے اسی کے ہم معنی حدیث بیان کی اور کہا کہ صاف ستھرے برتن میں لکھے پھر پیئے۔ میرے والد صاحب نے کہا کہ وکیع نے اس میں زیادتی کی کہ وہ عورت کو پلایا جائے اور پانی اس کے ناف کے نیچے کے حصہ میں چھڑکا جائے، حضرت عبداللہ نے کہا کہ میں نے اپنے والد صاحب کو کسی گلاس یا کسی پاک چیز میں عورت کے لیے لکھتے ہوئے دیکھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب عورت کو ولادت میں دشواری ہو تو وہ لکھے: بسم اللہ لا الٰہ الا اللہ العلی العظیم، لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم، سبحان اللہ وتعالیٰ رب العرش العظیم، و الحمد للہ رب العالمین ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا﴾ [النازعات:۴۶] ﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [الاحقاف:۳۵] علیؒ نے فرمایا کہ اس کو ایک کاغذ پر لکھ کر عورت کے بازو پر باندھ دیا جائے۔ حضرت علیؒ

فرمایا کرتے تھے کہ ہم اسے آزما چکے ہیں، ہم نے اس سے زیادہ اچھا علاج نہیں دیکھا، پھر جب وضع حمل ہو جائے تو اس کو فوراً کھول دے، پھر اس کو ایک کپڑے میں رکھ دے یا جلا دے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا کلام پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو مقدس کرے اور ان کے ٹھکانے کو منور بنائے۔''

عبارت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمالیں! ابن تیمیہؒ آیات قرآنیہ سے دم کردہ مبارک پانی کو مادون السرۃ (ناف کے نیچے) والے حصہ پر چھڑکنے کی اجازت دیتے ہیں، مادون السرۃ میں شرمگاہ اور ران بھی داخل ہے، اس لیے کہ ''دون'' کے متعدد معانی ہیں، ان میں سے ایک معنی ''نیچے'' کے ہیں۔ (القاموس الوحید: ۱/ ۵۵۸) (مجمع بحار الانوار: ۲/ ۲۱۲) نیز جس مقصد کے لیے یہ عمل بتلایا جارہا ہے اس کے سیاق وسباق کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ''دون'' کے معنی ''نیچے'' کے لیے جائیں۔

حضرت تھانویؒ نے ران پر تعویذ باندھنا لکھا ہے جبکہ علامہ ابن تیمیہؒ نے بازو پر تعویذ باندھنے کی اجازت فرمائی، عورت کی ران اور بازو ستر کے باب میں یکساں حکم رکھتے ہیں، سلفی حضرات ابن تیمیہؒ کے بارے میں کیا حکم صادر فرمائیں گے؟

نواب صدیق حسن خان صاحبؒ نے مذکورہ بالا عمل میں دائیں پنڈلی پر ''جبرئیل'' اور بائیں پنڈلی پر ''میکائیل'' لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ واضح ہو جبرئیل نام قرآن میں متعدد جگہ وارد ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں دو جگہ، سورۂ تحریم میں ایک جگہ آیا ہے، ران کی بنسبت پنڈلی حرکت زیادہ کرتی ہے، نیز پنڈلی کے گرد آلود ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہیں، نیز یہ نام ''جبرئیل'' براہ راست پنڈلی پر لکھنے کو کہا گیا ہے جبکہ حضرت تھانویؒ نے

تعویذ بنا کر بائیں ران پر باندھنا لکھا ہے۔

انصاف کیجئے! آیاتِ قرآنیہ کی حرمت کا لحاظ کس نے کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا﴾[المائدۃ] ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔

حضرت تھانویؒ نے سہولت ولادت کا جو عمل تحریر فرمایا ہے، اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

سوال میں اعمال قرآنی کے جس عمل کا تذکرہ ہے اس کی اصل عبارت یہ ہے:

''إِذَا السَّمَآءُ انشَقَّتْ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ.(پ۳۰ع۹)

(ترجمہ): ''جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ (آسمان) اسی لائق ہے اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی، اور وہ (زمین) اپنے اندر کی چیزوں کو (یعنی مردوں کو) باہر اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی''۔

خاصیت: ان آیتوں کو لکھ کر ولادت کی آسانی کے لیے بائیں ران میں باندھ دے، انشاء اللہ تعالیٰ بہت آسانی سے ولادت ہوگی؛ مگر بعد ولادت کے تعویذ کو فوراً کھول دینا چاہئے''۔(اشرف العملیات:۲/۳۲۶)

غور فرمالیں! آیات کو کاغذ پر لکھ کر تعویذ بنانے کی ہدایت ہے، ظاہر بات ہے کہ جب موم جامہ کر کے یا صرف سادہ کپڑے میں ملفوف کر کے تعویذ باندھا جائے گا تو آیات کے الفاظ نظر نہیں آئیں گے؛ بلکہ مستور ہوں گے۔ آیات قرآنیہ وغیرہ، مستور اور

غیر مستور کے احکام الگ الگ ہیں۔مثلاً جیب میں قرآن شریف رکھ کر بیت الخلاء میں جانا جائز ہے؛ مگر خلاف اولیٰ ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جبکہ قرآن شریف جیب وغیرہ میں چھپ جاوے، اور اگر جیب میں ہوتے ہوئے نظر آتا ہو تو ایسی حالت میں جیب سے نکال دینا ضروری ہے۔

ثم محل الكراهة ان لم يكن مستوراً، فان كان فى جيبه فانه حينئذ لابأس به. وفى القهستانى عن المنية الأفضل أن لايدخل الخلاء وفى كمه مصحف الا اذا اضطرّ ونرجوا ان لا يأثم بلا اضطرار اھ واقره الحموى وفى الحلبى الخاتم المكتوب فيه شىء من ذلك اذا جعل فصه الى باطن كفه قيل لايكره والتحرز اولىٰ اھ. (طحطاوى على مراقى الفلاح:۳۲)(امدادالاحکام/۱۵۶،۱۵۵)

حضرات فقہاء نے مذکورہ جزئیہ اپنی طرف سے وضع نہیں کیا، بلکہ اس کی اصل موجود ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ قضائے حاجت کے وقت انگوٹھی نکال دیتے تھے۔آپ ﷺ کی انگوٹھی پر ''محمد، رسول، اللہ'' منقش تھا۔

عن انس بن مالك ان النبى ﷺ كان اذا دخل الخلاء نزع خاتمه..... كان نقش خاتم النبى ﷺ (محمد) سطر و (رسول) سطر و (الله) سطر. (الشمائل المحمديه،باب ماجاء فى ذكر خاتم رسول الله ﷺ: ۴۰)

ملاحظہ کیجئے! مستور وغیر مستور میں فرق بیان کیا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اعمال قرآنی میں جو عمل لکھا ہے، اس سے مقصد ولادت کی سہولت اور تبرک حاصل کرنا ہے، نعوذ باللہ قرآن کی توہین اور بے حرمتی مقصد نہیں، فقہ کے

مسائل کا دارومدار مقاصد پر ہے، ''الأمور بمقاصدها'' فقہ کا مسلمہ اصول ہے۔ایک آدمی اپنے سامان کی حفاظت کی خاطر اپنے سامان پر بیٹھا، اس سامان میں قرآن شریف بھی ہے، تو اس کا یہ بیٹھنا جائز ہے؛ کیونکہ مقصد حفاظت ہے۔اسی طرح قرآن شریف پیر کے نیچے رکھ کر سو گیا؛ تا کہ چور چرا کر نہ لے جائے تو یہ جائز ہے۔اور اگر مقصد قرآن شریف کی توہین ہے، تو یہ فعل کفر ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:اذا كان لرجل جوالق وفيها دراهم مكتوب فيها شيء من القرآن أو كان في الجوالق كتب الفقه أو كتب التفسير أو المصحف فجلس عليها أو نام فان كان من قصده الحفظ فلا بأس به كذا في الذخيرة. رجل وضع رجله على المصحف ان كان على وجه الاستخفاف يكفر، والا فلا، كذا في الغرائب.(الفتاویٰ الهندية: ٥/٣٢٢)

صورت مسئولہ میں سلفی گروہ نے حضرت تھانویؒ پر کفر کا حکم لگایا ہے، یہ درست نہیں، کسی صاحب ایمان پر کفر کا حکم لگانا انتہائی نازک چیز ہے، اس کے لیے قوی دلیل کی ضرورت ہے۔ الكفر شيء عظيم.(شرح عقود رسم المفتی:۱۹۰)

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ بھی کسی معین شخص کی تکفیر سے حتی الوسع بچتے تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ جو کسی معین شخص کی بلا وجہ شرعی تکفیر کرے اس کو منع کرتے تھے، سلفی گروہ نے ان کا بھی لحاظ نہیں کیا اور ساری حدود پار کر کے اسلام کی ایک جلیل القدر عظیم المرتبت شخصیت کو بلا وجہ شرعی کافر ٹھہرا دیا۔ یااسفیٰ على هذه الطائفة.

علامہ ابن تیمیہؒ تکفیر کے باب میں اپنا احتیاط بایں الفاظ نقل فرماتے ہیں:

"هـذا مـع انـی دائـماً –ومن جالسنی یعلم ذلك منی– انی من اعظم الـنـاس نهیـاً عن ان ینسب معین الی تکفیر، وتفسیق، ومعصیة، الا اذا علم انه قـد قـامـت عـلیـه الـحـجة الـرسالیة التی من خالفها کان کافراً تارةً، وفاسقاً اخریٰ،و عاصیاً اخریٰ." (فتاویٰ ابن تیمیہؒ:۲/۱۴۷)

حضرت نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جب کوئی شخص کسی کو کافر کہے اور وہ حقیقتاً (دلائل شرعیہ کی روشنی میں) کافر نہ ہوتو اس کو کافر کہنے کا وبال اسی کی طرف لوٹتا ہے جس نے کافر کہا ہے"، اس لیے تکفیر کے باب میں نہایت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔

عـن أبی ذر رضی اللہ عنہ أنـه سـمـع النبی ﷺ یـقـول: "لا یـرمی رجل رجلاً بـالـفسـوق ولا یـرمیـه بـالـکفر، الا ارتدت علیه ان لم یکن صاحبه کذلك." (صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما ینهی عن السباب و اللعن: ۲/۸۹۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: عبدالقیوم راجکوٹی، معین مفتی دارالافتاء جامعہ ڈابھیل

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، صدر مفتی دارالافتاء جامعہ ڈابھیل، ۵/ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی دارالافتاء جامعہ ڈابھیل

ایک فلمی گانا (تجھ میں رب دکھتا ہے الخ) گانے کا حکم شرعی

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ابھی ایک گیت چلا ہے "تجھ میں رب دکھتا ہے یارا میں کیا کروں، سجدے سر جھکتا ہے یارا میں کیا کروں" اس کو گانا اور سننا کیسا ہے؟ کیا اس سے کفر لازم آئے گا؟ اس میں غیر شادی شدہ کا اور شادی شدہ کا کیا حکم ہوگا؟ یا اس کے علاوہ بہت سے گانے جس میں اللہ، خدا اور رب

کا نام آتا ہے تو اس کا گانا اور سننا کیسا ہے؟

''ہرے رام، ہرے کرشن، جے شیو شنکر'' گانے کا حکم

(۲) اس کے علاوہ غیر اللہ کے نام کے گانے بھی آتے ہیں، جس میں کفریہ جملے ہوتے ہیں، جیسے ہرے رام، ہرے کرشن، جے شیو شنکر جو عام طور پر سبھی گاتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

''نمسکار، باپا سیتا رام'' کہنے کا حکم

(۳) آج کل کاروبار میں نمسکار باپا سیتا رام یا اس کے علاوہ بھی دوسرے کفریہ جملے بولتے ہیں، اس کا کیا مسئلہ ہے؟ کیا ان سب کلمات کے بولنے سے نکاح ٹوٹے گا؟ اور ایمان جاتا رہے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) لفظ ''رب'' کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے؛ یہاں تک کہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رب کہنا جائز نہیں۔ (معارف القرآن ۱/۸۰)

سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے جو اسماءِ حسنیٰ منقول ہیں، ان میں ایک ''رب'' بھی ہے۔ (سنن ابن ماجہ ۲۷۵)

مطلب کہ ''رب'' اللہ کا پاکیزہ نام ہے، آپ کے سوال میں جو دریافت کیا گیا

ہے،اس کے مطابق فلمی گانے میں اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو اس طرح استعمال کیا گیا کہ فلم میں کام کرنے والا ہیرو عاشق کی حیثیت سے اس میں کام کرنے والی ہیروئن کو معشوقہ کی حیثیت سے مخاطب کر کے یہ اشعار بول رہا ہے''تجھ میں رب دکھتا ہے یارا میں کیا کروں،سجدے سر جھکتا ہے یارا میں کیا کروں''۔

یوں بھی فلم میں گانے کے ضمن میں اللہ کے پاک نام کو استعمال کرنا اور وہ بھی ایسے منظر میں جو عشقیہ تعلقات کو اجاگر کرنے والا اور شہوات سے پُر ہو یہ اللہ کے پاک نام کی اہانت اور استخفاف ہے، جو شرعی اعتبار سے ایمان سوز ہے۔

''فتاویٰ عالمگیری''میں ہے۔یکفر إذا وصف اللّٰه تعالیٰ بما لا یلیق به، أو سخر بإسم من أسمائه أو بأمر من أوامره. (عالمگیری ۲/۲۵۸)

إذا قرأ القرآن علی ضرب الدف والقصب فقد کفر. (عالمگیری ۲/۲٦۷)

من قال لغیره: قل هو الله أحد راپوست باز کردی، أو قال ألم نشرح را کریبان کرفته، أو قال لمن یقرأ یٰس عند المریض یس دردهان مرده منه، أو قال لغیره ای کوتاه تراز إنا اعطیناك الکوثر، أو قال لمن یقرأ القرآن ولا یتذکر کلمة والتفت الساق بالساق، أو ملأ قد حاو جاء به وقال کأسا دهاقا، أو قال فکانت سرا با بطریق المزاح، أو قال عند الکیل والوزن وإذا کالوهم أو وزنوهم یخسرون بطریق المزاح، أو قال لغیره دستار ألم نشرح بستۂ یعنی أبدیت العلم، أو جمع أهل موضع وقال فجمعنا هم جمعا أو قال وحشرناهم فلم نغادر منهم أحداً، أو قال لغیره کیف تقرأ والنازعات نزعا بنصب العین

أو بـرفعها وأراد به الطنز، أو قال لرجل أقرع أشتمك فإن الله تعالىٰ قال كلا بـل ران، أودعـى إلـى الصلاة بالجماعة فقال أنا أصلى وحدى إن الله تعالىٰ قـال إن الصلاة تنهى، أو قال لغيره تفشيله يجوز، فإن التفشيل يذهب بالريح قـال الـلـه تـعـالـىٰ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم كفر في هذه الصور كلها. (عالمگیری۲/۲٦٧)

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح گانا گانے سے وہ گانے والا ایمان سے نکل جائے گا یانہیں؟ اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر گانے والا یہ جانتا ہے کہ یہ کفریہ عمل ہے، اس کے باوجود اسے گارہا ہے چاہے لہو ولعب یا مزاح کے طور پر گارہا ہو یا واقعی طور پر گارہا ہو دونوں صورتوں میں وہ ایمان سے نکل جاتا ہے، اور اگر جبر واکراہ کی وجہ سے یا بطور خطاء گارہا ہے تو ایمان سے نہیں نکلے گا، اور اگر اپنی جہالت کی وجہ سے اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ کفریہ عمل ہے اور اختیاری طور پر گارہا ہے تو اس کے کافر ہونے میں اختلاف ہے۔

ثـم قال في البحر: والحاصل أن من تكلم بكلمة الكفر هازلا أو لاعبا كـفر عند الكل، ولااعتبار باعتقاده كما صرح به في الخانية و من تكلم بها مـخـطـئا أو مكرها لا يكفر عند الكل، ومن تكلم بها عامدا عالما كفر عند الكل، ومن تكلم بها اختياراً جاهلاً بأنها كفر ففيه اختلاف. اھ. (شامی۳/۳۱۲)

''مالا بدمنہ'' میں ہے:

اگر جاہلے کلمۂ کفر گفت ونمی داند کہ ایں کلمۂ کفر است بعضے علماء گفتہ اند کہ کافر نہ شود، وجہل عذر است، وبعضے گفتہ کافر شود وجہل عذر نیست۔ (مالا بدمنہ۱۵۳،۱۵۴)

یعنی اگر کوئی جاہل کلمۂ کفر بولے اور وہ نہیں جانتا کہ یہ کلمۂ کفر ہے تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوگا، اور جہالت عذر ہے، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ کافر ہوجائے گا جہالت عذر نہیں۔

اس لیے جن صورتوں میں سب کے کہنے کے مطابق کافر ہوجاتا ہے اور اس کے کفر میں اختلاف نہیں ان تمام صورتوں میں اس کے سارے اعمال باطل ہوجاتے ہیں، نکاح بھی ٹوٹ جاتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ توبہ کرے، دوبارہ کلمہ پڑھ کر ایمان میں داخل ہو اور نکاح بھی از سر نو پڑھے، اور جن صورتوں میں اس کے کفر میں اختلاف ہے ان صورتوں میں اس کو چاہئے کہ توبہ واستغفار کر کے تجدید نکاح کرلے۔

أن ما يكون كفر اتفاقا يبطل العمل والنكاح، ومافيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة وتجديد النكاح. (شامی ۳/۳۱۶)

(۲) سوال میں مذکور معبودان باطل کا نام لینا گناہ ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

(۳) یہ غیروں کے یہاں بوقت ملاقات کہے جانے والے کلمات ہیں، ان سے بچنا ضروری ہے۔ ''مسلم را تشبہ بہ کفار وفساق حرام است''۔ (مالا بدمنہ: ۱۱۴)

لیکن اس کی وجہ سے ایمان سے خارج نہیں ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نوٹ: ایمان سوز گانوں کے سلسلہ میں ایک تفصیلی جواب کتابچہ کی شکل میں شائع ہوچکا ہے، اس کا مطالعہ کریں۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

’’منافقانہ حرکتیں‘‘ کہنے سے منافق کہنا لازم نہیں آتا

سوال: ایک اجتماع میں کچھ جماعتیں روانہ ہوئیں، ترتیب دے کر روانہ کرنے والے جو اصل دو ذمہ دار تھے، انھوں نے زید کو (جو اصل میں ذمہ دار نہیں ہے) ساتھ لیا اوران سے (زید سے) جماعتوں کی ترتیب کا پورا کام کروایا، ۱۰، ۱۱ جماعتیں بنائی تمام جماعتوں کی ترتیب زید نے دی، اصل ذمہ دار متفق، ان تمام جماعت کے ساتھیوں کے علاوہ ایک اور ساتھی کو چلہ (۴۰/ چالیس دن) کے لیے ان جماعتوں کے رخ کے علاوہ رخ پر یعنی دہلی روانہ کیا، روانہ کرنے سے قبل اس ساتھی کے سلسلہ میں اصل ذمہ دار اور ایک دو کام کرنے والے ساتھیوں سے زید نے رائے لی، متفرق رائے آئی، ایک رائے دہلی کے لیے بھی تھی، زید نے اس کے بعد بغیر اور کوئی مذاکرہ کسی سے کئے اخیر دو ساتھی کو دہلی روانہ کر دئے، گویا جیسے تمام جماعتوں کی ترتیب زید نے دی، اس ساتھی کو بھی ترتیب دے دی اور دہلی روانہ کر دیا، اس کے بعد چونکہ بظاہر کچھ ساتھیوں کو اس ساتھی کا دہلی جانا درست معلوم نہ ہوا ہو؛ چنانچہ انھوں نے اس کے چرچے اور مذاکرے شروع کئے کہ اس ساتھی کا دہلی کے لیے روانہ ہونا مشورہ سے نہیں ہوا ہے، اور جس نے (زید نے) روانہ کیا ہے وہ (زید) اصل ذمہ دار نہیں ہے؛ چنانچہ اس کو حق نہیں تھا، بہر حال ان باتوں اور مذاکروں سے بظاہر ماحول میں غلط اثرات اور غلط فہمی وانتشار؛ نیز ایک دوسرے کی دل شکنی کا باعث ہونے کا خطرہ تھا؛ چنانچہ زید نے ان کی ان حرکتوں پر انہیں متنبہ کرنے ہی کے خیال سے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ حرکتیں ہمارے ہی لیے نقصان دہ ہیں، ہماری اس میں ترقی نہیں، یہ حرکتیں منافقانہ حرکتیں ہیں، یہ جملہ منافقانہ حرکتیں ان کو گراں گزرا، اور زید کو کہا کہ آپ

جو چاہو کہو، ہمیں منافق کہہ لو، زید نے اسی وقت کہا کہ میرا منشاء ومقصد آپ کو منافق کہنا قطعی نہیں ہے، اور حقیقتاً خیال تک میں یہ نہیں ہے کہ آپ کو منافق کہوں یا کہا ہو۔

اب جواب طلب بات یہ ہے کہ کیا یہ جملہ ''منافقانہ حرکتیں ہیں یا منافقانہ چال ہے'' یہ جملہ کتنا بھاری ہے، غلط ہے؟ ان جملہ سے سامنے والے کو منافق کہا، یہ معنیٰ اور مطلب ہوسکتا ہے؟ اور یہی معنیٰ اور مطلب ہر حال میں نکلتا ہے تو زید کو کیا سزا ہوسکتی ہے؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں گے، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں زید کا ان لوگوں کو تنبیہ کے طور پر یہ کہنا کہ تم لوگوں کی یہ حرکتیں (جن کے نتیجہ میں ماحول میں بدگمانیاں پھیلنے اور تبلیغی کار کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا) منافقانہ حرکتیں ہیں، اس سے ہرگز ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ زید نے ان کو منافق کہا، اس کا یہ مطلب نکالنا کہ ہمیں منافق کہا گیا اردو زبان ومحاورہ سے ناواقفیت پر مبنی ہونے کے ساتھ شرعی طور پر بھی درست نہیں ہے۔ حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: آیة المنافق ثلاث، اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن خان. (بخاری شریف) یعنی منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب گفتگو کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے۔ اس کی شرح کرتے ہوئے حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ''حدیث شریف میں ان چیزوں کو صرف علامت قرار دیا گیا ہے، علت نہیں فرمایا گیا جس سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا، اس بنا پر بعض حضرات کا یہ اشکال کہ ایسے انسان کو منافق کہا

جائے درست نہیں ہے؛ کیونکہ یہاں صرف علامت فرمایا ہے، اور ضروری نہیں کہ جہاں علامت موجود ہو وہاں اصل شئ بھی پائی جائے؛ بلکہ علامتیں مشترک بھی ہوتی ہیں، نبض کی سرعت بخار کی علامت ہے؛ مگر کبھی قوتِ نفس کی بناء پر بھی ایسا ہو جاتا ہے.................
اسی طرح یہاں ان چیزوں کو نفاق کی علامت بتلایا گیا ہے، یعنی ان سے نفاق کا اشتباہ ہوتا ہے، ایک مسلمان کو ان چیزوں سے احتراز لازم ہے الخ (ایضاح البخاری ۴/۳۳۲)

حدیث پاک میں اور بھی نمونے موجود ہیں جس کی اس مختصر جواب میں گنجائش نہیں ہے۔ زید کے یہ جملے جو اس نے اپنے رفقاءِ کار سے کہے، مقامِ تنبیہ اور مقامِ محاسبہ پر کہے ہیں، ایک کامل مومن اپنے نفس کا محاسبہ شدت سے شروع کرتا ہے، تو اس کو اپنی ہر حرکت وسکون پر یہ شبہ گزرنے لگتا ہے کہ کہیں اس میں سرّ وعلانیہ کا کوئی ادنیٰ سا اختلاف تو نہیں ہے، اس لیے وہ اپنی ظاہری و باطنی صلاح وفلاح پر کبھی مغرور نہیں ہوتا، وہ ہر ہر عمل میں اپنے نفس کو ہمیشہ متہم کرتا رہتا ہے، آخر اس سعی میں اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر فرمایا ”ما مضی مؤمن قط ولا یبقی الا وھو من النفاق غیر آمن، وما مضی منافق قط ولا یبقی الا وھو من النفاق آمن“ کوئی مومن جو پہلے گزر گیا یا اب موجود ہے ایسا نہیں جس کے دل میں اپنے نفس کے متعلق نفاق کا خطرہ نہ گزرتا ہو، اور کوئی منافق جو گزر گیا یا اب موجود ہے ایسا نہیں جو نفاق سے بے خطر نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کو اپنے نفس کے متعلق ہمیشہ نفاق کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ان کو یہ خطرہ نفاقِ اصغر سے تھا۔ صحیح بخاری میں

ابن ابی ملیکہؒ سے روایت ہے کہ تیس صحابہ سے میری ملاقات ہوئی، سب کو اپنے نفس پر نفاق کا خطرہ لگا رہتا تھا، ان میں کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ ہمارا ایمان حضرت جبرئیل علیہ السلام ومکائیل علیہ السلام کے ایمانوں کی طرح خطرۂ نفاق سے مامون ہے۔امام احمدؒ سے پوچھا گیا جس شخص کو اپنے متعلق نفاق کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ انھوں نے تعجب سے فرمایا ایسا کون مومن ہوسکتا ہے جس کو اپنے متعلق یہ خطرہ بھی نہ آتا ہو۔(ترجمان السنۃ۲/۴۶۲بحذف واختصار۲/ ۴۱۵،دارالاشاعت کراچی)

اس لیے تمام رفقائے کار بشمولیتِ زید کو چاہئے کہ ہر شخص اپنے اپنے افعال کا محاسبہ کرے، اور ایسی تمام باتیں جو اس کام کو اور اپنی آخرت کو نقصان پہونچانے والی ہوں، ان سے توبہ کرتے ہوئے آئندہ کے لیے مکمل احتراز کریں، اور اس قسم کی شیطانی ریشہ دوانیوں سے اپنے کو بچائیں، اور محبت والفت، عفو ودرگزر سے کام لیتے ہوئے متحد ہوکر کام کو آگے بڑھائیں، بہتر یہ ہے کہ فریقین ایک دوسرے سے حقوق معاف کرا کر نئے عزم وہمت سے کام میں لگ جائیں، اور اپنے قلوب کو اس قسم کی کدورتوں سے پاک صاف فرمالیں۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ:العبداحمدعفی عنہ خانپوری،۲۳/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح:عباس داؤدبسم اللہ عفی عنہ

قبر پر سجدہ وبوسہ

سوال: مزاروں پر سجدہ کرنا یا بوسہ لینا کیسا ہے؟ جبکہ مزاروں پر ناک، پیشانی ٹیک لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سجدہ نہیں ہوا، ہم نے سجدہ کے ارکان کو مکمل نہ کیا ہے، اس

لیے سجدہ نہیں ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

قبر پر سجدہ اور اس کا بوسہ بنیتِ عبادت وتعظیم کفر ہے، اور بلا نیتِ عبادت گناہِ کبیرہ ہے۔ شامی میں ہے:

(قوله إن على وجه العبادة أو التعظيم كفر الخ) تلفيق لقولين، قال الزيلعي: وذكر الصدر الشهيد أنه لا يكفر بهذا السجود؛ لأنه يريد به التحية، وقال شمس الائمة السرخسي: إن كان لغير الله تعالىٰ على وجه التعظيم كفر. اه. قال القهستاني: وفي الظهيرية يكفر بالسجدة مطلقاً. وفي الزاهدي: الايماء في السلام إلى قريب الركوع كالسجود الخ. (۵/۲۷۱) فقط والله تعالىٰ أعلم.

دوسرے سے مدد لینا شرک نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں: کہ اللہ کے ماسوا سے مدد لینا جیسا کہ عراق کے حملہ کا خدشہ سعودی کو، وہ امریکہ سے اپنے دفاع کے لیے مدد لیتا ہے، اور کسی سے خیرات اور بھیک مانگنا وغیرہ وغیرہ: غیر اللہ سے مانگنا ہوا، کیا یہ شرک نہیں ہے؟ کیا اس کے بارے میں پرسش ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

مادی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے جو مدد لیتا ہے، یہ شرک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ اسبابِ مادیہ میں ہر آدمی دوسرے

سے مدد مانگنے پر مجبور ہے، درزی کی مدد کے بغیر آپ اپنا ستر نہیں چھپا سکتے، معمار کی مدد کے بغیر اپنا مکان تیار نہیں کر سکتے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

رات کو جھاڑو دینا

سوال: رات کے وقت گھر کے اندر سے جھاڑو نکالنا کیسا ہے؟ اور یہاں پر لوگ کہتے ہیں کہ گناہ ہے اور روزی کم ہو جاتی ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۴/۳۷۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نبی کی ہڈی کے ذریعہ بارش برسنے والے واقعہ اور تمام انبیاء قبر میں زندہ کے عقیدہ میں تضاد

سوال: "البصائر في تذكير العشائر" مع اردو ترجمہ میں مناقب اہل بیت کا جہاں بیان ہے، اس میں ۵۹۷ میں حیاۃ الحیوان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: قحط پڑا ہوا تھا تو خلیفہ معتصم باللہ نے تین دن تک حکم دیا کہ باہر جا کر دعائے باراں کریں؛ مگر بارش نہ ہوئی، اسی واقعہ میں ہے کہ نصاریٰ میں ایک نصرانی راہب تھا تو وہ ہاتھ اٹھاتا تھا تو فوراً بارش ہوتی تھی، بعد میں حضرت ابو محمد حسن خالص رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے دیکھا تو کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو دیکھا تو آدمی کی ہڈی تھی، بعد میں بارش نہ ہوئی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ کسی نبی کی ہڈی ہے جو اس راہب کو کسی قبر سے

ہاتھ لگ گئی ہے، اور نبی کی ہڈی آسمان کے نیچے کھولی جاتی ہے تو بارش ہوتی ہے الخ۔

تو اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ کلام میں نبی کی ہڈی کیسے ہاتھ لگی؟ کیونکہ یہ تو بدن کے بوسیدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے؛ حالانکہ آقائے مدنی ﷺ کی حدیث ہے کہ: ''حرم اللّٰہ علی الارض أن یاکل اجساد الانبیاء، أو کما قال علیہ السلام. تو اب دونوں میں تطبیق کیسے ہوسکتی ہے؟ امید ہے کہ خلاصہ فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حدیث نبوی (ﷺ) إن اللّٰہ عزوجل حرم علی الارض اجساد الانبیاء.

(بوداؤد ۱/۱۵۰، دارمی ۱۹۵، نسائی ۱/۱۵٤، ابن ماجہ ۷۷، سنن کبریٰ ۳/۲٤۹) نیز حاکم نے بھی مستدرک ۱/۵٦۰ میں اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور وہاں امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں نے اس کو بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی اور نووی نے صحیح کہا ہے، تفسیر ابن کثیر ۳/۵۱۴۔ (حیات الانبیاء ۱۳۰، ۱۳۱)

کتاب مذکور میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فتویٰ بھی مذکور ہے، جس کا اقتباس پیش خدمت ہے: جمہور امت کا عقیدہ اس مسئلہ میں یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام برزخ میں جسد عنصری کے ساتھ زندہ ہیں، ان کی حیات برزخی صرف روحانی نہیں؛ بلکہ جسمانی حیات ہے الخ۔ (۵۹)

اس لیے سوال میں مذکورہ واقعہ کی صداقت ہی مخدوش ہوجاتی ہے، تطبیق کی کوئی صورت اس وقت ذہن میں نہیں آرہی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بی بی امّاں مرشدہ کا دجل وفریب، علم غیب کا دعوی، بھیس بدلنے کا اختیار، زیارت قبور کے لیے جانا، اجنبی کے جھوٹے کا حکم شرعی

سوال: ایک عورت جو اپنے کو مصلحۂ امت اور مربیہ ومرشدہ کہلواتی ہے، لوگوں کی اصلاح کا طریقہ یہ اپنائے ہوئے ہے کہ ایک ہال میں سبھی لوگ جمع رہتے ہیں، کھانے کو صرف ساگ کھائیں، گوشت نہیں کہ اس سے نفس موٹا ہوتا ہے، مہینہ میں ایک مرتبہ کسی درگاہ میں حاضری دینی ہوگی، جانے والے لوگوں کا انتخاب وہ خود کرتی ہے، کہ کوئی اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے کہ حضرت مرشدہ نے اس مرتبہ درگاہ جانے کے لیے فلاں فلاں کا انتخاب کیا ہے، کسی برتن میں دودھ آتا ہے جو ان کا پیا ہوا ہوتا ہے، یعنی ان کا جھوٹا، اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنا جھوٹا لوگوں کو پلا کر ان کے قلوب کو عبادت وریاضت اور معرفت الٰہی کے لیے کھولا جائے، اور کہتے ہیں کہ وہ خود لوگوں کے سامنے نہیں آتی، نہ عورتوں کے نہ مردوں کے، دعوی ہے کہ کسی کے بھیس میں وہ محفل میں شریک ہو کر چلی جاتی ہے، اور لوگوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی، اگر ان کے بارے میں کہیں مدح وذم ہو تو اس کا علم ان کو ہو جاتا ہے۔ یہی چند سوالات بذریعۂ کیسیٹ ان سے کیے گئے، کیسیٹ کے سننے سے قبل ہی کسی معتقد نے بتایا کہ ان سوالات کے جوابات املاء کرانے لگ گئی، جس کا فوٹو اسٹیٹ آپ حضرات کو بھی بھیجا جا رہا ہے، قلّت وقت اور عدیم الفرصتی کی بنا پر شاید وقت اجازت نہ دے کہ آپ حضرات ان کے جوابات پڑھیں؛ لیکن چونکہ امّت کا ایک بہت بڑا طبقہ اعتقاد میں غلو کر گیا ہے، مزید لوگ بڑی تیزی سے مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور بغیر پڑھے ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ شاید نہ لگ سکے، مجھے امید ہے کہ بعد

مطالعہ کے صحیح نتیجہ میں آپ حضرات بہت جلد پہونچیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے روحانی طاقت بھی علمائے امّت کو بہت دی ہے، ویسے آپ حضرات کی فراست ایمانی اس کی محتاج نہیں، تاہم زیادہ مناسب ہے، اور جواب بہت تفصیل سے لکھیں جو مدلل، مکمل ہو؛ یہاں کے لوگ اس کو شائع کر کے امّت کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں؛ کیونکہ بڑی تیزی سے یہ ہوا پھیل رہی ہے، جوابات مثبت ہوں یا منفی؛ بہرصورت شائع کریں گے انشاء اللہ۔

ہم لوگوں نے سوالات کیسیٹ میں اس طرح کئے تھے۔

محترمہ بی بی ماں (ان کو لوگ بی بی ماں کہتے ہیں) السلام علیکم آپ سے بہت ہی مہذب انداز میں چند سولات کے جوابات چاہئیں۔

(۱) آپ کے غائبانہ میں اگر کوئی آپ کی برائی یا بھلائی بیان کرے تو اس کا علم آپ کو ہو جاتا ہے، جب کہ یہ علم غیب ہے، جو سوائے خدا کے کسی نبی یا ولی، پیر، پیغمبر کسی کو نہیں؛ کیونکہ عالم الغیب والشھادۃ کی صفت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں، پھر آپ کس طرح دعوی کرتی ہیں کہ اس کا علم آپ کو ہو جاتا ہے؟

(۲) بھیس کے بدلنے کا اختیار جنّات کو ہے، پھر آپ کس طرح جب چاہیں کسی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں؟

(۳) درگاہوں پر عورتوں کا جانا حرام ہے، جب کوئی عورت درگاہ جانے کی نیت کرتی ہے تو اس پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی لعنت ہوتی ہے؛ جب تک اپنے ارادہ کو نہ بدلے، پھر آپ کیوں کر درگاہوں پر جاتی ہیں؟ (اس کا جواب انھوں نے بہت ہی مضحکہ انداز میں دیا ہے)

(۴) کسی غیر محرم عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر محرم مرد کا جھوٹا بلا کسی ضرورت کھائے یا پیے، اور اس کے برعکس کسی مرد کے لیے صحیح نہیں کہ بلا ضرورت کسی عورت کا جھوٹا پیے، جھوٹا پینے سے اصلاح نفس ہوتی ہے، اس کی کوئی اصل؟

بہر حال اس قسم کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے انھوں نے علماء کو نام نہاد، ضدی، اور ناسمجھ جیسے قبیح الفاظ سے خطاب کیا ہے؛ لہذا اس چیلنج کا نوٹس علمائے کرام لیتے ہوئے قوم وملت کو حقیقت حال سے آگاہ کریں، یہ ہم سب کی درخواست ہے۔

آخر میں پھر گذارش ہے کہ ان کے جواب پڑھ کر ہی اپنی بات پیش کریں تو زیادہ مناسب ہوگا، اور بہت ہی تفصیل سے لکھیں؛ کیونکہ ہم لوگ ضرور کتابچہ کی شکل میں اس کو آپ حضرات کے حوالہ کیساتھ شائع کریں گے۔

ماضی کی تاریخ میں ایسا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ کوئی عورت خانقاہ چلاتی ہو، اور لاؤڈ اسپیکر پر ذکر کرا رہی ہو، اور کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

علم غیب جو باری تعالیٰ کا خاصہ ہے، اس کا معنی ومطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اشکالات اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے اس کا مفہوم ومطلب سمجھ لینا ضروری ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ "مفردات القرأن" میں اس کی تعریف فرماتے ہیں: ما لاتدركه الحواس ولا يقتضيه بداهة العقل. (ص:۳۶۷) (یعنی جو چیز حواس اور بداھت عقلی سے معلوم نہ ہو سکے)۔

علامہ آلوسیؒ نے تفسیر ''روح المعانی'' میں ''لم ینصب علیه دلیل'' (یعنی اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو) کی قید کا اضافہ فرمایا ہے۔ (روح المعانی ۱/۱۱۴)

یعنی نظر وفکر اور دلیل عقلی سے بھی معلوم نہ ہو، وگرنہ پھر غیب نہیں رہے گا۔ (فضل الباری ۱/۵۴۱)

آپ نے سوال میں اس عورت کو سوال لکھا ہے کہ ''آپ کے غائبانہ میں اگر کوئی آپ کی برائی یا بھلائی بیان کرے تو اس کا علم آپ کو ہو جاتا ہے، جب کہ یہ علم غیب ہے، جو سوائے خدا کے کسی نبی یا پیغمبر، ولی یا پیر کسی کو نہیں''

سائل کا ان باتوں کو علم غیب سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ علم غیب جو خدا کا خاصہ ہے، اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے؛ حالانکہ اس عورت کی برائی یا بھلائی کی یہ باتیں جہاں بیان ہو رہی ہیں، وہاں جو حضرات موجود ہیں، وہ تو اس کو سن رہے ہیں، جان رہے ہیں، وہ جس کو اطلاع دیں گے وہ بھی اس کو جان لیں گے تو پھر یہ خدا کا خاصہ کہاں رہا؟ حالانکہ علم غیب تو وہ تھا جو خدا کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو، دراصل آپ نے اس کو علم غیب سمجھ لیا، وہ آپ کی غلط فہمی ہے۔

اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ جب وہ عورت وہاں موجود نہیں ہوتی پھر بھی اس کے متعلق کی جانے والی باتوں کا اس کو کیسے پتہ چلتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی جن (شیطان) سے اس کی دوستی ہو، اور وہ ایسے مواقع میں، جہاں اس عورت کے متعلق باتیں کی جاتی ہیں، موجود رہتا ہو، اور بعد میں اس کو ان باتوں سے باخبر کرتا ہو۔ ماضی میں بھی ایسا ہوا ہے، اسود عنسی جس نے حضور اکرم ﷺ کے آخری زمانہ میں نبوت کا

جھوٹا دعویٰ کیا تھا، اس کے متعلق شروح حدیث میں موجود ہے کہ اس کے پاس دو شیطان تھے، جو لوگوں میں پیش آنے والے واقعات کی اس کو اطلاع دے دیا کرتے تھے۔ وکان معہ شیطانان یقال لاحدھما سحیق...... والآخر شقیق ...... وکانا یخبرانہ بکل شئی یحدث من امور الناس. (فتح الباری شرح صحیح البخاری ج۸/۷۶) اور ان ہی باتوں سے متأثر ہو کر لوگ اس کے اوپر ایمان لے آئے۔

وہ عورت جو یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ میں وہاں بھیس بدل کر موجود رہتی ہوں، اس احتمال سے اس کے اس دعویٰ کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے، یعنی وہاں موجود رہنے والی وہ نہ ہو؛ بلکہ اس کا دوست جن ہو۔

آپ نے اس کے جوابات جو کیسیٹ سے اتار کر بھیجے ہیں وہ صاف پڑھے نہیں جاتے ہیں، اکثر کلمات مٹے مٹے سے ہیں؛ البتہ وہ الہام کا دعویٰ کرتی ہے، ان کا یہ دعویٰ کتنا مبنی بر صداقت ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے؛ لیکن اگر اس کو درست مان بھی لیا جائے تب بھی اہل سنّت والجماعت کے نزدیک یہ کسی چیز کی درستگی اور سچائی معلوم کرنے کے اسباب میں سے نہیں ہے، نہ ہی وہ حجت شرعیہ ہے۔

شرح عقائد نسفی میں ہے: ”والالھام المفسر بالقاء المعنی فی القلب بطریق الفیض لیس من اسباب المعرفۃ بصحۃ الشئی عند اھل الحق“ (۲۲)

(ترجمہ: اور الہام جس کی تفسیر دل میں فیض کے طور پر کسی بات کے ڈالنے سے کی جاتی ہے، اہل حق کے نزدیک شئی کی صحت کے اسباب علم میں سے نہیں ہے)

حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: الہام انبیاء کو بھی ہوتا ہے؛ چنانچہ حضور ﷺ دعا

فرماتے ہیں: اللّٰهم الهمني رشدي. اور غیر نبی کو بھی ہوتا ہے: فالهمها فجورها وتقواها. ہاں! اتنا فرق ہے کہ انبیاء کا الہام قطعی اور معصوم ہے، اور اولیاء کا الہام قطعی نہیں؛ کیونکہ ان کے الہام میں شیطانی ہونے کا احتمال ہے۔ (فضل الباری ۱/۱۳۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو ولی تسلیم کرلیا جائے اس کے بعد بھی ضروری نہیں کہ اس پر ہونے والا الہام قطعی ہو؛ بلکہ اس میں بھی شیطانی ہونے کا احتمال ہر حالت میں موجود ہے۔

اس جگہ ولی کی حقیقت اور اس کی تعریف بھی معلوم ہونی ضروری ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں ولی کس کو کہتے ہیں؟ عقائد وکلام کی مشہور کتاب شرح عقائد نسفی میں ہے: "الولی: هو العارف بالله تعالیٰ وصفاته بحسب ما یمکن المواظب علی الطاعات، المجتنب عن المعاصی، المعرض عن الانهماك فی اللذات والشهوات" (۱۰۵) (ترجمہ): ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات سے بقدر امکان واقف ہو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے تمام کاموں پر پابندی اور ہمیشگی کرنے والا، نافرمانی اور گناہوں سے دور رہنے والا، یہاں تک کہ مباح لذتوں میں بھی انہماک سے روگردانی کرنے والا ہو۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہم سے کیا گیا ایک سوال اور اس کا جواب نقل کرتا ہوں:

سوال: اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ مجھے کشف کے ذریعہ خدا نے حکم دیا ہے کہ فلاں شخص کے پاس جاؤ، اور فلاں بات کہو، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب: غیر نبی کو کشف یا الہام ہوسکتا ہے؛ مگر وہ حجت نہیں، نہ اس کے ذریعہ کوئی حکم ثابت ہوسکتا ہے؛ بلکہ اس کو شریعت کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھا جائے گا، اگر وہ صحیح ہوتو قبول کیا جائے گا، ورنہ رد کر دیا جائے گا، یہ اس صورت میں ہے کہ وہ سنت نبوی کا متبع اور شریعت کا پابند ہو، اگر کوئی شخص سنت نبوی ﷺ کے خلاف چلتا ہوتو اس کا کشف والہام کا دعوی شیطانی مکر ہے۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل ۱/۳۴،۳۵)

عارف باللہ شیخ بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: اگر تم کسی کو دیکھو کہ اس کو عجیب وغریب باتیں ملی ہیں، ہوا میں اڑتا ہے، فضا میں چار زانو ہوکر بیٹھتا ہے، پانی پر چلتا ہے تو جب تک وہ شریعت اور طریقہ سنت کا پابند نہ ہو، اسے خیال میں نہ لاؤ۔ شیخ بایزید بسطامیؒ کہ از مشائخ ملقب سلطان العارفین ست؛ نیز فرمودہ: لو نظرتم إلى رجل أعطي أنوا عا من الكرا ما ت؛ حتى يتربع فى الهواء، أويمشى على الماء، فلا تعتبروابه؛ حتى تنظروا كيف تجدونه عند الامر والنهى، وحفظ الحدود وأداء احكام الشريعة. (البلاغ المبین فارسی ص:۴۶)اور(رسالہ قشیریہ ص:۱۵)(منقول از فتاوی رحیمیہ ۴/۶)

حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ ایک بزرگ کی شہرت سن کر زیارت کے لیے گئے وہ بزرگ اتفاق سے گھر سے مسجد آرہے تھے، ان کو قبلہ کی جانب تھوکتے ہوئے دیکھا، تو حضرت بایزید بسطامیؒ ملاقات کئے بغیر ہی واپس چلے آئے، اور فرمایا کہ جس کو رسول خدا ﷺ کے آداب (قبلہ کی حرمت) کا پاس نہیں ہے، تو اس کی بزرگی کا کیا اعتبار۔ (بحوالہ قشیریہ ص:۱۵)(منقول از فتاوی رحیمیہ ۴/۷)

جو کوئی پابند شرع اور متبع سنت نہ ہو وہ کبھی خدا کا دوست اور ولی نہیں بن سکتا، اور

اس سے کوئی عجیب بات ظاہر ہوتو وہ کرامت نہیں ہوسکتی؛ بلکہ یہ سحر اور استدراج ہے، ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعہ بھی عجیب اور حیرت انگیز باتیں ظاہر ہوسکتی ہیں، اس میں اسلام کی بھی قید نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: قال ابن حجرؒ أنه ناظر صوفى برهمنا فطار البرهمى فى الجو فارتفعت اليه نعل الشيخ، والنا س ينظرون.
یعنی ایک صوفی کا ایک جوگی کے ساتھ مناظرہ ہوا، تو جوگی ہوا میں اڑنے لگا، اس کے پیچھے صوفی نے اپنی کھڑاؤں پھینکی، اور عوام اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ (البصائر ص۴۱۲، بصیرت ۴۷)

حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی نے پوچھا کہ فلاں آدمی ایک ہی شب میں مکہ مکرمہ پہنچ جاتا ہے، آپ نے فرمایا: شیطان پل بھر میں مشرق سے مغرب پہنچتا ہے تو یہ کوئی کمال اور حق ہونے کی دلیل نہیں؛ حالانکہ وہ خدا کی لعنت میں گرفتار رہتا ہے۔ وقيل له: فلان يمر فى ليلة الى مكة، فقال: الشيطان يمرّ فى لحظة من المشرق الى المغرب، وهو فى لعنة الله. (البصائر ص/۴۱۲، بصیرت/ ۴۷، ازفتاوی رحیمیہ ۴/ ۸)

(۲) انسان کو یہ قدرت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مختلف شکل وصورت میں مشکل کرسکے؛ البتہ جنات کو یہ قدرت عطا کی گئی ہے۔ قاضی بدرالدین شبلیؒ نے ”آکام المرجان في احكام الجان“ میں ایک مستقل عنوان اس کا قائم فرمایا ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں: لا شك أن الجن يتطورونَ ويتشكلون في صور الانس والبهائم، فيتصورون فى صور الحيات والعقارب، وفى صور الإبل والبقر والغنم والخيل والبغال والحمير وفي صور الطير، وفى صور بنى آدم. الخ (ص:۱۸)

(۳) زمانۂ جاہلیت کی قبر پرستی سے نفرت دلانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے

ابتدا میں امت کو قبروں پر جانے سے منع فرما دیا تھا، اور جب اس رسم کی بخوبی اصلاح ہو گئی تو آپ ﷺ نے زیارت قبور کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

کنت نهیتکم عن زیارة القبور، فزوروها؛ فإنها تزهد فی الدنیا وتذکر الآخرة. (مشکوہ ص:۱٥٤) میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا، اب ممانعت منسوخ کی جاتی ہے، پس ان کی زیارت کیا کرو؛ کیونکہ وہ دنیا سے بے رغبت کرتی ہیں، اور آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔

اس لیے قبرستان جانے کی اجازت ہے، البتہ دو مسئلوں میں اختلاف ہے، ایک یہ کہ یہ اجازت مردوں اور عورتوں سب کو ہے یا صرف مردوں کو؟ بعض اکابر کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو اجازت نہیں؛ کیونکہ آں حضرت ﷺ نے عورتوں کے بارے میں خصوصیت سے فرمایا ہے: "لعن الله زوارات القبور" (مشکوۃ ص:۱۵۴) (یعنی اللہ تعالی کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کو جاتی ہیں) اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد اجازت سے پہلے کا ہے، اور اب مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اجازت ہے، صحیح یہ ہے کہ عورتوں کو ممانعت اس بنا پر کی گئی ہے کہ یہ کم صبری اور کم علمی کی بناء پر وہاں جا کر جزع فزع؛ نیز بدعات اور غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں رہ سکتیں، چونکہ ان کے جانے میں فتنے کا احتمال غالب تھا، اس لیے ان کو خصوصیت سے منع کر دیا گیا، تاہم اگر کوئی عورت وہاں جا کر کسی بدعت اور کسی غیر شرعی حرکت کی مرتکبہ نہ ہو، اس کو اجازت ہے؛ مگر بوڑھی عورتیں جا سکتی ہیں، جوان عورتوں کو نہیں جانا چاہئے۔ (فتاوی شامی ۲/۲۴۲ طبع جدید مصر) (منقول از اختلاف امت اور صراط مستقیم ج۱/۵۱، ۵۲)

کسی مرد کے لیے اجنبی عورت کا جھوٹا اور کسی عورت کے لیے اجنبی مرد کا جھوٹا مکروہ ہے؛ اس لیے کہ اس صورت میں خطرہ ہے کہ لذت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو، (کما فی الدر المختار علی ھامش الشامی ۱/۱۶۳)

جس چیز کو مکروہ وناپسندیدہ قرار دیا گیا ہو، اس کو معرفت الٰہی کے لیے قلوب کو کھولنے کا ذریعہ قرار دینا، دجل وفریب ہے، عورتوں کو گھر میں جمے رہنے کی شریعت میں تاکید ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وقرن فی بیوتکن﴾ (تم اپنے گھروں میں جمی رہو)۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”لیس للنساء نصیب فی الخروج إلا مضطرة“. (رواہ الطبرانی) (یعنی عورتوں کو اپنے گھروں سے باہر نکلنے کا حق نہیں؛ لیکن ایسے وقت کہ وہ مجبور ومضطر ہو جائیں)۔ آپ ﷺ کا دوسرا ارشاد ہے: ”المرأة عورة، فاذا خرجت استشرفها الشیطان“ (یعنی عورت چھپانے کی چیز ہے؛ کیونکہ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تانک جھانک کرتا ہے)۔ مجالس الابرار میں ہے۔ فالمرأة کلما کانت مخفیة من الرجال کان دینها اسلم. (یعنی عورت جس قدر مردوں سے پوشیدہ ہوگی اس کا دین زیادہ سالم اور محفوظ رہے گا)۔

”فتاویٰ محمودیہ“ میں ہے: حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کے ہاتھ پر کسی نے بیعت نہیں کی، خلفائے راشدین اور بعد کے اکابرین اہل اللہ کے یہاں بھی یہ دستور نہیں ملتا، اس لیے عورت کو پیر بنا کر اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے۔ (۱۵/۹۷)

ایک دوسرے جواب میں ہے: ”اصلاح نفس کی ضرورت مردوں کو بھی ہے، اور عورتوں کو بھی، اس مقصد کے لیے مرید ہونے کی ضرورت ہوتی ہے؛ مگر دوسروں کی

اصلاح کرنا اور مرید کر کے ذکر و شغل کی تلقین کرنا یہ کام مردوں کے لیے مخصوص ہے۔

(فتاویٰ محمودیہ ۱۵/۹۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب أحکام التبلیغ

یہ بھی احکامِ شرع کی تبلیغ ہے

سوال: ہم لوگ محلّہ کی مسجد میں تبلیغی جماعت کا کام کرتے ہیں، اب محلّہ والے کبھی کسی کے انتقال کی وجہ سے اجتماعی ختمِ قرآن کرتے ہیں اور ختمِ قرآن کی تاریخ اور وقت اور دن متعین ہوتا ہے اور پھر ختم کے بعد سب کے اوپر گلاب کا پانی چھانٹا جاتا ہے، اب اگر ہم لوگ اس میں نہ بیٹھیں، تو توڑ ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے جوڑ باقی رکھنے کے لیے اس کے اندر بیٹھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

محلّہ والوں کو ایصالِ ثواب کا صحیح شرعی طریقہ محبت ونرمی کے ساتھ بتلا دیا جائے، اور غیر شرعی طریقہ کی قباحت اور اس کے نقصانات سے ان کو واقف کرایا جائے، یہ بھی احکامِ شرع کی تبلیغ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مروجہ تبلیغ شریعت کی نظر میں

سوال: اس دور میں تبلیغی جماعت کا زور سارے عالم میں ہے، یہ اس طرح کی تبلیغ جو مسلمانوں میں ہو رہی ہے، کیا سنت ہے یا بدعت ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نفسِ تبلیغ کا حکم تو کتاب وسنت میں موجود ہے، اور ہر زمانہ میں اس پر عمل بھی ہوتا رہا؛ البتہ ہر زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کے قلوب میں مفید طریقے القاء فرماتے رہے ہیں، حضرت نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد، ہفتہ میں ایک یا دو دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس لوگ جمع ہوتے اور وہ احادیث

سناتے، مسائل بتلایا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہفتہ میں ایک دفعہ مسجد نبوی میں ممبر کے قریب کھڑے ہو کر احادیث سنایا کرتے تھے۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ ہر جمعہ کو خطبہ شروع ہونے سے پہلے احادیث سنایا کرتے تھے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بھی مستقلاً تبلیغ کیا کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس خط لکھا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہاں بھیج دیجئے تبلیغ کے لیے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھیجا، تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ڈیڑھ ہزار کے قریب اپنے تلامذہ کو لے کر تشریف لے گئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ احادیث کو لکھا گیا، اور کتابی شکل دی گئی جگہ جگہ حدیث سنانے کے حلقے ہوتے تھے، بعض محدثین کے حلقہ میں ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد آدمی موجود رہتے تھے، (یہ سب مخاطبین مسلمان ہی تھے)۔ پھر ایک وقت آیا کہ مشائخ نے تصوف اور توجہ باطن کے ذریعہ تبلیغ کی، علماء نے مدارس قائم کئے، واعظین نے وعظ کہے۔ غرض یہ امت مجموعی حیثیت سے کسی بھی وقت نفس تبلیغ سے کلیۃً غافل نہیں رہی، اور ہر ہر طریقۂ تبلیغ نہایت ہی مؤثر مفید ثابت ہوا، ان میں کوئی طریقہ غلط نہیں۔ آج کے دور میں تبلیغی جماعت کا طریقہ اصول کی پابندی کے ساتھ نہایت مؤثر ومفید ہے، جس طرح مدارس کے عمل کو نیا طریقہ کہہ کر غلط نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح تبلیغ کے طریقہ کو نیا کہہ کر غلط نہیں کہا جا سکتا، مسلمان کا اپنے اسلام میں پختہ ہونا لازم ہے، پھر اس کی غیر مسلموں میں بھی فی الجملہ تبلیغ ہوتی ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ خود ہی اس طرف مائل ہو جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/۳۴۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب البدعات والرسوم

محرم کی بدعات کے لیے ورگنی (چندہ) دینا

سوال: ہر گاؤں میں مذہب کی ایک جماعت رہتی ہے اور رہنا ضروری ہے، اور ہر کسی کو جماعت کے ساتھ رہنا چاہئے، بات یہ ہے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں محرم نکالنے کے واسطے ہر گھر سے ورگنی یعنی پیسے نکال کر تعزیہ نکالا جاتا ہے اور محرم کھیلا بھی جاتا ہے، اس لیے یہ ورگنی دینا اچھا ہے یا نہیں؟ اور اگر اچھا نہیں ہے تو کیوں؟ در اصل ہم پندرہ سال سے محرم میں شامل نہیں ہے؟ صرف جماعت کو برابر ورگنی دیتے ہیں اور محرم کی مجالس پڑھنے جاتے ہیں، صرف جماعت کے برابر رہنے کے لیے ورگنی دینا پڑ رہا ہے، اس میں کچھ گنہ تو نہیں؟ وہ معلوم کرنا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تعزیہ سازی کا ناجائز ہونا، اور اس کا خلاف دین وایمان ہونا اظہر من الشمس ہے، ادنیٰ درجہ کے مسلمان کے لیے بھی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ أَتَعۡبُدُونَ مَا تَنۡحِتُونَ ﴾ کیا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جس کو خود ہی نے تراشا اور بنایا ہے؟ ظاہر ہے کہ تعزیہ انسان اپنے ہاتھ سے بانس کو تراش کر بناتا ہے اور پھر منت مانی جاتی ہے اور اس سے مرادیں مانگی جاتی ہیں، اس کے سامنے اولاد وصحت کی دعائیں کی جاتی ہیں، سجدہ کیا جاتا ہے، اس کی زیارت کو زیارت امام حسین رضی اللہ عنہ سمجھا جاتا ہے، کیا یہ سب باتیں روحِ ایمان اور تعلیمِ اسلام کے خلاف نہیں ہیں؟

علامہ حیات سندھی ثم المدنیؒ (المتوفی ۱۱۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ: رافضیوں کی

برائی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لوگ امام حسین رضی اللہ عنہ کی قبر کی تصویر بناتے ہیں، اور اس کو مزین کر کے گلی کوچوں میں لے کر گشت کرتے ہیں اور یا حسین! یا حسین! پکارتے ہیں اور فضول خرچ کرتے ہیں، یہ تمام باتیں بدعت اور ناجائز ہیں۔(الرقضه في ظهر الرفضه)

حضرت شاہ سید احمد صاحب بریلویؒ فرماتے ہیں (از جملہ بدعاتِ رفضہ کہ در دیارِ ہندوستان اشتہار تمام یافتہ، ماتم داری، وتعزیہ سازی ست در ماہِ محرم بزعم محبت حسین رضی اللہ عنہ ....این بدعات چند چیز ست: اول ساختن نقل قبور، ومقبرہ وعلم وسدہ وغیرہا وایں معنی بالبداہت از قبیل بت سازی وبت پرستی ست۔ (صراط مستقیم ۵۹)(فتاویٰ رحیمیہ ۲/۲۷۵)

یعنی ماہ محرم میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کے گمان میں ماتم اور تعزیہ سازی بھی روافض کی ان بدعات میں سے ہے، جو ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں، ان بدعتوں کی چند قسمیں ہیں: سب سے پہلے قبر ومقبرہ کی نقل، علم وسدہ وغیرہ کہ یہ کھلے طور پر بت سازی اور بت پرستی کی قسم میں سے ہیں۔

حافظ ابن حجر مکیؒ فرماتے ہیں: وإياه! ثم إياه! أن يشتغل ببدع الرافضة ونحوهم: من الندب، والنياحة، والحزن، إذ ليس ذلك من اخلاق المومنين؛ وإلا لكان يوم وفاته صلى الله عليه وسلم أولى بذلك وأحرىٰ. (صواعق محرقه ۱۱۲) یعنی خبردار! خبردار! یومِ عاشوراء کو روافض کی بدعات میں ہرگز مشغول نہ ہونا، جیسا کہ مرثیہ خوانی، رونا چلانا اور ماتم کرنا یہ سب امور مسلمانوں کے نہیں، اور اگر ان کا کچھ بھی تعلق اسلام سے ہوتا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن اس ماتم سرائی کے لیے زیادہ مستحق تھا۔(فتاویٰ رحیمیہ ۲/۳۴۲)

جناب مولوی احمد رضا خان صاحب بریلویؒ کا فتویٰ اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمایئے: علم تعزیہ، بیرک مہندی جس طرح رائج ہے، بدعت ہے اور بدعت سے شوکتِ

اسلام نہیں ہوتی، تعزیہ کو حاجت روا یعنی ذریعۂ حاجت روائی سمجھنا جہالت ہے، اور اس سے منت ماننا اور حماقت! اور نہ کرنے والے کو باعث نقصان خیال کرنا زنانہ وہم، مسلمانوں کو ایسی حرکت سے باز آنا چاہیے۔ (رسالہ محرم وتعزیہ داری ۵۹) (فتاویٰ رحیمیہ ۲/۳۴۳)

مولوی حکیم محمد حشمت صاحب بریلوی کا فتوی: تعزیہ داری جس طرح رائج ہے، متعدد معاصی (نافرمانی) ومنکرات یعنی خلاف شرع باتوں کا مجموعہ اور گناہ وناجائز وبدعتِ شنیعہ وباعثِ عذابِ الٰہی طریقۂ روافض ہے، اسے جائز نہیں کہے گا مگر بے علم، احکام شرع سے ناواقف۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: كل بدعة ضلالة، وكل ضلالة في النار. دوسری حدیث میں ہے: شر الأمور محدثاتها، وكل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. كذا في المشكوٰة. پس تعزیہ کا بنانے والا، رکھنے والا، اس میں دامے درمے قدمے مدد کرنے والا، اس پر شیرینی چڑھانے والا، فاتحہ دینے والا، سب گنہ گار، مستحقِ عذابِ نار کے، یہ سب باتیں بدعت واعانت علی المعصیت ہیں اور وہ حرام، سخت عذاب کا باعث اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس بدعتِ شنیعہ سے بموجبِ حدیث "إياكم ومحدثات الأمور" بچیں اور دور رہیں، اور کسی بھی طرح اس میں شرکت نہ کریں۔ (مجمع المسائل ۱/۱۹۹)

(منقول از فتاویٰ رحیمیہ ۲/۳۴۴، ۳۴۵) اس لیے آپ کا محرم کی بدعات کے لیے ورگنی یعنی چندہ دینا ناجائز اور حرام ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مروجہ مجالس میلاد

سوال: نبی کریم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے روز محفلِ میلاد منانا، اور اسے

عید میلاد النبی ﷺ کا نام دے کر ایسے اجتماعات پر لوگوں سے چندہ لینا اور لوگوں کو ایسے اجتماعات پر پیسے خرچ کرنے کی ترغیب دینا اسلام میں کیا حکم رکھتا ہے؟

کیا اصحابِ خیر القرون نے کوئی ایسا اجتماع کیا، یا نبی ﷺ نے اس پر کوئی فضیلت بیان فرمائی، یا آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ وتبعِ تابعینؒ میں کسی عالم یا بزرگ کا کوئی قول اس کا شاہد ہے؟ اور کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ: جو کوئی عید ملاد النبی ﷺ کے خاطر ایک درہم بھی خرچ کرے گا وہ میرے قریب ہوگا، اس طرح کا کوئی فرمان آپ رضی اللہ عنہ سے وارد ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ مروجہ مجلس میلاد نہ قرآن کریم سے ثابت ہے، نہ حدیث شریف سے ثابت ہے، نہ خلفائے راشدین و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، نہ تابعینؒ، نہ محدثین (امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ وغیرھم رحمہم اللہ) سے ثابت ہے، نہ ائمۂ مجتہدین (امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد وغیرھم رحمہم اللہ) سے ثابت ہے، نہ اولیائے کاملین (حضرت عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، شیخ عارف شہاب الدین سہروردی وغیرھم رحمہم اللہ) سے ثابت ہے۔ چھ صدی اس امت پر اس طرح بیت گئیں کہ اس مجلس کا کہیں وجود نہیں تھا، سب سے پہلے بادشاہ اربل نے شاہانہ انتظام سے اس کو منعقد کیا، اور اس پر بہت روپیہ خرچ کیا، پھر اس کی حرص اور اتباع میں وزراء، امراء نے اپنے اپنے انتظام سے مجالس منعقد کیں، تفصیل تاریخِ ابن خلکان میں ہے، اسی وقت سے علمائے حق نے

اس کی تردید بھی لکھی ہے؛ چنانچہ "المدخل" میں علامہ ابن الحاجؒ نے بتیس صفحات میں اس کے قبائح ومفاسد دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ ۷۳۲ھ میں اس کی تصنیف سے فراغت ہوئی، پھر جہاں جہاں یہ مجلس پہنچتی گئی، وہاں کے علماء تردید فرماتے گئے؛ چنانچہ عربی، فارسی، اردو؛ ہر زبان میں اس کی تردید موجود ہے، اور آج تک تردید کی جارہی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/۱۷۹)

ایسی مجلس کے لیے رقم خرچ کرنے کے واسطے لوگوں کو ترغیب دینا ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مروجہ مجالسِ میلاد اور نیاز میں چندہ دینے کا حکم

سوال: اسی طرح دونوں عید کے دن نیاز کے لیے پیسے نکالے جاتے ہیں، اور رات میں مولود، یا گیارھویں پڑھی جاتی ہے، اس لیے یہ بھی نیاز کے پیسے دینا گنہ ہے یا نہیں؟ کیونکہ قرآن شریف کے دوسرے پارے کے اندر ۱۷۳ نمبر کی آیت کی وجہ سے یہ سب کچھ پوچھنا پڑ رہا ہے، جماعت کے ساتھ گیارھویں اور مولود اور مجالس پڑھنے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ یہ برابر تفصیل سے معلوم کرنا ہے، جس طرح آپ نے عورتوں کی جماعت کے بارے میں تفصیل وار معلومات دیے تھے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

مروجہ مجالس میلاد نہ قرآن کریم سے ثابت ہے، نہ حدیث شریف سے ثابت

ہے، نہ خلفائے راشدین ودیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، نہ تابعینؒ، نہ محدثین (امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ وغیرہ رحمہم اللہ) سے ثابت ہے، نہ ائمۂ مجتہدین (امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد وغیرہ رحمہم اللہ) سے ثابت ہے، نہ اولیائے کاملین (حضرت عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی، شیخ عارف شہاب الدین سہروردی وغیرہ رحمہم اللہ) سے ثابت ہے۔ چھ صدی اس امت پر اس طرح بیت گئی کہ اس مجلس کا کہیں وجود نہیں تھا، سب سے پہلے بادشاہ اربل نے شاہانہ انتظام سے اس کو منعقد کیا اور اس پر بہت روپیہ خرچ کیا، پھر اس کی حرص اور اتباع میں وزراء، امراء نے اپنے اپنے انتظام سے مجالس منعقد کیں، تفصیل تاریخِ ابن خلکان میں ہے، اسی وقت سے علمائے حق نے اس کی تردید بھی لکھی ہے؛ چنانچہ کتاب ”المدخل“ میں علامہ ابن الحاجؒ نے بتیس صفحات میں اس کے قبائح ومفاسد دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ ۷۳۷ھ میں اس کی تصنیف سے فراغت ہوئی، پھر جہاں جہاں یہ مجلس پہنچتی گئی، وہاں کے علماء تردید فرماتے گئے؛ چنانچہ عربی، فارسی، اردو؛ ہر زبان میں اس کی تردید موجود ہے، اور آج تک تردید کی جارہی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/۱۷۹)

”بخاری شریف“ میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ سے روایت ہے کہ صحابیٔ رسول حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ہدیہ پیش نہ کروں، جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، تو میں نے عرض کیا، کیوں نہیں؟ ضرور ہدیہ پیش کیجئے، تو انھوں نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے ہوئے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اہلِ بیت پر صلوٰۃ (درود) کا کیا طریقہ

ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہمیں بتلا دیا ہے، یعنی تشہد میں، تو حضور ﷺ نے فرمایا اس طرح کہو: اللّٰھم صل علی محمد کما صلیت علی إبراھیم وعلی آل إبراھیم إنك حمید مجید. اس روایت سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سلام علی الرسول ﷺ کا طریقہ معلوم تھا، یعنی التحیات الخ مگر درود کا طریقہ معلوم نہیں تھا، سو انھوں نے دریافت کیا اور "قولوا" (کہو) سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ مقام ہے تعلیم کا، پس جس طرح تعلیم دیا گیا اس میں اور مروجہ سلام پڑھنے میں کوئی تعلق نہیں، اگر یہی مروجہ طریقہ سلام وصلوٰۃ کا ہوتا، تو نبی کریم ﷺ اس طرح پر تعلیم دیتے۔ معلوم ہوا کہ مروجہ طریقہ من گھڑت ہے اور من گھڑت چیزوں کو دین سمجھنا اور ثواب کی امید رکھنا بدعت ہے، اس مروجہ طریقہ کا ثبوت نہ تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وتابعینؒ اور نہ تبع تابعینؒ اور نہ بزرگانِ سلف صالحینؒ سے پایا جاتا ہے:

مپندار سعدی کہ راہ صفا		تواں یافت جز در پئے مصطفیٰ

مسجد میں جمع ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنے والوں کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بدعتی قرار دیا ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۱/۳۶۳)

غیر اللہ کے نام کی نذر ونیاز حرام وناجائز ہے، اس لیے کہ اس میں مخلوق کے لیے نذر ماننا ہے؛ حالانکہ نذر عبادت ہے جو خالق کے ساتھ مخصوص ہے۔

اعلم أن النذر الذي يقع للاموات من أكثر العوام، ومايؤخذ من الدراهم والشمع والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربّا إليهم فهو بالاجماع باطل وحرام. اھ.(درمختار) قوله باطل وحرام لوجوه: منها أنه نذر لمخلوق ولا

يجوز، لأنه عبادة، والعبادة لاتكون لمخلوق. (طحطاوي على الدر ازفتاویٰ محمودیہ ا/۲۱۴)

نیاز کے نام سے آپ سے جو رقم طلب کی جاتی ہے، وہ آپ نہ دیں اور ان کی بدعات ورسوم میں ہرگز ہرگز کسی بھی طرح کی شرکت نہ فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

بدعت سے بچنے پر مالی جرمانہ

سوال: آپ نے جو محرم بدل فتویٰ دیا تھا، اس کے مطابق ہم چند لوگوں نے یعنی چار گھر کے لوگوں نے شرق بدل جو قدم اٹھائے ہیں؛ مگر ہمارے گاؤں کی جماعت نے ہمارے چاروں گھر کا بائیکاٹ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جماعت کے برابر سب کچھ دینا ہوگا، ہم نے کہا کہ محرم کے لیے چندہ اور نیاز کے پیسے نہیں دیں گے، اور گیارھویں، مولود وغیرہ کو نہیں آئیں گے، صرف جماعت کا کچھ فیصلہ ہوگا اس میں آئیں گے، تو وہ لوگ قبول نہیں کرتے ہیں، ہم نے کہا کہ یہ قرآن شریف بتاتا ہے کہ نذر و نیاز اللہ کے سوا غیر اللہ پر حرام ہے، تو کہنے لگے کہ کونسا قرآن؟ کہاں کا قرآن؟ کدھر سے لایا قرآن؟ تو ہم نے جواب دیا کہ مسجد سے کوئی بھی قرآن اٹھالاؤ، اس میں بتاتا ہوں، اور اب وہ لوگ منہ دیکھتے بیٹھ گئے؛ کیونکہ وہ سب لوگ ایک ہیں، پھر آخر کار یہ معاملہ پولس اسٹیشن پر گیا، وہاں پر یہ ہوا کہ جس کو نذر و نیاز نہیں دینا ہے وہ خوشی سے مسجد کو پندرہ روپئے ہر مہینہ دے دو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سال میں محرم کا چندہ اور نیاز کے پیسے سب مل کر دس بارہ روپئے ہوں گے؛ مگر یہ مسجد کو ہر مہینہ کے حساب سے ۱۸۰/ روپیہ ہوں گے، مگر یہ ایک طرح کا سلسلہ ہوگیا، اور جو کوئی غریب شرک و بدعت کے بارے میں قدم اٹھانے والا

ہوگا وہ قدم نہیں اٹھائے گا؛ کیونکہ اس کو ہر مہینہ پندرہ روپئے مسجد کے نام سے دینا ہوگا، یہ ایک اس طرح کا قانون بن جائے گا، کہ جس کو نذر و نیاز نہیں دینا ہے اس کو ہر مہینہ پندرہ روپئے دینا ہے، یہ ایک میرے خیال سے زبردستی کی بات ہوگئی، اس لیے یہ اس طرح سے مسجد کو پیسے دینے سے ثواب ملے گا یا نہیں؟ وہ معلوم کرنا ہے۔ دوسری بات اپنے لیے جو کوئی قدم اٹھانے والا ہے وہ قدم نہیں اٹھائے گا، اس کا گناہ شاید مجھے لگتا ہے کہ اپنے سر ہوگا، اس لیے اس کا خلاصہ دیں گے ایسی مجھے امید ہے۔

اس طرح سے پیسے دینے سے ثواب ملے گا یا نہیں؟ وہ معلوم کرنا۔

قرآن کو ٹھکرانے والا، اور اس کے الفاظ کو سننے والے کے لیے کیا تنبیہ ہے وہ لکھنا۔

یہاں پر نوکری کے لیے آئے ہیں، اور موقع ملا ہے تو حج کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ سر پر دوسرے کا قرض ہے؛ مگر وہ دینے کی امید رکھتے ہیں، اس لیے حج کے لیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ وہ بھی معلومات دینا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شریعت مطہرہ میں کسی جرم پر مالی تاوان یا مالی سزا مقرر کرنا درست نہیں ہے۔

قوله لا بأخذ مال في المذهب، قال في الفتح: وعن ابي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال، وعندهما وباقي الائمة لا يجوز، ومثله في المعراج. (شامی ۱۹۵/۳)

یہ حکم تو اس وقت ہے جبکہ کسی نے واقعۃً جرم کیا ہو، اور اگر اس آدمی نے کوئی جرم نہیں کیا؛ بلکہ اپنے آپ کو شرک و بدعت سے بچایا تو اس کا یہ کام تو قابل تعریف ہے،

ضروری ہے کہ آدمی شرک وبدعت سے بچے، بھلا اس پر بھی کوئی سزا یا مالی تاوان مقرر کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جولوگ ایسا کرتے ہیں صریح ظلم ہے۔

حدیث پاک میں نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "ألا لا تظلموا! ألا لا يحل مال امرئٍ إلا بطيب نفس منه" (مشکوٰۃ شریف ۲۵۵) خبردار! ظلم مت کرو، سنو کسی آدمی کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر درست نہیں ہے، جائز اور حلال نہیں ہے۔

اس لیے جولوگ محرم کی نذر و نیاز میں حصہ نہیں لیتے ان پر ہر مہینہ مسجد میں پندرہ روپیہ دینا ضروری ٹھہرانا وہ جائز نہیں ہے، مسجد میں اپنی رضامندی اور خوشی سے دے گا تو اس کو ثواب ملے گا، اس میں زبردستی کرنا درست اور جائز نہیں ہے۔ جہالت اور نادانی کی وجہ سے بدعات کرتے ہیں، اور جولوگ ان بدعات کے خلاف قرآن وحدیث سے دلیل پیش کرتے ہیں، ان کو یہ کہتے ہیں کہ کہاں کا قرآن؟ وغیرہ یہ بڑی جرأت اور دیدہ دلیری کی بات ہے، اور ایمان کے لیے مہلک اور خطرناک ثابت ہوسکتی ہے، ضروری ہے کہ اپنی ان حرکتوں سے توبہ اور استغفار کریں۔

اگر آپ کو اپنے قرض کے ادا ہونے کا یقین ہے تو اس کی ادائیگی سے پہلے حج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

شادی میں سہرا باندھنا

سوال: شادی کے وقت ایک رسم ہے کہ دولھا کو سہرا باندھا جاتا ہے، یہ سفید

کوڑیاں کی الگ الگ تاریں ہوتی ہیں، وہ دولھا اپنے سر پر باندھتا ہے، اور تاریں منہ پر آجاتی ہیں، ایک طرح کی زینت ہے پھول وغیرہ کی طرح؛ مگر رسماً کیا جاتا ہے، کوئی کرنے اور نہ کرنے سے ثواب یا گناہ نہیں جانتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سہرا چونکہ کافروں کی رسم ہے، اس لیے خلاف شرع ہے۔ (بہشتی زیور ۶/ ۲۵) ”من تشبه بقوم فهو منهم“ حدیث میں وارد ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مرد کے لیے مہندی لگانا

سوال: اور شادی کے وقت ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی جاتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مرد کے لیے ہاتھ پاؤں پر مہندی لگانا جائز نہیں ہے، عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، اور ایسے مردوں پر جو عورتوں سے مشابہت اختیار کریں حدیث میں لعنت آئی ہے۔ (مشکوۃ ص: ۳۸۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دولہا کو اونٹ پر بٹھانے کی رسم

سوال: اونٹ دوڑائے جاتے ہیں دولھا کو بیٹھا کر۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بھی ایک رسم ہے، جس کی کوئی اصل نہیں۔ (کفایت المفتی ۹/ ۶۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

پیٹھی لگانا

سوال: اور دولھا کو دوست احباب پیٹھی کرتے ہیں، وہ ہمارے راجستھان میں

چند چیزیں: تیل اور سفیہ مٹی اور ہلدی وغیرہ ملا کر دولھا کو بدن پر ملتے ہیں، جس سے میل دور ہو جاتا ہے، اور بعد میں صابن لگا کر نہلاتے ہیں، یہ رسماً کیا جاتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ بھی رسم ہے۔ (اصلاح الرسوم ص:۵۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شادی میں روپیہ لینے دینے کی رسم (نیوتہ)

سوال: شادی میں کھانے کے بعد خاص کر سب لوگ جو شادی میں آتے ہیں وہ لوگ دولھا کو روپئے دیتے ہیں، با قاعدہ لکھتے ہیں، اور بعد میں جب کبھی روپئے دینے والوں کے یہاں شادی ہوتی ہے تو وہ اپنی چوپڑی میں دیکھ کر جاتا ہے، اور روپئے دے کر آتا ہے، اتنے یا کم وبیش دیتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر یہ بطریقِ اعانت کے ہو اور ریاکاری نام وغیرہ کچھ نہ ہو تو شرعاً درست؛ بلکہ مستحسن ہے، مگر طریقۂ مروجہ کی حیثیت بجز رسم ورواج کے کچھ نہیں، اور بسا اوقات برادری کے زور اور رسوائی کے خوف سے دیا جاتا ہے؛ بلکہ اگر پاس نہ ہو تو سودی قرض لے کر دیا جاتا ہے، اس لیے ناجائز ہے، اور بطورِ قرض دیا جاتا ہے جیسا کہ بعض جگہ رواج ہے، تو اس میں اور بھی مفاسد ہیں: لایحل مال إمرأ مسلم إلا بطيب نفس منه. رواه البيهقي اه. مشكوٰة ٢٥٥ (فتاویٰ محمودیہ ۹۲/۵، ۹۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایک دوسرے کی بہن سے آپسی نکاح

سوال: ہمارے وہاں ایک کی بہن میرے یہاں، تو میری بہن اس کے وہاں،

مطلب کے بہنوں کا ادل بدل کرنا کیسا ہے کہ کسی کی بہن یا کوئی دوسری رشتے کو دے کر، سامنے والی کی بہن یا اور کوئی اس کی رشتے کو ادل بدل لیتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر دونوں کا مہر مقرر کیا جاتا ہے تو یہ درست ہے۔ (ہدایہ ۲/۳۲۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لڑکی کے عوض پیسہ لینا

سوال: اپنی لڑکی کو دوسرے کے وہاں پیسے سے دینا، باقاعدہ باپ اپنی بیٹی کو دس ہزار یا بیس ہزار، مطلب کے قیمت کر کے دیتا ہے ایک طرح کا سودا ہوا کہ اپنی بیٹی کو بیچ کر کھاتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ جائز نہیں ہے۔ (شامی ۷/۱۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

پتنگ کی رسم

سوال: تمام جگہ پتنگ کی رسم ہے، کیا مسلمان کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ناجائز ہے۔ (احکام القرآن للتھانوی ۳/۲۰۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لکھوٹی، پتہ اور کرکٹ کھیلنا

سوال: لکھوٹی اور کرکٹ اور پتہ وغیرہ شرطوں کے ساتھ کھیل سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اس سے وقت بیکار ضائع ہوتا ہے، اور اب تو وقت کی بات الگ رہی، نماز چھوڑی جاتی، سب کھیل کھیلنا جس میں نماز ضائع ہوتی ہے کیسا ہے؟ حضرت تمام مسئلوں

کے جواب واضح عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ناجائز اور حرام ہے، قمار (جوا) کی حرمت منصوص ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

شادی کے بعد مصافحہ ومعانقہ کرنا

سوال: شادی کے بعد مصافحہ ومعانقہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عبادت اور سنت سمجھ کر کرنا بدعت ہے جیسا کہ اکابر کے فتاویٰ میں ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۵/۲۶۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

نماز کے بعد مصافحہ

سوال: نماز کے بعد مصافحہ کرتے وقت درود شریف پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ملاقات کے شروع میں یعنی جیسے ہی ملاقات اور سلام وجواب ہو، اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت جو مصافحے کیئے جاتے ہیں، مثلاً: نماز فجر ونماز عصر ونماز جمعہ یا نماز عیدین (یا ہر نماز) وغیرہ کے بعد جو مصافحہ کیا جاتا ہے اور اس کو سنت سمجھا جاتا ہے، یہ غلط ہے، آنحضرت ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت نہیں ہے۔

شامی میں ہے: ونقل في تبيين المحارم: عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوٰة لكل حال؛ لأن الصحابة ﷺ ما صافحوا بعد أداء الصلوٰة، ولأنها من سنن الروافض. اهـ ثم نقل عن ابن حجر من الشافعية: أنها بدعة مكروهة، لا اصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعله أولا، ويعزر ثانيا، ثم قال: وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل: أنها من البدع، وموضع المصافحة في الشرع أنما هو عند لقاء المسلم لأخيه، لافي ادبار الصلوات، فحيث وضعها الشرع يضعها، فينهى عن ذلك ويزجر فاعله لما اتى به من خلاف السنة. اهـ **(ترجمہ) نماز کے بعد مصافحہ کرنا مکروہ ہے، کیونکہ صحابہ ﷺ بعد نماز مصافحہ نہیں کیا کرتے تھے، اور اس لیے بھی مکروہ ہے کہ یہ روافض کا طریقہ ہے، اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ قابل کراہیت بدعت ہے، شریعت محمدی میں اس کی کوئی اصلیت نہیں، اس کے کرنے والے کو پہلی دفعہ میں تنبیہ کردی جائے، (نہ مانے تو) دوسری دفعہ میں اس کو سزا دی جائے، اور ابن الحاج مالکیؒ "مدخل" میں تحریر فرماتے ہیں: یہ بھی ایک بدعت ہے، شریعت میں مصافحہ کرنے کا وقت وہ بتلایا گیا ہے، جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرے، نمازوں کے بعد نہیں، پس جہاں شریعت نے مصافحہ رکھا ہے، وہیں مصافحہ کرے، اس کے علاوہ دوسرے اوقات میں (مثلاً: نمازوں کے بعد) مصافحہ کرنے سے منع کیا جائے اور کرنے والے کو جو سنت کے خلاف عمل کررہا ہے، سختی سے منع کیا جائے۔** (شامی ۵/۳۳۶، از فتاویٰ رحیمیہ ۲/۳۲۱،۳۲۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ، ۲۱/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

نماز کے بعد مصافحہ بدعت ہے

سوال: شوافع کے یہاں عید کی نماز کے بعد مصافحہ کا اہتمام مسنون ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شوافع میں کسی نے عید کی نماز کے بعد مصافحہ کو مسنون بتلایا ہو، یہ میرے علم میں نہیں؛ البتہ شامی میں نماز کے بعد مصافحہ کو ابن حجر شافعیؒ کے حوالہ سے بدعتِ مکروہہ بتلایا ہے۔ ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية انها بدعة مكروهة، لا اصل لها فى الشرع وانه ينبه فاعلها اولاً ويعزر ثانياً. (شامی ۵/۲۷۰) یعنی ابن حجر شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ (نمازوں کے بعد کا مصافحہ) ناپسندیدہ بدعت ہے، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، ایسا کرنے والے کو اولاً تنبیہ کی جائے، اور (پھر بھی کرتا ہے تو) ثانیاً اس کو تعزیر کی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ذوالقعدۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

اجتماعی ایصالِ ثواب سے بچنے کا طریقہ

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عظام اور علمائے کرام اس بارے میں کہ ہم گجراتی، جن کے باپ دادا یہ کام کرتے آتے ہیں کہ ہمارے گھروں میں جب کسی آدمی کا انتقال ہوجاتا ہے، تو تیسرے، چوتھے روز لوگوں کو جمع کر کے قرآن پاک کی تلاوت فرما کر مرحوم کے لیے ایصال ثواب اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں، اگرچہ اس عمل کو معین دن اور وقت اور اہتمام کی بناء پر علمائے دیوبند منع فرماتے ہیں؛ لیکن یہی گجراتی حضرات

ہندوستان چھوڑ کر یہاں انگلینڈ پہنچے اور ساتھ ساتھ وہ طور وطریق جو وطن میں کرتے تھے، وہ ساتھ لائے ؛ لیکن یہاں اس میں تھوڑی سی اصلاح ہوئی، اور وہ یہ ہے کہ جب کبھی کسی کے یہاں پر انتقال ہوتا ہے، یا ہندوستان میں اپنے کسی عزیز اور رشتہ داروں کی انتقال کی خبر آتی ہے، تو خاص کر جمعہ کے دن اور گاہے گاہے کسی دوسرے دن مسجد کے امام صاحب اعلان فرماتے ہیں کہ مرحوموں کے ایصالِ ثواب کے لیے یٰسین شریف کا ختم ہوگا، اس اعلان کے بعد جن صاحبان کے پاس فرصت اور وقت ہو، وہ مسجد میں نماز کے بعد بیٹھ جاتے ہیں اور وہ بھی سو میں سے پانچ فی صد بیٹھتے ہیں اور پانچ دس منٹ بیٹھ کر یٰسین پاک پڑھتے ہیں اور دعا فرما کر مجلس برخواست ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی شیرینی وغیرہ کی تقسیم نہیں ہوتی، اور مرحوموں کے گھر جا کر کھانا وغیرہ کا اہتمام نہیں ہوتا، اور تیسرے چوتھے روز گھر پر جمع ہو کر جو اہتمام وطن میں کرتے تھے، وہ ختم ہو گیا اور لوگ اطمینان کر لیتے ہیں کہ ہم نے ہمارے مرحوموں کے لیے ایصال ثواب کر لیا، مزید اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔

نوٹ: یہ اعلان بعض مرتبہ مسلسل کئی جمعہ تک چلتا ہے؛ کیونکہ یہاں پر علاقہ میں بہت سارے دیہاتوں کے لوگ رہتے ہیں اور کسی نہ کسی کے انتقال کی خبر آتی رہتی ہے، اس لیے مسلسل چلتا ہے، اس کے باوجود کوئی جمعہ خالی بھی ہو جاتا ہے، اور جمعہ ہی کو یہ اعلان ہو، یہ ضروری نہیں ہے، دوسرے دنوں میں بھی چل سکتا ہے؛ لیکن جمعہ کو زیادہ تر اعلان اس لیے ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن لوگ زیادہ جمع ہوتے ہیں، ورنہ دوسرے دنوں میں بھی اعلان ہو سکتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا ہوتا بھی ہے، اب اس معاملہ میں ہمارے یہاں

ایک نوجوان عالم دین جو جلال آباد سے فارغ ہوکر تشریف لائے ہیں، اور ہمارے یہاں دین کی خدمت ادا کرتے ہیں، انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارے یہاں یہ طریقہ جو اعلان کرکے جمع ہوکر یٰسین شریف پڑھتے ہیں، یہ بدعت ہے، اس کو بند کرو، تو اس طرح اعلان کرکے جمع ہوکر پڑھنا بند کردیا۔ لیکن لوگوں کو ان کے اس اعلان پر اطمینان نہیں؛ کیونکہ جب دوسرے علمائے کرام جو یہاں پر ہیں، اور وہ علمائے کرام جو ہندوستان و پاک سے تشریف لاتے ہیں، ان میں سے بعض اور وہ بھی جید اور سالہا سال سے بڑی بڑی درسگاہوں میں خدمت پر مامور ہیں، ان سے اس بارے میں سوال کرتے ہیں، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ پڑھ سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور ساتھ ساتھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یٰسین شریف اس طرح پڑھنا بدعت ہے، تو یٰسین شریف پڑھنے کا اہتمام دارالعلوموں اور خانقاہوں اور مرکزوں میں ہوتا ہے اور پڑھتے ہیں تو اگر یہ بدعت ہو تو پھر یہ دارالعلوموں میں اور خانقاہوں میں اور مرکزوں میں کیوں پڑھتے ہیں؟ ان وجہوں کی بناء پر لوگوں کو اطمینان نہیں ہے! ہاں بعض ایسے بھی ہیں، جو ہمارے اسی عالم دین کے ہم خیال ہیں، ساتھ جن لوگوں کو اطمینان نہیں ہے وہ، اور وہ لوگ جو اپنے مرحوم کے ایصال ثواب خود نہیں کرسکتے، انھوں نے وہی اہتمام جو وطن میں کرتے تھے، اس کو پھر اپنے گھروں میں شروع کردیا، یعنی تیسرے چوتھے روز لوگوں کو گھروں میں جمع کرتے ہیں اور قرآن خوانی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ دودھ اور کھانا پینا شروع ہوگیا ہے اور بعض بعض جگہ پر بدعتی مسجد کے امام اور بچوں نے ہمارے صحیح العقائد کے گھروں میں آکر ختم پڑھنا اور دعا کرنا شروع کردیا ہے، کیونکہ وہ تو

کام اور اہتمام کے عادی ہیں اور ہمارے بچے اور علماء کسی کے گھر پر جاتے نہیں ہیں، یٰسین شریف اسی طرح پڑھنا بدعت ہے، تو اس سے بڑی بڑی بدعتیں جو ہمارے یہاں ہمارے گھروں میں یہاں پر پہلے نہیں تھی، وہ شروع ہوگئی، تو دو بڑی مصیبتیں ہو، تو چھوٹی اور آسان کو اختیار کرلو، تو اگر یہ دونوں بدعتوں میں ہو، تو چھوٹی اور آسان بدعت کر لینے سے بڑی بڑی بدعتوں سے بچ جانا اچھا ہے، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی زید مجدھم کے فتاویٰ محمودیہ ٦/ ۱۳۵، ۱۳٦، ۱۳۷ کے سوال وجواب سے جواز معلوم ہوتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

رسم ورواج کی پابندی اور برادری مروت اور دباؤ کے بغیر اور کوئی مخصوص تاریخ اور دن معین کئے بغیر اور دعوتی اہتمام اور اجتماعی التزام کے بغیر، میت کے متعلقین، خیر خواہ اور عزیز واقرباء ایصالِ ثواب کی غرض سے جمع ہوکر قرآن خوانی کریں، تو یہ جائز ہے، ممنوع نہیں۔ (عینی شرح ہدایہ اول منقول از فتاویٰ رحیمیہ ۱/ ۳۸۹)

یہ تو نفس قرآن خوانی کا حکم ہے، جس کے ساتھ خلاف سنت اہتمام اور دعوتی التزام، برادری رسم ورواج کی پابندی اور بدنامی کا ڈر وغیرہ خرابیاں شامل نہ ہوں، ورنہ یہ رسمی قرآن خوانی ثواب کے بدلہ عذاب کا سبب بن سکتی ہے۔ (ایضاً ۱/ ۳۹۱)

آپ کے ہاں جو قرآن خوانی ہوتی ہے وہ رسمی ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ وہاں کے مقامی متدین، ماہرِ شریعت، عوامی نفسیات سے واقف اہلِ حق علماء کر سکتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کا ایسا طریقہ بتایا ہے جو آسان ہے، اخلاص سے بھرا ہوا، شک وشبہ سے محفوظ۔ فرماتے ہیں: جس طریقہ

سے آج کل قرآن شریف پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، یہ صورت مروجہ تو ٹھیک نہیں، ہاں! احباب خاص سے کہہ دیا جائے کہ اپنے اپنے مقام پر حسب توفیق پڑھ کر ثواب پہنچا دیں، باقی اجتماعی صورت اس میں بھی مناسب نہیں، چاہے تین بار قل ھواللہ ہی پڑھ کر بخش دیں، جس سے ایک قرآن کا ثواب مل جائے گا، یہ اس سے بھی اچھا ہے کہ اجتماعی صورت میں دس قرآن ختم کیے جائیں، اس میں اکثر اہلِ میت کو جتلانا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں تھوڑے بہت کو نہیں دیکھا جاتا، خلوص اور نیت دیکھی جاتی ہے؛ چنانچہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میرا ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک مد کھجور خیرات کرے اور غیر صحابی احد پہاڑ کے برابر سونا تو وہ اس درجہ کو نہیں پہنچ پاتا، یہ فرق خلوص وعدمِ خلوص ہی کا تو ہے، کیونکہ جو خلوص ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا ہوگا، وہ غیر صحابی کا نہیں ہوسکتا۔ (انفاسِ عیسیٰ ۱/ ۲۱۵، منقول از فتاویٰ رحیمیہ ۱/ ۳۹۱، ۳۹۲)

کسی بدعت سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ دوسری بدعت کی اجازت دے دی جائے؛ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ حضراتِ علماء، جو وہاں مقامی دینی کام کے ذمہ دار ہیں، وہ جدوجہد کر کے لوگوں کے دلوں میں بدعت کی قباحت ونحوست جمائیں اور اتباعِ سنت کی ترغیب وترویج کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲/ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

رسمی قرآن خوانی

سوال: جب کسی کا انتقال ہوتا ہے، اس کے بعد مسجدوں اور گھروں میں مجموعی طور پر مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے یٰسین شریف کے ختم کے لیے اور قرآن خوانی

کے لیے باضابطہ اعلان کیا جاتا ہے اور لوگ اس کو سن کر پابندی کے ساتھ تلاوت کرتے ہوئے ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں کھانے پینے کی کوئی چیز تقسیم بھی نہیں کرتے، جس کو بعض لوگ بدعتوں میں شمار کرتے ہیں، لہذا اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

رسم ورواج کی پابندی اور برادری مروت اور دباؤ کے بغیر اور کوئی مخصوص تاریخ اور دن معین کئے بغیر، اور دعوتی اہتمام اور اجتماعی التزام کئے بغیر، میت کے متعلقین، خیرخواہ اور عزیز واقرباء ایصالِ ثواب کی غرض سے جمع ہوکر قرآن خوانی کریں، تو یہ جائز ہے، ممنوع نہیں۔ (عینی شرح ہدایہ منقول فتاویٰ رحیمیہ ۱/ ۳۸۹)

یہ تو نفس قرآن خوانی کا حکم ہے، جس کے ساتھ خلاف سنت اہتمام اور دعوتی التزام، برادری رسم ورواج کی پابندی اور بدنامی کا ڈر وغیرہ خرابیاں شامل نہ ہوں، ورنہ یہ رسمی قرآن خوانی ثواب کے بدلہ عذاب کا سبب بن سکتی ہے۔ (ایضاً ۱/ ۳۹۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

اجتماعی ایصالِ ثواب

سوال: مسجد میں ربیع الاول کے مہینے میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نام پر ختم قرآن رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی بھی میت کو اپنے طور پر صدقاتِ نافلہ یا تلاوت وغیرہ کا ثواب پہنچانا ثابت

ہے؛ البتہ ایصال ثواب کے لیے اجتماع کا اہتمام اور اس میں قیود ورسوم بدعت اور ناجائز ہے۔ (کفایت المفتی ۹/۱۰۵۔۹/۸۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اشیاء سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنے کا ثبوت نہیں

سوال: ہمارے اس گاؤں میں اور اکثر بڑے بڑے شہروں میں بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ جب فاتحہ دی جاتی ہے، تو اس وقت اشیاء کو سامنے رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھائی! اشیاء سامنے نہیں رکھنا چاہئے، تو وہ ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فاتحہ کے وقت اشیاء کو سامنے رکھنا مستحب ہے، حدیث یوں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہوا، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ میری ماں کا انتقال ہو چکا ہے، کیا میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کر سکتا ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! ضرور، آپ ایک کنواں کھودو، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کنواں کھودا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا کہ کنواں کھود دیا گیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کنویں کے پاس گئے اور کنویں کے پاس کھڑے ہو کر دعاء کی، اس حدیث کی روشنی میں ہم لوگ تو فاتحہ کے وقت اشیاء کو سامنے رکھنا مستحب سمجھتے ہیں، تو میں نے ان سے کہا کہ ہم ابھی فتویٰ منگا رہے ہیں، میں یہاں پر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ مستحب ہے یا بدعت ہے یعنی فاتحہ کے وقت اشیاء کو سامنے رکھنا بدعت ہے یا مستحب ہے؟ مذکورہ حدیث کا کیا مطلب ہے؟ مزید یہ بھی بتائیے کہ فاتحہ کا کھانا، امیر لوگ کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بلا التزامِ تاریخ ومہینہ وغیرہ کے نفسِ ثواب پہنچانا: قرآن کریم پڑھ کر، نماز پڑھ

کر، روزہ رکھ کر، غرباء ومساکین کو کھانا کھلا کر، کپڑا وغیرہ دے کر بلا شبہ بہتر و مستحسن ہے؛ لیکن فاتحہ مروجہ یعنی کھانا سامنے رکھ کر قرآن شریف کی کچھ آیتیں یا سورتیں پڑھ کر، اس کھانے اور قرآن کا ثواب میت کو پہنچانا بے اصل ہے، اور بدعت وممنوع ہے، نہ حضور ﷺ کا یہ طریقہ تھا، نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا، نہ تابعین عظام رحمہم اللہ کا، نہ تبعِ تابعین رحمہم اللہ کا، نہ امام اعظم رحمہ اللہ کا، نہ ان کی کسی کتاب میں منقول ہے، جو شخص مدعی ہے، اس سے پوچھنا چاہئے کہ کس کتاب میں لکھا ہے؟ (فتاویٰ محمودیہ ۱/ ۱۸۷)

آپ کو جس روایت کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں صرف اتنا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، (ان کے ایصالِ ثواب کے لیے) کونسا صدقہ زیادہ افضل ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ پانی سب سے افضل ہے، اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کے ثواب کے لیے ایک کنواں کھدوایا۔ (مشکوٰۃ شریف ۱۶۹ بحوالۂ ابوداؤد ونسائی)

اس روایت میں یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے کنویں کے پاس جا کر دعا مانگی، یہ زیادتی من گھڑت ہے، جس نے یہ بات کہی اس سے آپ کتاب کا حوالہ طلب کیجئے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۱/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

اہلِ میت کی دعوت کھانا ناجائز ہے

سوال: فاتحہ کا کھانا، یا ایصال ثواب کا کھانا، مالداروں کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جب ان حضرات سے کہا جاتا ہے کہ فاتحہ یا ایصالِ ثواب کا کھانا مالداروں کے لیے جائز

نہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب کنواں کھودا، تو اس کنویں سے نہ صرف غریب؛ بلکہ امیر لوگ بھی پانی پیا کرتے تھے، لہٰذا اس سے یہی ثبوت ملتا ہے کہ فاتحہ کا کھانا یا ایصالِ ثواب کا کھانا، امیر لوگ بھی کھا سکتے ہیں، میں مفتی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ فاتحہ کا کھانا یا ایصالِ ثواب کا کھانا امیر کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ اور جو حضرات کنویں کی مثال دیتے ہیں، یہ بات کہاں تک درست ہے؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اہلِ میت کی طرف سے کی جانے والی یہ دعوتِ مروجہ ناجائز ہے۔ بچند وجوہ:
(۱) یہ حقیقت میں ہنود کی رسم ہے، پس اس میں تشبہ بالھنود ہے۔ (۲) شریعت میں غمی کے موقعہ پر دعوت مشروع نہیں۔ (۳) اس دعوت کو لازم سمجھا جاتا ہے، اور التزام مالا یلزم ناجائز ہے۔ (۴) دعوت میں جو رقم صَرف ہوتی ہے، اس میں عموماً نابالغ یتامی کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ (۵) اس دعوت سے مطلوب ریا و نمود ہوتی ہے، یا لوگوں کے طعن و تشنیع کے ڈر سے دعوت کی جاتی ہے۔

اگر ایصالِ ثواب کی نیت ہوتی تو فقراء و مساکین کو مقدم سمجھا جاتا؛ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ اقرباء واحباب کا اجتماع ہوتا ہے، یا پھر صاحبِ اقتدار سرمایہ دار لوگوں کی دعوت ہوتی ہے، فقراء تو صرف برائے نام ہوتے ہیں۔ (از احسن الفتاوی ملخصاً ۱/۳۵۶)

کنواں صدقۂ جاریہ ہے جیسا کہ مسجد و مدرسہ بنانا، اس پر دعوت کا قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

گیارہویں، بائیسویں، رجب، محرم اور شبِ برأت کے ساتھ چند ناجائز کام ورسومات

سوال: (۱) گیارہویں، بائیسویں، رجبہ، محرم کا کھچڑا، عرفے، عیدین، امام جعفر صادق کے کنڈے، شبِ براءت کا حلوہ، آخری بدھ ان کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ سب رسوم جائز ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

گیارہویں منانا بدعت ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/ ۲۸۷) تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ فرمالیں۔

بائیسویں رجب کو کونڈا کرنے کا جو رواج ہے یہ رسم مذہبِ اہل سنت میں محض بے اصل خلافِ شرع اور بدعت ممنوعہ ہے؛ کیونکہ بائیسویں نہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی تاریخِ پیدائش ہے، اور نہ تاریخ وفات الخ۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/ ۲۲۰، ۲۲۱، احسن الفتاویٰ ۱/ ۳۶۷ تفصیل دونوں جگہ موجود ہے۔)

رجبہ سے مراد اگر یہی ہے تو اس کا حکم ظاہر ہے، اور کچھ ہے تو اس کی تفصیل لکھ کر حکم معلوم کرلیں، بعد میں فتاویٰ رشیدیہ میں اس کے متعلق نادرست اور بدعت کا حکم دیکھا۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۱۴۹)

محرم میں کھچڑا کی رسم کرنا ممنوع و ناجائز ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم (عزیز الفتاویٰ) مطبوعہ کراچی ۱/ ۱۲۷)

شبِ براءت میں حلوہ پکانے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں؛ لہذا ناجائز اور بدعت ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۱/ ۳۸۵، اصلاح الرسوم ۱۳۲ میں اس کی تفصیل موجود ہے)

ماہِ صفر کے آخری بدھ کے متعلق احسن الفتاویٰ میں ہے کہ یہ غلط اور من گھڑت عقیدہ ہے، اس لیے ناجائز اور گناہ ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۱/۳۶۰)

عرفہ کے نام سے ۸/ ذوالحجہ کو عمدہ کھانے پکانے کو ضروری سمجھنا اور کرنا، اور عیدوں کے نام سے ۹/ ذوالحجہ کو یہی عمل کرنا، اس کی کوئی اصل نہیں، یہ رسم محض اور ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بارات میں دولہے کے ہاتھ میں کنگنا اور کٹیار دینا

سوال: (۲) شادی کی بارات میں دولہے کے ہاتھ میں کنگنا، اور ہاتھ میں کٹیار دینا (یعنی دعوت طعام کے بعد کچھ رقمیں دعوتی شخص کو دینا لازم ہوتی ہیں) کیا یہ تمام جائز ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ سب ہندوانہ رسوم ہیں "من تشبه بقوم فهو منهم" (الحديث) کی بناپر ان کا ترک لازم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تعزیت کے اجتماع میں علماء اور عورتوں کی شرکت

سوال: ہمارے ضلع کھیڑا میں چند سالوں سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ آدمی کے انتقال کے بعد دو سے چار بجے کے درمیان ایک دن مقرر کر کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو خط لکھ کر بلایا جاتا ہے، جس میں عورتیں شرکت کرتی ہیں، کچھ مرد بھی ساتھ میں۔ یہ بات یادر ہے کہ جس کو خط پہنچتا ہے اس کو سماج کی رسم کے مطابق جانا ضروری ہوتا ہے، اور نہ آنے پر داعی برا مانتا ہے، پھر اس میں ہر قسم کے رسم ورواج کئے جاتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ:

(الف) اس قسم کی دعوت تعزیت پر میت کے گھر جا کر مقرر دن میں اکٹھا ہونا جائز ہے یا نہیں؟

(ب) چونکہ ایسے وقت پر دینی بات سنانا کبھی مؤثر بھی ہوتا ہے، اس لیے ایسے موقعہ پر اکثر جلسۂ وعظ مقرر کیا جاتا ہے، اور مردوں اور عورتوں کو دینی وعظ سنانے کے لیے علماء یا دینی آدمی کو بلایا جاتا ہے، اب ایسی مجلس کا انعقاد شرعی ہے یا غیر شرعی ہے؟

(ت) جس مجلس کا انعقاد غیر شرعی ہے ایسی مجلس میں وعظ کہنے کے لیے جانا جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں ایک عالم ایسی مجلسوں میں وعظ کہنے سے انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو جانے سے منع کرتے ہیں، آیا ان کا یہ فعل محمود ہے یا مذموم ہے؟

(ث) جو شخص اس میں شرکت کرتا ہے اور رواج دینے میں مدد کرتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اور وہ آدمی کیسا ہے؟

(ج) ایسی چیزوں کو بند کرنے میں کون سا طریقہ موجب اجر وثواب ہوگا؟۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(الف) اہل میت کی تعزیت یعنی ان کی تسلی اور دل جوئی کرنا، صبر کی تلقین وترغیب دینا، اس کے اور میت کے حق میں دعا کے الفاظ کہنا مسنون ہے، اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حدیث میں ہے "من عزى مصابا فله مثل أجره" یعنی جو کوئی مصیبت زدہ کی تعزیت کرے، خدائے پاک اس کو اس قدر ثواب دے گا جس طرح مصیبت زدہ کو (اس کے صبر پر)۔ (ترمذی شریف ۱/ ۱۲۷) دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی اپنے دینی بھائی کی مصیبت میں تعزیت کرے، تو قیامت کے روز خدائے پاک اس کو

بزرگی اور کرامت کا لباس پہنائیں گے۔(ابن ماجہ شریف ۱۱۶)

تعزیت تین دن تک کرنی چاہئے،اس کے بعد مکروہ ہے، ہاں جس کو اطلاع نہ ہو یا تعزیت کرنے والا یا اہل میت حاضر نہ ہوں تو تین دن کے بعد بھی کر سکتے ہیں۔(فتاوی عالمگیری ۱/ ۱۶۷) مجبوری یا دوری کی بناء پر حاضر نہ ہو سکے تو بذریعۂ خط تعزیت کی جا سکتی ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تعزیت بذریعۂ خط فرمائی جبکہ ان کے لڑکے کی وفات ہوئی۔(حصن حصین ۱۸۰)

الفاظِ تعزیت اور مضمون متعین نہیں، جدا جدا ہیں، صبر و تسلی کے لیے جو الفاظ زیادہ مؤثر ہوں ان کو استعمال کرے، بہتر یہ ہے کہ یہ الفاظ کہے جائیں: "إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهٗ مَا أَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهٗ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ." یعنی جو لیا وہ بھی خدا کا ہے، اور جو کچھ دیا وہ بھی اسی کی ملکیت ہے، ہر چیز کا اس کے پاس ایک وقت مقرر ہے، (یعنی میت کی زندگی اتنی مقدر تھی) پس صبر اختیار کرو، اور ثواب کی امید رکھو۔(مشکوٰۃ شریف ۱۵۰)

رسولِ خدا علیہ الصلاۃ والسلام کی احادیث اور فقہاء کے فرامین کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ تعزیت محض رواج دنیوی نہیں ہے کہ مرضی کے مطابق کمی بیشی کرتے رہو؛ بلکہ خاص اسلامی تعلیم اور فضیلت و ثواب کا امر ہے، اس کو خصوصی ثواب اور عبادات کے امور کی طرح اسلامی تعلیم اور آنحضرت ﷺ کی سنت کے مطابق عمل میں لانا ضروری ہے، ورنہ بجائے مقبولیت کے مردودیت، اور بجائے ثواب کے عتاب و گمراہی کا کام ہو جائے گا۔

حضرت امام غزالیؒ کا ارشاد ہے: تم کوئی کام بدونِ حکمِ شارع علیہ السلام کے کرو اگر چہ وہ بشکل عبادت ہی ہو، وہ عبادت نہیں؛ بلکہ گناہ ہے۔(مکتوب ۷) حضرت غوث

الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فیصلہ ہے: کوئی قول عمل کے بغیر قبول نہیں، اور کوئی عمل قبول نہیں جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اور سنتِ رسول ﷺ کی اتباع نہ ہو۔ (الفتح الربانی ١٤)

تعزیت کا سنت طریقہ یہ ہے کہ میت کے گھر والوں کے ہاں دعوت اجتماع اور دیگر پابندی رسوم کے بغیر تنہا جائے، آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحینؒ کا یہی طریقہ تھا، لہٰذا جو صورت سوال میں ذکر کی گئی ہے کہ خاص وقت مقرر کر کے اجتماع کیا جائے، اور اس کے لیے بلایا جائے یہ بدعت ہے اور مکروہ ہے۔

زادالمعاد میں ہے: ولم يكن من هديه أن يجتمع للعزاء، ويقرأ له القرآن لا عند قبره ولا غيره، وكل هذه بدعة حادثة مكروهة. یعنی آنحضرت ﷺ کا یہ طریقہ نہیں تھا کہ تعزیت کے لیے جمع ہوں اور قرآن خوانی ہو، نہ قبر کے پاس، نہ کسی اور جگہ، یہ سب باتیں بدعت ہیں، ایجاد کردہ ہیں، مکروہ ہیں۔ (زاد المعاد١/ ١٥٠)

"فتاوی جامع الرموز" میں ہے: ويكره اجتماعهم عنده للتعزية. یعنی تعزیت کے لیے اہل میت کے ہاں اجتماع کرنا مکروہ ہے۔(١/١٢٨، مراقي الفلاح ١٢٠، طحطاوی علی الدر١/٦١٢، شامی ١/٩٤٢)

"شرح سفر السعادة" میں ہے: وعادت نبود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند، وقرآن خوانند وختمات خوانند، نہ بر سر گور، ونہ غیر آں، وایں مجموع بدعت است ومکروہ۔ یعنی آنحضرت ﷺ اور صحابہ وغیرہ سلف صالحینؒ کی یہ عادت نہ تھی کہ میت کے لیے سوائے صلوۃ جنازہ دوسرے کسی موقعہ پر جمع ہوتے ہوں اور قرآن پڑھتے ہوں، نہ قبر پر، اور نہ دیگر کسی مقام پر، یہ تمام رواج ورسوم بدعت اور مکروہ ہیں۔ (شرح سفر السعادة ٢٧٣)

بہت سے مقامات پر گھر کے سامنے شارعِ عام پر فرش یا کرسیاں بچھا کر تعزیت کرنے والوں کے لیے نشست کا انتظام کیا جاتا ہے، اس رسم کی فقہاء نے سخت الفاظ میں تردید فرمائی ہے۔ (فتاوی عالمگیری وغیرہ)

اجتماع کی قید کے بغیر اتفاقاً لوگ کسی وقت جمع ہو گئے، اس میں کسی بزرگ نے حاضرین کے ساتھ مل کر دعا کر لی، یہ مذکورہ رواجوں میں شامل نہیں ہے۔ ریاکاری سے ثواب برباد ہو جاتا ہے۔

مجالس الابرار میں ہے: أما موافقة أهل الدنيا لحاجته عندهم، أو خوف اللوم، أو اتباع العادة، أو نحو ذلك وفساد الكل ظاهر، لأن كل ذلك رياء، والرياء بالعبادة حرام. یعنی دنیاداروں کی اتباع اور پیروی، اور رسم ورواج کے خاطر یا لوگوں کی ملامت سے بچنے کے لیے کوئی کام کیا جائے تو وہ ریاء ہے، اور ریاء عبادت میں حرام ہے۔ (ص ۱۹۔۱۴۱)

شامی میں "معراج الدرایه" شرح هدایه کے مصنف علامہ قیام الدینؒ (المتوفی ۷۴۹ھ) کا قول منقول ہے: وأطال ذلك في المعراج وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء، فيحترز عنها، لأنهم لا يريدون بها وجه الله. یہ سب ناموری اور دکھاوے کے کام ہیں، ان میں للّٰہیت نہیں ہوتی، ان سے احتراز کیا جائے۔ (۱/۸۴۲، از فتاویٰ رحیمیہ ۲/۳۳۰ تا ۳۳۴ مختصراً)

نیز عورتوں کو فقہائے حنفیہ نے نماز کی جماعتوں اور عیدین اور مجالسِ وعظ میں جانے سے منع کیا ہے، اور کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ عورتوں کے لیے مجالسِ وعظ

اور جماعت نماز اور عیدین میں جانا مکروہ تحریمی ہے، جو حرام کے قریب ہے، تو مجالس تعزیت میں سفر کر کے جانے کی اجازت کیونکر ہوگی؟ باوجودیکہ نمازِ پنج گانہ اور عیدین اور جمعہ کی جماعتوں میں رسول خدا ﷺ کے زمانے میں عورتیں جاتی اور شریک ہوتی تھیں، اور یہ جماعتیں فرائض کی جماعتیں ہیں، اور شعائرِ اسلام میں سے ہیں؛ مگر اختلاف زمانہ اور تغیر حالات کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ عظامؒ نے عورتوں کو ان جماعتوں سے روک دیا، اور ائمۂ حنفیہ نے بالاتفاق عورتوں کے جماعت میں جانے کو مکروہ فرمادیا۔ (کفایت المفتی ۵/۳۹۴) تو ہر سمجھ دار شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب فرائض کی جماعتوں کا یہ حکم ہے تو تعزیت کی مجلسوں میں جانا عورتوں کو کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔

(ب) جب یہ اجتماع جائز ودرست نہیں تو اس کو بنیاد بنا کر وعظ کی مجلس قائم کرنے کی اجازت بھی نہیں؛ بلکہ جلسۂ وعظ کے نام سے ان اجتماعات کی ترویج لازم آتی ہے جس کی قباحت ظاہر ہے۔

(ت) اس اجتماع کو منعقد کرنے والوں کی طرف سے قائم کی جانے والی مجلسِ وعظ میں ان کی دعوت پر وعظ کہنے کے لیے نہ جائے؛ البتہ اگر کوئی عالم اپنے طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ارادہ سے وہاں پہنچ کر اس اجتماع کی خرابیوں کو بیان کردے تو محمود ہے؛ لیکن اجتماع بلانے والوں کی دعوت پر جانا یا اس اجتماع کی خرابیوں کو بیان کرنے کے بجائے دیگر امور کو بیان کرنا تو ان کے تعاون کے مترادف ہے۔

(ث) جو اس میں شرکت کرتا ہے وہ گناہ میں بھی شریک ہے۔ من تشبه بقوم فهو منهم، لا تركنوا الى الذين ظلموا، فلا تقعد بعد الذكرىٰ مع القوم الظلمين.

(ج) لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام وفرامین سے واقف کیا جائے، اتباع سنت کی اہمیت وضرورت پر زور دے کر رسم ورواج اور بدعت کی قباحت وبرائی سے ان کو آگاہ کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اذان کے وقت انگوٹھے چومنا

سوال: "أشهد أن محمدا رسول الله" کے وقت شہادت کی انگلی کو آنکھوں سے چومنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اذان واقامت میں "أشهد أن محمدا رسول الله" کہے جانے پر سنت اور عبادت سمجھ کر انگوٹھے چومنا بدعت ہے، نہ سرورِ کائنات ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے، نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظامؒ سے انگوٹھا چومنا ثابت ہے، اور اس سلسلہ میں جتنی روایتیں سرکارِ دوعالم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتیں ہیں، وہ سب بے اصل اور بے بنیاد ہیں۔

شامی میں ہے۔ وذكر ذلك الجراحي، وأطال، ثم قال: ولم يصح في المرفوع من كل هذا شيء. (۲۶۷/۱) یعنی علامہ جراحیؒ نے اس (انگوٹھے چومنے کی) روایت کو ذکر کیا ہے، اور اس پر طویل گفتگو کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی روایت حضور ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

شیخ عجلونیؒ نے بھی اس سلسلہ کی تمام روایتوں کو نقل کرنے کے بعد آخر میں فرمایا ہے کہ: ولم يصح في المرفوع من كل هذا شيء. (كشف الخفاء ۲۷۱/۲)

''امداد الفتاویٰ'' میں ہے: ''اول تو اذان ہی میں انگوٹھے چومنا کسی معتبر روایت

سے ثابت نہیں، اور جو کچھ بعضے لوگوں نے اس بارے میں روایت کیا ہے، وہ محققین کے نزدیک ثابت نہیں؛ مگر اقامت میں کوئی ٹوٹی پھوٹی روایت بھی موجود نہیں، پس اقامت میں انگوٹھے چومنا اذان کے وقت چومنے سے بھی زیادہ بدعت اور بے اصل ہے''۔ (از آداب اذان واقامت ۱۴۰،۱۴۱) اس سلسلہ میں ایک تفصیلی فتویٰ ''فتاویٰ رحیمیہ جلد دوم (۵/۲۵۹) از ۳۰۳ تا ۳۰۷'' موجود ہے، اس کا مطالعہ انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا۔

قبر پر اذان دینا

سوال: قبروں پر اذان دینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مردے کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا بدعت ہے، اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ شامی میں ہے: لا يسن الأذان عند ادخال الميت في قبره، كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة. (۱/۶٦٠) یعنی میت کو قبر میں اتارنے کے وقت اذان دینا مسنون نہیں ہے، جیسا کہ اس کا رواج ہے، علامہ ابن حجرؒ نے اپنے فتاویٰ میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ قبر پر اذان دینا بدعت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب العلم

فتویٰ دینے کا حق کس کو ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے شرعِ عظام مندرجۂ ذیل کے مسئلوں میں کہ:

فتوی نقل کرنا کس کا کام ہے؟ ایک شخص نے صرف معمولی طور پر مخارج قرآن یاد کرر کھا ہے، نہ وہ حافظ ہے اور نہ وہ صاحب سند قاری ہے، نہ وہ عالم؛ البتہ ٹوٹا پھوٹا اردو جان لیتا ہے۔

دوسری شق ایک شخص صرف حافظ وقاری ہے، عالم اور درس نظامی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، کیا ایسے دونوں حضرات اردو فتاویٰ کی کتابوں سے کسی معاملہ میں فتوی نقل کر کے فتوی جاری یا اس کو اختیار کر سکتے ہیں یا کہ نہیں؟ فتوی نقل کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟ ایک شخص ماہرِ علوم شرع ہے، فنِ فقہ، اصولِ فقہ، فنِ حدیث، اصولِ حدیث، فنِ تفسیر، اصولِ تفسیر، فنِ فصاحت و بلاغت، فنِ میراث، فنِ علمِ کلام، علمِ منطق وفلسفہ؛ گویا تمام علومِ نحو، صرف وغیرہ میں بھی مہارت رکھتا ہے اور اس کے نزدیک زمانہ کے علمائے مشاہیر کی جانب سے سند بھی ہے، تو یہ شخص فتاویٰ کی کتب (فتاویٰ دار العلوم قدیم جدید، کفایت المفتی، فتاوی رشیدیہ، فتاوی محمودیہ، امداد الفتاوی، فتاوی رحیمیہ وغیرہ) سے یہ عالم فتاوی نقل کر کے عوام کو بتا سکتا ہے یا کہ نہیں؟ اور فتاویٰ نقل کرنے والا عالم جامع العلوم ہونے کے باوجود ظاہری و باطنی اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی کرتا ہے، جلد جواب مع حوالجات کہ بیان کر کے لکھ دیں، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فتوی دینے کا حق کس کو ہے اور کس کو نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے ”شرح عقود رسم المفتي“ میں فتاوی ابن حجرؒ کے حوالہ سے اصولی بات نقل فرمائی

ہے، اسی کو پیش کرتا ہوں:

وقد رأيت في فتاوىٰ العلامة إبن حجرؒ: سئل في شخص يقرأ ويطالع في الكتب الفقهية بنفسه، ولم يكن له شيخ، ويفتى ويعتمد على مطالعته في الكتب، فهل يجوز له ذلك ام لا؟ فأجاب بقوله لا يجوز له الافتاء بوجه من الوجوه؛ لأنه عامي جاهل، لا يدري مايقول؛ بل الذي يأخذ العلم عن المشائخ المعتبرين لا يجوز له أن يفتى من كتاب، ولا من كتابين؛ بل قال النوويؒ: ولامن عشرة، فإن العشرة والعشرين قد يعتمدون كلهم على مقالة ضعيفة في المذهب، فلا يجوز تقليدهم فيها، بخلاف الماهر الذي أخذ العلم عن أهله، وصارت له فيه ملكة نفسانية، فإنه يميز الصحيح من غيره، ويعلم المسائل، وما يتعلق بها على الوجه المتعمد به، فهذا هو الذي يفتى الناس، ويصلح أن يكون واسطة بينهم وبين الله تعالىٰ، وأما غيره فيلزمه إذا تسور هذا المنصب الشريف التعزير البليغ، والزجر الشديد، الزاجر ذلك لامثاله عن هذا الامر القبيح الذي يؤدى إلى مفاسد لا تحصى، والله أعلم. انتهىٰ. (شرح عقود رسم المفتى ٤٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

مجتہد فیہ امر کے متعلق فتویٰ کے منکر کا حکم

سوال: (۱) ایک شخص نے مجھے سوال کیا کہ عورتیں ایک امام کے پیچھے مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتی ہیں کہ نہیں؟ تو میں نے انکار کیا، تو اس شخص نے کہا

کتابوں میں آتا ہے کہ پہلے صف آدمیوں کی پھر بچوں کی پھر خنثوں کی پھر عورتوں کی، تو عورتوں کو کیوں صف میں شمار کیا؟ تو میں نے اس آدمی سے کہا کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ بات منسوخ ہوگئی، تو اس نے کہا اس وقت کے علماؤں نے یہ ابھی نکالا ہے، تو میں نے کہا کہ یہ بات جو آپ کرر ہے ہیں حضور ﷺ نے خود عورتوں کو منع کر دیا، تو اس آدمی نے کہا کہ حضور ﷺ نے منع کیا ہی نہیں ہے، اور اس کے بارے میں علماؤں نے اپنی طرف سے فتویٰ لگایا ہے، اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں مانتا نہیں ہوں کہ حضور ﷺ نے منع کیا ہے، اور حضور ﷺ کی حدیث ہو، تو کیا اس آدمی پر کافر کا فتویٰ لگا سکتے ہیں؟ خلاصہ لکھیں اور کتاب کے حوالے بھی لکھیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): ایسے آدمی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا، اگر کوئی آدمی کسی فتویٰ کے ماننے سے انکار کرے، اور وہ فتویٰ کسی قطعی چیز کے متعلق نہیں ہے؛ بلکہ کسی مجتہد فیہ امر سے متعلق ہے تو اس کا انکار کفر نہیں۔ (کفایت المفتی ۱/ ۳۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

واقعۂ کربلا کی حقیقت

سوال: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور یزیدی لشکر کے درمیان کربلا کے میدان میں جو کچھ ہوا، یعنی تلواروں کا چلنا، ایک دوسرے پر بڑھ بڑھ کر حملہ آور ہونا، بچوں کا پیاس کی بناء پر دم توڑنا، آپ کا بچوں کے لیے پانی مانگنا، خیموں کا لوٹا جانا، عورتوں کی پریشانی وغیرہ؛ کیا ایسے واقعات کا کھول کھول کر بیان کرنا جمعہ میں یا عید کے مجمع میں، جس کو سن کر عام طور پر لوگ روتے ہیں، علمائے کرام نے منع فرمایا ہے یا کہ نہیں؟ مفصل بیان کریں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے جواب میں ہم کچھ عرض کرنے کے بجائے حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی مدظلھم کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ ''احسن الفتاویٰ'' میں مستقل ایک رسالہ منکراتِ محرم کے نام سے شامل ہے، اس کے ضروری اقتباسات پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:

محرم کی حقیقت اصلاحِ منکرات میں بات یہاں سے چلتی ہے کہ یہ مہینہ معظم ومحترم ہے یا منحوس ہے؟ شیعہ لوگ اس کو منحوس سمجھتے ہیں، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے نزدیک شہادت بہت بری اور منحوس چیز ہے، اور چونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اس میں ہوئی ہے، اس لیے اس میں وہ کوئی تقریب اور خوشی کا کام شادی نکاح وغیرہ نہیں کرتے، اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں یہ مہینہ محترم، معظم اور فضیلت والا ہے، محرم کے معنیٰ محترم، معظم اور مقدس کے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مہینہ کو اس لیے فضیلت ملی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اس میں ہوئی، یہ غلط ہے، اس مہینہ کی فضیلت اسلام سے بھی بہت پہلے سے ہے، بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون سے اس دن میں نجات ہوئی، اس نعمت پر ادائے شکر کے طور پر اس دن میں روزہ رکھنے کا حکم ہوا، اور بھی بہت سی فضیلت کی چیزیں اس میں ہوئی ہیں؛ البتہ یوں کہیں گے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں زیادہ فضیلت اس لیے ہوئی کہ ایسے فضیلت والے ماہ میں ہوئی، جب یہ ثابت ہوا کہ یہ مہینہ اور دن افضل ہے، تو اس میں نیک کام بہت زیادہ کرنے چاہئے. نکاح وغیرہ خوشی

کی تقریبات بھی اس میں زیادہ کرنی چاہئے، اس میں شادی کرنے سے برکت ہوگی؛ لیکن یہ بڑی بات اس لیے کہ بہت دنوں سے یہ غلط باتیں کوٹ کوٹ کر دل میں بھری ہوئی ہیں، سوسال کا رام بھرا ہوا جلدی سے نہیں نکلتا، وہ نکلتے ہی نکلتے نکلتا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت: شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کا حادثہ اگرچہ انتہائی المناک ہے، مگر شیعہ ذہنیت نے اسے حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے، عام مسلمانوں کے اذہان میں یہ غلط بات جما دی گئی ہے، کہ دنیا میں شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ جیسا اور کوئی سانحہ واقع نہیں ہوا؛ حالانکہ اس سے بدر جہا زیادہ مظلومیت کے بے شمار اندوہناک واقعات ہیں: مثال کے طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت دیکھئے، مدافعت پر پوری قدرت کے باوجود ظلم عظیم پر کس قدر صبر واستقامت کے ساتھ جان دے دیتے ہیں، کیا اس کی نظیر کہیں دنیا میں ملتی ہے؟ مگر مسلمان اس خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی بڑی مظلومیت سے اس قدر بے خبر ہے کہ گویا یہ فرش وعرش کو لرزا دینے والا سانحہ واقع ہی نہیں ہوا، کیا آپ نے کبھی کسی زبان کو اس مظلومیت کی داستان بیان کرتے ہوئے کسی کا اس طرف التفات، کسی قلم کو یہ جانفگار حادثہ لکھتے ہوئے، اوراق تاریخ میں اس کی تفصیل دیکھنے کے لیے کسی نگاہ کی توجہ، اس مظلومیت پر کسی دل میں احساس درد اور کسی آنکھ کو کبھی اشکبار دیکھا ہے؟ اس سے بھی بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامِ مبارکہ کا لہولہان ہونا، دانت مبارک کا شہید ہونا، چہرۂ انور کا زخمی ہونا، اور اس سے نہ رکنے والا خون جاری ہونا، انگلی سے خون بہنا اور بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کا شہید ہونا، دنیا بھر کے اولیاء اللہ کا خون نبی کے ایک قطرۂ خون کے برابر نہیں؛ مگر یہاں تو زبان، کان، قلم، نگاہ، دل اور آنکھ سب ایک ہی کرشمہ میں مست ہیں، نہ

کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کی شہادت کسی شمار میں، نہ کسی نبی علیہ السلام کی، غور فرمائیں کہ یہ شیعیت کا زہر نہیں تو اور کیا ہے؟ (۱/ ۳۸۸، ۳۹۰)

شہادت کے قصے سننا اور سنانا: اس مہینہ میں دیگر خرافات کے ساتھ ایک یہ بھی ہے کہ اس مہینہ میں مجلس اور جلسے کئے جاتے ہیں، جن میں شہادت کے قصے سنے سنائے جاتے ہیں، اس میں ایک گناہ تو یہ ہے کہ اہلِ باطل کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے جو شرعاً منع ہے؛ چنانچہ جب دسویں محرم کے روزے کے بارے میں بارگاہِ رسالت میں یہ عرض کیا گیا کہ اس میں یہود روزہ رکھتے ہیں، تو فرمایا کہ ایک روزہ اور ملالو، نویں یا گیارھویں، عبادت میں مشابہت کی اجازت نہ دی .... نیز یہ رونے رلانے کے واقعات جوان مہینوں میں سنائے جاتے ہیں، اکثر غلط ہیں، اس لیے ان کا سننا تو ویسے بھی ناجائز ہے، تاریخ پر اہلِ تشیع کا تسلط، تقیہ باز منافق شیعوں کا مسلمانوں میں گھس کر مَن گھڑت روایات کی اشاعت کرا کر اور مسلمانوں کا آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی محبت وعقیدت کی وجہ سے مظلومیت کی ہر داستان کو صحیح باور کر لینا، یہ ایسے امور ہیں کہ ان کی وجہ سے واقعۂ شہادت کی صحیح حقیقت کا انکشاف ناممکن ہے؛ حتی کہ بظاہر معتبر ومستند کتابوں میں مندرجہ تفاصیل بھی قابل اعتماد نہیں، اکثر روایات آپس میں متضاد اور عقل واصولِ شرع کے خلاف ہونے کی وجہ سے یقیناً غلط ہیں؛ بلکہ نفسِ شہادت کے سوا اس کی تفصیل کا شاید ہی کوئی جزئیہ ایسا ہو جس کی صحت پر پورا اعتماد کیا جا سکے، جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے والوں نے اپنی شقاوت پر پردہ ڈالنے اور حقیقت کو مسخ کرنے کی غرض سے جھوٹی روایات وضع کرنے میں اپنی مخصوص مہارت سے پورا کام لیا ہے۔ (۱/ ۳۹۲، ۳۹۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

یزید کی شخصیت کی تحقیق میں پڑھنا

سوال: (۱) ایک شخص یزید کو حضرت یزید کہتا ہے، اس کے نام کے آگے "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتا ہے اور اسے جنتی کہتا ہے، اور ان سب کے ثبوت میں "بخاری شریف" کی ایک حدیث پیش کرتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میری امت کا وہ پہلا لشکر جو قیصرِ روم کے پایۂ تخت (قسطنطنیہ) میں جنگ کرے گا، اس کی مغفرت فرمادی گئی ہے، اس حدیث کی روشنی میں مذکورہ شخص کہتا ہے کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلے اول جہاد یزید ابن معاویہ نے کیا تھا، اس لیے وہ یعنی یزید ابن معاویہ جنتی ہے، اور اس کی مغفرت بھی ہوچکی ہے، اس لیے عرض خدمت یہ ہے کہ مذکورہ شخص کا کہنا کہاں تک صحیح ہے یا غلط؟ اور وہ جس حدیث کو پیش کرر ہا ہے کیا اس جہاد میں اول یزید ابن معاویہ شریک تھا؟ مستند و معتبر حنفی کتابوں سے جواب عنایت فرمائیں۔

(۲) امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یزید کی حیثیت کیا ہے؟ اس پر لعن طعن کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) یزید کو امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کہہ سکتے ہیں؟ کیا یزید متفقہ طور پر تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یزید کے فسق و فجور کے جانتے ہوئے کیوں خاموش تھے؟ اول امام حسین نے کیوں آواز حق بلند فرمائی؟

(۴) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات میں یزید تھا یا نہیں؟

(۵) واقعاتِ کربلا کن معتبر و مستند کتابوں سے ثابت ہے؛ نیز "ابن خلدون،

تاریخ طبری اور ناسخ التواریخ“کی شرعی وتاریخی حیثیت معتبر ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ نے جن امور کے متعلق دریافت فرمایا ہے وہ ﴿لھا ما کسبت وعلیھا ماا کتسبت﴾ میں داخل ہیں، ہمیں اس کا مکلّف نہیں کیا گیا کہ گڑے مردے اکھاڑیں، ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، وہ جو چاہے کرے، ہمارے عمل وعقیدہ سے جس کا تعلق ہوگا، اسی سے بروز قیامت باز پرس ہوگی۔

محمود احمد عباسی صاحب کی کتاب ”خلافت معاویہ ویزید“ جب شائع ہوئی تھی، تب اس قسم کے سوالات پیدا ہوئے، اوراس زمانہ میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا جاچکا تھا۔ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحبؒ (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) کا ایک مختصر مگر جامع رسالہ ”حقیقت یزید“ کے نام سے، اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا ایک کتابچہ ”شہید کربلا اور یزید“ کے نام سے اسی زمانہ میں شائع ہوچکا ہے، ان دونوں کتابوں کا مطالعہ انشاء اللہ آپ کے تمام سوالات کے حل کے لیے کافی ہوگا۔

اتنا یادرہے کہ اس پُرفتن دور میں جبکہ عوام مسلمین دین اسلام سے برگشتہ ہوتے جارہے ہیں، اوراسلام دشمن طاقتیں اسلام ومسلمین کی بیخ کنی کے لیے متحد ہوکر ایڑی چوٹی کا زور لگارہی ہیں، اس قسم کی بحثوں کو چھیڑنا دین وملت کی کوئی خدمت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

تنبیہ: کتبِ تواریخ کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند ومفتیٔ اعظم پاکستان) نے اپنی تصنیف ”مقام صحابہ“ میں تفصیل سے بحث

فرمائی ہے، اس کا مطالعہ فرمالیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

”دروس التاریخ“ کی ایک عبارت کا حل

سوال: دیگر یہاں ”دروس التـاریخ“ کی تدریسی خدمت احقر کے ذمہ ہے، جس میں احقر کو صفحہ ۶۹ پر ذکر کردہ ۲۷ نمبر کی حدیث ”ظلـم الأجیر أجره من الکبائر“ اور صفحہ ۷۰ پر مذکور ۳۸ نمبر کی حدیث ”في کل ذات کبد حری اجر“ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا ہے، حضرت والا اس کا بھی جواب مرحمت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں گے، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

”ظُلـمُ الأجِیرِ أجرَہ من الکبائر“ ”مزدور کو اس کی مزدوری کم کرکے (گھٹا کر) دینا کبیرہ گناہ ہے“، ظلم مصدر ہے جس کی اضافت مفعول اول کی طرف ہوئی ہے، اور اجرہ اس کا مفعول ثانی ہے۔ ”فـي کـل ذات کبـدٍ حَـرّی اجرٌ“ ہر گرم کلیجہ والے (یعنی ہر جاندار) کے ساتھ بھلائی کرنے میں ثواب ہے، حرّی یہ حرّ کی طرف نسبت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے تابعی ہونے کا ثبوت

سوال: جیسا کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کی صحابہ رضی اللہ عنہم سے

ملاقات نہیں ہوئی، آپ ذرا بتائیں کتاب کا حوالہ دے کر، امام ابوحنیفہؒ کی ملاقات کون کون سے صحابی سے ہوئی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب "تبييض الصحيفة بمناقب ابي حنيفة" میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن الحارث ابن الجزء رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ، وغیرھم سے روایات سنیں۔ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ (صحابی وخادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا ہے، اس کی تصریح ابن سعد صاحب طبقات نے اور حافظ ذہبی نے "تـذكـرة الحفاظ" میں حافظ ابن عبدالبر نے "الانتقاء" میں کی ہے، ان کے علاوہ کئی حضرات محدثینؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے تابعی ہونے کی صراحت فرمائی ہے، مثلاً: حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، حافظ عراقیؒ، حافظ دار قطنیؒ، حافظ ابوالحجاج مزیؒ، خطیب بغدادیؒ، حافظ ابن الجوزیؒ، حافظ سمعانیؒ، علامہ نوویؒ، امام جزریؒ، علامہ بلقینیؒ، علامہ ابن حجر مکیؒ، علامہ قسطلانی وغیرھم۔ (قواعد في علوم الحديث ۳۰۶،۳۰۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب مایتعلق بالقرآن

"یھدی به کثیرا وما یضل" میں ادغام

سوال: نون ساکن وتنوین کے بعد "یرملون" میں سے کوئی حرف آئے تو ادغام ہوتا ہے، "یومن" میں ادغام مع الغنہ ہوتا ہے، اگر نون ساکن اور تنوین کے بعد ان "یرملون" کے حرف پر تشدید نہ ہو تو بھی ادغام ہوگا؟ جیسے ﴿وَیَھْدِیْ بِهٖ کَثِیْراً وَمَا یُضِلُّ بِه﴾ الخ نون تنوین کے بعد واؤ پر تشدید نہیں تو ادغام ہوگا؟۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

﴿وَیَھْدِیْ بِهٖ کَثِیْراً﴾ پر بات مکمل ہو جاتی ہے، اس لیے اس پر وقف کریں گے اور ﴿وَمَا یُضِلُّ بِه﴾ کو از سرِ نو شروع کریں گے، جب درمیان میں وقف ہو گیا، تو اب ادغام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ ادغام مسلسل پڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے اور اسی لیے واؤ پر تشدید نہیں لگائی ہے، اس کے باوجود اگر کوئی آدمی مسلسل پڑھے گا، تو اس کو چاہئے کہ ادغام کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

آیت درود اور درود میں وصل

سوال: یہاں پر آیتِ درود کے وقت درود (جمعہ کے خطبہ میں) زور سے پڑھتے تھے، تو میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ: تسلیما اللّٰھم صل وسلم الخ پڑھنا شروع کر دیا تو جن کو موقع نہ ملا تو انھوں نے مجھے کہا کہ امام صاحب آپ آیت پر رکتے نہیں ہو، میں

نے کہا کہ جمعہ میں انشاء اللہ اس کا مکمل خلاصہ کروں گا، تو الحمد للہ گزشتہ جمعہ میں خلاصہ کرلیا؛ مگر پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ آیت کے ساتھ درود کو ملانے میں کوئی قباحت ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس طرح آیت کا وصل درود شریف کے ساتھ جائز اور درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نابینا کے لیے قرآن پڑھنے کے لیے مخصوص تحریر کا حکم

سوال: اندھوں کے قرآن پڑھنے کے لیے مخصوص تحریر آتی ہے، جس کے حروف عربی نہیں ہوتے، کیا ایسے قرآن کو بغیر وضو پکڑ سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرآن شریف عربی کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے سے قرآنی رسم الخط جو قرآن کا ایک رکن ہے، چھوٹ جاتا ہے، اور تحریف رسمی لازم آتی ہے، جس سے احتراز ضروری ہے، قرآنی رسم الخط قیاسی نہیں ہے۔ بلکہ توقیفی اور سماعی ہے، لوحِ محفوظ میں تحریر شدہ قرآن کے رسم الخط کے مطابق ہے، منزل من اللہ ہے، تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، اعجازی ہے، اس میں قراءتِ سبعہ وغیرہ شامل ہیں، اور ساری قراءتیں جاری کی جاسکتی ہیں، یہ کمال اور خوبی دوسرے رسم الخط میں نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کا اتباع واجب ہے، اور تبدیلی ناجائز اور حرام ہے، اس لیے دوسرے رسم الخط والے قرآن میں تلاوت نہ کرے، اندھے کے لیے زبانی طور پر جتنا یاد کرنا ممکن ہو اتنا سیکھ لینا چاہئے۔ (ماخوذ فتاویٰ رحیمیہ ۱/ ۹۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قرآن کریم کی آیات ورکوعات کی تعداد ورسم عثمانی کی رعایت

سوال: ایک صاحب کوآیات ورکوعات قرآنی کی تعداد میں اشکال ہے، اشکال کی نوعیت یوں ہے۔

(۱) آیات قرآنی عوام الناس کے درمیان مشہور ۶۶۶۶ ہیں، حالانکہ تحقیق اس کے خلاف ہے اور وہ یہ کہ کل آیات ۶۲۳۶ ہیں۔

(۲) رکوعات قرآنی مشہور ۵۴۰ ہیں؛ حالانکہ تحقیق اس کے خلاف ہے اور وہ یہ کہ کل رکوعات ۵۵۷ ہیں۔

(۳) قرآن کریم کے شروع کے قریب قریب تین پاروں میں ہر جگہ لفظ "ابرٰھم" (بقرہ آیت ۱۲۴) لکھا ہے، بعدازاں چوتھے پارے سے لے کر جہاں جہاں مذکورہ لفظ آیا ہے وہاں بشکل "ابراھیم" لکھا ہے، یعنی یاء کے ساتھ لکھا ہے، یہ فرق کیوں ہے؟ مذکورہ بالا مسائل کا تشفی بخش کافی وشافی مدلل جواب تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

نوٹ: سائل نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ مذکورہ اشکالات کے جوابات فلاں فلاں اہل علم سے دریافت کئے تھے؛ مگر تشفی بخش جوابات نہ ملے؛ نیز استفتاء میں غیر مناسب الفاظ بھی مرقوم تھے، استفتاء میں ان تمام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے ان سوالات کا تعلق فنون قرأت سے ہے، یہ وہ علوم وفنون ہیں جن میں ہمارے اسلاف کی ایک جماعت نے زندگیاں کھپا دیں، ان موضوعات پر تصانیف کا ایک مستقل ذخیرہ چھوڑا ہے؛ لیکن آج وہ ہماری غفلت کا شکار ہے، آپ کے سوالات

کے جوابات دینے سے پہلے چند باتیں بطور تمہید پیش کرتا ہوں؛ تا کہ جواب آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

(الف) قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ میں پورا نازل نہیں ہوا؛ بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لیے عہد رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اس کو کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کرلیا جائے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں یہ امتیاز عطا فرمایا تھا کہ اس کی حفاظت قلم اور کاغذ سے زیادہ حفاظ کے سینوں سے کرائی جائے، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے فرمایا "ومنزل عليك كتابا لا يغسله الماء" (یعنی میں آپ پر ایسی کتاب نازل کرنے والا ہوں جسے پانی نہیں دھو سکے گا) مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام کتابوں کا تو حال یہ ہے کہ وہ دنیوی آفات کی وجہ سے ضائع ہوجاتی ہیں؛ چنانچہ تورات، انجیل اور دوسرے آسمانی صحیفے اسی طرح نابود ہوگئے؛ لیکن قرآن کریم کو سینوں میں اس طرح محفوظ کردیا جائے گا کہ اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ابتداء اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ اس کے الفاظ کو اسی وقت دہرانے لگتے تھے؛ تا کہ وہ اچھی طرح یاد ہوجائیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿لا تحرك به لسانك لتعجل به، ان علينا جمعه وقرانه﴾ ان آیات میں یہ بات واضح کردی گئی کہ قرآن کریم یاد رکھنے کے لیے آپ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ

نزول وحی کے بعد آپ اسے بھول نہ سکیں گے؛ چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپ ﷺ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں، ادھر آپ ﷺ کو یاد ہوجاتیں، اس طرح سرکار دوعالم ﷺ کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب سے محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنی غلطی یا ترمیم وتغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ ﷺ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان المبارک کے مہینہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس سال دو مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا، پھر آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم کے صرف معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے؛ بلکہ انہیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، سیکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کردی تھی؛ غرض ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لیے بنیادی طریقہ یہی اختیار کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد کرایا گیا، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لیے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لیے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لیے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوسکتی تھی، اور نہ اس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں؛ بلکہ اپنے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے

تھے، اس لیے قرآن کریم کی حفاظت میں اس قوت حافظہ سے کام لیا گیا، اوراسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اورسورتیں عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئیں۔

حفاظت قرآن کا اصل مدار تو اگرچہ حافظہ پر تھا؛ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا، اس سلسلہ میں آپ ﷺ کے طریق کار کی تفصیل طبرانی کی روایت میں موجود ہے، کتابت وحی کا یہ کام مختلف حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ لیا جاتا تھا، جن میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سرفہرست ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ ﷺ کاتب وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھا جائے؛ چنانچہ وہ آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا تھا، اس زمانہ میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لیے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں؛ البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں، لیکن آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوتے تھے، کوئی آیت چمڑے پر، کوئی ہڈی پر، کوئی پتھر کی سل پر- کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں، اور کسی کے پاس صرف چند آیات- اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ کارنامہ اس وقت انجام دیا جب کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہوگئی؛

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے یہ کام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیا، (بخاری شریف میں اس کی تفصیل موجود ہے) حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بڑی احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا؛ لیکن ہر سورت علیحدہ صحیفہ میں لکھی گئی، اس لیے یہ نسخہ بہت سے صحائف پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "ام" کہا جاتا ہے، یہ نسخہ تیار ہونے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، ان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، اوران کی شہادت کے بعد ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں میں پہنچ گیا، اوراس زمانہ کے دستور کے مطابق ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی، اور چونکہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قرأتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لیے ہر صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں کو اسی قرأت کے مطابق قرآن پڑھایا جس کے مطابق خود انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا، اس طرح قرأتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی نہیں پیدا ہوئی؛ لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قرأت کو صحیح اور دوسرے کی قرأت کو

غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قرأتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم میں ایسا کوئی معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لیے حجت بن سکے؛ کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اوران میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہ تھا، اس لیے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دئے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اورانہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قرأت صحیح اورکونسی غلط ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اس کی تفصیل بڑی طویل ہے، مختصر یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے تیارکرائے ہوئے جو صحائف موجود تھے اور محفوظ تھے، وہ منگوائے اورچار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بنائی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اورحضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ، ان کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحائف سے نقل کرکے کئی ایسے صحائف تیارکریں، جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ان کی مدد کے لیے ساتھ لگادیا گیا، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلہ میں مندرجۂ ذیل امورانجام دیے:

(۱) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جونسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں؛ بلکہ ہرسورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب

کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرائتیں سما جائیں، اسی لیے ان پر نہ نقطے لگائے گئے، اور نہ حرکات (زبر، زیر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قرائتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً ”نـنشـزھـا“ لکھا تاکہ اسے نَنْشُزُهَا اور نُنْشِزُهَا دونوں طرح پڑھا جاسکے؛ کیونکہ یہ دونوں درست ہیں۔

(۳) ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، ابوحاتم سجستانیؒ کا ارشاد ہے کہ: کل سات نسخے تیار کئے گئے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقہ سے لکھنا جائز نہیں؛ چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی؛ لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیروزبر اور پیش سے خالی تھے، اس لیے اہل عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے؛ تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کرسکیں، اس مقصد کے لیے بعد کے زمانوں میں مختلف اقدامات کئے گئے، اس میں روایتیں مختلف ہیں کہ قرآن کریم کے نسخہ پر سب سے پہلے

کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے ابوالاسود دئلی نے انجام دیا، بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلقین سے کیا، نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زبر، زیر، پیش) بھی نہیں تھیں، اوراس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دئلی نے انجام دیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن کریم ختم کرلیا کرتے تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کررکھی تھی، جسے منزل کہا جاتا ہے، اس طرح قرآن کریم کو سات منزلوں پر تقسیم کیا گیا، آج کل قرآن کریم تیس (۳۰) اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں؛ بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لیے آسانی کے خیال سے تیس (۳۰) مساوی حصوں پر تقسیم کردیا گیا، یہ تقسیم بھی عہد صحابہ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لیے کی گئی ہے۔ایک اَور علامت جس کا رواج بعد میں ہوا اورآج تک جاری ہے، رکوع کی علامت ہے، اوراس کی تعیین معنیٰ کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام ختم ہو وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ''ع'') بنادی گئی، جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے کی اور کس دور میں کی؟

(بندہ عرض کرتا ہے کہ یہ رکوع والی علامت عموماً صرف ان مصاحف میں پائی جاتی ہے، جو بلادِ عجم میں طبع ہوتے ہیں، بلادِ عرب میں طبع شدہ مصاحف عموماً اس سے خالی ہوتے ہیں۔)

(ب) تلاوت کی سہولت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متعدد قرأتوں میں نازل فرمایا تھا، قرأتوں کے اس اختلاف سے آیات کے مجموعی معنی میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی؛ لیکن تلاوت اور اس کی ادئیگی کے طریقوں میں فرق ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو آسانی پیدا ہوگئی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تیار کردہ مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے اس لیے خالی رکھا گیا تھا؛ تاکہ اس میں تمام مسلّم قرأتیں سما سکیں، چنانچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مصاحف عالم اسلام کے مختلف خطوں میں روانہ کئے تو ان کے ساتھ ایسے قراء کو بھی بھیجا، جو ان کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قرأت کے مطابق لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قرأتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قرأتوں کو یاد کرنے، اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں، اور اس طرح علم قرأت کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطہ کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لیے ائمہ قرأت سے رجوع کرنے لگے۔ (ماخوذ از علوم القرآن باب پنجم تاریخ حفاظت قرآن مؤلفہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ملخصاً)

(ج) قرآن کریم کی آیات کی تعداد میں حضرات قراء میں اختلاف ہے، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں مستقل عنوان سے اس پر تفصیلی بحث فرمائی ہے، شیخ عبدالعظیم زرقانیؒ نے "مناھل العرفان" میں اس کا خلاصہ تحریر فرمایا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: کہ تعداد آیات کے سلسلہ میں تمام قراء اتنی بات پر تو متفق ہیں کہ وہ چھ ہزار دو سو سے کچھ اوپر ہیں، آگے اس اوپر والی تعداد میں اختلاف ہے، قرائے کوفہ

کے نزدیک وہ تعداد ۳۶ ہے، قرائے بصرہ کے نزدیک ۵ ہے، اہل مکہ کے نزدیک ۲۰ ہے، اہل مدینہ کا پہلا قول ۱۷ کا ہے، اور دوسرا قول ۱۴ کا ہے۔(مناهل العرفان جلد۱/۳۳۶)

علامہ سیوطیؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول چھ ہزار چھ سو سولہ (۶۶۱۶) کا بھی نقل کیا ہے۔(الاتقان فی علوم القرآن ۱/۸۹)

علامہ شمس الحق افغانیؒ نے اپنی کتاب ''علوم القرآن'' میں مولانا عبدالصمد کی ''تاریخ القرآن'' اور ابن جوزی کی ''فنون الا فنان'' کے حوالہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) نقل فرمایا ہے۔(علوم القرآن افغانی ۱۴۳)

تعداد آیات قرآنی کے سلسلہ میں حضرات قراء میں جو اختلاف پیش آیا اس کی وجہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے؛ تاکہ غلط فہمی سے کوئی اشکال پیدا نہ ہو، اور یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اس اختلاف کے باوجود قرآن کریم میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، نبی کریم ﷺ بوقت تلاوت ختم آیات پر وقف فرماتے تھے؛ تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہاں آیت ختم ہوئی، جب وہ حضرات اس سے واقف ہوجاتے تو آنحضرت ﷺ معنوی مناسبت کی رعایت فرماتے ہوئے ایک آیت کو بعد والی آیت سے ملا کر تلاوت فرماتے، اس کی وجہ سے بعض حضرات یہ سمجھتے کہ جہاں آپ ﷺ پہلے ٹھہرے تھے، وہاں آیت مکمل نہیں ہوئی، اور بعد والی کے ساتھ ملا کر ایک آیت شمار کرتے، جب کہ بعض دونوں کو مستقل آیت قرار دیتے، مثلاً قرائے کوفہ نے ''الٓمٓ'' جس سورت کے بھی شروع میں آیا ہے اس کو مستقل آیت شمار کیا، جب کہ دیگر قراء نے مستقل آیت قرار نہ دیتے ہوئے بعد والی آیت کے ساتھ ملا کر اس کا جزء قرار دیا، اسی اصول کے پیش نظر سورہ بقرہ کے شروع میں ﴿الٓمٓ.

ذلك الكتاب لا ريب فيه، هدى للمتقين﴾ قرائے کوفہ کے نزدیک دو مستقل آیتیں ہیں، جب کہ دیگر قراء کے نزدیک دونوں ملا کر ایک آیت ہے، یا مثلاً ﴿حٰمٓ. عٓسٓقٓ﴾ کو قرائے کوفہ نے دو آیت شمار کیا ہے، جب کہ دوسرے حضرات نے اس کو مستقل آیت نہیں مانی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سورۂ شوریٰ کے شروع میں ﴿حٰمٓ. عٓسٓقٓ. كذلك يوحي اليك والى الذين من قبلك الله العزيز الحكيم﴾ قرائے کوفہ کے نزدیک تین مستقل آیات ہیں، جب کہ دیگر حضرات کے نزدیک یہ تمام ملا کر صرف ایک آیت ہوئی۔ (ماخوذ از الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی)

اب میں آپ کے سوالات کا بالترتیب جواب دیتا ہوں۔

(۱) جیسا کہ تمہید جواب میں واضح کیا جا چکا کہ آیات کی تعداد میں اختلاف ہے، ساتھ ہی عوام کے درمیان جو تعداد ٦٦٦٦ کی مشہور ہے، وہ قرأت متواترہ میں نہیں ہے، ایک ضعیف روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہے، آپ نے ہمارے یہاں (براعظم ہندو پاک میں) رائج قرآن کریم نسخوں سے جو تعداد جمع کی ہے (٦٢٣٦) یہ وہی تعداد ہے جو قرائے کوفہ کے نزدیک ہے؛ چونکہ ہمارے علاقہ میں حضرت امام عاصمؒ کی قرأت رائج ہے، اور ان کا شمار قرائے کوفہ میں ہے، اس لیے یہ تعداد ان کی تعداد کے موافق ہوئی۔

(۲) رکوع کی علامت کے سلسلہ میں تمہید جواب میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعینؒ کے زمانہ کے بعد اہل عجم کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کو آسان کرنے کے لیے جو اقدامات کئے گئے ان میں سے ہے، اور رکوع والی اس علامت کے متعلق تو حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے تصریح فرمائی ہے کہ: باوجود تفتیش کے یہ معلوم نہ

ہوسکا کہ اس کی ابتداء کب ہوئی اور کس نے کی؟ اور جیسا کہ بندہ نے عرض کیا کہ یہ علامت بلادعجم میں طبع شدہ مصاحف میں عموماً ہوتی ہے، بلاد عرب کے مصاحف میں نہیں، تو اگر اس کی تعداد میں کوئی اختلاف وفرق بھی ہو تو چنداں قابل تعجب نہیں۔

نوٹ:- بندہ نے بلادعجم میں طبع شدہ مصاحف والی جو بات عرض کی ہے اس پر خادم الحرمین ملک فہد کے مطابع میں طبع شدہ حالیہ ان مصاحف سے اعتراض نہ ہو، جو ہند و پاک و بنگلہ دیش والوں ہی کے لیے طبع ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہیں سے جو مصاحف اہل عرب کے لیے طبع شدہ ہیں، ان میں یہ علامت نہیں ہے۔

(۳) تمہید جواب میں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقہ سے لکھنا جائز نہیں ہے، اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے اس رسم الخط میں آیات قرآنی اس طرح لکھی گئی ہیں کہ تمام متواتر قرأتیں اس میں سما جائیں، لفظ "ابـرٰهـم" مصحف عثمانی میں سورۂ بقرہ میں جتنی جگہ آیا ہے اس طرح بغیر یاء کے آیا ہے، اور سورۂ بقرہ کے علاوہ دیگر تمام مواقع میں "ابراهیم" یاء کے ساتھ آیا ہے، اس لیے ہمارے لیے بھی اس کی پابندی ضروری ہوئی۔

رہا یہ سوال کہ خود رسم عثمانی میں فرق کیوں کیا گیا تو اس کا جواب بھی وہی ہے کہ سورۂ بقرہ میں واقع "ابـرٰهـم" کی قرأت میں اختلاف ہے، ابن عامر سے ابن ذکوان کی روایت میں "ابـراهام" پڑھا گیا ہے جب کہ دیگر قرائے کرام "ابـرٰهیم" پڑھتے ہیں اس لیے اس کو اس طرح لکھا گیا کہ دونوں قرأتیں سما جائیں۔ "ابراهام" "ابرٰهیم" سورۂ بقرہ میں ابـرٰهـم چودہ مواضع پر آیا ہے۔ (آیت نمبر ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳،

۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۲۵۸، ۲۵۸، ۲۵۸، ۲۶۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایک ضروری نوٹ: مفتی کا دائرہ علم فقہ تک محدود ہے، اور سوال میں دریافت طلب امور کا تعلق علم فقہ سے نہیں ہے؛ بلکہ علم قرأت سے ہے، اس لیے اگر کسی مفتی نے ان سوالات کے جوابات نہیں دیے تو وہ قابل ملامت یا قابل اعتراض نہیں ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ مفتی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر بات کا جواب دے، خصوصاً جب کہ اس کا تعلق عمل سے نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ بعض سوالات اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس فن کی مبادیات اور ضروری باتوں سے سائل واقف نہ ہو اس عدم واقفیت کے ساتھ لم دریافت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بچہ بلوغ کی کیفیت دریافت کرے، اگر کسی ڈاکٹر سے علاج کی کوئی لم دریافت کی جائے تو آپ کس جواب کی امید رکھتے ہیں؟ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ

بوسیدہ قرآنی اوراق کو دفن کرنا

سوال: قرآن کے پرانے کاغذات کو کیا کیا جائے؟ کیا جلا سکتے ہیں جبکہ جلانے میں توہین ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

پاک کپڑے میں لپیٹ کر زمین میں گڑھا کھود کر اس میں رکھ دیے جاویں، اور پھر لکڑی وغیرہ سے اس پر چھت جیسا بنانے کے بعد مٹی سے بند کر دیں۔ (شامی ۵/۲۹۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

باب مایتعلق بالحدیث

حنفی کا شوافع کی حدیثوں پر عمل کی خواہش کرنا

سوال: میں حنفی مسلک کا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کی حدیثوں پر میرا عمل ہو، تو کیا میں شوافع کی حدیثوں پر عمل کرسکتا ہوں؟ جبکہ ان کی حدیثیں بھی ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دو حدیثوں میں تعارض ہونے کی صورت میں ہر حدیث پر آپ کیسے عمل فرمائیں گے؟۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

"المؤمن في المسجد كالسمك في الماء" اور "الفاسق في السوق كالطير في القفص" حدیث کی تحقیق

سوال: محترم المقام، لائقِ صد احترام مولانا مفتی صاحب

باعثِ تحریر یہ ہے کہ "المؤمن في المسجد كالسمك في الماء" اور "الفاسق في السوق كالطير في القفص" یہ دونوں جملے کیا کسی حدیث سے ثابت ہیں؟ یا یوں ہی کسی بزرگ کے قول ہیں، یا کہ ضرب المثل میں سے ہیں، مع حوالۂ کتب جلد از جلد روانہ فرمائیں، اس سلسلہ میں ہمارے یہاں بہت بڑا تنازع پیدا ہوا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تتبع اور تلاشِ بسیار کے باوجود مسئولہ عبارت کا حدیث ہونا کسی کتاب میں نہیں ملا، کتبِ موضوعات میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ہے؛ البتہ اس کا دوسرا جملہ کچھ تغیر کے ساتھ یعنی "المنافق في المسجد كالطير في القفص" حضرت نزال بن سبرہ رضی اللہ عنہ (جن کا

صحابی ہونا مختلف فیہ ہے) کی طرف منسوب ملا، جس کی تصریح "تنبیہ الغافلین"میں ہے:

وقال النزال بن سبرة رضي الله عنه: "المنافق في المسجد كالطير في القفص" (تنبيه الغافلين ١١٥)

اس میں تنازع کی ضرورت نہیں ہے، اگر کوئی اس کے حدیث ہونے کا مدعی ہے تو اس سے اس کی دلیل طلب کی جائے، اور کوئی اس کے کسی بزرگ کا مقولہ ہونے کا قائل ہے تو اس سے بھی دلیل کا مطالبہ کیا جائے، اس لیے کہ حوالہ مدعی کے ذمہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، مؤرخہ: ۸/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

ایک درود شریف کی تحقیق

سوال: کیا یہ درود حدیث پاک سے ثابت ہے: "صَلاَةً وَّسَلاَماً عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه" کیا آپ ﷺ کی قبر اطہر پر پڑھ سکتے ہیں؟ کیا اس کا ثبوت کسی امام کے نزدیک ہے یا حرف ندا حاضر کے لیے، مگر ہم حضور کہتے ہیں اس کا معنی حاضر کا ہوا؟ تو کیا حضور کہہ سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سوال میں مذکور الفاظ کے ساتھ احقر کی نظر سے نہیں گزرا، ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس کو درست قرار دینے کے لیے بھی مقدر ماننا پڑے گا، کسی امام سے بھی اس کا منقول ہونا میرے علم میں نہیں، قبر اطہر پر پڑھنے کی گنجائش ہے؛ البتہ وہاں بھی ان الفاظ میں پڑھنا مناسب ہے جو علمائے کرام نے آدابِ زیارت کے تحت بیان فرمائے ہیں، اردو زبان میں حضور کا لفظ تعظیم وعزت کا لقب ہے، جیسے: حضرت کا لفظ، اس لیے بول سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتاب السلوک والإحسان

مرشد کے پانچ شرائط، مرشد کا مریدہ کے گلے ملنا

سوال: ایک شخص پیر و مرشد ہے اور اس کے چہرے سے سنت رسول ﷺ غائب ہے، کیا ایسا شخص پیر و مرشد ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور پیر صاحب اپنے مریدین کے گھر جاتے ہیں، تو عورت اور مردان کے ہاتھ اور پیشانی کو بوسہ دیتے ہیں اور گلے ملتے ہیں، عورتوں کا کسی غیر محرم سے گلے ملنا کیسا ہے؟ اور مرد وعورت دونوں کا پیر چھونا کیسا ہے؟ اور اس سنت رسول ﷺ سے محروم پیر و مرشد کے بارے میں مفتیانِ دین کیا فرماتے ہیں؟ آپ سے میری دردمندانہ درخواست ہے کہ آپ کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کو سمجھائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فتاویٰ عزیزی میں لکھا ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ مرید ہونا اس سے درست ہے جس میں پانچ شرطیں پائی جاتی ہوں: (۱) کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا علم رکھتا ہو، خواہ پڑھ کر، خواہ کسی عالم کی صحبت میں رہ کر اس سے سن کر یاد کیا ہو۔ (۲) عدالت وتقویٰ کے ساتھ موصوف ہو، کبائر اور صغائر پر اصرار سے باز رہتا ہو۔ (۳) دنیا سے بے رغبت اور آخرت میں راغب ہو، طاعاتِ مؤکدہ اور صحیح احادیث میں وارد شدہ اذکار کا پابند ہو۔ (۴) اچھائیوں کا حکم کرتا ہو، برائیوں سے روکتا ہو۔ (۵) مشائخِ سلسلہ کی خدمت میں ایک مدت رہ کر سلوک سیکھا اور اجازت حاصل کی ہو۔ جس میں یہ پانچ شرطیں پائی جاویں، اس سے بیعت ہونا درست ہے۔ (فتاوی عزیزی ۲/۱۰۲)

داڑھی منڈانا یا اس طرح کتروانا کہ ایک مشت سے کم رہ جائے حرام ہے اور اس کا مرتکب فاسق ہے۔ غیر محرم عورتوں سے گلے ملنا حرام ہے، ایسا شخص فاسق ہے، اس

سے بیعت ہونا ناجائز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی اجنبی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا، کسی عورت کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر بیعت نہیں فرمایا۔ (فتاوی محمودیہ ۱/۱۳۲،۱۳۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

لفظ عشق ومحبت کا استعمال

سوال: لفظ عشق اور محبت میں کیا فرق ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ جل شانہ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے لفظ عشق استعمال کرتے ہوئے یوں کہنا صحیح ہے کہ ہمیں اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ عشق ہے؟ کیا قرآن وحدیث میں لفظ عشق کو اللہ ورسول ﷺ کے لیے استعمال کیا گیا ہے؟ کیا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس لفظ عشق کو اللہ ورسول ﷺ کے لیے استعمال کیا؟ حالانکہ عشق (س) اور حب (س) دونوں عربی کے الفاظ ہیں، باوجود اس کے حب کا لفظ قرآن وحدیث میں بکثرت ملتا ہے تو لفظ عشق کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

عشق کا لفظ وفورِ محبت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "المعجم الوسيط" میں ہے: عشِقه عِشْقا، وعَشَقاً ومَعْشَقاً، أحبه أشد الحب فهو عاشق (٦٠٣)

''قاموس'' میں ہے: العشق، المعشق كمقعد عجب المحب المحبوبه أو افراط الحب. (۱۳/۷ تاج العروس)

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ (خلیفہ حضرت اقدس حکیم الامت تھانویؒ) فرماتے ہیں: محبت جب شدت پکڑ لیتی ہے تو اسی کا نام عشق ہے۔ (معرفت الٰہیہ ۱۶۵)

قرآن میں تو لفظ عشق آیا ہی نہیں ہے، چاہے اللہ تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کے لیے ہو، یا دوسروں کے لیے، اور حدیث صحیح میں بھی بقول علامہ ابن قیمؒ لفظ عشق وارد نہیں ہوا ہے۔ولا يحفظ عن رسول الله ﷺ لفظ العشق في حديث صحيح البتة. (زاد المعاد ۳۲۵/۳) رہا صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے اس کا خدا اور رسول ﷺ کے حق میں استعمال، تو اس کا جواب اثبات ونفی میں دشوار ہے، اثبات میں تو اس لیے کہ میرے علم میں ایسا استعمال نہیں ہے، اور نفی میں اس لیے کہ اس کے لیے استقراءِ تام کی ضرورت ہے، جو احقر کو حاصل نہیں ہے۔

اب یہ سوال کہ اس لفظ کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے حق میں استعمال کرنا کیسا ہے؟ تو عربی زبان میں اس کا استعمال خدا اور رسول ﷺ کے حق میں میری نظر سے نہیں گزرا، باری تعالیٰ کے حق میں اس لفظ کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ نے اختلاف نقل کیا ہے۔وقد اختلف الناس هل يطلق هذا الاسم في حق الله تعالىٰ؟ فقالت طائفة من الصوفية: لا بأس بإطلاقه، وذكروا فيه اثراً لا يثبت، وفيه فإذا فعل ذلك عشقني وعشقته. وقال جمهور الناس: لا يطلق ذلك في حقه سبحانه وتعالىٰ فلا يقال إنه يعشق، ولا يقال عشقه عبده، ثم اختلفوا في سبب المنع على ثلاثة أقوال: أحدها عدم التوقيف بخلاف المحبة. الثاني: أن العشق إفراط المحبة ولايمكن ذلك في حق الرب تعالىٰ .... الثالث: أنه مأخوذ من التغير كما يقال للشجرة المذكورة عاشقة، ولا يطلق ذلك على الله سبحانه وتعالىٰ. (روضة المحبين ۲۸، ۲۹ بيروت)

البتہ فارسی اور اردو زبانوں میں بزرگوں کے کلام میں اس لفظ کا استعمال خدا ورسول ﷺ کے حق میں کیا گیا ہے، مثلاً فارسی میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے دو شعر مشہور ہیں۔

عشق باحی وباقیوم دار		عشق بامرد نباشد پائیدار
عشق مولی کے کم از لیلیٰ بود		گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں کئی جگہ یہ شعر ملتا ہے۔

ہرچہ جز عشق خدائے احسن است		گر شکر خوردن بود جان کندن است

(مکتوبات دفتر اول مکتوب نمبر ۳۷، ومکتوب نمبر ۸۳، ومکتوب نمبر ۱۳۳)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ایک قصیدہ نعتیہ عربی زبان میں ہے اور اس کی شرح وترجمہ فارسی زبان میں خود حضرت موصوف کا ہے، اس میں فرماتے ہیں: فصل دہم در بیانِ عشقِ آنجناب ﷺ (أطيب النغم في مدح سيد العرب والعجم ٢٠)

آگے اسی قصیدہ کے ایک شعر "سأذكر حبي للحبيب محمد، إذا وصف العشاق حب الحبائب. کا ترجمہ فرماتے ہیں یعنی بیان خواہم کرد عشق خود را بہ نسبت آنحضرت ﷺ؛ وقتیکہ بیان کنند عاشقاں دوستیٔ معشوقہا را۔ (۲۱) اسی قصیدہ کا آخری شعر اور اس کا ترجمہ وتشریح حضرت موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے: وليس ملوما عيّ صب أصابه، غليل الهوى في الاكرمين الأطائب. یعنی نیست ملامت کردہ شد، زبان بند شدن عاشقی، کہ رسیدہ باشد اورا سوزشِ عشق در مدح بزرگاں وپاکاں، ودریں بیت اشارست بختم سخن، وعجز ادائے مدح کہ لائق آنجناب باشد بدو سبب: یکے آنکہ عشق

مقتضی سکوت است، دیگر آنکہ مدحِ بزرگاں و پاکاں را پایانی نیست۔ (۳۲)

اسی طرح اردو زبان میں بھی علمائے حقہ کی تصانیف اوران کے کلام میں اس لفظ کی نسبت خدا اور رسول کی طرف موجود ہے، جو آپ کی نظر سے بھی گذری ہوگی، پھر بھی ایک دو نمونے پیش کرتا ہوں: حضرت اقدس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ایک قصیدہ نعتیہ جو ''قصیدۂ بہاریہ'' مشہور ہے، اس میں یہ اشعار بھی ہیں:

وہ تیرِ غم عشق کا مرے دل میں ہزار پارہ ہو		دل خون دل میں ہوسہ شار
لگے وہ آتش عشق اپنی جان میں جس کی		جلا دے چرخ ستمگر کو ایک ہی جھونکا
تمھارے عشق میں رو رو کے ہوں نحیف		اتنا کہ آنکھیں چشمۂ آبی سے ہوں دروں غبار

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ اپنے پیرومرشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے نقل فرماتے ہیں: حضرت مرشدیؒ نے فرمایا تھا کہ ''اٰمَنَّا'' معنی میں ''عشقنا'' کے ہے، اب سوال یہ ہے کہ پھر ''عشقنا'' کیوں نہیں فرمایا؟ تو بات یہ ہے کہ لفظ عشق چونکہ شعرائے عرب میں نفسانی محبت کے لیے مستعمل ہوتا تھا، اس لیے حق تعالیٰ نے اس کو شدتِ محبت سے تبدیل فرما کر ﴿اشد حبا للّٰہ﴾ فرمادیا۔ (معرفت الٰہیہ ۱۶۵)

نیز صوفیاء کے یہاں عشق کی دو قسمیں حقیقی اور مجازی معروف ہیں اور عشق حقیقی میں اس لفظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف بھی ہوتی ہے، اب اگر فارسی اور اردو میں اس لفظ کا استعمال خدا اور سول ﷺ کے حق میں کیا جائے، تو شرعاً کوئی ممانعت نہیں؛ بلکہ جائز ہے، اس لیے کہ یہ ممکن: بلکہ واقع ہے کہ کوئی لفظ اصالۃً جس زبان سے آیا ہے، اس میں اس کا استعمال ایک معنی میں ہو اور دوسری زبان میں منتقل ہونے کے بعد دوسرے معنی میں

بھی مستعمل ہوتا ہے، یا سابقہ معنی میں تعمیم یا تخصیص ہوگئی ہو، اس لیے کہ اس کا مدار استعمال اور اصطلاح پر ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: والشيء إذا انقطع رواجه في الناس لا تكاد تدري حقيقته، كالليف، فإنه غير مستعمل في الحشو في ديارنا، فتحير في حقيقته بعضهم وحقيقته هذا. (درخت کھجور کے ساتھ ایک جالی ہوتی ہے، اسے کاٹ کر تکیہ میں بھرتے ہیں) وكذلك يشكل الامر عند تبدل الاصطلاح كالجيب فإنه عند العرب بمعنى (گریبان) وفي أهل الهند بمعنى (کیسہ)۔ وكالخف فإنه عند العرب من الجلد، وترجمته فى الفارسية (موزہ) مع أنه في اصطلاحنا يكون من الكرباس، ولا يقطع فيه السفر؛ بل يستعمل لحفظ الرجل من القر، والحر، والغبار، والتراب، وغيرها. وكالقميص فإنها عند العرب ثوب سابغ يضرب الكعبين، وفي ديارنا قصير جداً يضرب الفخذين، ومن لايدرى الاصطلاحين يظن أن قميص صحابة النبي ﷺ أيضا كان إلى الفخذين. (فيض البارى ٤/٣٧٥)

استعمال و اصطلاح بدل جانے سے حکمِ شرعی بدل جانے کی کئی مثالیں کتب فقہ میں موجود ہیں، علامہ شامیؒ نے اپنے رسالہ "نشر العرف" میں اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کسی عمل کے ثواب پر خوشی حظ نفس نہیں

سوال: بعد سلام عرض یہ ہے کہ قاری محمد طیب صاحبؒ نے لکھا ہے خطبات میں

کہ عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لیے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے: ایک اخلاص، یعنی: خالص اللہ کے لیے ہو، ریاء یا شہرت کے لیے نہ ہو، اور حظ نفس کے لیے بھی نہ ہو، تو حظ نفس کا معنیٰ لکھیں کہ حظ نفس سے کیا مراد ہے؟ اور اگر کوئی انسان اعمال کرے اور اس کے اوپر جو اجر وثواب آخرت میں ملنے والا ہے اس کے اوپر خوش رہے، تو اس کا یہ اجر وثواب پر خوش رہنا حظ نفس میں داخل ہے یا نہیں؟ یعنی آخرت والے اعمال کے کرنے پر خوش رہے تو یہ حظ نفس میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آخرت کا اجر وثواب شرعاً مطلوب ہے، اور انسان اس کی تحصیل کا مامور ہے، اس لیے اعمالِ آخرت کے اپنے ذریعہ ہونے پر خوش ہونا حظ نفس نہیں؛ بلکہ علامتِ ایمان ہے۔ عن أبي أمامة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل ما الإيمان؟ فقال من سرته حسنته، وساءته سيئته فهو مومن. (رواه الحاكم في المستدرك) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ایمان کی علامت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو اپنی نیکی بھلی لگے، اور برائی بری معلوم ہو، بس یہ اس کی علامت ہے کہ وہ مومن ہے۔ (ترجمان السنۃ ۲/۲۲۴)

''حظِ نفس'' کا مطلب اپنے نفس کی خواہش پوری کرنا جس کام میں پیش نظر ہو، اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری مقصود وپیش نظر نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مصلح سے اصلاحی تعلق اور حضوری

سوال: عرض یہ ہے کہ حضرت وہ ذکر جو کسی شیخ نے تجویز کر کے دیا، اور اس سے جو خدا کا دھیان رہنے لگے اس کے اوپر تو ثواب ہو، اور وہ ذکر جو تصوف کی کتابوں میں دیکھ کر کیا ہو اور اس سے جو خدا کا دھیان رہنے لگے اس کے اوپر ثواب ہے یا نہیں؟ (دھیان کے بارے میں ثواب کا پوچھنا مطلوب ہے، نہ کہ ذکر کے بارے میں، یعنی حضوری اور یادداشت کے بارے میں) اور اگر کوئی آدمی شیخ کو تلاش نہ کرے یا شیخ مل نہ سکے، اور اسی طرح ذکر کرتا رہے اور جو حضوری حاصل رہے اس پر ہمیشہ تک ثواب ملے گا یا نہیں؟ مراد ہر جگہ عبارت میں شیخ کے عدم تجویز کئے ہوئے ذکر پر جو حضوری ہو اس کے اوپر ثواب کا پوچھنا مطلوب ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

احکامِ شریعت کی دو قسمیں ہیں: (۱) ظاہر سے متعلق۔ (۲) باطن سے متعلق۔ اعمالِ باطنہ کا وجود قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اور ہر شخص کا وجدان بھی اس کی شہادت دیتا ہے، علاوہ ازیں مسلمات عقلیہ اور متفق علیہ حقائق میں سے ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وذروا ظاهر الاثم وباطنه﴾ اس کے علاوہ حسد، کبر، ریا، حبِ مال، حبِ جاہ وغیرہ رذائل، اور ان کی متقابلات صفات محمود، اخلاق رذیلہ سے تخلیہ اور اخلاق حمیدہ سے تحلیہ کا حکم ہے، اول کے علاج اور دوم کی تحصیل کے طرق قرآن وحدیث میں بار بار بکثرت مذکور ہیں، بس ان اعمال باطنہ، یعنی: رذائل کے امالہ، اور اخلاق حمیدہ کی تحصیل سے متعلق علم کا نام تصوف ہے۔

مصلح کا کام یہ ہے کہ وہ کسی شخص میں مرض کی تشخیص کر کے نسخہ تجویز کر دیتا ہے، مرض اور علاج تو منصوص ہے، مرض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز مصلح کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مصلح بعض ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جن کا تعلق فراست اور تجربہ سے ہے۔ مصلح نہ ملنے کی شکایت اس کی دلیل ہے کہ علاج کی فکر نہیں، اور مرض کو مرض نہیں سمجھا جا رہا، امراضِ جسمانیہ کے علاج کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا سا پیٹ میں درد ہو تو ہر شخص معالج نظر آنے لگتا ہے؛ مگر آخرت کی فکر نہیں، اس لیے معالج نہ ملنے کی شکایت کی جاتی ہے، کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت نہ ہوگی کہ امراضِ باطنہ تو پیدا فرما دیے؛ مگر معالج کوئی بھی پیدا نہیں فرمایا۔ اگر یوں کہا جائے کہ جب امراضِ باطنہ کا علاج قرآن وحدیث میں موجود ہے تو علماء اپنا علاج خود ہی کر سکتے ہیں، کسی کے ساتھ اصلاحی تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں، یہ خیال اس لیے صحیح نہیں کہ اولاً: قرآن وحدیث میں مذکور نسخوں کو صرف اہل فن ہی جانتے ہیں، دوسرے علماء کی وہاں تک رسائی نہیں۔ ثانیاً: جیسے امراضِ جسمانیہ کا علاج صرف کتب طب کے مطالعہ سے نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ اس کے لیے کسی ماہر فن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اسی طرح امراض باطنہ کا علاج بھی بدون صحبت کامل کے نہیں ہو سکتا۔

(احسن الفتاویٰ ۱/ ۵۴۶، ۵۴۷ ملخصاً)

آپ جس کو حضوری سے تعبیر فرما رہے ہیں وہ واقعۃً حضوری ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ بھی شیخ کامل ہی کر سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱/ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سلبِ خلافت کے بعد بیعت کرنا

سوال: زید نے بکر کو خلافت مجاز بایں طور پر عطا کی، زید کہتا ہے کہ میں نے بکر کے ساتھ پندرہ سال حج کا زمانہ گزارا، اس دوران اللہ سے دل سے دعا کرتا تھا کہ ہمارے حکیم الامت تھانویؒ کے سلسلہ چشتیہ کے لیے بکر کو قبول فرمالے، اس لیے قطب عالم حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بکر کو بہت زیادہ محبت ہے اور بکر بعینہ امورِ تشریعی میں حکیم الامتؒ کے نقش قدم پر ہے، امور تکوینی میں مجاز کا بھی اثر کبھی حضرت حکیم الامتؒ کا ظاہر ہوتا ہے، اور شریعت کا بھی خوب لحاظ رکھتے ہیں؛ چنانچہ بے ساختہ دل پر مکۃ المکرّمہ میں ورود ہوا کہ چل کر بکر کو میں حضرت حکیم الامتؒ کی تلقین و بیعت کی اجازت رکھوں، پھر ایک سال بعد ستائیسویں شب رمضان المبارک مدینہ میں بہت ہی رسخ اور منظور ہوگیا، اس خلافت کو مصلحتاً ظاہر نہ کیا، پھر کامل تسلی ہونے پر ظاہر کیا، اور الحمدللہ بکر نے اس خلافت کو قبول فرمالیا۔

(۱) کیا باعتبار ورود خلافت کسی کے کہنے پر سلب کی جاسکتی ہے، جبکہ سلبِ خلافت کا ورود نہ ہوا ہو؟

(۲) کیا کسی کے کہنے پر خلافت سلب کرنے کے بعد بکر کو بیعت و تلقین کا حق حاصل ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

کیونکہ سلب خلافت کا وردو نہیں ہوا، لہٰذا کسی کے کہنے پر خلافت سلب نہیں کی جاسکتی۔

دوسرے یہ کہ کیونکہ خلافت سلب نہیں ہوئی، لہذا بکر کو بیعت و تلقین کا حق حاصل ہے۔

مفتی غلام ہمدانی، خطیب جامع مسجد ججن، تحصیل بھارھن ضلع: سرگودھا ۱۴/۱۱/ ۱۹۸۹ء

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ کے یہاں اجازتِ تلقین وبیعت دینے کے بعد اس کے واپس لینے کا بھی مستقل دستور تھا اور یہ واپسی اور سلبِ اجازت مختلف اسباب کی بناء پر ہوتی تھی، اس لیے شیخ محق نے اگر اجازت دینے کے بعد واپس لے لی، تو ظاہر ہے اس کا یہ اقدام مبنی برحق ہے، ورنہ اس کا مبطل ہونا لازم آتا ہے۔ نیز کسی مرید کا اپنے شیخِ طریقت کے متعلق اس قسم کا سوال کرنا یہ اپنے شیخ پر ایک نوع کا اعتراض ہے، جو گستاخی ہے اور ایسی گستاخی کے نتیجہ میں شیخ کے ساتھ جو نسبت ہوتی ہے، وہ منقطع ہو جاتی ہے، جیسا کہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے ''انفاسِ عیسیٰ'' میں تصریح فرمائی ہے۔

(۲) بکر کو بیعت وتلقین کا حق بربنائے اجازت حاصل ہوا تھا، اب جبکہ شیخ نے وہ اجازت کھینچ لی، تو وہ حق ختم ہو گیا، اس لیے سلبِ اجازت کے بعد بکر کے لیے جائز نہیں کہ زید کے سلسلہ میں لوگوں کو بیعت کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

دین ودنیا کا فرق

سوال: ایک اشکال ہے جس کا جواب مرحمت فرمائیں، وہ یہ ہے کہ دنیا وآخرت میں بالکل تضاد ہے، یا یہ کہ ایسی بات نہیں ہے، تضاد سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک آدمی دنیا کے حصول میں مصروف ہو تو نہ ذکر واذکار قابل قبول ہوں، نہ صلوٰۃ وتلاوت، یا یہ کہ ایسا نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ صوفیائے کرام کا دنیا کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ یعنی وہ

کتنی مقدار دنیا میں مصروف رہتے ہیں آیا ضرورت کی مقدار یا اس سے زیادہ؟ دیگر یہ کہ ایک آدمی ہے جو سلوک الی اللہ میں مصروف ہے اور ضرورت کی مقدار دنیا حاصل کر لیتا ہے: لیکن اس کی عورت ہے جو دنیا کے حصول کی سعی میں مجبور کرتی ہے، دنیا کے حصول سے مراد آخرت کو چھوڑ کے جو ہے وہ سب کچھ، چاہے مال ہو، جاہ ہو یا اور کچھ ہو، اب اگر آدمی اس کی بات نہ مانے تو وہ ناراض ہوتی ہے، اور معاملہ یہاں تک جاتا ہے کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے سے شادی کر لے گی، تو کیا وہ آدمی اس بیوی کو چھوڑ دے یا یہ کہ اس کی بات مان لے، یعنی دنیا کمانے میں لگ جائے، اور سلوک الی اللہ کو چھوڑ دے، کونسا پہلو اختیار کرے، ان تینوں شق کا جواب مرحمت فرمائیں۔

مرد کو تو زائد از ضرورت کمانے کی قطعاً خواہش نہیں لیکن اس کی عورت نہ مانے تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آدمی کو موت سے پہلے پہلے (یعنی زندگی میں) جو کچھ احوال پیش آتے ہیں، اور جو امور اس کو لاحق ہوتے ہیں، وہ سب دنیا کہلاتے ہیں، اور موت کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب آخرت کہلاتا ہے۔ امور تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ چیزیں جو آدمی کے ساتھ اس عالم میں چلی جاتی ہیں، وہ علم دین اور نیک عمل ہے جو خالص حق تعالیٰ شانہ کے واسطے کیا گیا ہو، یہ دونوں چیزیں خالص آخرت اور دین ہی ہیں، دنیا نہیں ہیں؛ اگرچہ آدمی کو اس میں لذت آتی ہو، اور جن لوگوں کو ان میں لذت آجاتی ہے، وہ ان کی وجہ سے کھانا، پینا، سونا، شادی؛ وغیرہ تک چھوڑ دیتے ہیں: لیکن اس سب کے باوجود یہ دونوں

چیزیں آخرت ہی کی چیزیں ہیں۔ دوسری قسم ان کے بالمقابل گناہوں کی لذتیں، اور جائز چیزوں کی وہ مقداریں جو محض فضول اور زائد ہیں، جیسا کہ سونے، چاندی کے ڈھیر اور فاخرہ لباس، خوشنما جانوروں کا شوق، اونچے اونچے محل، لذیذ لذیذ کھانے، یہ سب دنیا ہے۔ تیسری قسم ان دونوں کے درمیان ہے، وہ ضروری چیزیں جو آخرت کے کاموں کے لیے معین ومددگار ہوں، جیسا کہ بقدرِ ضرورت کھانا، سونا اور ضرورت کے موافق معمولی لباس گرمی اور سردی کا، اور ہر وہ چیز جس کی آدمی کو اپنی صحت اور بقاء کے لیے ضرورت ہے، اور اس کی وجہ سے پہلی قسم میں اعانت حاصل ہوتی ہے، یہ چیزیں بھی دنیا نہیں ہیں، یہ آخرت ہی ہیں، دین ہی ہیں؛ بشرطیکہ واقعی ضرورت کے درجہ میں ہوں، ان سے مقصد دینی امور پر تقویت ہو، اور اگر ان کا مقصد محض حظِ نفس اور دل کی خواہش کا پورا کرنا ہوگا، تو یہی چیزیں دنیا ہو جائیں گی۔ (ماخوذ از احیاء العلوم ۳/ ۱۹۰، فضائل صدقات ۳۸۸)

امام غزالیؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ: دنیا فی نفسہ ممنوع اور ناجائز نہیں ہے؛ بلکہ اس وجہ سے ممنوع ہے کہ وہ حق تعالیٰ شانہ تک پہنچنے میں مانع بنتی ہے۔ اسی طرح فقر فی نفسہ مطلوب نہیں ہے؛ بلکہ وہ اس لیے مطلوب ہے کہ اس میں حق تعالیٰ شانہ سے ہٹانے والی کوئی چیز نہیں، (بلکہ وہ حق تعالیٰ شانہ تک پہنچانے میں معین ہے) لیکن بہت سے غنی ایسے بھی ہیں کہ غنا ان کو حق تعالیٰ شانہ تک پہنچنے سے مانع نہیں ہوا، جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ حضرات رضی اللہ عنہم۔ اور بعض فقیر ایسے ہوئے ہیں کہ ان کا فقر بھی حق تعالیٰ شانہ تک پہنچنے میں مانع بن جاتا ہے کہ ناداری کے ساتھ مال کی محبت اس کو راستے سے ہٹا دیتی ہے، لہٰذا اصل ممنوع اور ناجائز

مال کی محبت ہے، چاہے اس کے وصال سے ہو جیسا غنی، یا فراق سے ہو جیسا کہ دنیا دار فقیر، دنیا حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے غافل لوگوں کی معشوقہ ہے، جو اس کا عاشق یعنی دنیا دار فقیر اس سے محروم ہے وہ اس کی طلب میں مر رہا ہے، اور جس عاشق کو اس کا وصال حاصل ہے جیسا کہ غنی، وہ اس کی حفاظت اور اس سے لذتیں حاصل کرنے میں اللہ تعالیٰ شانہ سے غافل ہے، لیکن اکثر قاعدہ یہ ہے کہ جو اس سے محروم ہے، وہ اس کے فتنوں سے بہت زیادہ محفوظ ہے، اور جو اس میں پھنسا ہوا ہے وہ فتنوں میں مبتلا ہے۔ (ایضاً ۳۸۹)

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (سورۂ تغابن) اے ایمان والو! تمہاری بعض بیبیاں، اور اولاد تمہارے (دین کے) دشمن ہیں، (جبکہ وہ اپنے نفع دنیوی کے واسطے تم کو ایسی بات کا حکم کریں جو تمھارے لیے مضرِ آخرت ہو) سو تم ان سے ہوشیار رہو، (اور ان کے ایسے امر پر عمل مت کرو) اور (اگر تم کو ایسی فرمائشوں پر غصہ آوے، اور تم ان پر تشدد کرنے لگو اور وہ اس وقت معذرت اور توبہ کریں اور) تم (اس وقت ان کی وہ خطا) معاف کردو، (یعنی سزا نہ دو) اور درگذر کر جاؤ، (یعنی زیادہ ملامت نہ کرو) اور بخش دو، (یعنی ان کو دل سے اور زبان سے بھلا دو) تو اللہ تعالیٰ (تمھارے گناہوں کا) بخشنے والا (اور تمہارے حال پر) رحم کرنے والا ہے۔

اس لیے بیوی کی یہ باتیں اس کی نادانی اور جہالت کی وجہ سے ہیں، آپ اس کو قرآن وحدیث کی تعلیمات اور بزرگوں کے حالات وواقعات سے روشناس کریں، جب اس کو یہ سب معلوم ہوگا تو وہ بھی آپ کی ہم خیال ہو جاوے گی، ایسی باتیں سمجھانے سے

درست ہوتی ہیں، حکم چلانے سے کام نہیں چلتا، اس کی تعلیم وتربیت آپ کا فریضہ ہے، اس میں کوتاہی کرنے سے آپ کی پکڑ ہوگی، اس کا علاج چھوڑنا نہیں ہے۔ ﴿قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَاراً﴾ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حال طاری ہونا حق کی دلیل نہیں

سوال: آج کل لوگوں کو مزار و درگاہوں پر جو حاضری وحال آتا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا کہنا ہے؟ اگر ہم نفی کرتے ہیں کہ کوئی حاضری نہیں آتی یہ دیکھ کر کہ ناپاک رہتے ہیں اور بیت الخلاء سے آتے ہیں اور حال آجاتا ہے، اور خاص جب محرم کے مہینہ میں ایک ساتھ سب کو حاضری آتی ہے (جن سوار ہوتا ہے)، اور نفی بھی نہیں کرسکتے کہ ان میں بخدا اتنی طاقت ہوتی جاتی ہے کہ اس وقت تین آدمی مل کر بھی ایک کو قابو میں نہیں لاسکتے ہیں، اور جن کو حاضری آتی ہے وہ سب کو یہ بھی بتلاتے ہیں کہ: لیمولاؤ وغیرہ، اور علاج کرتے ہیں۔ اسی طرح کیم اور دیگر مقامات پر ہوتا ہے، اور اگر اثبات کریں تو سمجھ میں نہیں آتا جب کہ کم بخت بے نمازی اور فاسق کو کیسے یہ حال آجاتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اللہ تعالیٰ نے جن کو قدرت دی ہے کہ وہ انسانی جسم میں سرایت کرتا ہے، جس طرح انسانوں میں کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنی مختلف حرکتوں اور شرارتوں کے ذریعے لوگوں کے عقائد کو فاسد کرنے کی سعی کرتے ہیں، اِسی طرح جنوں میں بھی ایسے افراد

ہوتے ہیں؛ بلکہ ان میں یہ تعداد زیادہ ہے۔ درگاہ پر جانے والے جس حرکت کو ''حال'' سے تعبیر کرتے ہیں، وہ بھی جنوں کی ان شیطانی شرارتوں کا اثر ہوتا ہے؛ اِس لیے جس پر حال طاری ہورہا ہے اس کی قوت کی زیادتی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حق ہے، مشکوۃ شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے کہ: انھوں نے اپنے شوہر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ: میری آنکھ میں درد ہوتا رہتا تھا تو میں فلاں یہودی کے پاس جھاڑ پھونک کرانے جاتی تھی، جب وہ جھاڑ دیتا تو آنکھ اچھی ہوجاتی تھی، تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: یہ شیطان کا کام تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے آنکھ کو تکلیف پہنچاتا تھا، اور جب یہودی جھاڑتا تو شیطان اپنی حرکت سے باز آجاتا؛ (تاکہ اس طرح لوگوں کے اعتقاد فاسد کرے)۔ (مشکوۃ شریف ص:۳۸۹)

اس لیے آپ اِن فُسّاق وفجار کے حال کو بھی اسی پر محمول فرمائیں اور پریشان نہ ہوں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ

كتاب الطهارة

سنن وضو کا پورا کرنا ضروری ہے چاہے جماعت ختم ہو جائے

سوال: فتاوی دارالعلوم مرتبہ مفتی ظفیر الدین، مفتاحی مدظلہ مطبوعہ زکریا بکڈپو، دیوبند ۱/۱۳۱ پر مرقوم ہے۔ ’’سنن وضو کا پورا کرنا ضروری ہے، چاہے جماعت ختم ہو جائے‘‘ اور حاشیہ میں بطور اس کی دلیل کے مذکور ہے: قال رسول اللہ ﷺ: أسبغوا الوضوء. رواه مسلم (مشکوۃ) باب سنن الوضوء، فصل اول أی أتموه بإتيان جميع فرائضه وسننه أو أكملوا واجبته۔ (مرقاۃ:۱/۳۱۰)اھ

عرض ہے کہ کیا یہ مسئلہ درست ہے؟ بندہ کے ذہن میں اس کے متعلق چند باتیں ہیں، جو حاضر خدمت ہے:

(الف) خط کشیدہ الفاظ میں سنت کا اصل مفہوم باقی محسوس نہیں ہوتا۔

(ب) اس مسئلہ کو صحیح قرار دینے پر جماعت کی جو اہمیت جمہور کے نزدیک ہے اس پر زد پڑتی ہے، جیسا کہ قاموس الفقہ میں ہے: فقہاء احناف میں سے بعض نے اس کو (جماعت کو) واجب اور بعض نے سنت مؤکدہ قرار دیا ہے، جو واجب کے قریب قریب ہوتا ہے۔ (قاموس الفقہ ۳/۱۱۷ مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)

(ج) مفتی ظفیر الدین مدظلہ از خود درمختار کے ترجمہ شرح کشف الاسرار ۱/۳۰۰ پر تحریر فرماتے ہیں: فلا صلوة إلا المكتوبة؛ إلا بسنة الفجر إن لم يخف فوت جماعتها ولو بإدراك تشهد ها فإن خاف تركها أصلاً. إلخ (مکتبۂ فیض القرآن، دیوبند)

(د) اور بہشتی زیور میں فجر کی سنت کے متعلق لکھا ہے: من خاف أن تفوته ركعتا الفجر لو اشتغل بسنتها، تركها وإلا فلا. (حاشیۂ بہشتی زیور مدلل، ۲/۳۶)

المختصر! فجر کی سنتوں جیسی اہم سنت کے متعلق یہ صراحت ہے، اب حضور واضح فرمائیں کہ وضوء کی سنتوں کا کیا حکم ہے۔ اور پھر ترمذی وغیرہ میں ایک بار اعضاء وضوء دھونے کی روایتیں بھی ہیں۔ كما أظهر عليك مني.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فقہ حنفی کی عربی کتب فتاوی، نیز شروح میں یہ جزئیہ کہیں صراحۃً نظر سے نہیں گزرا، اس لیے غالب یہ ہے کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کا جواب اپنی فقہی بصیرت اور فقاہت نفس سے ہی لکھا ہوگا، اس جواب کو لکھتے وقت ان کے پیش نظر کیا دلیل یا مأ خذ رہا اس کی تصریح انہوں نے اپنے جواب میں تو نہیں فرمائی؛ البتہ محشی مدظلہ نے اس کی دلیل میں ارشاد نبوی ''اسبغوا الوضوء'' اور اسباغ کی تشریح بحوالۂ مرقاۃ پیش فرمائی ہے، جس میں فرائض کے ساتھ سنن کی ادائیگی کو بھی اسباغ کا مصداق قرار دیا گیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وضوء کو کامل طور پر اداء کرنے میں کوتاہی سے نماز میں نقص آتا ہے؛ بلکہ وضوء کے بعض افعال جن کی سنیت اور رکنیت حضرات ائمۂ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ ہے، ان میں تو نماز کی صحت ہی اختلافی ہو جائے گی، مثلاً سر کا مسح کہ احناف کے یہاں چوتھائی سر کا مسح تو فرض ہے، اور پورے سر کا مسح سنت ہے جبکہ مالکیہ کے یہاں پورے سر کا مسح فرض ہے، اب اگر کوئی حنفی پورے سر کے مسح کو سنت ہونے کی وجہ سے چھوڑ دے اور صرف چوتھائی پر اکتفاء کرے تو اس کی نماز مالکیہ کے یہاں درست نہ ہوگی۔ یہی حال نیت، ترتیب، موالات وغیرہ کا ہے؛ بلکہ وضو میں سنتوں کے چھوڑنے کا اثر دوسروں تک متعدی ہوتا ہے، سنن نسائی میں ہے کہ ایک

مرتبہ صبح کی نماز میں آں حضرت ﷺ نے سورۂ روم پڑھنا شروع کی، اثناء قرأت میں آپ کو کچھ خلجان اور التباس واشتباہ پیش آیا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو یہ ارشاد فرمایا: ما بال اقوام یصلون معنا لایحسنون الطھور وانما یلبس علینا القرآن اولئك.

ترجمہ: کیا حال ہے لوگوں کا کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وضوء ٹھیک طرح نہیں کرتے، جز یں نیست کہ ایسے ہی لوگ ہمارے پڑھنے میں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ علامہ طیبی طیب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سنن وآداب کے انوار وبرکات دوسروں تک سرایت کرتے ہیں، اوران کے ترک سے فتوحات غیبیہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات اس کا اثر دوسروں تک متعدی ہوتا ہے کہ اس شخص کی وجہ سے دوسرا شخص خیرات وبرکات اور انوار وتجلیات سے محروم ہو جاتا ہے۔ (سیرۃ مصطفیٰ ۳/ ۵۷، ۵۸)

قال الطیبی: قد تقدم معنی احسان الوضوء فی الفصل الأول، وفیه اشارة الی ان السنن والآداب مکملات للواجب یرجی برکتها وفی فقدانها سد باب الفتوحات الغیبیة، وان برکتها تسری الی الغیر کما ان التقصیر فیها یتعدی الی حرمان الغیر الخ. (مرقاۃ ۱/ ۳۳۰)

اس لیے وضو کی سنتوں کو محض اس لیے کہ ان کو سنت کا عنوان دیا گیا ہے، کم نہ سمجھا جائے؛ بلکہ چونکہ وضو کے افعال میں نماز کی طرح فرائض کے بعد واجبات کا درجہ نہیں رکھا گیا ہے، اس لیے جو افعال واجبات کے درجہ میں آسکتے تھے ان کو بھی سنن کے خانہ میں رکھ دیا گیا ہے، اس لیے اگر حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے اپنی فقہی بصیرت

اور فقاہت نفس کی بنیاد پر مندرجۂ بالا جواب تحریر فرمایا ہے تو وہ قابل اشکال نہیں۔

آپ نے چند باتوں کے نام سے اپنے جو اشکالات لکھے ہیں اس میں نمبر (الف) والا اشکال تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کی مراد کیا ہے؟ رہا نمبر (ب) اور (ج) والا اشکال تو یہ یاد رہے کہ جماعت کو سنت مؤکدہ یا واجب جو بھی درجہ دیا جائے۔ بہرحال وہ نماز کے لیے شرط کی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے کوئی آدمی بغیر جماعت کے تنہا نماز پڑھے گا تب بھی اس کا فریضہ ادا ہوکر وہ بریٔ الذمہ ہوجاتا ہے، چاہے اس کی یہ اداء ادائے ناقص کہی جائے؛ لیکن وضوء کی حیثیت نماز میں شرط کی ہے، اگر کوئی آدمی بغیر وضوء نماز ادا کرے گا، تو اس کی نماز ہی درست نہ ہوگی، اس سے آپ کو دونوں کے درمیان کے فرق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

رہا آپ کا یہ اشکال کہ جماعت پانے کے لیے فجر کی سنتوں جیسی اہم سنت کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی، تو ظاہر ہے کہ جماعت کے مقابلہ میں فجر کی سنتوں کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، اس لیے کہ اگر فجر کی سنتیں اداء کر کے جماعت حاصل ہوسکتی ہے، تو اس صورت کو اختیار کیا جائے گا، ورنہ فجر کی سنتوں کو چھوڑ کر جماعت کے ساتھ نماز اداء کی جائے گی، آپ کا وضو اور اس کی سنتوں کو فجر کی سنتوں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتاب الصلاۃ

قبلہ سے ۲۷/ درجہ انحراف کی وجہ سے جماعتِ ثانیہ کے داعی کا حکم

سوال: ہم نے مسجد کے لیے ایک جگہ آج سے ۵/ سال پہلے خریدی تھی، اُس میں سمت قبلہ ذرا بائیں جانب کی طرف مائل تھا، محراب بنانے سے قبل ہم نے کئی بار کمپاس کے ذریعے دیکھا کہ اگر صفوں کو سیدھا کر دیا جائے تو تقریباً ۲۷/ درجہ کا فرق آتا ہے، علمائے کرام سے مشورہ لے کر ہم نے اس وقت قبلہ سیدھا کر دیا، اور مسلسل ۵/ سال سے پانچ وقتوں کی نماز مع جمعہ وعیدین وغیرہ اِس قبلہ کی طرف ہو رہی ہیں، اب ایک صاحب نے یہ مسئلہ کھڑا کیا کہ قبلہ ٹیڑھا کیا گیا ہے؛ اِس لیے وہ اسی مسجد کے تہہ خانے میں دوسری جماعت با قاعدہ ۵/ وقتی نماز کے علاوہ جمعہ وعیدین بھی ادا کریں گے، اور اُنھوں نے علی الاعلان اشتہار وغیرہ دے کر لوگوں کو فتنہ برپا کرنے کی غرض سے ابھارا بھی ہے؛ مگر ابھی تک وہ صاحب اپنی کوشش میں ناکام رہے ہیں؛ مگر اُن کی اِس فتنہ بازی سے مصلیوں کی تعداد میں باقاعدہ نمازوں میں عموماً اور جماعت وغیرہ میں کافی اثر پڑا۔

اس لیے مندرجۂ ذیل مسائل میں آپ سے جوابات درکار ہیں، امید قوی ہے کہ آپ جوابات سے نوازیں گے:

(۱) مسجد مذکورہ میں محراب سمت قبلہ سے تقریباً ۲۷/ درجہ کا فرق ہے، تو کیا ایسی صورت میں نماز صحیح ہو جاتی ہے کہ نہیں؟

(۲) ایک جماعت کے ہوتے ہوئے اُسی مسجد میں دوبارہ جماعت کی تشہیر اور دعوت دینا کیسا ہے؟

(۳) اس فتنہ بازی کرنے پر اگر ہم مذکورہ صاحب کو مسجد میں آنے سے روک

دیں تو شریعت مطہرہ میں کہاں تک گنجائش ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) فقہاء کی تصریح کے بموجب عین کعبہ سے پینتالیس (۴۵) درجے تک بھی انحراف ہو جائے، تو استقبال فوت نہیں ہوتا اور نماز صحیح ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کا اِس مسئلہ پر مستقل رسالہ ''سمتِ قبلہ'' کے نام سے موجود ہے، جو آپ کی تالیف ''جواہر الفقہ'' حصۂ اول کا ایک جزء ہے، اُس کا مطالعہ ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگا۔

(۲) جس مسجد میں باقاعدہ پابندیٔ وقت کے ساتھ جماعت ہوتی ہو اس میں جماعتِ ثانیہ مکروہ ہے، اور مکروہ کی دعوت اور تشہیر موجبِ گناہ ہے۔

(۳) اس آدمی کو نرمی اور محبت سے سمجھا کر اس سے باز رکھا جائے، اِس پر بھی باز نہ آئے تو کوئی ایسی تدبیر عمل میں لائی جاسکتی ہے جس کے نتیجہ میں اُس کو باز رکھا جاسکے بشرطیکہ خود وہ تدبیر باعثِ فتنہ نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/ شعبان ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھنا

سوال: بچہ رات میں پیشاب کر کے (بستر میں) ماں کے کپڑے اور جسم ناپاک کر دیتا ہے، اگر جسم اور کپڑے پاک کرنے میں فجر کی نماز قضاء ہو جانے کا خوف ہو، تو ایسی صورت میں بغیر پاکی حاصل کئے ماں یا باپ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نہیں پڑھ سکتا ہے۔

تـم الشـرط هـي ستة طهارة بدنه………… وثوبه…………لقوله تعالیٰ: ﴿وثيابك فطهر﴾. (درمختار زکریا ۲/۷۳، ۷۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قطرہ روکنے کی غرض سے عضوِ مخصوص کو باندھ کر نماز پڑھنا

سوال: بیوی سے بوس وکنار کی وجہ سے (شہوت رفع ہو جانے کے بعد بھی اور پیشاب کرنے کے بعد بھی) مذی کا قطرہ نکل جانے کا خوف ہونے کی وجہ سے عضو کو کپڑے وغیرہ سے باندھ دیا؛ تاکہ قطرہ نہ نکلے، تو اس صورت میں نماز باجماعت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ یہی صورت اگر امام کو پیش آئے، تو وہ یہ تدبیر کر کے نماز پڑھا سکتا ہے نہیں؟ سلسل البول والا اس تدبیر کو اختیار کرنے کے بعد بے عذروں کو نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر ایسا کرنے سے قطرہ باہر نہیں نکلتا، تو نماز درست ہو جاوے گی اور اندیشہ ہونے کی صورت میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ایسا آدمی نماز پڑھا سکتا ہے؛ البتہ عمومی حالت اس قسم کی ہوگئی ہے، تو امامت کی ذمہ داری دوسرے کے حوالہ کر دے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مذی کو روک کر نماز پڑھنا

سوال: زید نے اپنی بیوی سے بوس وکنار کی، جس کے نتیجہ میں مذی کا اخراج شروع ہوا، اتنے میں ظہر کی اذان ہوگئی، زید جماعت کی نماز کے لیے جانا چاہتا ہے؛ لیکن اسے یقین ہے کہ مذی کا اخراج نماز میں بھی جاری رہے گا (باوجودیکہ استنجاء بھی کرلے) اگر زید نے کپڑے وغیرہ سے عضو کو باندھ کر مذی کا اخراج روک دیا، تو اب وہ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر نماز قضاء ہونے کا یقین ہو تو اس ترکیب سے مذی کو روک کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر زید نے کسی تدبیر سے مذی کا نکلنا روک دیا ہے، تو اس کی نماز درست ہوجائے گی۔ وان خرج البول الی قصبة الذکر لا ینتقض. (السعایة ۱/۲۰۳) اگر نماز قضاء ہوجانے کا یقین ہے تو اس تدبیر کو اختیار کرنے میں حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نماز میں ستر کا حصہ کھلنے پر ناظر و منظور کی نماز کا حکم

سوال: زید ایک نمازی آدمی ہے، اس سے اگلی صف میں عمر نماز پڑھ رہا ہے، عمر کا حالتِ صلوٰۃ میں ستر کا حصہ کھل جاتا ہے، تو زید کی نگاہ حالت صلاۃ میں عمر کے ستر کے اس مخصوص جگہ پر اچانک پڑگئی، یا وہ خود عمداً اپنی نگاہ ڈالتا ہے، تو صورت مذکورہ میں زید کی نماز ہوئی یا نہیں ہوئی؟ اور عمر کی نماز کا کیا حکم رہے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حالتِ نماز میں دوسرے نمازی یا غیر نمازی کے ستر پر نگاہ پڑ جانے سے، یا ڈالنے سے نماز فاسد نہیں ہوگی؛ اگر چہ قصداً نگاہ ڈالنا گناہ ہے، رہا عمر جس کا ستر نماز میں کھل گیا تھا، اگر وہ کھلنا غیر اختیاری تھا اور تین تسبیحات پڑھ سکیں اس سے کم وقت کے لیے کھلا رہا، تو اس کی نماز بھی فاسد نہیں ہوئی، ورنہ فاسد ہوگئی۔ (شامی ۱/۳۰۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

امام کی اقتدا کی نیت ضروری ہے؟

سوال: مقتدیوں کے لیے امام کی نیت کرنا کیسا ہے؟ بغیر امام کی نیت کے نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر کوئی شخص کسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہے، تو اس کے لیے بوقتِ نیت یہ ضروری ہے کہ امام کی متابعت واقتداء کی نیت کرے۔ وينوي المقتدي المتابعة الخ. (درمختار مع الشامي ۱/ ۳۰۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

معذور شخص کے لیے ٹیبل وغیرہ پر سجدہ کرنے کا حکم

سوال: مسئلۂ ذیل میں شرع شریف کا حکم معلوم کرنا ہے:

خلاصۂ سوال: اگر زمین پر سجدہ کی قدرت نہ ہو تو تکیہ، ٹیبل وغیرہ کسی بلند چیز پر کیا سجدہ کرنا فرض ہے؟

ایک مدرسہ کے ماہنامہ گجراتی رسالہ میں شائع شدہ فتاویٰ-جس کی عکسی تحریر بھی ساتھ ہے-جس کی خط کشیدہ عبارت میں دوجگہ زمین پر سجدہ سے معذور کے لیے کسی بلند چیز جس کی بلندی ۹/ انچ سے زیادہ نہ ہو پر سجدہ کرنا فرض لکھا ہے۔جس کی وجہ سے بعض جگہوں پر شدید اضطراب وہنگامہ ہے۔

نیز یہ اظہار بھی ضروری ہے کہ، صاحب فتویٰ کی تنقیص یا تعریض یا تعاقب قطعاً مقصود نہیں، صرف رفع انتشار بین العلماء والعوام اور تسہیل فی العمل کا قصد ہے، غالبًا کسی وجہ سے مرجوح روایت نقل ہوگئی ہو؛ کیوں کہ دلائل اور راجح قول اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم وعلمه أتم.

بہشتی زیور اختری: فی صلاۃ المریض:

مسئلہ(۳): سجدہ کرنے کے لیے تکیہ وغیرہ کوئی اونچی چیز رکھ لینا اور اس پر سجدہ کرنا بہتر نہیں، جب سجدہ کی قدرت نہ ہو تو بس اشارہ کرلیا کرے، تکیہ کے اوپر سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

وعلیٰ حاشتیه نقلا عن شرح البداية وعن شرح التنوير:

فإن لم يستطع الركوع والسجود أومىٰ إيماء، وجعل سجوده أخفض من ركوعه، ولا يرفع إلىٰ وجهه شيئا يسجد عليه. (اختری ۲/۴۵)

نصب الراية (الطبع بدابهيل): عن جابر أن النبي ﷺ عاد مريضا، فراٰه يصلي علىٰ وسادة فأخذها، فرمىٰ بها، فأخذ عودا ليصلي عليه، فأخذه فرمىٰ به، وقال: صل على الأرض إن استطعت؛ وإلافاومي إيماء، واجعل

سجودك أخفض من ركوعك. (۱۷۵/۲)

وفيه عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: من استطاع منكم أن يسجد فليسجد، ومن لم يستطع فلا يرفع إلىٰ جبهته شيئا يسجد عليه، وليكن ركوعه وسجوده يومي برأسه. (۱۷٦/۲)

هداية في صلاة المريض:

ولا يرفع إلىٰ وجهه شيء يسجد عليه، لقوله عليه السلام: إن قدرت أن تسجد على الأرض فاسجد؛ وإلا فاوم برأسك. (۱٦۱/۱)

بدائع الصنائع، دارالكتاب ديوبند:

عن علي أن النبي ﷺ قال في صلاة المريض: إن لم يستطع أن يسجد أومأ، وجعل سجوده أخفض من ركوعه. (۲۸٤/۱)

وروي عن النبي ﷺ أنه قال: من لم يقدر على السجود فليجعل سجوده ركوعا، وركوعه إيماء، والركوع أخفض من الإيماء. (۲۸٤/۱)

وعلىٰ هامشه: من حديث ابن مسعود موقوفا: إن استطعت أن تسجد على الأرض فاسجد؛ وإلا فاومئ إيماء، واجعل السجود أخفض من الركوع. (۲۸٥/۱)

وفيه: لورفع إلىٰ وجه المريض وسادة أو شيئا فسجدعليه من غير أن يؤمي لم يجز؛ لأن الفرض في حقه الإيماء ولم يوجد، ويكره أن يفعل هذا؛ لما روي عن النبي ﷺ: دخل علىٰ مريض يعوده، فوجده يصلي كذلك،

فقال: إن قدرت أن تسجد على الأرض فاسجد؛ وإلا فأوم رأسك. (۲۸۹/۱)

وفيه: روي عن عبدالله بن مسعود: دخل علیٰ أخيه يعوده، فوجده يصلي ويرفع إليه عود فيسجد عليه، فنزع ذلك من يد من كان في يده، وقال: هذا شيء عرض لكم الشيطان، أوم لسجودك. (۲۸۹/۱) (العود: لکڑی کٹی ہوئی ٹہنی [مصباح: ۵۸۳])

وفيه: روي ان ابن عمر رأى ذلك من مريض فقال: أتتخذون مع الله الٰهة أخریٰ؟ فإن فعل ذلك ينظر، إن كان يخفض رأسه للركوع شيئا ثم للسجود ثم يلزق بجبينه يجوز (أي الصلاة)؛ لوجود الإيماء، لا للسجود علیٰ ذلك الشيء، فإن كانت الوسادة موضوعة على الأرض وكان يسجد عليها جازت صلاته؛ لما روي أن أم سلمة كانت تسجد علیٰ مرفقة موضوعة بين يديها لرمد بها، ولم يمنعها رسول الله ﷺ. (۲۸۹/۱)(المرفقة: چھوٹا تکیہ جس پر سوتے ہوئے رخسارہ رکھتے ہیں۔[مصباح:۳۰۶])

ان اقوال واحادیث سے یہ امور ظاہر ہوتے ہیں:

(۱) **بوقت قدرت زمین پر سجدہ۔** كما في البدائع (۲۸٤/۱) مكن جبهتك وأنفك من الأرض.

(۲) **بوقت عدم قدرت فقط اشارہ۔** (إيماء لا علیٰ شيء) كما ورد عليه عامة النصوص وعليه أصحاب المتون.

(۳) **زمین پر تکیہ وغیرہ رکھ کر سجدہ کرنا اباحت مرجوحہ**، كما اختاره بهشتي

زیور، ولأن حدیث أم سلمة فعلي وما سواه قولي، وفيهم صيغ الأمر وحديث أم سلمة ليس كذلك.

(۴) کوئی چیز اونچی اٹھا کر سجدہ کرنا یہ منع ہے۔ کما منع ابن مسعود وابن عمر، واختاره الهداية كما مر.

(۱) اب سوال یہ ہے کہ: ٹیبل وغیرہ پر سجدہ کی فرضیت کی ترجیح کس دلیل سے؟

(۲) یہ کہ ۹/ انچ یا اس سے کم بلندی پر سجدہ کی فرضیت کس وجہ سے؟

(۳) نیز یہ ۹/ انچ (نصف ذراع) سجدہ میں کہاں سے اخذ کیا ہے؟

السائل: فضل الرحمٰن ابن مولانا آدم صاحب طالع پوری

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

آپ نے جس فتویٰ پر اشکالات کیے ہیں اُس کے مجیب باحیات اور سلامت موجود ہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ آپ اپنا یہ سوال ان ہی کی خدمت میں بھیجتے، اب جب کہ آپ نے ہم سے ہی جواب کا مطالبہ فرمایا ہے تو اصل جواب سے پہلے بطورِ تمہید چند باتیں پیش کی جاتی ہیں؛ تاکہ اصل جواب پر کوئی اشکال باقی نہ رہے۔

(۱) اولاً تو آپ کے سوال کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے: آپ نے فتویٰ کے دو مقامات پر اشکال کیا ہے، اُن میں سے ایک مقام ''زمین پر بیٹھ کر اشارہ سے سجدہ کرنا'' کے عنوان کے ماتحت ہے، جس میں سوال کیا گیا ہے کہ زمین پر بیٹھ کر فرض، واجب یا نفل نماز پڑھنے والا زمین پر پیشانی رکھے بغیر صرف سر کو جھکا کر اشارہ سے سجدہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اِس کے جواب میں مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ: ''نماز کے ارکان: قیام، رکوع،

سجدہ، قعدہ؛ وغیرہ میں سجدہ کو خصوصی امتیازی حیثیت حاصل ہے، اور سجدہ یہ نماز کی روح ہے؛ اس لیے زمین پر بیٹھ کر کسی بھی قسم کی نماز پڑھنے والا نمازی اگر زمین پر پیشانی رکھ کر سجدہ کرسکتا ہے، یا زمین پر تپائی وغیرہ سخت چیز جو زمین سے نو انچ یا اس سے کم اونچی ہو اس پر پیشانی رکھ کر سجدہ کرسکتا ہے، تو اِن دونوں صورتوں میں زمین پر یا سجدہ کے لائق سخت چیز سجدہ کی جگہ پر رکھ کر اس پر سجدہ کرنا ضروری اور فرض ہے، اِن دونوں صورتوں میں صرف سر جھکا کر سر کے اشارہ سے سجدہ کرنا کافی نہیں، اور ان دونوں صورتوں میں اس طرح صرف سر کے اشارہ سے سجدہ کرنے سے نماز صحیح نہیں ہوگی، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سجدہ کے ساتھ دوبارہ نماز کا اعادہ کرے''۔

(۲) جو بیمار حقیقی سجود پر قدرت رکھتا ہو اس کے لیے ایماء یعنی صرف سر کے اشارہ سے سجدہ کرنا درست نہیں۔

کنز میں ہے: تعذر عليه القيام أو خاف زيادة المرض صلىٰ قاعدا يركع ويسجد، وموميا إن تعذر، وجعل سجوده أخفض.

بحرالرائق میں ہے: قوله: وموميا إن تعذر، أي: يصلي موميا وهو قاعد إن تعذر الركوع والسجود لما قدمناه، ولأن الطاعة بحسب الطاقة. (۱۲۲/۲)

درمختار میں ہے: وإن تعذرا ليس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود كاف لا القيام أومأ قاعدا، وهو أفضل من الإيماء قائما لقربه من الأرض.

(درمختار علىٰ هامش الشامی ۵۶۰/۱)

وإن عجز عن القيام والركوع والسجود وقدر على القعود يصلي

قـاعـدا بـإيـمـاء، ويجعل السجود أخفض من الركوع، كذا في فتاوىٰ قاضي خـان. حتـىٰ لـو سـوى لـم يـصـح، كذا في البحر الرائق. وكذا لو عجز عن الـركـوع والسجود وقدر على القيام فالمستحب أن يصلي قاعدا بإيماء، وإن صلىٰ قائما بإيماء جاز عندنا، هكذا في فتاوىٰ قاضي خان. (هنديه ۱/۱۳٦)

بدائع میں ہے: فـإذا عـجـز عـن القيام يصلي قاعدا بركوع وسجود، فـإن عـجـز عـن الـركـوع والسجود يصلي قاعدا بالإيماء، ويجعل السجود أخفض من الركوع. (بدائع ۱/۱۰۵،۱۰٦)

(۳) یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ، حقیقی سجود پر قدرت رکھنے والا کس کو کہا جائے؟ تو ظاہر ہے کہ شرعاً جس سجدہ کو معتبر اور صحیح قرار دیا گیا ہے جو بیمار اُس طرح کا سجدہ کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو اُسی کو اِیماء یعنی سر کے اشارہ سے سجدہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ فقہاء نے جہاں سجدہ کی کیفیت سے بحث کی ہے وہاں لکھا ہے کہ: زمین پر پیشانی رکھنے کو سجدہ کہتے ہیں، کسی نرم چیز پر جس میں سر ناک دھنس جائے اور ناک اور پیشانی قرار نہ پکڑے، مثلاً: گھاس یا روئی وغیرہ پر سجدہ کیا تو سجدہ جائز نہیں، اور اگر اُس کی پیشانی اور ناک قرار پکڑے اور اس جگہ کی سختی معلوم ہو، یعنی اب اگر مبالغہ کیا جائے تو نہ دبے اور سر نیچے نہ جائے تو سجدہ جائز اور درست ہے۔

نیز سجدہ کی جگہ پاؤں کی جگہ سے آدھ گز شرعی (ایک بالشت) یعنی نو انچ تک اونچی ہو تو سجدہ جائز ہے، اور اگر اس سے زیادہ اونچی ہو تو جائز نہیں۔

چناں چہ **نور الایضاح** میں "بـاب شروط الصلاة وأركانها" کے عنوان کے

ماتحت تحریر فرماتے ہیں: لا بـد لصحة الصلا ة مـن سبـعة وعشرين شيئا. **آگے نمبر ۱۷/ پر لکھا ہے:** والسجود علىٰ مايجد حجمه وتستقر عليه جبهته إلخ. **اس کے بعد نمبر ۱۸/ پر لکھا ہے:** وعـدم ارتـفـاع محل السجود عن موضع القدمين بأكثر مـن نـصف ذراع، وإن زاد عـلـىٰ نـصف ذراع لـم يـجز السجود إلا لزحمة سجد علىٰ ظهر مصل صلاته. (نور الایضاح جدید ایڈیشن ص:۱۹۹)

مراقی الفلاح میں ہے: ومن شروط صحة السجود: عدم ارتفاع محل السـجـود عن موضع القدمين بأكثر من نصف ذراع ليتحقق صفة الساجد، والارتفاع القليل لايضر، وإن زاد علىٰ نصف ذراع لم يجز السجود، أي: لم يـقـع مـعتدا به، فإن فعل غيره معتبرا صح، وإن انصرف من صلاته ولم يعده بطل. (مراقي الفلاح علىٰ هامش الطحطاوي)

طحطاوی میں ہے: والارتفاع القليل وهو ما كان من نصف ذراع فأقل. (ص:۱۲٦)

طحطاوی علی الدر میں ہے: إذا سـجـد الـمـريض علىٰ شيء موضوع على الأرض صـح عـلـىٰ أنهـا سجود إن وجد قوة الأرض وكان ارتفاعه أقل من نـصف ذراع؛ وإلا فهـو إيـمـاء. قـال الـحلبي: وقوله: فكان ارتفاعه أقل من نـصف ذراع، ظـاهـره أن الارتـفـاع نـصف ذراع مـضر في السجود وليـس كـذلك؛ بـل الـمـضـر مـاكان أكثر عند عدم الضرورة. قال أبو السعود: ولو سجد علىٰ ما يجد حجمه من وسادة لم يكن ارتفاعها القدر المانع بأن كان قـدر لبـنة أو لبـنتيـن جـاز عـلـىٰ أنها بركوع وسجود، انتهىٰ. وقال في شرح

الملتقیٰ: إلا أن يجد قوة الأرض فتكون صلاته بالركوع والسجود، كما أفاده المصنف. واستفيد من هذين النصين أن الركوع في هذه المسئلة حقيقي كالسجود. (طحطاوي على الدر ۱/۵۰۵)

منقولہ بالا عبارات سے یہ بات صاف ہوگئی کہ، جو آدمی سپاٹ زمین پر سجدہ کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو اور وہ کوئی اونچی سخت اور ٹھوس چیز رکھ کر سجدہ کرے بہ شرطے کہ اُس کی اونچائی ایک بالشت سے زیادہ نہ ہو تو اس کو حقیقتاً سجدہ کرنے والا سمجھا جائے گا، اور اس کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ: وہ سجدہ کرنے سے معذور ہے، لہٰذا بہ ذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے اس کا سجدہ کرنا معتبر نہ ہوگا، اور اس کی وہ نماز درست قرار نہ دی جائے گی۔

صاحب درمختار بہ ذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے کیے جانے والے رکوع اور سجدہ کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ويجعل سجوده أخفض من ركوعه لزوما، ولا يرفع إلىٰ وجهه شيئا يسجد عليه فإنه يكره تحريما، فإن فعل للبناء على المجهول –ذكره العيني– وهو يخفض برأسه لسجوده أكثر من ركوعه صح علىٰ أنها إيماء لا سجود؛ إلا أن يجد قوة الأرض، وإلا يخفض لا يصح لعدم الإيماء. (در علىٰ هامش الشامي ۱/۵٦۱)

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: (قوله إلا أن يجد قوة الأرض) هذا الاستثناء مبني علىٰ أن قوله: ولا يرفع إلخ شامل لما إذا كان موضوعا على الأرض، وهو خلاف المتبادر؛ بل المتبادر كون المرفوع محمولا بيده أو يد غيره

وعليه، فالاستثناء منقطع لاختصاص ذلك بالموضوع على الأرض؛ ولذا قال الزيلعي: كان ينبغي أن يقال: إن كان ذلك الموضوع يصح السجود عليه كان سجودا؛ وإلا فإيماء. اه وجزم به في شرح المنية، واعترضه في النهر بقوله: وعندي فيه نظر؛ لأن خفض الرأس بالركوع ليس إلا إيماء، ومعلوم أنه لايصح السجود بدون الركوع ولو كان الموضوع مما يصح السجود عليه. اه أقول: الحق التفصيل، وهو: أنه إن كان ركوعه بمجرد إيماء الراس من غير إنحناء وميل الظهر فهذا إيماء لا ركوع، فلايعتبر السجود بعد الإيماء مطلقا، وإن كان مع الانحناء كان ركوعا معتبرا حتىٰ أنه يصح من المتطوع القادر على القيام، فحينئذ ينظر إن كان الموضوع مما يصح السجود عليه كحجر مثلا ولم يزد ارتفاعه علىٰ قدر لبنة أو لبنتين فهو سجود حقيقي، فيكون راكعا ساجدا لا مومئا، حتىٰ أنه يصح اقتداء القائم به، وإذا قدر في صلاته على القيام يتمها قائما، وإن لم يكن الموضوع كذلك يكون مومئا فلايصح اقتداء القائم به، وإذا قدر فيها على القيام استأنفها؛ بل يظهر لي: أنه لو كان قادرا علىٰ وضع شيء على الأرض مما يصح السجود عليه أنه يلزمه ذلك؛ لأنه قادر على الركوع والسجود حقيقة، ولايصح الإيماء بهما مع القدرة عليهما؛ بل شرطه تعذرهما، كما هو موضوع المسئلة. (۵٦۱/۱)

اِس میں خط کشیدہ عبارت کو بغور پڑھیں۔

(۴) جو آدمی حقیقۃً سجود پر قادر نہ ہو وہ بذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے سجدہ

کرے گا، اِس صورت میں کوئی چیز اٹھا کر اس کی پیشانی اور ناک کے ساتھ لگانے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ ایسا کرنا مکروہ ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جب اس کا سجدہ سر کے اشارہ سے ہورہا ہے تو پیشانی اور ناک کے زمین پر یا زمین پر رکھی ہوئی ایک بالشت یا اس سے کم اونچی کسی سخت چیز پر رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، گویا اس کا سجدہ پیشانی اور ناک سے نہیں؛ بلکہ سر کے اشارہ سے ادا ہورہا ہے، جب یہ صورت حال ہے تو کوئی چیز اٹھا کر اس کی پیشانی اور ناک سے لگانا فضول ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اوپر جو عبارات پیش کی گئیں اُن میں اِس کی بھی صراحت موجود ہے۔

اب آپ کے پہلے اشکال کا جواب صاف ہوگیا کہ، زمین پر ٹپائی وغیرہ سخت چیز جو زمین سے نو اِنچ یا اس سے کم اونچی ہو اس پر پیشانی رکھ کر جو نمازی سجدہ کرسکتا ہے، وہ چوں کہ حقیقتاً سجدہ پر قادر ہے؛ اِس لیے مفتی صاحب نے اُس کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ اس صورت میں اِسی طرح یعنی ٹپائی وغیرہ سخت چیز رکھ کر اس پر سجدہ کرے، اِس صورت میں صرف سر جھکا کر سر کے اشارہ سے سجدہ کرنا کافی نہیں۔ نیز چوں کہ یہ سجدہ حقیقی سجدہ ہے، بہ ذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے نہیں ہے؛ اس لیے یہ ٹپائی جو رکھی گئی ہے اُس کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی چیز اُس کے سر کی طرف اٹھائی گئی ہے، یہ ممانعت تو اُس وقت ہے جب کہ سجدہ بہ ذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے ہو؛ اِس لیے آپ نے چہرہ کی طرف کسی چیز کے اُٹھائے جانے کی ممانعت کے سلسلہ میں جو روایات اپنے سوال میں بہ طورِ اشکال درج کی ہیں وہ یہاں پیش نہیں کی جاسکتیں۔

حضرت مفتی صاحب زید مجدہم کے جواب کی تائید ''احسن الفتاویٰ'' کے جواب

سے بھی ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

’’اگر سر اتنا جھکایا جاسکتا ہو کہ زمین تک ایک بالشت یا اِس سے کم فاصلہ رہ جائے تو کسی اینٹ یا ٹپائی وغیرہ پر سجدہ کرنا لازم ہے، اشارہ سے نماز نہ ہوگی‘‘۔ الخ (احسن الفتاویٰ ۴/۵۵)

مولانا مفتی سلمان صاحب منصور پوری زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں:

جو شخص سپاٹ زمین پر سجدہ کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو اور کوئی اونچی چیز رکھ کر اس پر سجدہ کرے، تو اگر وہ چیز سخت اور ٹھوس ہے اور اس کی اونچائی دو اینٹ سے زیادہ نہیں ہے تو اُس کو حقیقتاً سجدہ کرنے والا سمجھا جائے گا، اور اسے سجدہ کرنے سے معذور قرار نہیں دیں گے، اور اسی طرح سجدہ کرنا اس پر لازم ہوگا۔ (کتاب المسائل ۱/۵۳۳)

آپ کا دوسرا اشکال ’’کرسی پر بیٹھ کر اشارہ سے سجدہ کرنا‘‘ کے عنوان کے ماتحت دیے گئے جواب پر ہے۔ پہلے مفتی صاحب کے جواب کی عبارت پیش کرتا ہوں، وہو ہذا:

’’جو نمازی کھڑے رہ کر نماز نہ پڑھ سکنے اور زمین پر بیٹھ کر نماز نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھے، تو اگر وہ نمازی اپنے سامنے سجدہ کی جگہ پر کوئی ٹیبل وغیرہ رکھ کر اس پر پیشانی رکھ کر سجدہ کر سکتا ہو اور وہ ٹیبل اونچائی میں کرسی کے برابر یا نو اِنچ اونچا ہو، اِس سے زیادہ اونچا نہ ہو تو اُس کے لیے اپنے سامنے اس طرح کا ٹیبل رکھ کر اُس پر سجدہ کرنا فرض ہے، کرسی پر بیٹھ کر اس طرح سجدہ کر سکنے کی صورت میں صرف سر کے اشارہ سے یا تھوڑا جھک کر سجدہ کرنا درست نہیں، اور اس صورت میں صرف سر کے اشارہ سے یا تھوڑا جھک کر سجدہ کرنے سے نماز صحیح نہ ہوگی‘‘۔

آپ کے اِس اشکال کا جواب دینے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ، سجدہ

کی حالت میں گھٹنوں کا زمین پر رکھنا کیا حکم رکھتا ہے؟ اِس سلسلہ میں تین قول ہیں: چناں چہ صاحب درمختار نے باب صفة الصلاة میں سجدہ میں جانے کی جو کیفیت بیان کی ہے، وہاں فرماتے ہیں: ویسجد واضعا رکبتیه أولاً لقربهما من الأرض ثم یدیه. اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله واضعا رکبتیه ثم یدیه) قدمنا الخلاف في أنه سنة أو فرض أو واجب؟. (درمختار مع الشامي ۱/۳۶۸) یعنی گھٹنوں کو زمین پر رکھنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے، کہ وہ سنت ہے یا فرض ہے یا واجب ہے؟ چناں چہ فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ اِس کے فرض ہونے کے قائل ہیں، علامہ شرنبلالیؒ نے ''نور الایضاح'' میں اِسی کو اختیار فرمایا ہے، چناں چہ "باب شروط الصلاة وأرکانها" کے ماتحت فرماتے ہیں: لابد لصحة الصلاة من سبعة وعشرین شیئا. آگے اِس کی تفصیل کرتے ہوئے انیسویں نمبر پر سجدہ کا طریقہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ووضع الیدین والرکبتین في الصحیح. (نور الایضاح ص: ۲۰۰ شائع کردہ: مکتبہ کنوز العلم)

لیکن فتویٰ اِس کی عدم فرضیت پر ہے، چناں چہ صاحب درمختار نے جہاں نماز کی سنتوں کو بیان کیا ہے وہاں پر تحریر فرماتے ہیں: ووضع یدیه ورکبتیه في السجود. (درمختار مع الشامي ۱/۳۵۲) جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ، صاحب درمختار کے نزدیک یہ سنت ہے۔ اِسی کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله ووضع یدیه ورکبتیه) هو ما صرح به کثیر من المشائخ، واختار الفقیه أبو اللیث الافتراض، ومشیٰ علیه الشرنبلالي، والفتویٰ علیٰ عدمه کما في التجنیس والخلاصة، واختار في الفتح الوجوب؛ لأنه مقتضی الحدیث مع المواظبة. قال في البحر: وهو إن

شاء الله أعدل الأقاويل لموافقة الأصول. اه وقال في الحلية: وهو حسن ماش على القواعد المذهبية، ثم ذكره أن يؤيده. (شامي ۱/۳۵۲)

اِس سے یہ معلوم ہوا کہ، اکثر مشائخ بوقت سجدہ گھٹنوں کو زمین پر رکھنے کی سنیت کے قائل ہیں، اگر چہ بقول علامہ شامیؒ راجح اور معتدل قول وجوب کا ہے۔

وہ شخص جو زمین پر بیٹھ کر سجدہ کرنے سے معذور ہے اور بیماری کی وجہ سے گھٹنوں کو زمین پر رکھ کر سجدہ نہ کر سکنے کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کر رہا ہے، اور اپنے سامنے ٹیبل وغیرہ ایسی چیز جس کی سطح اس کی کرسی کی سطح سے نو اِنچ سے زیادہ اونچی نہ ہو رکھ کر اُس پر پیشانی رکھ کر سجدہ کر سکتا ہے، تو کیا اُس کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے؟ جن حضرات کے نزدیک سجدہ میں گھٹنوں کو زمین پر رکھنا فرض ہے جیسے کہ صاحب نور الایضاح علامہ شرنبلالیؒ وغیرہ، اُن کے مسلک کے اعتبار سے تو جب یہ آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور زمین پر گھٹنے ٹیک کر سجدہ کرنے سے معذور ہے تو اس کے حق میں حقیقی سجود کا تحقق نہ ہونے کی وجہ سے بہ ذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے سجدہ کرنے کا حکم جاری ہوتا ہے؛ اِس لیے سامنے ٹیبل رکھ کر اس پر پیشانی رکھنے کی طاقت ہونے کے باوجود ایسا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں؛ کیوں کہ اس کا سجدہ بذریعۂ ایماء ہو رہا ہے، اور وہ ٹیبل پر پیشانی رکھنے پر موقوف نہیں؛ بلکہ اس کے بغیر بھی بذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے سجدہ کا تحقق ہو رہا ہے۔ البتہ جن حضرات کے نزدیک سجدۂ حقیقی میں گھٹنوں کو زمین پر رکھنا فرض نہیں؛ بلکہ واجب ہے، ان کے نزدیک جب یہ شخص اس پر قادر نہیں تو یہ وجوب اس سے ساقط ہو کر اس کے بغیر بھی اس کے حق میں سجدۂ حقیقی کا تحقق ہو سکے گا، اور جن حضرات کے نزدیک

یہ سنت ہے اُن کے نزدیک تو بصورت عذر بطریق اولیٰ سجدۂ حقیقی کا تحقق ہوگا؛ اِس لیے ان دونوں فریق کے بقول کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا معذور شخص سامنے ٹیبل رکھ کر جس کی اونچائی اُس کی کرسی کی سطح سے نو اِنچ سے زیادہ نہ ہو پیشانی رکھ کر سجدہ کرنے پر قادر ہے تو اُس کے حق میں سجود حقیقی کا تحقق ہونے کی وجہ سے اُس کے لیے ایسا کرنا ضروری قرار دیا جائے، اِسی میں احتیاط ہے۔ اِس لیے حضرت مفتی صاحب نے اپنے جواب میں جو لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔

''احسن الفتاویٰ'' میں ریل گاڑی اور بس میں نماز کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ نقل کیا جاتا ہے:

''ریل گاڑی اور بس میں کھڑے ہوکر قبلہ رخ نماز پڑھیں، گرنے کا خطرہ ہو تو کسی چیز سے ٹیک لگا کر یا ہاتھ سے کوئی چیز پکڑ کر کھڑے ہوں، حالتِ قیام میں ہاتھ باندھنا سنت ہے، فرض نہیں، اور قیام فرض ہے؛ اِس لیے بوقت ضرورت ہاتھ چھوڑ کر کسی چیز کو پکڑ کر کھڑا ہو۔ اگر قبلہ رخ ہونے کی گنجائش نہ ہو تو دو نشستوں کے درمیان قبلہ رخ کھڑا ہو کر قیام و رکوع کا فرض ادا کرے، اور سجدہ کے لیے پچھلی نشست پر کرسی کی طرح بیٹھ جائے یعنی پاؤں نیچے ہی رہیں، اور سامنے کی نشست پر سجدہ کرے، اِس صورت میں بحالتِ سجدہ گھٹنے کسی چیز پر نہیں ٹکیں گے؛ مگر سجدہ میں گھٹنے رکھنا فرض نہیں؛ بلکہ واجب یا سنت ہے، بوقت عذر اُس کے ترک سے نماز ہو جائے گی''۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۸۸)

نوٹ: اُس کو قیام کے بجائے بیٹھنے اور رکوع کے بجائے ایماء یعنی سر کے اشارہ سے رکوع کی اجازت اس لیے تھی کہ، اس کے حق میں یہ سمجھا گیا تھا کہ اس کا سجود حقیقی نہیں

ہے؛ بلکہ بذریعۂ ایماء یعنی سر کے اشارہ سے ہے، اور ایسا آدمی جو سجودِ حقیقی پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے سجدہ بذریعۂ ایماء کررہا ہو اُس کے لیے قیام ورکوع پر حقیقتاً قدرت ہوتے ہوئے بیٹھ کر سجدہ کی طرح رکوع بھی بذریعۂ ایماء ادا کرنا افضل ہے؛ لیکن اب جب کہ یہ محقق ہوگیا کہ، کرسی پر بیٹھ کر بھی سجدۂ حقیقی ہوتا ہے، تو کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا جو شخص قیام اور رکوع کرنے پر قادر ہے وہ بحالت قیام کرسی پر نہ بیٹھے؛ بلکہ کھڑا رہے، پھر بوقت رکوع حقیقتاً رکوع کرے، اور بوقت سجدہ کرسی پر بیٹھ کر کرسی کے سامنے رکھے ہوئے ٹیبل پر جس کی اونچائی کرسی کی سطح سے نو اِنچ سے زیادہ نہ ہو، سجدہ کرے؛ ورنہ اُس کی نماز نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، مؤرخہ: ۲۷/شوال ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

﴿ہم عن صلاتہم﴾ کی جگہ ﴿ہم صلاتہم﴾ پڑھنا

سوال: ”سورۂ ماعون“ کے اندر ﴿ہم عن صلاتہم﴾ کی بجائے ﴿ہم صلاتہم﴾ سے نماز ہوگی یا نہیں؟ اور وہ بھی امام کی تین مرتبہ یہ غلطی نکالنے کے باوجود وہ اپنی غلطی کا اقرار نہ کرے اور اسی حالت میں نماز کو پوری کرے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں نماز ہوجائے گی، ایک مرتبہ لقمہ دینے کے بعد بھی امام کسی غلط فہمی کی وجہ سے لقمہ قبول نہ کرے، تو لقمہ دینے والے کو اصرار نہ کرنا چاہیے، نماز کے بعد تنبیہ کردے، حالت نماز میں مقتدی کا لقمہ پر اصرار کرنا مناسب نہیں، اسی طرح امام کا

اس کو قبول نہ کرنا بشرطیکہ امام کا یہ فعل قصداً ہو، اگر وہ قبول نہیں کر رہا ہے کہ اپنی قرأت کو صحیح سمجھ رہا ہے تو وہ معذور ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

"فاقرۃ" کی جگہ "فراق" پڑھنا

سوال: اگر امام نے نماز میں ﴿تظن ان یفعل بھا فاقرۃ﴾ میں "فاقرۃ" کی جگہ "فراق" پڑھا، تو نماز میں کوئی حرج تو نہیں ہوا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورت مسئولہ میں نماز فاسد نہیں ہوئی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ، ۲۱/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

"وتواصوا بالصبر" پھر "وتواصوا بالحق" پڑھنا

سوال: امام نے نماز میں سورۃ العصر میں پہلے ﴿وتواصوا بالصبر﴾ پھر ﴿وتواصوا بالحق﴾ پڑھا، پھر بعد میں صحیح پڑھ لیا، تو نماز صحیح ہوگئی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورت مسئولہ میں نماز درست ہوگئی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زلۃ القاری کے اصول کے مراجع

سوال: نماز میں قرأت میں کن کن غلطیوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے؟ اس کے لیے مفتیٰ بہ اصول کیا کیا ہیں؟ حوالہ کے ساتھ مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ ایک مستقل موضوع ہے، جو تفصیلات و تمثیلات، اصول وضوابط اور فروع وجزئیات پر مشتمل ہے، ایک فتویٰ میں اس کا احصاء دشوار ہے، اس موضوع پر علامہ طحطاویؒ نے "مراقي الفلاح" کے حاشیہ میں اصولی کلام فرمایا ہے اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے نور الایضاح میں بطور تکمیل "باب زلة القاري" کے عنوان سے اس کا اضافہ مزید فرمایا ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں، انشاء اللہ آپ کے لیے کافی اور شافی ثابت ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

گھر پر رہ کر امام کی اقتداء کرنا

سوال: ایک شخص مسجد کے قریب والی بلڈنگ میں رہتا ہے، بہت ہی معذور ہے، مسجد میں آنے کی طاقت نہیں ہے، تنہا گھر میں نماز پڑھتا ہے، مگر وہ چاہتا ہے کہ امام کے ساتھ نماز پڑھوں، امام کی آواز گھر تک پہنچتی ہے، کیا وہ آواز پر نماز پڑھ سکتا ہے؟ امام کی اتباع کرسکتا ہے؟ مسجد میں اسپیکر ہے کہ اس کی آواز پر اگر کوئی معذور نماز امام کی اتباع میں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں اگر مسجد سے لے کر آدمی کے گھر تک صفوف کا اتصال ہے، تو اقتداء درست ہوگی۔ ولم يختلف المكان حقيقة كمسجد، وبيت في الأصح. قنية.

ولاحکماً عند اتصال الصفوف، ولو اقتدى من سطح داره المتصله بالمسجد لم يجز لاختلاف المكان الخ. (درعلی هامش الرد ١/٤٣٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

امام سے پہلے رکوع سجدے میں چلے جانا

سوال: ہمارے یہاں ایک مسجد میں ایک امام صاحب طبیعت کے اعتبار سے ذرا موٹے ہیں اور ان کو نماز کے اندر انتقال کے اندر بڑی دشواری ہوتی ہے؛ یہاں تک کہ مقتدیان حضرات ان سے پہلے رکوع، سجدے میں چلے جاتے ہیں اور قیام کے لیے بھی ان سے پہلے ہی اٹھ جاتے ہیں، تو کیا ان امام صاحب کے لیے نماز پڑھانا مناسب ہے؟ بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

افعالِ صلاۃ کی ادائیگی میں امام سے قصداً سبقت کرنا مکروہ ہے۔

"مراقي الفلاح" میں ہے: يكره للمصلي سبعة وسبعون شيئاً تقريباً لا تحديداً: ترك واجب أو سنة .... كمسابقة الإمام لما فيها من الوعيد على ما في الصحيحين: اما يخشى أحدكم إذا رفع رأسه قبل الامام الخ. (مراقي الفلاح على هامش الطحطاوي ١٨٩)

اور یہ مسئلہ تمام ائمہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔ وبالجملة نفى التقدم كلاً وجزءاً والتأخر كلاً متفق بين الائمة. (معارف السنن ٣/٦٠) حدیث پاک میں اس پر وعید آئی ہے، "كما مرفي عبارة المراقي"۔

اب اگر امام صاحب موٹے ہیں، اس لیے ان کو انتقالات میں دیر ہوتی ہے، تو

مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ انتظار کریں اور جب امام صاحب رکوع، سجدہ میں پہنچ جائیں، تب مقتدی حضرات رکوع، سجدہ میں جائیں، اسی طرح امام صاحب رکوع، سجدہ سے اٹھ جائیں، تب مقتدی اٹھیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: إني قد بدنت، فإذا ركعت، فاركعوا، وإذا رفعت، فارفعوا، وإذا سجدت، فاسجدوا، ولا ألفينّ رجلا يسبقني إلى الركوع ولا إلى السجود. (سنن ابن ماجه شريف ٦٨، باب النهي عن أن يسبق الامام بالركوع والسجود) میرا جسم موٹا پا اختیار کر چکا ہے، اس لیے جب میں رکوع میں پہنچ جاؤں، تب تم لوگ رکوع میں جاؤ اور جب میں (رکوع سے) سر اٹھالوں، تب تم لوگ (رکوع سے) سر اٹھاؤ اور جب میں سجدہ میں پہنچ جاؤں، تب تم سجدہ کے لیے جاؤ، خبردار! میں تم میں سے کسی کو اپنے سے پہلے رکوع سجدہ میں جاتے ہوئے نہ پاؤں۔ بلکہ ایک روایت میں صراحۃً امام سے سبقت کرنے سے منع فرماتے ہوئے فرمایا گیا ہے: فإن الإمام يسجد قبلكم، ويرفع قبلكم، فتلك بتلك. (نسائی وابوداؤد) اس روایت پر تفصیل کلام فرماتے ہوئے علامہ بنوریؒ نے آخر میں تحریر فرمایا ہے: وإذن لا يكون نصا مسوقا في المعاقبة؛ بل يكون مسوقا لنفي المسابقة. (معارف السنن ٣/٥٨)

اس لیے مقتدیوں کو چاہئے کہ جلد بازی ترک کردیں اور اپنے عمل کی اصلاح کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

فرض قرأت کے بعد فاحش غلطی سے نماز کا فساد

سوال: اگر امام فرض نماز میں "مایجوز به الصلوٰة" قرأت کرنے کے بعد کوئی مفسدِ صلوٰۃ غلطی قرأت میں کرے، تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ جیسے سورہ بینہ میں ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ پڑھ لیا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فاسد ہوگی۔وإن تغير المعنى بأن قرأ: ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي جَحِيمٍ﴾ ﴿وإِنَّ الْفُجَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾ أو قرأ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ أو قرأ: ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ، أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنونَ حَقّاً﴾ تفسد صلوٰته؛ لأنه أخبر بخلاف ما أخبر الله تعالىٰ به، وقال بعضهم: لا تفسد صلوٰته لعموم البلوى، والأول أصح. (فتاوىٰ قاضي خان على هامش الهندية ١/١٥٣،١٥٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سلام پھیرنے کا مسنون طریقہ

سوال: (۱) بعض امام صاحبان ونمازی صاحبان سلام پھیرتے وقت پہلے چہرہ دائیں جانب یا بائیں جانب پھیر دیتے ہیں، پھر "السلام عليكم ورحمة الله" کہتے ہیں۔

(۲) اور بعض پہلے "السلام عليكم" کہتے ہیں، پھر چہرہ دائیں جانب یا بائیں جانب پھیرتے ہیں، پھر "ورحمة الله" کہتے ہیں۔

(۳) اور بعض لوگ پہلے "السلام علیکم ورحمة اللّٰه" پورا کہہ دیتے ہیں، پھر دائیں یا بائیں جانب سلام پھیرتے ہیں، ان تینوں طریقوں میں سے کونسا طریقہ صحیح ہے؟ اگر ائمہ کا اختلاف ہو تو اسے بھی واضح فرمائیں، اور احناف کا مسلک بھی وضاحت سے فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

سلام کے الفاظ کی ابتداء تو جانبِ قبلہ سے کردے، اس کے بعد دائیں یا بائیں جانب چہرہ پھیرتے ہوئے اس کو مکمل کرے۔ ''ترمذی شریف'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت قالت: كان رسول اللّٰه ﷺ يسلم في الصلوٰة تسليمة واحدة تلقاء وجهه، ثم يميل إلى الشق الأيمن شيئا" کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ فرماتے ہیں: أي يأخذ فيها من تلقاء وجهه، ويختمها إذا مال وجهه إلى اليمين، وكذا الحكم في تسليم اليسار؛ لكنها اكتفت بذكر تسليمة لما أن مقصودها بالذكر انما هو بيان التسليمة من أين تبتدأ وبيان كيفيتها كيف هى. (الكوكب الدري ١/١٤٠)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ رقمطراز ہیں: ولعله يريد أن المقصود بيان كيفية السلام هكذا، لابيان العدد، والكيفية هذه من إبتدائه تلقاء الوجه، وانتهائه في جانب اليمين، ذكره في المجموع والمغني وهو المعمول به عندنا. (معارف السنن ٣/١١١) حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ نے بھی "شرح سفر السعادة ٩٢" میں اس کو بیان فرمایا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نماز میں گھڑی دیکھنا

سوال: حالت نماز میں گھڑی دیکھنے سے نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر حالت نماز میں گھڑی دیکھنے سے فعلِ کثیر کا مرتکب نہیں ہوا ہے، تو نماز فاسد نہیں ہوئی؛ البتہ مکروہ ہے۔(کمایفهم من شرح المهذب للنووی ٤/٩٣،٩٤)

ولـو نظر إلیٰ مكتوب وفهمه فالصحيح أنه لاتفسد صلاته بالإجماع (هدایه اولین ١٣٨) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

ناپاک رومال جیب میں رکھ کر نماز پڑھادی

(۴) مجھے ناک میں پھوڑا ہونے کی بناء پر ناک صاف کرتے وقت خون نکلا، جس کا مجھے علم نہیں ہوا؛ چونکہ سردی ہوئی تھی، وہ قدرِ درہم خون والے رومال کو بھول سے جیب میں رکھ کر عصر و مغرب دو نماز پڑھادی، اب اعلان کر کے نماز دہرانی ہوگی یا نہیں؟ یہ مسئلہ میں نے آپ سے پوچھا بھی تھا، دراصل تکلیف دہ بات یہ ہوئی کہ میں نے جب یہ واقعہ پیش آیا تو دو تین معتبر اور ذی علم دوستوں سے معلوم کیا تھا، انھوں نے نماز درست ہونے کے بارے میں بتایا تھا، اس وجہ سے میں نے نماز نہیں دہرائی تھی؛ بہر کیف آپ جو فرمائیں اس پر انشاء اللہ عمل ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۴) اس رومال پر لگا ہوا خون اگر قدر درہم سے زائد تھا تو نماز نہیں ہوئی، اس کا اعادہ ضروری ہے، اعلان بھی کردے؛ تاکہ جن لوگوں نے وہ نماز آپ کے پیچھے پڑھی

ہے، وہ بھی اعادہ کرلیں، بوقت اعلان تفصیل بتلا دیجئے کہ یہ صورت پیش آئی تھی؛ تا کہ لوگوں کو بدگمانی اور تنقید کا موقعہ نہ ملے۔

''بہشتی زیور'' کے گیارھویں حصہ میں نماز کی شرطوں کے بیان میں جہاں طہارت کے مسائل مذکور ہیں، اس کا پہلا مسئلہ دیکھ لیجئے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نماز میں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال اور اس کی حفاظت کرنا

سوال: آلۂ مکبر الصوت کہ اس کے ذریعہ تراویح وفرائض، واجبات نمازیں پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟ اور آج کل آلۂ مکبر الصوت کی ایک جدید شکل ہے، وہ یہ ہے کہ آلۂ مکبر الصوت بالکل چھوٹا سا بنایا ہوا جس کو لے کر امام اپنے گریبان یعنی بٹن کی جگہ آویزاں کرتا ہے اور اس کی وائر مکمل اس کی مرکز مشین سے لے کر امام کے گلے تک لٹکی ہوئی رہتی ہے اور وہ وائر اور آلۂ مکبر الصوت دونوں امام کی ہر حالت میں سجدہ، قومہ، رکوع، قیام، قعدہ ہر حال میں امام کے ساتھ چسپاں رہتا ہے، مستقل اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے، اس طرح کے آلۂ مکبر الصوت کو نمازِ فرض وسنت، واجب کے لیے استعمال جائز ہے یا ناجائز ہے؟

ایک تو قدیمی شکل وہ ہے کہ آلۂ مکبر الصوت کو اسٹیل لوہے کی سٹیج پر باندھ کر امام یا مقرر کے سامنے تقریباً دو ڈھائی فٹ رکھا جاتا ہے، جس کے جز سے امام کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ پرانا آلۂ مکبر الصوت ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

اور آج کل جو جدید آلۂ مکبر الصوت ہے جو ہر حال میں اپنی ۲۰-۲۵ فٹ وائر کے ساتھ، یا کم از کم دس بارہ فٹ وائر کے ساتھ امام کے بغل وگریبان سے چسپاں رہتا ہے، اس کا استعمال کیسا ہے؟ کیا اس طرح ادا کردہ نماز واجب الاعادہ ہے یا نہیں ہے؟ مع دلائل وحوالہ کے واضح فرمائیں، یہ مسئلہ بہت ہی اُلجھا ہوا ہے، عام طور پر مساجد میں اس کا استعمال کیا جارہا ہے؛ جبکہ امام کو اس وقت اس آلۂ مکبر الصوت کی طرف اپنی گردن جھکاتے ہوئے متوجہ رہنا پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے بسا اوقات بھول بھی ہونے کا خدشہ رہتا ہے، یہاں پر اکثر علماء کی رائے اس کے ذریعہ نماز حرام ہونے کی ہے، بعض نا اہل حضرات کہتے ہیں اس کا ہونا ضروری ہے، تفصیل مطلوب ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تکبیرات انتقال کی آواز تمام مقتدیوں تک برابر پہنچ جاتی ہے، تو اس آلہ کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے اور اگر نہیں پہنچ پاتی ہے تو اس صورت میں معقول طریقہ سے مکبرین کا نظم ہوجاتا ہے، تو اس صورت میں بھی اس آلہ کو نماز میں استعمال نہ کریں اور اگر مکبرین کا معقول نظم نہیں ہو پاتا اور تکبیرات انتقال کی آواز تمام مقتدیوں تک برابر نہ پہنچ پانے کی وجہ سے نماز میں گڑبڑ ہوجاتی ہے، تو اس کے استعمال کی اجازت ہے اور نماز میں اس کے استعمال کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، چاہے جدید صورت ہو یا قدیم۔ جدید صورت میں اس کا مائیکروفون بذریعۂ کلیپ امام کے گریبان سے لگا دیا جاتا ہے، خود امام کو سنبھالنا نہیں پڑتا، اس میں امام کو اتنی توجہ بھی نہیں کرنی پڑتی، جتنی موسم سرما میں چادر اوڑھ کر نماز پڑھنے والوں کو چادر سنبھالنے میں کرنا پڑتی ہے، اس موضوع پر مستقل رسائل بھی لکھے گئے ہیں،

ان کا مطالعہ کرلیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حرمین شریفین میں عورتوں کا جماعت کی نماز میں شریک ہونا

سوال: حرمین شریفین میں خواتین کا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فقہ حنفی کی رو سے کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فقہاء احناف نے جہاں عورتوں کے لیے مسجد میں جماعت کی شرکت کو مکروہِ تحریمی لکھا ہے، وہاں مسجد حرام کا استثناء نہیں کیا ہے، اس لیے یہ حکم حرمین شریفین میں بھی جاری ہوگا۔ ویکره حضورهن الجماعة؛ ولو لجمعة، وعيد، ووعظ مطلقاً؛ ولو عجوزا ليلاً على المذهب المفتىٰ به، لفساد الزمان. (درمختار علی هامش الشامی ۱/ ۴۱۸، ۴۱۹)

معلم الحجاج میں ہے: ''مسئلہ: مسجدِ حرام تمام مسجدوں سے افضل ہے، اس میں نماز پڑھنے کا بڑا ثواب ہے، ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہوتا ہے، لیکن یہ ثواب کی زیادتی صرف فرض نماز کے ساتھ مخصوص ہے، نوافل کا ثواب اتنا نہیں، نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے، اسی طرح یہ ثواب صرف مردوں کو ہوتا ہے، عورتوں کو نہیں ہوتا، ان کو اپنے گھر میں نماز پڑھنی افضل ہے۔ (معلم الحجاج ۱۲۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

ٹیپ کی قرأت پر سجدۂ تلاوت، ٹیپ کی اذان ناکافی ہے

سوال: ٹیپ میں سجدۂ تلاوت کی قرأت ہوئی، تو سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب ہے کہ نہیں ہے؟ اور ٹیپ کی اذان کو ہر صلوٰۃ کے وقت لگادیا جائے، تو درست اور کافی ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس میں اگر کوئی آیتِ سجدہ پڑھی جائے، تو اس سے سجدہ واجب نہیں ہوتا؛ کیونکہ فقہاء تحریر فرماتے ہیں: کہ سامع پر وجوبِ سجدہ کے لیے یہ شرط ہے کہ پڑھنے والے میں خود بھی وجوبِ سجدہ کی اہلیت وصلاحیت ہو، گو بالفعل اس کے ذمہ واجب ہو یا نہ ہو، اسی وجہ سے سونے والے آدمی یا مجنون مطبق کی زبان سے اگر آیتِ سجدہ نکل جائے یا کسی جانور طوطے وغیرہ کو آیت سجدہ سکھادی جائے، تو ان سب صورتوں میں اس کے سننے والے پر سجدہ واجب نہیں ہوتا؛ کیونکہ ان میں اہلیت وجوبِ سجدہ کی نہیں ہے، بخلاف حیض ونفاس والی عورت کے، کہ اگر وہ آیتِ سجدہ پڑھ دیں، تو گو اس وقت ان کے ذمہ سجدہ واجب نہ ہوگا؛ مگر ان میں اہلیتِ وجوب موجود ہونے کی وجہ سے سننے والوں پر سجدہ واجب ہوجائے گا۔ (آلات جدیدہ ۱۳۵، ۱۳۶)

ٹیپ میں بند کی ہوئی اذان کو ہر نماز کا وقت آنے پر لگا دینا کافی نہیں ہے؛ اس لیے کہ اذان کا مقصود وقتِ نماز کے داخل ہونے کی خبر دینا ہے، اور یہ وہ خبر ہے جس کا تعلق دیانت سے ہے، اور ایسی خبر کے معتبر اور مقبول ہونے کے لیے اسلام، عقل، بلوغ، عدالت وغیرہ کی ضرورت ہے، جو ٹیپ میں موجود نہیں ہے۔

أن المقصود الأصلي من الأذان في الشرع الاعلام بدخول أوقات

الـصلوٰة، ثم صار من شعار الاسلام في كل بلدة، أو ناحية من البلاد الواسعة على مامر، فمن حيث الاعلام بدخول الوقت، وقبول قوله لابد من الاسلام، والعقل، البلوغ، والعدالة الخ (شامی ۱/۲۹۰)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اذان واقامت سے پہلے تعوذ وتسمیہ پڑھنا

سوال: اذان واقامت سے قبل اعوذ باللہ، بسم اللہ، درود شریف کا بلند آواز سے پڑھنا کیسا ہے؟ اگر پڑھتا ہے تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ اگر نہیں پڑھتا ہے تو کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب لکھیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اذان یا اقامت سے پہلے اعوذ باللہ، اور بسم اللہ سراًیا جہراً پڑھنا ثابت نہیں ہے، اس لیے اعوذ باللہ اور بسم اللہ نہ بلند آواز سے پڑھے، نہ پست آواز سے پڑھے۔(احسن الفتاویٰ ۲/۲۸۷)

اذان واقامت سے پہلے بلند آواز سے یا آہستہ سے درود شریف پڑھنا بھی بدعت ہے۔

''طحطاوی'' میں ہے:ومن المكروهات الصلوٰة علي النبي ﷺ في ابتداء الاقـامة؛ لأنـه بدعة. (۱۰۸)(اقامت کے شروع میں نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا مکروہ ہے؛ کیونکہ یہ بدعت ہے)۔

''احسن الفتاویٰ'' میں ہے: درود شریف کا موقع شریعت نے اذان کے بعد بتایا ہے، نہ کہ اذان سے پہلے؛ لہذا اذان سے پہلے درود شریف پڑھنا، خواہ بلند آواز سے ہو یا آہستہ؛ بہر کیف ناجائز اور بدعت ہے، اور دین میں اپنی طرف سے زیادتی ہے، اس کی

مثال ایسی ہے، جیسے کوئی نماز کے آخر کے بجائے نماز شروع کرتے ہی سبحانک اللّٰھم الخ کے بجائے درود شریف پڑھنے لگے، اور روکنے والے کو درود شریف کا منکر بتائے۔ (از آداب اذان واقامت ۱۴۰) (۱/ ۳۶۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

غیر مؤذن کا اقامت کہنا

سوال (۱۰) مؤذن اذان دیتا ہے تو تکبیر دوسرا بول سکتا ہے یا نہیں؟ مؤذن سے اجازت لے کر تکبیر بولنے کا کہ موذن ہی تکبیر بول سکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بول سکتا ہے۔ وفي الفتاوى الظهيرية: والأفضل أن يكون المقيم هو المؤذن ولو أقام غيره جاز. (بحر الرائق ۱/ ۲۷۰۔ شامی ۲/ ٦٤ ز کریا) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چین والی گھڑی پہن کر نماز پڑھنا

سوال: چین والی گھڑی پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ چین والی گھڑی پہن کر نماز مکروہ ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر چین (پٹہ) سونے یا چاندی کا نہیں ہے، تو نماز مکروہ نہ ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۹/ ۳۶۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کویت پر حملہ میں قنوت نازلہ پڑھنا

سوال: یوم عاشورہ کو عراق نے کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، جس سے وہاں کی معیشت پر بڑا نقصان پہنچا اور نتیجہ یہاں تک پہنچ چکا کہ امریکہ وغیرہ عراق کے

خلاف جنگ کی تیاری میں ہیں، عراق نے بھی اعلان کر دیا ہے، مزید تفصیل آپ کو معلوم ہوگی؛ بہرحال کیا ان حالات میں ابھی سے قنوتِ نازلہ کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں قنوت نازلہ نہیں ہے۔(فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۷۳/۷)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۸/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

خانۂ کعبہ وغیرہ کی تصویر والے مصلّٰی پر نماز پڑھنا

سوال: ایسے جائے نماز جس میں کعبۃ اللہ یا مدینۃ المنورہ یا بیت المقدس یا بزرگانِ دین کے مزارات کی تصویر، یا عکس بنی ہوئی ہو، اس پر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ جواز کا عدم جواز کا؟ .... زید کہتا ہے جواز وعدمِ جواز کا مسئلہ معلوم نہیں؛ البتہ بے ادبی اور بے حرمتی ہوتی ہے؛ کیونکہ پاؤں کے نیچے ہوتی ہے، یہ تصویر یا عکس جو جائے نماز میں بنایا گیا ہے یہ یہود و نصاریٰ کی سازش ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور بے ادبی اور بے حرمتی ہوتی ہے یا نہیں؟ جوابِ شافی سے مدلل سمجھائیں، اگر بے حرمتی ہوتی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس قسم کی جائے نماز پر نماز پڑھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

في غنية المستملي: وأما صورة غير ذي روح، فلا خلاف في عدم

کراهة الصلوٰة عليها، أو إليها. (٣١٤)

اوراس تصویر سے خانۂ کعبہ کی تعظیم میں کوئی فرق نہیں آتا؛ کیونکہ تصویر کا حکم عین شئ کا نہیں ہوتا، دوسرے خود خانۂ کعبہ میں جب نماز پڑھی جاتی ہے، تو وہاں بھی زمین پیروں کے نیچے ہوتی ہے، جب وہ تعظیم کے منافی نہیں تو تصویر کا پیروں کے نیچے ہونا بطریقِ اولیٰ تعظیم کے منافی نہ ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ ۷/۱۱۱ بحذف یسیر)

ایک رکن میں بار بار کھجلانا

سوال: ایک ہی رکن میں تین سے زائد مرتبہ ہاتھ چھوڑ کر کھجلانا یا کپڑے کو کھینچنا، کیا ان چیزوں سے نماز فاسد ہوجاتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

تین دفعہ کھجلانے سے مطلقاً نماز فاسد نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ اس وقت مفسد ہے کہ ہر دفعہ ہاتھ اٹھائے، اگر ہر دفعہ علیحدہ ہاتھ نہ اٹھائے؛ بلکہ ایک ہی دفعہ ہاتھ اٹھا کر تین دفعہ کھجلایا تو نماز فاسد نہ ہوگی؛ نیز اگر ایک بار کھجلانے کے بعد بقدرِ رکن، یعنی: تین بار "سبحان ربي الأعلى" کی مقدار تک توقف کے بعد کھجلایا، تو اس طرح تین بار کھجلانا بھی مفسد نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۳/ ۴۱۷)

بلاضرورت ایک بار بھی کھجلانا مکروہ تحریمی ہے اور نماز واجب الاعادہ ہے، اگر کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے کہ بدونِ کھجلائے نماز میں یکسوئی نہ ہو، تو ایک یا دو بار کھجلانا بلا کراہت جائز ہے اور تین بار اس طرح کھجلانا کہ درمیان میں بقدرِ رکن توقف نہ ہو؛ بہر حال مفسد نماز ہے، اگر چہ ضرورت ہی سے ہو۔ (ایضاً ۳/ ۴۱۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

آیت چھوڑنے سے نماز میں نقص نہیں آتا

سوال: زید نے فجر کی نماز پڑھائی، دوسری رکعت میں ایک آیت ﴿وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا﴾ اتنا پڑھا تھا اور اگلی آیت بھول گئے ﴿انك ان تذر هم يضلوا عبادك ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا﴾ یہ پوری آیت چھوڑ گئے، سلام پھیرنے کے بعد ایک مقتدی نے بطورِ یاددہانی کے کہا کہ ایک آیت چھوٹ گئی ہے، اس پر امام صاحب سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم نے مجمع عام کے سامنے میری بے عزتی کی، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح قرآن چھوٹ جانے سے نماز ہوئی یا نہیں؟ اور جس ایک آیت کی تلاوت امام نے کی وہ "قدر مایجوز به الصلوٰۃ" کی مقدار ہو جاتی ہے؟ تشویش ہے کہ اس صورتِ مذکورہ میں نماز ہوگئی یا کہ فاسد ہوئی، جس کا اعادہ ضروری ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ امام کے قرأت چھوڑ دینے پر اگر اس کو یاد دلایا جائے، تو کیا واقعی یہ بے عزتی ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں اگر امام نے سورۂ فاتحہ کے بعد صرف یہی ایک آیت ﴿وقال نوح رب الخ﴾ پڑھی ہے، تب بھی نماز درست ہوگئی، نہ تو نماز فاسد ہوئی اور نہ سجدۂ سہو واجب ہوا، آگے والی آیت چھوڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہا مقتدی کا امام کو یہ بتلانا کہ ایک آیت چھوٹ گئی، اس میں امام کی کوئی بے عزتی نہیں ہے، امام کو چاہئے تھا کہ مقتدی کو مسئلہ بتلا کر مطمئن کر دیتا، اس سے ناراض یا اس پر غصہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی اور اگر مقتدی نے بتلانے کے لیے کوئی ایسا نامناسب طریقہ اختیار کیا ہو، جس سے امام کی

دل آزاری ہوئی، تو یہ اس کی غلطی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مکروہ وقت میں سجدۂ تلاوت

سوال: (۱) اگر اوقات مکروہ میں سجدۂ تلاوت آ گیا، کیا احناف کے یہاں اس وقت سجدہ کر سکتے ہیں؟ کہ وقت گزرنے کے بعد کیا جائے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اگر آیتِ سجدہ وقتِ کامل میں پڑھی گئی تھی، تو اس سے واجب شدہ سجدۂ تلاوت وقتِ مکروہ میں کرنے سے ادا نہ ہوگا، اور اگر تلاوت وقتِ مکروہ میں کی گئی اور اسی وقت سجدہ بھی کر لیا، تو کراہت تنزیہہ کے ساتھ ادا ہوگا۔ (درمختار مع الشامی ۱/ ۲٦٥) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قعدہ کرنے نہ کرنے میں امام ومقتدی کے مابین اختلاف، کس کا قول معتبر ہے؟

سوال: زید امام ہے، ظہر کی نماز میں امامت کی، دو رکعت ختم کر کے تیسری رکعت میں سجدہ کے بعد بجائے قیام کے بھول سے بیٹھ گیا، ابھی پوری طرح بیٹھا بھی نہیں تھا کہ خود امام کو بھی یاد آ گیا اور مؤذن صاحب نے بھی لقمہ دیا، اور امام فوراً چوتھی رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا، وہ رکعت پوری کر کے سلام پھیر کر نماز ختم کی، دعاء کے بعد ایک مقتدی صاحب جو تیسری صف میں تھے، انھوں نے کہا کہ نماز ہوئی کہ نہیں؟ امام نے جواب دیا نماز ہو گئی، سجدہ سہو کی ضرورت نہیں، یہ کہہ کر امام باہر صحنِ مسجد میں اپنی سنت پڑھنے لگے،

اس وقت نماز میں دو عالم بھی تھے، کسی اور مقتدی کی جانب سے کوئی بات نہیں ہوئی، جس مقتدی نے سوال کیا ان کا کہنا ہے کہ قعدہ اولیٰ نہیں کیا، اور لقمہ دیا تو نہیں لیا، اور تیسری رکعت میں قعدہ کیا، جبکہ امام کو یقین ہے کہ دوسری رکعت میں قعدہ کیا ہے، اور تیسری رکعت میں بھول سے بیٹھ گیا؛ لیکن اتنی مقدار نہیں جس سے سجدہ سہو لازم آتا ہو، تو اس میں نماز صحیح ہوئی کہ نہیں؟ اور امام کے قول کا اعتبار ہوگا یا اس ایک مقتدی کا قول معتبر ہوگا جبکہ وہ صاحب ڈاڑھی بھی نہیں رکھتے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں امام کا قول معتبر ہوگا، نماز ہوگئی، نہ سجدۂ سہو ہے، نہ اعادہ کی ضرورت۔ (درمختار مع الشامی ۱/۵۵۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نوافل کی جماعت جہراً قرأت کے ساتھ

سوال: قابلِ احترام محترم مفتی صاحب حسبِ ذیل چند سوالات مکتوب ہیں:

(۱) دن میں نوافل جماعت سے پڑھنا اور اس میں جہراً قرأت کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نوافل کی جماعت (چاہے دن میں ہو یا رات میں) اگر علی سبیل التداعی ہے تو مکروہ ہے، علی سبیل التداعی کا مطلب یہ ہے کہ امام کے علاوہ چار مقتدی ہوں، اور اگر مقتدی تین ہوں تو کراہت میں اختلاف ہے، ایک یا دو مقتدیوں کے ساتھ جماعت اگرچہ بلا کراہت جائز ہے؛ مگر اس میں بھی جماعت کی فضیلت اور ثواب نہیں۔

يكره ذلك لو على سبيل التداعي؛ بأن يقتدى أربعة بواحد، كما في

الدرر. (درمختار) قال ابن عابدين الشامي: أما اقتداء واحد بواحد، أو إثنين بواحد فلا يكره، وثلاثة بواحد فيه خلاف، بحر عن الكافي. وهل يحصل بهذا الاقتداء فضيلة الجماعة؟ ظاهر ما قدمناه من أن الجماعة في التطوع ليست بسنة يفيد عدمه، تأمل. (درمختار مع الشامي ۱/ ۵۲٤)

دن میں پڑھی جانے والی نفل میں قرأت سراً ہی کی جائے گی، جہراً درست نہیں۔ کمتنفل بالنهار فإنه يسر. (درمختار على هامش الشامى ۱/ ۳۹٤)

اگر جہراً قرأت کرے گا تو سجدۂ سہو واجب ہے۔ والجهر للإمام، والاسرار للكل فيما يجهر فيه ويسر. (درمختار) قال ابن عابدين: والاسرار يجب على الامام والمنفرد فيما يسر فيه الخ (شامی ۱/ ۳٤٦) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

دیر سے رمضان کا ثبوت ہوا وتر کا اعادہ نہیں

سوال: (۲) عشاء کی نماز و وتر پڑھ لینے کے بعد دیر سے رمضان کے چاند ہونے کی خبر پہونچی، تو کیا تراویح پڑھنے کے بعد وتر کو دوبارہ جماعت سے پڑھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اس صورت میں وتر کا اعادہ نہیں ہے۔ قال في التنوير: ووقتها بعد صلوٰة العشاء قبل الوتر وبعده. (رد المحتار بحوالۂ احسن الفتاوی ۳/ ٤۹۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

جماعت کا وقت ہونے کے بعد پانچ منٹ کی تاخیر

سوال: جماعت کا وقت ہونے کے بعد امام کے لیے پانچ منٹ انتظار کرنے میں کیا حرج ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ امام کو تاخیر کی عادت نہیں بنانی چاہئے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شوافع کے یہاں نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت

سوال: زید ایک شافعی مذہب کا امام ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت مسنون ہے؛ لہذا عوام کو بتا کر دو رکعت پڑھنا شروع کر دیا بعد اذان، سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح اس کا کہنا از روئے شرع درست ہے؟ کیا شوافع مذہب میں کوئی گنجائش ہے کہ مغرب کی نماز تاخیر کر کے اس دو رکعت کا اہتمام کیا جاوے؟ اور اس طرح تاخیر کرنے سے وقتِ مکروہ تو داخل نہیں ہو جاتا ہے، جواب سے نوازیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے ''شرحِ مہذب'' میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ پیشِ خدمت ہے:

''باب الاذان'' میں متن کی عبارت: والمستحب ان يقعد بين الاذان والاقامة قعدة ينتظر فيها الجماعة الخ کی شرح فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اما حكم المسئلة: فاتفق اصحابنا على استحباب هذه القعدة قدر ما تجتمع الجماعة؛ إلا فى صلوٰة المغرب؛ فانه لا يؤخرها لضيق وقتها، ولان الناس فى العادة يجتمعون لها قبل وقتها، ومن تأخر عن التقدم لا يتأخر عن اول الصلاة ولكن يستحب ان يفصل بين اذانها واقامتها فصلا يسيرا بقعدة او سكوت او نحوهما هذا مذهبنا، لا خلاف فيه عندنا، وبه قال احمد

و ابـويـوسف ومـحـمـد وهـو رواية عـن ابي حنيفة وقال مالك وابوحنيفة فى المشهور عنه لا يقعد بينها. (شرح المهذب ۱۲۱/۳)

ایک دوسرے مقام پر "باب صلوٰة التطوع" میں رقمطراز ہیں:

(فـرع) فـى استـحبـاب ركـعتين قبل المغرب وجهان مشهوران فى طريقة الخراسانيين، الصحيح منها الاستحباب.

اس کے بعد بطورِ دلیل چند احادیث نقل فرما کر تحریر فرماتے ہیں:

فهـذه الاحاديث صحيحة فى استحبابها، وممن قال به من اصحابنا ابـو اسحق الطوسى وابوزكريا السكرىٰ حكاه عنها الرافعى، وهذا الاستحباب انـما هو بعد دخول وقت المغرب وقبل شروع المؤذن فى اقامة الصلوٰة، واما اذا شـرع الـمـؤذن فـى الاقـامة، فيـكره ان يشرع فى شيء من الصلوات غير المكتوبة الخ. (شرح المهذب ٤/٩)

علامہ نوویؒ شرحِ مسلم میں فرماتے ہیں:

ولا خلاف فى شيء منها عند اصحابنا الا فى الركعتين قبل المغرب فـفيهـا وجهـان لأصـحابنا اشهر هما لا يستحب، والصحيح عند المحققين استحبابها. (نووی شرحِ مسلم ۲۵۱/۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت ملادی، یا قعدہ اولیٰ بھول گیا، یا دوسری کے بعد کھڑا ہوگیا؛ مسلکِ شافعی میں نماز کا حکم

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں امام نے چار رکعت والی

نماز میں اخیری قعدہ نہیں کیا، اور پانچویں رکعت کے لیے سیدھا کھڑا ہوگیا، پانچویں رکعت ادا کر کے التحیات کے بعد سجدۂ سہو کیا، اب یہ نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ شافعی مسلک سے جواب دیجئے۔

(۲) امام نے چار رکعت والی نماز میں دوسری رکعت پر سلام پھیر دیا، اس کے بعد مقتدیوں اور امام نے کلام کیا، پھر امام نے کھڑا ہوکر باقی دو رکعت ادا کی، اور اخیر میں سجدۂ سہو کیا، اب امام اور مقتدیوں کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ شافعی مسلک سے جواب دیجئے۔

(۳) امام چار رکعت والی نماز میں پہلا قعدہ بھول گیا اور سیدھا کھڑا ہوا، پھر نماز پوری کر کے اخیر میں سجدۂ سہو کیا، شافعی مسلک سے جواب دیجئے۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

(۱) صورتِ مسئولہ میں شافعی مسلک کے اعتبار سے نماز ہوگئی۔

إذا قام إلى الخامسة في صلوٰة رباعية، ثم تذكر قبل أن يسلم، فعليه أن يعود إلى الجلوس ويسجد للسهو، سواء تذكر في قيام الخامسة أو ركوعها أو سجودها، وإن تذكر بعد الجلوس فيها سجد للسهو ويسلم. (فتح العزيز شرح الوجيز ٤/١٦٢)

(۲) اگر کلام کرنے والے کو اپنا نماز میں ہونا یاد نہیں رہا، اور کلام قلیل ہے تو نماز ہوگئی، اور کثیر ہونے کی صورت میں نماز باطل ہوجاوے گی۔

أو تكلم ناسيا كونه في الصلوة، أو جاهلا تحريم الكلام فيها، فإن كان ذلك يسيراً لم تبطل صلوته بلا خلاف عندنا، وإن كان كثيراً فوجهان مشهوران،

الصحيح منهما باتفاق الاصحاب تبطل صلوته، وهو المنصوص في البويطي كما ذكر المصنف، وهو ظاهر نصه ايضاً في غير البويطي الخ (شرح مهذب ۸۰/۴)

الذي يقتضى سجود السهو امران: زيادة ونقصان، فأما الزيادة فضربان: قول وفعل، فالقول أن يسلم في غير موضع السلام ناسيا أو يتكلم ناسياً فيسجد للسهو، والدليل عليه أن النبي ﷺ سلَّم من اثنين وكلم ذا اليدين، وأتم صلوته وسجد سجدتين الخ (المجموع شرح المهذب ۱۲۴/۴)

(۳) نماز ہوگئی۔

إذا قام إلى الثالثة ناسيا فإن انتصب لم يعد إلى التشهد الخ...... ......

قد سبق أن فوات التشهد الأول يقتضي سجود السهو. (شرح الوجيز ۱۵۶/۴) فقط والله تعالیٰ أعلم۔

نوٹ: ہمارے دارالافتاء میں حنفی مسلک کے مطابق جواب دیے جاتے ہیں؛ لیکن آپ کی طلب پر کتبِ شوافع سے رجوع کرکے فقہ شافعی کے مطابق جواب دیا گیا ہے، اس لیے کسی شافعی مفتی کی تصدیق کے بعد ہی مندرجۂ بالا جوابات کو قابلِ عمل سمجھیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسائل الصفوف

نمازی کے سامنے سے گذرنے کی حد

سوال: مسجدِ صغیر و کبیر کی فقہاء نے کیا تحدید بیان کی ہے، یعنی مرور بین یدی المصلی کے مسئلہ میں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اتنی چھوٹی مسجد یا کمرہ یا صحن میں نماز پڑھ رہا ہو کہ اس کا کل رقبہ چالیس ہاتھ ۳۶ء۸/ مربع میٹر سے کم ہے، تو نمازی کے سامنے سے گزرنا مطلقاً ناجائز ہے، خواہ قریب سے گزرے یا دور سے؛ بہرحال گناہ ہے؛ البتہ اگر کھلی فضاء میں یا ۳۶ء۸/ مربع میٹر یا اس سے بڑی مسجد یا بڑے کمرے میں یا بڑے صحن میں نماز پڑھ رہا ہے، تو سجدہ کی جگہ پر نظر جمانے سے آگے جہاں تک بالتبع نظر پہنچتی ہو وہاں تک گزرنا جائز نہیں، اس سے ہٹ کر گزرنا جائز ہے، بندہ نے اس کا اندازہ لگایا تو سجدہ کی جگہ سے ایک صف کے قریب ہوا؛ لہذا نمازی کے موضع قیام سے دوصف کی مقدار (تقریباً آٹھ فٹ ۴۴ء۲/ میٹر چھوڑ کر گزرنا جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۳/ ۴۰۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

محراب حائل ہو تو پہلی صف کونسی شمار ہوگی؟

سوال: تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر مسجدوں میں منبر محراب سے باہر ہوتا ہے، جس کے حائل ہونے کی وجہ سے جمعہ کے روز پہلی صف منقطع ہو جاتی ہے، تو اس صورت میں وہ

صف پہلی صف شمار ہوگی؟ اس میں کھڑا رہنے والا صف اول کا ثواب پائے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وہ پہلی صف شمار ہوگی۔ فلا ینقطع الصف ببنائها كما لا ينقطع بالمنبر الذي هو داخلها فيما يظهر. (شامی ۴۲۱/۱)

جب وہ پہلی صف ہے تو اس میں کھڑے رہنے والے کو صف اول کا ثواب بھی ملے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

صفوں کی درستگی کے دو طریقے

سوال: عرض یہ ہے کہ تبلیغی اجتماع کے موقعہ پر نماز سے کچھ پہلے صفیں درست کروائی جاتی ہیں، پھر اقامت کہی جاتی ہے تو یہ طریق اقامت کے موضوع لہ کے خلاف ہے، اگر دوسرا طریق اختیار کیا جائے کہ پہلے اقامت کہہ دی جائے، پھر صفیں درست کروائی جائیں، تو تکبیر تحریمہ اور اقامت کے درمیان فصل طویل ہو جاتا ہے، جو محمود نہیں ہے؛ لہٰذا ایسے طریق کی طرف رہنمائی فرمائیں جس میں دونوں پہلو کی رعایت ہو جائے؛ نیز یہ کہ دور نبوی یا دور صحابہ میں مصلی حضرات کی کثرت کے باوجود اس صورت کی نظیر ملتی ہے یا نہیں جو تبلیغی اجتماع کے موقعہ پر تسویۂ صفوف کے لیے اختیار کی جاتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ نے صفوں کی درستگی کے سلسلہ میں جن دو طریقوں کا تذکرہ اپنے سوال میں کیا ہے، شرعاً دونوں بلا کراہت درست ہیں۔

پہلے طریقہ کے متعلق "عمدۃ الفقہ" میں ہے: صفیں سیدھی کرنے کے لیے تکبیر شروع

کرنے سے پہلے سب مقتدیوں کا کھڑا ہونا جائز ہے، اوراس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ عوام الناس کی سستی اوراہتمام کی کمی کے باعث حی علی الفلاح پر کھڑا ہونے سے امام کی تحریمہ کے وقت تک صفیں سیدھی نہیں ہوتیں؛ بلکہ پہلے کھڑے ہونے پر بھی دیر لگاتے ہیں، اس طرح اقامت اورامام کے تحریمہ (نیت باندھنے) میں فاصلہ ہوجاتا ہے یا پھر امام نیت باندھ لیتا ہے، اورلوگ صفیں سیدھی کرنے کے لیے کہتے رہتے ہیں جس سے لوگوں کو نیت باندھنے میں الجھنیں ہوتی ہے؛ پس اس ضرورت کی وجہ سے افضل وراجح یہ ہے کہ تکبیر (اقامت) شروع ہونے سے پہلے کھڑے ہوکر صفیں سیدھی کرلی جائیں۔ (عمدۃ الفقہ ۲/ ۳۵)

دوسرے طریقہ کے متعلق فتاوی رحیمیہ میں ہے: صفوں کو درست کرنے کے لیے اگر کسی شخص کو مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتو امام کسی کو بھی مقرر کرسکتا ہے اورصفوں کی درستگی تک نماز شروع کرنے میں تاخیر کرسکتا ہے۔

ترمذی شریف میں ہے: روی عن عمر رضی اللہ عنہ أنـه كان يؤكل رجلاً باقامة الـصـفـوف، ولايكبر حتى يخبر أن الصفوف قداستوت. وروي عن على رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ انهما كانايتعاهدان ذلك ويقولا ن استووا. یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفیں درست کرنے کے لیے ایک شخص کو مقرر کیا تھا اور جب تک آپ کو صفیں درست ہونے کی خبر نہ دی جاتی آپ تکبیر تحریمہ نہ کہتے۔ حضرت علی اورعثمان رضی اللہ عنہما کا بھی یہی معمول تھا، اور فرماتے: ''استووا'' سیدھے کھڑے رہو! (ترمذی شریف ۱/ ۳۱ باب ماجاء فی اقامة الصفوف)

موطا امام مالک میں روایت ہے: مـالك عـن ابـى الـنـضـر مولى عمر بن عبيدالله عن مالك بن ابى عامر أن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ كان يقول فى خطبته

قـل مـايـدع ذلك اذاخـطـب: إذا قـام الامـام يخطب يوم الجمعة فاستمعوا، وانـصتـوا، فـان لـلمنصت الذى لايسمع من الحظ مثل ماللمنصت السامع، فـاذا قـامت الصلا ة فـاعـدلـوا الـصـفـوف، وحـاذوابالمناكب، فان اعتدال الـصـفـوف مـن تـمـام الـصلوة ثم لايكبر حتى ياتيه رجال قد وكلهم بتسوية الصفوف فيخبرونه ان قداستوت، فيكبر. یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اکثر اپنے خطبہ میں ارشادفرماتے: جب امام جمعہ کے دن خطبہ دے تو غور سے سنواور خاموش رہو،جس کوخطبہ سنائی نہ دےاوروہ خاموش رہےتو اسے خطبہ سننے والے کے مثل ثواب ملتاہے، جب نماز کھڑی ہوجائےتو صفیں درست کرو،اورکندھے برابررکھو(یعنی کوئی بلندجگہ کھڑانہ رہے؛ بلکہ برابرجگہ پرکھڑارہے؛ تاکہ کندھے برابررہیں)صفوں کی درستگی نماز کی تمامی میں سے ہے۔ ثـم لايـكبر...... آپ نے جن لوگوں کوصفیں درست کرنے کے لیےمقررکررکھاتھا جب وہ آپ کوصفیں درست ہونے کی اطلاع دیتے اس وقت آپ تکبیرتحریمہ کہتے۔(مؤطا امام مالک؛ص:۳٦ ماجاءفی انصات یوم الجمعۃ والامام یخطب)(فتاوی رحیمیہ ۸/۱۰۰،۱۰۱)

اس دوسری صورت کےمتعلق آپ نےفصل طویل ہونے کا جواشکال لکھاہےوہ قابل اعتناءنہیں،اولاًتواس لیے کہ آج کل لاؤڈسپیکر کی وجہ سےمکبر کی آوازآخری صفوف تک شروع ہی سے پہنچ جاتی ہے، اذان تو پہلے ہی ہوچکی ہے اورلوگ نماز کے لیے تیار بیٹھے ہیں،ایسی حالت میں اقامت شروع ہونے کے بعدصفوف کی درستگی میں چندمنٹ لگتے ہیں،جن کوفصل طویل سےتعبیرکرنادرست نہیں۔

ثانیاًمندرجۂ بالااحادیث میں جب اس بات کی صراحت ہے کہ تسویۂ صفوف

کے لیے مقرر کیے گئے حضرات جب یہ اطلاع دیتے کہ صفیں درست ہوگئیں ہیں، اس کے بعد نماز شروع کی جاتی تھی، ظاہر ہے مجمع اتنا بڑا ہوگا کہ ان کو صفوں کی درستگی کے لیے متوجہ کرنے اور تاکید کرنے کے واسطے امام کی آواز کافی نہیں ہوتی ہوگی، تب ہی تو پیچھے تک آدمی بھیجے جاتے تھے، ظاہر ہے یہ حضرات جب آکر اطلاع دیں گے تو اس صورت میں جو فصل ہوا ہوگا وہ یقیناً صورت مسؤلہ میں ہونے والے فصل سے زیادہ ہی ہوتا ہوگا۔

ثالثاً اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ صورت مسؤلہ میں ہونے والا فصل احادیث میں واردشدہ صورتوں میں ہونے والے فصل سے زیادہ ہے، تب بھی تسویہ صفوف۔ جو نماز باجماعت کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے لیے اس کی اجازت ہے۔ امام بخاریؒ نے اقامت اور نماز کو شروع کرنے کے درمیان فصل کے بوقت ضرورت جائز ہونے کو بتلانے کے لیے اپنی کتاب ''الجامع الصحیح ''میں چند ابواب قائم کئے ہیں؛ چنانچہ ایک باب میں ہے۔ إذاقال الامام مکانکم حتی یرجع انتظروه. اس میں جو روایت پیش کی ہے، اس سے اگلے والے باب میں بھی اسی روایت کو لائے ہیں، روایت ملاحظہ ہو: عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ خرج، وقد اقيمت الصلاة وعدلت الصفوف؛ حتى اذا قام فی الصلاة انتظرنا ان يكبرانصرف، قال: على مكانكم، فمكثناعلى هيئتناحتى خرج اليناينطف رأسه ماء وقد اغتسل. (فتح الباری ۱۲۱/۲)

اس روایت سے مستنبط ہونے والے مسائل کو بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں: و(فیه) جواز الفصل بين الاقامة والصلوة. (فتح الباری ۱۲۲/۲)

علامہ عینیؒ اسی روایت کے ماتحت ”وممایستفادمن ھذا الحدیث“ کا عنوان قائم کر کے تحریر فرماتے ہیں: وجواز الفصل بین الاقامة والصلوة. (عینی شرح بخاری ٥/ ١٥٦)

دوسرا واقعہ ملاحظہ کیجئے:

امام بخاریؒ باب قائم کرتے ہیں: ”باب الامام تعرض له الحاجة بعدالاقامة“ اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت پیش فرماتے ہیں: أقیمت الصلوة والنبی ﷺ یناجی رجلاً فی جانب المسجد فقام الی الصلاة حتی نام القوم.

اس روایت میں صراحت ہے کہ نماز کی اقامت کہی جانے کے بعد نبی کریم ﷺ ایک آدمی کے ساتھ سرگوشی میں مشغول ہوئے؛ یہاں تک کہ لوگ سو گئے، یہ واقعہ چونکہ عشاء کی نماز میں پیش آیا تھا، اس لیے سو جانے والی صورت بھی پیش آئی۔

”فتح الباری“ میں اسی روایت کے ماتحت ہے: وفیه جواز الفصل بین الاقامة والاحرام إذا کان لحاجة، أما اذا کان لغیر حاجة، فھو مکروہ. (١٢٤/٢)

علامہ عینیؒ بھی اس روایت کے بعد اس سے مستفاد مسائل کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں: وفیه جواز الفصل بین الاقامة والاحرام للضرورة. (ج٥/١٥٨)

بہر حال تسویہ صفوف کی ضرورت کے پیش نظر ہونے والے فصل پر کوئی اشکال نہیں، اور نہ ہی اس کو غیر محمود کہا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

جگہ کی تنگی کی وجہ سے ترچھی صفوں کی گنجائش کی حد

سوال: شہر بمبئی کے ایک گنجان آبادی والے علاقے میں ہم احباب نے ایک جگہ مسجد کے لیے خریدی ہے، پہلے سے تعمیر شدہ اس جگہ کی دیواریں بالکل قبلہ رخ نہیں

ہیں، صفوں کو اگر بالکل قبلہ رخ رکھیں تو آگے پیچھے کافی جگہ چھوٹ جاتی ہے، اور بہت کم جگہ نمازیوں کے لیے نکلتی ہے، اس کے برخلاف اگر صفوں کو تھوڑا ترچھا کردیں، تو کافی جگہ نکلتی ہے، کیا نمازیوں کی تعداد اور گنجان مسلم آبادی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح صفوں کو ترچھا رکھنے کی شرعا اجازت ہے؟ اگر یہ رعایت ہے تو صفوں کو دائیں یا بائیں جانب کتنی ڈگری تک ترچھا رکھا جاسکتا ہے، اور کیا اہلِ ہند کے لیے عین قبلہ کی جانب رخ کرنے کے بجائے صرف سمتِ قبلہ کی طرف رخ کرنے سے استقبال قبلہ ہوجائے گا؟ دورجدید کے رصدی آلات اور جدید قواعدِ ریاضی سے عین قبلہ رخ کا تعین کرنا کس حد تک صحیح ہے، اور درست ہے؟ بصورت دیگر استقبال قبلہ کس طرح کیا جائے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو شخص بیت اللہ شریف کے سامنے ہو، اس کے لیے عین کعبہ کا استقبال فرض ہے، اور جو اس سے غائب ہے، اس کے ذمہ جہت قبلہ کا استقبال ہے، عین کعبہ کا نہیں۔

كما في البدائع وتعتبر الجهة دون العين، وكذا ذكر الكرخي والرازي، وهو قول عامة مشائخنا بماوراء النهر. (بدائع ۱/۱۱۸) ومثله في الهداية وعامة المتون والشروح. (جواہر الفقہ ۱/۲۵۳)

پھر جہت قبلہ کے استقبال کے معنی یہ ہیں کہ ایک خط جو کعبہ پر گذرتا ہوا جنوب وشمال پر منتہی ہوجائے، اور نمازی کے وسطِ جبہہ (درمیانی پیشانی) سے ایک خط مستقیم نکل کر اس پہلے خط سے اس طرح تقاطع کرے کہ اس سے موضع تقاطع پر دوزاویہ قائمہ پیدا ہوجاویں، وہ قبلہ مستقیم ہے، اور اگر نمازی اتنا منحرف ہو کہ وسط جبہہ سے نکلنے والا خط تقاطع کرکے

زاویہ قائمہ پیدا نہ کرے؛ بلکہ حادہ یا منفرجہ پیدا کرے؛ لیکن وسط جبہہ کو چھوڑ کر پیشانی کے اطراف میں کسی طرف سے نکلنے والا خط زاویہ قائمہ پیدا کردے، تو وہ انحراف قلیل ہے اس سے نماز صحیح ہوجاوے گی اور اگر پیشانی کی کسی طرف سے بھی ایسا خط نہ نکل سکے جو خطِ مذکور پر زاویہ قائمہ پیدا کردے، تو وہ انحراف کثیر ہے، اس سے نماز نہ ہوگی۔ (ایضاً/۲۵۴)

سمتِ قبلہ میں آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ سے کام لینا سلف کا طریقہ نہیں تھا، اور نہ شریعت نے اس کا امر کیا ہے، اور نہ کسی حال میں اس کی ضرورت ہے؛ بلکہ طریقہ معروفہ سلف کا یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجدِ قدیمہ موجود ہوں، ان کا اتباع کیا جائے، جہاں نہ ہوں وہاں مشہور ومعروف ستاروں اور دوسرے آثارِ جلیہ سے کام لے کر اندازہ قائم کرکے جہت متعین کرلی جاوے۔ بڑی وجہ ان آلات اور حسابات کے استعمال نہ کرنے کی تو یہی ہے کہ یہ چیزیں اتنی عام نہیں ہیں کہ ہر شخص کو ہر جگہ میسر آسکیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درجہ ان آلات وحسابات کا بھی تخمینہ وتحری اور اندازہ اور اٹکل سے زائد نہیں، جس طرح تحری واندازہ میں خطا ہوسکتی ہے، ان آلات وحسابات میں بھی خطا ہوجانا ممکن؛ بلکہ واقع ہے.......... جبکہ حساباتِ ریاضیہ اور آلاتِ رصدیہ کا انجام وہی غلبۂ ظن بامارات وعلامات ہے، اور احتمالِ خطا وصواب اس میں بھی یکساں، تو سادہ سہل طریقۂ سلف کو کیوں چھوڑا جائے۔ (ایضاً/ ۲۶۷، ۲۶۸)

بلادِ ہندوستان میں سہل اور احوط طریق سمتِ قبلہ معلوم ہونے کا یہ ہے کہ موسم گرما کے سب سے بڑے دن (یعنی ۲۲/ جون) اور اسی طرح سرما کے سب سے چھوٹے دن (یعنی ۲۲/ دسمبر) میں غروب شمس کا موقع دیکھا جائے، قبلہ ان دونوں موقعوں کے

درمیان ہوگا، یعنی ان دونوں موقعوں کے درمیان درمیان جس نقطہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاوے گی، صحیح ہو جائے گی۔ (ایضاً ۱/ ۲٦۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

امام اور منبر کے درمیان ایک مصلی کی جگہ خالی رکھنا

سوال: امام اور منبر کے درمیان بقدر ایک مصلی کے کھڑے رہنے کی جگہ خالی رہتی ہے، اب کوئی شخص اس جگہ میں کھڑا ہو لے، تو صف میں شمار ہوگا یا نہیں؟ نیز اس کے کھڑے رہنے سے نماز میں کوئی کراہت تو نہیں آئے گی؟ اور اگر وہاں کوئی بھی کھڑا نہ رہے، تو صف میں جگہ خالی رہنے کی کراہت تو نہیں آئیگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

پہلی صف کا آگے بڑھ جانا اس طرح پر کہ مقتدی امام کے پیچھے سجدہ نہ کر سکیں، مکروہ تحریمی ہے؛ البتہ اگر پیچھے جماعت خانہ میں یا برآمدہ اور صحن میں بھی جگہ نہ ہو، یا اگر ہو تو بارش یا شدید دھوپ کی وجہ سے کھڑا رہنا دشوار ہو، تو پھر کراہت نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۴۵)

اور ایسی صورت میں امام اور منبر کے درمیان جو جگہ رہتی ہے، جس میں ایک آدمی کھڑا رہ سکتا ہے، اس کو خالی نہ رکھا جائے؛ بلکہ اگر امام کے ذرہ کھسکنے کی وجہ سے وہاں دو آدمیوں کی گنجائش ہو جاتی ہو، تو ایسا کرلیا جائے، ورنہ ایک آدمی ہی کھڑا رہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۴/ شوال ۱۴۱۰ھ

مسائل سجدۂ سہو

تیسری رکعت میں بھول کر بیٹھنے سے سجدۂ سہو

سوال: اگر امام تیسری رکعت میں بھول کر بیٹھ گیا، اور اتنی مقدار نہ بیٹھا کہ تین مرتبہ تسبیح نہ پڑھی ہو، اور کھڑا ہو گیا لقمہ کے بغیر، اور سجدۂ سہو نہ کیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟ (نماز عصر کے وقت)

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

راجح یہ ہے کہ تین بار "سبحان ربي الاعلیٰ" کی مقدار بیٹھنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا، اس سے کم پر نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۴/۴۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھ لیا

سوال: اگر امام دوسری رکعت میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھ لے، اور اس کے بعد تیسری رکعت میں کھڑا ہو گیا سجدہ سہو کرے یا نہ کرے؟ اگر سجدہ سہو نہ کیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

فرض، وتر اور سننِ مؤکدہ میں قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا، اس لیے کہ تیسری رکعت کا قیام جو رکن ہے، اس کی ادائیگی میں تاخیر ہوئی، اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو نماز ناقص ہوئی اس کا اعادہ کرے۔

وتاخير قيام إلى الثالثة بزيادة على التشهد بقصد ركن (تنوير الأبصار ۲/۸۱)

لها واجبات لاتفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو إن لم يسجد.

فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ (درمختار ۱/ ٤٥٦)

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

وتر کے قعدۂ اولیٰ میں سورۂ فاتحہ پڑھ لینا

سوال: ایک شخص نے وتر کے قعدۂ اولیٰ میں بھول سے سورۂ فاتحہ کو پڑھ لیا، پھر التحیات کو بھی پڑھا تو کیا سجدہ سہو سے نماز درست ہوجائے گی یا نہیں؟ مفصل ومدلل جواب تحریر فرماویں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ہوجائیگی۔

وإذا قرأ الفاتحة مكان التشهد، فعليه السهو ...... اذا بدأ في موضع التشهد بالقرأة ثم تشهد فعليه السهو. (فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۱۲۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

قعدۂ اولیٰ کے ترک اور تیسری رکعت میں قعدہ کرنے پر سجدۂ سہو

سوال: زید ایک مسجد کا امام ہے، زید نے عصر کی نماز پڑھائی اور قعدۂ اولیٰ نہیں کیا، مقتدی نے لقمہ دیا، امام نے لقمہ نہیں لیا اور تیسری رکعت میں قعدہ میں بیٹھا، پھر لقمہ دیا گیا، اس لقمہ کو بھی قبول نہیں کیا، تیسری رکعت میں قعدہ پورا کیا اور چوتھی رکعت میں قعدۂ اخیرہ پورا کر کے بغیر سجدۂ سہو سلام پھیر دیا، لہذا معلوم کرنا ہے کہ صورتِ مذکورہ میں نماز ہوگئی یا کہ فاسد ہوئی، جس کا دہرانا ضروری ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں جبکہ امام نے قعدۂ اولیٰ چھوڑ دیا، تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہوا، اسی طرح تیسری رکعت میں اس کو کھڑا ہو جانا چاہئے تھا، اس کے بجائے قعدہ کرلیا، اس سے بھی سجدۂ سہو واجب ہوا، اس لیے امام پر ضروری تھا کہ آخر میں سجدۂ سہو کرتا؛ لیکن اس نے سجدۂ سہو نہیں کیا اور نماز ناقص رہی، اس کا اعادہ واجب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نفل نماز میں بھی سجدۂ سہو واجب ہے

سوال: (۴) نفل نماز میں سجدۂ سہو ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

نماز کے واجبات اصلیہ میں سے کسی واجب کو سہواً چھوڑ دینے کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے، نماز چاہے فرض ہو یا واجب ہو یا نفل۔ (شامی ۲/ ۵۶۰ زکریا) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسائل امامت

حرام کمائی سے دعوت کھانے والے امام کی امامت

سوال: ہمارے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب پانچوں وقت کی نماز پڑھاتے ہیں، عام طور پر لوگ دعوت امام صاحب کی کیا کرتے ہیں، اب جماعت کے ایک آدمی جو اکثر اس کی کمائی تمام حرام کمائی کی آمدنی ہے، جوا، بیٹنگ وغیرہ، وہ بھی امام صاحب کو مدعو کیا کرتے ہیں، ایسے اماموں کے پیچھے نمازیوں کا اقتداء کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

کسی آدمی کی اکثر آمدنی حلال ہے، تو اس کی دعوت کھانا درست ہے؛ البتہ اگر خاص وہ دعوت مال حرام سے ہو تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے، اور اگر کسی کی اکثر آمدنی حرام ہے تو اس کی دعوت کھانا درست اور جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر خاص وہ دعوت مالِ حلال سے ہو تو اس کا کھانا جائز اور درست ہے، مثلاً: اس نے کسی سے قرض لے کر دعوت کی ہے، اب اگر امام صاحب ایسے آدمی کے گھر دعوت کھاتے ہیں جس کی اکثر آمدنی حرام ہے، تو وہاں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس آدمی نے حلال مال سے دعوت کی ہو، یا کسی سے قرض لے کر دعوت کی ہو، اس لیے محض اتنی بنیاد پر امام صاحب کی امامت پر کوئی حکم کراہت وغیرہ کا نہیں لگایا جاسکتا، مومن کے ساتھ خصوصاً جبکہ وہ امام بھی ہو حسنِ ظن رکھنا چاہئے، پھر بھی امام صاحب کو چاہئے کہ ایسے شخص کی دعوت سے احتیاط کریں۔

غیر منتشر آلہ والے کی امامت

سوال: اگر کوئی شخص کا ذکر منتشر نہ ہوتا ہو تو اس کے لیے امامت کرانا جائز ہے یا

نہیں؟ اور وہ پہلی صف میں کھڑا رہ سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب جلد سے جلد روانہ کریں اوراس کی عمر ۲۵/ سال سے زیادہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جس کی عمر ۲۵/ سال ہے؛ لیکن کمزوری کی وجہ سے اس کا ذکر منتشر نہیں ہوتا تو اس کی امامت درست ہے، بشرطیکہ اس میں اور کوئی مانع موجود نہ ہو؛ نیز ایسا آدمی پہلی صف میں کھڑا بھی رہ سکتا ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ ۲/۱۰۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حرام خور اور کاذب کی امامت

سوال: ہمارے محلّہ کی مسجد کے پیش امام مٹکے واندے والے کے پاس کھانا کھاتے ہیں، ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور قبرستان والے کی کمائی کھاتے ہیں، اور جھوٹ بہت بولتے ہیں، ان کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جس آدمی کی تمام آمدنی یا زیادہ تر آمدنی حرام کی ہو اس کی دعوت کھانا درست نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا حرام ہے، ایسا آدمی اگر توبہ نہیں کرتا ہے تو اس کی امامت مکروہ ہوگی۔

ویکره إمامة عبد واعرابي وفاسق. (تنویر الابصار) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ناپسند امام کی امامت

سوال: زید تیسری اور چوتھی رکعت میں قیام اتنا طویل کرتا ہے- طویل سے سے مراد، جیسے:الحمد الحمد، اياك نعبد اياك نعبد، واياك نستعين - اتنے عرصہ میں مقتدیان الحمد دس مرتبہ پڑھ سکتے ہیں، گویا سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت بھی پڑھ رہا ہے۔

زید کو حالتِ قیام میں وسوسہ آتا ہے، یعنی شک کی بناء پر کسی لفظ کو بار بار دہراتا ہے۔

زید التحیات، درود شریف، دعاء ماثورہ اتنی جلدی پڑھتا ہے کہ دوسرے لوگ صحیح طور سے التحیات بھی نہیں پڑھ سکتے۔

آواز اتنی پست ہے کہ قراءت اور نہ ہی تکبیر وغیرہ صحیح طور سے سننے میں آتی ہے، جس کی وجہ سے کوئی رکوع میں ہے اور کوئی سجدے میں۔

زید رکوع وسجود میں تسبیح اتنی جلد پڑھتا ہے کہ دوسرے لوگ صحیح طور سے ایک مرتبہ بھی نہیں پڑھ سکتے، اگر کسی امام میں مندرجۂ بالا وجوہات پائی جائیں تو کیا اس امام کے پیچھے نماز درست ہوگی؟

تقریباً سبھی مصلیان ان وجوہات کی بناء پر اس امام سے متنفر ہو چکے ہیں، اگر مقتدیان امام سے متنفر ہوں تو ان کی نماز اس امام کے پیچھے ہوگی یا نہیں؟ جواب مرحمت فرمائیں عین کرم ہوگا۔

نوٹ: اگر شافعی مسلک سے جواب عنایت فرمائیں تو زیادہ بہتر ہوگا؛ چونکہ امام ومقتدیان سبھی شافعی المسلک ہیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر کسی امام کی امامت کو مقتدی حضرات ناپسند کرتے ہیں، اور یہ ناپسندیدگی کسی ذاتی رنجش یا عداوت کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اس لیے ہے کہ امام میں شرعی طور پر ناپسندیدگی کی وجوہات پائی جاتی ہیں۔ (جیسا کہ سوال میں مذکور صورت میں زید کے حق میں ہے) تو ایسے امام کے لیے لوگوں کی امامت کرنا مکروہ ہے۔

ویکره أن یصلي الرجل بقوم، وأکثرهم له کارهون...... (قال الشارح) وإنما تکره إمامته إذا کرهوه لمعنی مذموم شرعاً، کوال ظالم ...... أو یمحق هیئات الصلوٰة الخ. (شرح مهذب ۲۷۳،۲۷۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تنبیہ: ہمارے یہاں سے فقہ حنفی کے مطابق جواب دیے جاتے ہیں، آپ کی طلب پر فقہ شافعی کے مطابق ''شرح مہذب'' سے جواب دیا گیا ہے، کسی شافعی مفتی کی تصدیق کے بعد اس پر عمل فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ٹی-وی دیکھنے والے کی امامت

سوال: ٹی-وی دیکھنا اور اس کے پروگراموں میں شرکت کر کے کوئی کردار کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ نیز ان کی امامت اور ان کی اقتداء میں ادا کردہ نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ٹیلی ویژن دیکھنا ناجائز ہے اور ایسے امام کی اقتداء مکروہِ تحریمی ہے؛ مگر نماز

ہو جائے گی، لوٹانا ضروری نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۳/ ۲۸۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

پتا کھیلنے اور ٹی-وی دیکھنے والے کی امامت

سوال: (۸) اور مولانا ہوتے ہوئے پتا کھیلتے ہیں، اور ٹی-وی دیکھتے ہیں تو اس کے پیچھے ہمیں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

مکروہ ہے۔ (شامی ۲/ ۲۹۸ زکریا) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

فاسق کی امامت

سوال: کوئی امامِ مسجد ہے، جھوٹ بولتا ہے، یا زنا کرتا ہے، کیا اس کے پیچھے نماز درست نہیں ہے؟ اگر کوئی امام خالص جمعہ پڑھاتا ہے، باقی نماز میں مسجد میں نہیں آتا؛ جبکہ گاؤں میں ایک ہی مسجد ہے، کیا اس کی اقتداء صحیح ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق ہے، جب تک وہ توبہ کر کے اپنی حالت درست نہ کر لے، وہاں تک اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے۔

جو شخص بلا عذر ترکِ جماعت کا عادی ہو، اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، بحالت مجبوری اس کے پیچھے جو نماز ادا کی جائیگی، اس کا اعادہ لازم نہیں ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ ۲/ ۷۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مودودی امام کی امامت

سوال: جماعتِ اسلامی کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

مودودی عقائد والے کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۳/۲۹۱)

غیر مقلد کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال: اہلِ حدیث کے پیچھے جو کہ ائمہ اربعہؒ کو نہ مانے اور سب وشتم کریں ان پر، اسی طرح تبلیغی جماعت کو نہ مانے، تو آیا اس کے پیچھے نماز پنج وقتہ پڑھ سکتے ہیں کہ نہیں؟ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جہاں پر وہ امامت کراتے ہیں، اس مسجد میں جماعت والے آکر چلے گئے، تو ان صاحب نے کہا، مسجد ناپاک ہوگئی؛ لہذا دھوڈالو؛ چنانچہ مسجد کو بھی دھوڈالنے کا امر کیا، اسی طرح اپنی طرف سے من گھڑت فتوے بگارتا ہو، مثلاً: یہ کہ قربانی میں سات سے زائد بھی شریک ہوسکتے ہیں، اسی طرح خاندان میں صرف ایک نے قربانی دی تو تمام کی طرف سے کافی ہوجائیگی، چاہے ان پر فرض ہو کہ نہ ہو، اور جس کا بیان مسجد میں ہنسی مذاق سے خالی نہ ہو، جس کی وجہ سے مسجد کے ادب کو بالکل محفوظ نہ رکھتا ہو، اور مسجد میں بغیر گھٹنے ڈھانکے رہ کر اسی حالت میں بیت الخلاء جاکر اسی حالت میں پھر مسجد میں آتا ہو، تو اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کا اعادہ لازم ہے کہ نہیں؟ اور ان اوصاف کے ہونے کے باوجود ایسے کو امامت کے لیے مقرر کرسکتے ہیں کہ نہیں؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر یہ یقین ہو کہ امام نماز کے ارکان وشرائط میں دوسرے مذاہب کی رعایت کرتا ہے، تو اس کی اقتداء بلا کراہت جائز ہے۔ اور اگر رعایت نہ کرنے کا یقین ہو تو اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز صحیح نہ ہوگی۔ اور جس کا حال معلوم نہ ہو، اس کی اقتداء مکروہ ہے۔

آج کل کے غیر مقلدین کی اکثریت صرف یہی نہیں کہ رعایت مذاہب کا خیال نہیں رکھتی؛ بلکہ اس کو غلط سمجھتی ہے اور عمداً اس کے خلاف کا اہتمام کرتی ہے اور اس کو ثواب سمجھتی ہے، اس لیے ان کی اقتداء سے حتی الامکان احتراز لازم ہے؛ مگر بوقتِ ضرورت ان کے پیچھے نماز پڑھ لے، جماعت نہ چھوڑے۔

قال في العلائية عن البحر: إن تيقن المراعاة لم يكره، أو عدمها لم يصح، وإن شك كره. (رد المحتار ۱/۵۲۶)

یہ تفصیل اس وقت ہے کہ یہ امام صحیح العقیدہ ہو، اگر اس کا عقیدہ فاسد ہے، مقلدین کو مشرک جانتا ہے اور سبِّ سلف کرتا ہے، تو اس کی امامت بہرحال مکروہ تحریمی ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۳/۲۸۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

بدعتی کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال: ہماری دوکان کے قریب دونوں مسجدوں میں محبین حضرات کا قبضہ ہے، اور ان کا عقیدہ بالخصوص امام کا عقیدہ دیوبندی حضرات کے بارے میں منافق کا ہے، اور دوسرا ان کا عقیدہ قبر والوں سے حاجات مانگنے کا ہے، یہ دونوں عقیدے ایسے ہیں جس کو براہِ راست بندے نے سنا ہے، اور آگے ان کے کیا کیا عقائد ہیں؟ وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کیا ان کے پیچھے ہم نماز پڑھ سکتے ہیں؟ ہماری نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ بالتفصیل لکھیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آج کل کے فرقہ مبتدعہ کے عقائد حدّ شرک تک پہنچے ہوئے ہیں، اس لیے ان

کے پیچھے نماز نہیں ہوتی؛ البتہ اگر کوئی بدعتی شرکیہ عقائد نہ رکھتا ہو؛ بلکہ موحد ہو، صرف تیجہ، چالیسواں وغیرہ جیسی بدعات میں مبتلا ہو، اس کی امامت مکروہِ تحریمی ہے۔

قال في الشامية: فهو (الفاسق) كالمبتدع، تكره إمامته بكل حال. (رد المحتار ۵۲۳/۱) وقال العلامة الحلبي: بعد ماحرر من أن كراهة تقديم الفاسق كراهة تحريم، ويكره تقديم المبتدع أيضاً؛ لأنه فاسق من حيث الاعتقاد، وهو أشد من الفسق من حيث العمل؛ لأن الفاسق من حيث العمل يعترف بأنه فاسق، ويخاف ويستغفر، بخلاف المبتدع، والمراد بالمبتدع: من يعتقد شيئا على خلاف مايعتقده أهل السنة، والجماعة وانما يجوز الاقتداء به مع الكراهة إذا لم يكن مايعتقده يؤدى إلى الكفر عند أهل السنة إما لوكان مؤديا إلى الكفر فلا يجوز أصلا الخ (غنية ٤٨٠)

کوئی صحیح العقیدہ امام مل جائے تو بدعتی کی اقتداء میں نماز نہ پڑھے، ورنہ اسی کے پیچھے پڑھ لے، جماعت نہ چھوڑے، بدعتی کے اقتداء میں پڑھی ہوئی نماز اگرچہ مکروہ تحریمی ہے؛ مگر واجب الاعادہ نہیں۔ یہ ایسے بدعتی کا حکم ہے جو مشرک نہ ہو، شرکیہ عقائد رکھنے والے کا حکم اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس کے پیچھے نماز قطعاً نہیں ہوتی۔ (احسن الفتاویٰ ۲۹۰/۳)

امام کا دیوبندی حضرات کو منافق سمجھنا شرکیہ عقیدہ نہیں، اہل قبور سے حاجات، ان کو حاجت روا سمجھ کر مانگی جاتی ہیں تو یہ شرکیہ عقیدہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

طامعِ دنیا، بناوٹی شافعی کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال: (۱) اس اطراف میں بعض لوگ امامت کے لیے آتے ہیں، اور روپیہ

کے خاطر دوسرا مسلک حنفی ہوتے ہوئے مقتدیوں کے ہم مسلک ہو کر اسی کے مطابق نماز پڑھاتے ہیں، اور دوسرے احکام بجا لاتے ہیں، اور جب اپنے مکان جاتے ہیں تو وہی اپنا اصل مسلک اختیار کرتے ہیں، ایسی صورت میں خود امام کی نماز درست ہوئی یا نہیں؟ اور مقتدیوں کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ عدمِ صحت کی صورت میں قضا کا کیا حکم ہے؟

اس میں کئی شقیں ہیں: (۱): حنفی کی اقتداء شافعی کے پیچھے۔ (۲): شافعی کی اقتداء حنفی کے پیچھے۔ (۳): شافعی کی اقتداء بناوٹی شافعی کے پیچھے۔ (۴): حنفی کی اقتداء ایسے حنفی کے پیچھے جو بناوٹی شافعی ہو، پھر خود امام کا وقتی طور پر مسلک بدلنا (انتقال من مسلك الى مسلك) خواہ حقیقۃً یا طمعاً درست ہے؟ آیا یہ تلفیق تو نہیں؟ اگر یہ حرام ہے تو امام کو نکال دینا چاہئے یا کیا کرنا چاہئے؟ نیز کبھی مقتدی حضرات بھی ہم مسلک امام نہ ملنے کی وجہ سے حنفی آئے ہوئے امام کو اپنے ہم مسلک کرا کے اسی کے پیچھے نماز پڑھنے پر راضی ہو جائیں، ایسی صورت میں خود مقتدیوں کی نماز کا کیا حکم ہے آیا مقتدیوں کے لیے ایسا کرنا، کرانا جائز ہے؟

براہِ کرم ہر مسئلہ کا مفصل مکمل و مدلل جواب دیں؛ بلکہ اگر کوئی اشکال پیدا ہو سکتا ہو تو اس کا جواب بھی عنایت فرمائیں؛ کیونکہ اس اطراف میں بہت سے ائمہ (حقیقۃً حنفی) بناوٹی شافعی بنے ہوئے لوگوں کو ہانک رہے ہیں؛ تاکہ اس کا انسداد کیا جا سکے، اور مسلمانوں کی نماز کو ضیاع سے بچایا جائے۔

شافعی المسلک کی جماعتِ ثانیہ میں حنفی المسلک کی شرکت

(۲) یہاں کی مسجدیں عموماً اس وضع کی ہوتی ہیں کہ جماعت خانہ کے سوا باہر کوئی

جگہ مستقلاً نہیں رہتی ہے، اور اسی میں شوافع حضرات جماعتِ ثانیہ کر لیتے ہیں، تو اس جماعتِ ثانیہ میں کوئی حنفی المسلک شخص اقتداء کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱)فی الدر المختار: ارتحل إلى مذهب الشافعيّ يعزر. سراجية. قال الشامی: (قوله ارتحل الى مذهب الشافعی يعزر) ای إذا كان ارتحاله لا لغرض محمود شرعاً، لما فی التاتارخانية: حكى أن رجلا من اصحاب أبي حنيفةؒ خطب إلى رجل من أصحاب الحديث ابنته في عهد أبي بكر الجوزجاني، فابى إلا أن يترك مذهبه فيقرأ خلف الامام، ويرفع يديه عند الانحطاط، ونحو ذلك، فاجابه، فزوجه، فقال الشيخ: بعد ماسئل عن هذه واطرق راسه،النكاح جائز؛ ولكن أخاف عليه أن يذهب إيمانه وقت النزع؛ لانه استخف بمذهبه الذی هو حق عنده، وتركه لاجل جيفة منتنة، ولو ان رجلا بَرِئ من مذهبه باجتهاد وضح له كان محمودا ماجورا، اما انتقال غيره من غير دليل؛ بل لما يرغب من غرض الدنيا وشهوتها، فهو المذموم الأثم المستوجب للتاديب والتعزير لارتكابه المنكر فی الدين، واستخفافه بدينه ومذهبه.اهـ. ملخصا. وقال بعد ثمانية اسطر: قلت: وايضا قالوا العامی لا مذهب له؛بل مذهبه مذهب مفتيه، وَعلّلَه فی شرح التحرير: بان المذهب انما يكون لمن له نوع نظر واستدلال وبصر بالمذاهب على حسبه، أو لمن قرء كتابا فی فروع ذلك المذهب، وعرف فتاوی امامه واقواله، واما غيره

مـمـن قال انا حنفی او شافعی لم یصر کذلك بمجرد القول کقوله انا فقیه او نـحـوی.اھ. وتـقـدم تـمام ذلك فی المقدمة اول هذا الشرح، وانما اطلنا فی ذلك لـئـلا یـغتر بعض الجهلة بما یقع فی الکتب من اطلاق بعض العبارات الموهمة خلاف المراد فیحملهم علی تنقیص الائمة المجتهدین، فان العلماء حـاشـاهـم الـلـه تـعـالـیٰ ان یریدوا ما الازدراء بمذهب الشافعی او غیره؛ بل یـطـلـقـون تـلك الـعبـارات بـالمنع من الانتقال خوفا من التلاعب بمذاهب المجتهدین نفعنا الله تعالی بهم و أماتنا علی حبّهم. اٰمین

یـدل لـذلك مافی القنیة رامزا لبعض کتب المذهب لیس للعامیّ أن یتحول من مذهب الی مذهب ویستوی فیه الحنفی والشافعي.اھ.(شامی ۲۰۸/۳، ۲۰۹)

وقال في الدر المختار فی الشهادات فی باب القبول وعدمه: ولا من انتـقل من مذهب أبي حنیفة إلی مذهب الشافعی، قال العلامة الشامی (قوله مـن مذهب أبی حنیفة) ای استخفافا، قال فی القنیة من کتاب الکراهیة: لیس لـلـعامي أن یتحول من مذهب الی مذهب، ویستوی فیه الحنفی والشافعی، وقیل لـمـن انتقل الی مذهب الشافعی لیزوج له: اخاف ان یموت مسلوب الایمان لاهـانته للدین لجیفة قذرة، وفی آخر هذا الباب من المنح: وإن انتقل إلیه لقلة مبـالاته فی الاعتقاد والجراء ة علی الانتقال من مذهب الی مذهب کما یتفق له، ویمیل طبعه الیه لـغرض یحصل له فانه لاتقبل شهادته اھ فعلم بمجموع مـاذکـرناه أن ذلك غیر خاص بانتقال الحنفی، وانه اذا لم یکن لغرض صحیح

فافهم، ولا تكن من المتعصبين فتحرم بركة الأئمة المجتهدين. (شامی ٤/٤٢٤)

قال العلامة الشامی فی تنقيح الفتاوى الحامدية: قال في جواهر الفتاویٰ: لو ان رجلا من اهل الاجتهاد بَرِئَ من مذهبه فی مسئلة، او فی اكثر منها باجتهاد لما وضح له من دليل الكتاب او السنة او غيرهما من الحجج، لم يكن ملوما ولا مذموما؛ بل كان ماجورا محمودا وهو فی سعة منه، وهكذا افعال الائمة المتقدمين. فاما الذی لم يكن من اهل الاجتهاد فانتقل من قول الى قول من غير دليل؛ لكن لما يرغب من غرض الدنيا وشهوتها فهو مذموم آثم مستوجب للتاديب والتعزير؛ لارتكابه المنكر فی الدين واستخفافه بدينه ومذهبه. اه ونقل السيوطی فی رسالته المسماة: "بجزيل المواهب فی اختلاف المذاهب" من فصل الانتقال من مذهب الى مذهب وهو جائز - الى ان قال- وأقول للمنتقل احوال الاول ان يكون السبب الحامل له على الانتقال امراً دنيويا كحصول وظيفة، او مرتب او قرب من الملوك، وأهل الدنيا فهذا حكمه كمهاجر ام قيس؛ لان الامور بمقاصدها، ثم له حالان: الاول ان يكون عاريا من معرفة الفقه، ليس له فی مذهب امامه سوى اسم شافعی او حنفی كغالب متعممی زماننا ارباب الوظائف فی المدارس؛ حتى ان رجلا سأل شيخنا العلامة الكافيجی رحمه الله مرة يكتب له على قصة تعليقا بولاية اول وظيفة تشغر بالشيخونية، فقال له: ما مذهبك؟ فقال: مذهبي خبز وطعام، يعنی وظيفة اما فی الشافعية أو المالكية أو الحنابلة فن الحنفية في الشيخونية لا خبز لهم ولا طعام، فهذا

امره فی الانتقال أخف لا یصل إلیٰ حد التحریم؛ لانه الی الآن عامی لا مذهب له یحققه فهو یستأنف مذهبا جدیدا. ثانیهما: ان یکون فقیها فی مذهب، ویرید الانتقال لهذا الغرض، فهذا امره اشد وعندی انه یصل الی حد التحریم؛ لانه تلاعب بالاحکام الشرعیة لمجرد غرض الدنیا الخ (تنقیح الفتاویٰ الحامدیة۲/۳۶۰،۳۶۱)

عباراتِ منقولہ بالا سے یہ بات ایک دم واضح طور پر معلوم ہوچکی کہ دنیا کمانے کے خاطر تبدیل مذہب (حنفی سے شافعی بننا یا شافعی سے حنفی بننا) ایک ایسا جرم ہے جو موجبِ تعزیر ہے، اور ایسے آدمی کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے؛ بلکہ یہ طریقہ دین کے ساتھ ایک قسم کی کھلواڑ ہے، اس قسم کے آدمی کو امامت کے عظیم منصب پر فائز کرنا درست نہیں ہے، اب تک جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی گئیں ان کی قضاء نہیں ہے؛ البتہ آئندہ اس سے احتیاط ضروری ہے۔

(۲): مسجد طریق (وهو مسجد لیس له امام ولا مؤذن، ویصلی الناس فیه فوجا فوجا) (شامی ۱/۴۰۸) .... کے علاوہ مسجد میں تکرارِ جماعت مکروہ تحریمی ہے۔ ویکره تکرار الجماعة باذان واقامة فی مسجد محلة، لا فی مسجد طریق الخ (درمختار) (قوله ویکره) ای تحریما (شامی ۱/۴۰۸)

اس لیے حنفی المسلک کو چاہئے کہ ایسی جماعت میں شرکت نہ کرتے ہوئے تنہا پڑھے۔ خود حضرات شوافع کے نزدیک بھی مسجدِ محلّہ میں جماعتِ ثانیہ مکروہ ہے، علامہ نوویؒ نے شرحِ مہذب (۴/۲۲۱و۲۲۲) میں اس کی تصریح کی ہے: وان حضر وقد فرغ الامام من الصلوٰة، فان کان المسجد له امام راتب، کره ان یستأنف فیه جماعة.

آگے شرح میں فرماتے ہیں: اما حکم المسئلة: فقال اصحابنا ان کان للمسجد امام راتب، ولیس هو مطروقا، کره لغیره اقامة الجماعة فیه ابتداء قبل فوات مجیء إمامه، ولو صلی الامام کره ایضا اقامة جماعة اخریٰ فیه بغیر اذنه، هذا هو الصحیح المشهور الخ

البتہ عبارتِ ہذا سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ امام راتب کی اجازت لے لی جائے تو کراہت نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

نماز عید شافعی امام کی اقتداء میں

ایک مسئلہ کا حل مطلوب ہے، وہ یہ کہ کوئی حنفی بھائی عید کی نماز میں کسی شافعی امام کی اقتداء کرے تو اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟ کیونکہ شافعی امام تو اپنے مسلک کے مطابق پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ کے علاوہ قرأت سے پہلے سات، اور اسی طرح دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہے گا؛ جبکہ حنفی مذہب میں پہلی رکعت میں تکبیرِ تحریمہ کے بعد اور قرأت سے پہلے تین تکبیریں اور دوسری میں قرأت کے بعد اور رکوع سے پہلے تین تکبیریں کہی جاتی ہیں؛ نیز کوئی شافعی کسی حنفی کی اقتداء کرے تو کیا حکم ہے؟ مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر عید کی نماز میں کسی حنفی مقتدی نے شافعی امام کی اقتداء کرلی تو اس کی نماز درست ہے، اور اس حنفی مقتدی کو چاہئے کہ اپنے شافعی امام کی اقتداء میں تکبیراتِ زوائد بھی امام کے مطابق، یعنی پہلی رکعت میں سات اور دوسری رکعت میں پانچ ادا کرے۔

درمختار میں ہے: ولو زاد تابعه الی ستة عشر؛ لانه ماثور. (درمختار)

علامہ شامیؒ اس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: (قوله ولوزاد تابعه الخ) لانه تبع لإمامه، فتجب عليه متابعته، وترك رأيه برأى الامام لقوله عليه الصلوٰة والسلام "انما جعل الامام ليؤتم به" فلا تختلفوا عليه، فمالم يظهر خطؤه بيقين كان اتباعه واجبا، ولا يظهر الخطأ فى المجتهدات، فاما اذا خرج عن اقوال الصحابة فقد ظهر خطؤه بيقين، فلا يلزمه اتباعه الخ (شامی ۱/۶۱۵)

ایک دوسرے موقعہ پر علامہ شامیؒ نے لکھا ہے: مثال ماتجب فيه المتابعة مما يسوغ فيه الاجتهاد، ما ذكره القهستانى فى شرح الكيدانية عن الجلابى بقوله: كتكبيرات العيد، وسجدتي السهو قبل السلام، والقنوت بعد الركوع فى الوتر .اه. والمراد بتكبيرات العيد مازاد على الثلاث فى كل ركعة مما لم يخرج عن اقوال الصحابة، كما لو اقتدى بمن يراها خمسا مثلا كشافعى. (شامی ۱/۳٤۸)

بدائع الصنائع (۱/ ۲۷۷) میں اس کی تصریح موجود ہے۔

کوئی شافعی مقتدی عید کی نماز میں حنفی امام کی اقتداء کرے تو شرحِ مہذب للنووی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ درست ہے؛ البتہ وہ اپنے مسلک کے مطابق پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیرات کہے، یا حنفی امام کی اقتداء میں ہر رکعت میں تین تین پر اکتفاء کرے، اس سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے دونوں قول نقل کئے ہیں؛ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں: ولو صلى خلف من يكبر ثلاثا او ستا ففيه قولان: (احدهما)

یکبر سبعا فی الاولیٰ وخمسا فی الثانیة، کما لو ترك امامه التعوذ ونحوه (واصحهما) لا يزيد عليه لئلا يخالفه. (شرح المهذب ۱۸/۵)

البتہ دوسرے قول یعنی امام حنفی کی اقتداء میں تین پر اکتفاء کرنے کو اصح بتلایا ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سات ماہ میں پیدا ہونے والے کی امامت

سوال (۱) آپ کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کی لڑکی نے ایک مسلمان سے محبت کی اور اسی محبت میں اسے دو مہینہ کا حمل ہو گیا تھا، پھر اس لڑکی نے دوسرے مسلمان آدمی سے نکاح کر لی، اور نکاح کرنے کے ساتویں مہینہ لڑکا پیدا ہوا، اور وہ لڑکا بروقت حافظ ہو گیا ہے، اور مسجد میں نماز پڑھاتا ہے تو اس کے پیچھے ہمیں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کہیں مسجد میں نماز پڑھا سکتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

وہ لڑکا شرعاً ثابت النسب ہے، اس لیے اس کی امامت میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

ان الفراش علی اربع مراتب. (درمختار) وقوی هو فراش المنكوحة ومعتدة الرجعی؛ فانه فیه لا ینتفي إلا باللعان. (شامی ۲/۶۸٤) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نصف آستین کا کرتہ پہن کر نماز پڑھانا

سوال: (۹) ایک آدمی غیبت کرتا ہے، اور جھوٹ بولتا ہے، ایک دوسرے کی

بات دوسرے سے لگاتا ہے، اور ہاف (نصف) آستین کا کرتہ پہن کر نماز پڑھتا ہے تو اس کے پیچھے ہمیں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

مکروہ ہے۔

ویکره إمامة عبد وإعرابي وفاسق وأعمیٰ. (تنویر الأبصار ۵۶۰/۱) ولو صلیٰ رافعا کلیه إلی المرفقین کره. (خانیه ۱۳۵/۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کفریہ عقیدہ رکھنے والے بریلوی کے پیچھے نماز

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں:

ہمارے ایک امام آیا ہوا ہے پاکستان سے بریلوی خیالات کا، وہ حضور ﷺ کو عالم الغیب اور حاضر وناظر مانتا ہے، اور تمام وہ باطل عقیدے- جو بریلوئیوں کے اندر معروف ہیں- ان پر وہ عقیدہ رکھتا ہے، جس کے نتیجہ میں یہاں پر بڑا فتنہ عوام میں برپا ہو رہا ہے، اس وجہ سے ''موزمبیق'' میں مجلس العلماء کی طرف سے بعض سوالات کئے جا رہے ہیں، امید ہے کہ ہمیں مدلل ومطمئن جواب دیں گے قرآن اور احادیث کی روشنی میں؛ کیونکہ اگر قرآن اور احادیث نبویہ کی روشنی میں ایسے عقائد رکھنے والے حضرات صاف طور پر شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں، جیسا کہ علماء کرام کی کتابوں سے بھی صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے، مثل مولانا سرفراز خان صاحب اور دیگر کتابوں سے؛ لیکن پھر بھی ہمارے علماء دیوبند نے احتیاط پر عمل کرتے ہوئے ان کو کافر یا مشرک قرار نہیں دیا؛ لہذا ہم لوگ یعنی ''موزمبیق'' کے تمام علماء آپ حضرات سے مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب انتظار کر رہے ہیں۔

(۱) بریلوی عقائد رکھنے والا قرآن واحادیث کی روشنی میں مسلمان ہے یا مشرک؟

(۲) اگر یہ مشرکانہ عقیدہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو علمائے دیوبند کافر یا مشرک قرار نہیں دیتے؟

(۳) بریلوی عقائد رکھنے والے کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ نکاح یا صلوٰۃ الجنازہ پڑھایا ہوا مقبول اور جائز ہے یا نہیں؟ خاص طور پر جبکہ یہ لوگ ہمارے پیچھے نماز کو جائز نہیں سمجھتے ہیں، اور ہمارا پڑھایا ہوا نکاح باطل جانتے ہیں، اور ہمیں کافر قرار دیتے ہیں۔

(۴) اگر ایک مسجد میں ایسے عقیدے رکھنے والا امام موجود ہے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے دوسری جماعت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ، اور کیا یہ دوسری جماعت پہلی جماعت شمار ہوگی یا نہیں؟

(۵) کن حالات میں دوسری جماعت جائز ہے؟ اور ان حالات میں کیا دوسری جماعت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

امید ہے کہ ان مسائل کا جواب کما حقہ ادا کیا جائے؛ تاکہ اس فتنہ کا قلع قمع ہو سکے جو کہ ہمارے ملک میں پہلی دفعہ داخل ہو رہا ہے، اور ہم چاہتے ہیں اس کی برائیاں نہ جمنے پائیں اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں، امید ہے کہ جلد از جلد جواب ملے؛ کیونکہ یہ اس فتنہ کی ابتداء ہے، اور لوگ اس وقت مذبذب ہیں، امید ہے کہ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جلد از جلد جواب دیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

بریلوی عقائد کیا ہیں؟ اس کی تحقیق کر کے ان کی تصریح کے ساتھ سوال کیجئے،

جس شخص کا عقیدہ کفریہ ہو اس کا امام بنانا اور اس کی اقتداء کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں، اس کے پیچھے نماز درست نہیں۔

ویکره إمامة عبد، وأعرابي، وفاسق، وأعمى إلا أن يكون أعلم القوم، ومبتدع لا يكفر بها فلا يصح الاقتداء به اصلاً. (تنویر الابصار) (فتاوی محمودیہ ۲/۷۰، ۷۳)

امام کا عقیدہ کفریہ ہونے کی صورت میں جب نماز ہی درست نہیں ہوتی تو الگ نماز پڑھنا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بریلوی عقائد والے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرعِ متین مسئلۂ ذیل میں:

کیا ہم بریلوی امام کی اقتداء کر سکتے ہیں؛ جبکہ ان کے عقائد میں شرک کا وجود ہے، جیسے: حضور ﷺ کو عالم الغیب کہنا، حضور ﷺ کو حاضر و ناظر سمجھنا، حضور ﷺ کو اللہ کے برابر سمجھنا، ان عقائد کے باوجود کیا ان کے پیچھے نماز ہوگی؟ اگر نہ ہوگی تو پچھلی نمازوں کو دہرانا پڑے گا؟ کیا بریلوی حضرات پر کفر کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

حضور ﷺ نے اپنے عالم الغیب ہونے کی خود نفی فرمائی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنے علم غیب کی نفی کر دیں۔ ﴿قل لا اقول لكم عندي خزائن الله ولا اعلم الغيب، قل لا يعلم من في السمٰوٰت والارض الغيب الا الله﴾ اس لیے کہ

یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ذاتی ہے، اسی طرح ہر جگہ حاضر وناظر ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر و برابر نہیں ﴿ولم يكن له كفوا احد﴾۔

اس لیے سوال میں مذکور عقائد قرآن وحدیث واجماعِ امت کے خلاف ہیں، ایسے عقائد رکھنے والے کے پیچھے نماز درست نہیں۔وإن أنكر بعض ماعلم من الدين ضرورة كفر بها، كقوله إن الله تعالىٰ جسم كالاجسام، وانكاره صحبة الصديق فلا يصح الاقتداء به اصلا فليحفظ. (درمختار على هامش الشامی ۱/۴۱۵)

اگر یہ معلوم ہوجائے کہ امام کے یہ عقائد ہیں تو پچھلی نماز بھی دہرا لینی چاہئے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تارکِ فجر کی امامت

سوال: امجد ایک شخص ہے جو غسالی کا پیشہ کرتا ہے، اور مردوں کو نہلانے کا کام کرتا ہے، دوسرے یہ کہ صبح کی نماز برسوں میں ادا نہیں کرتا صرف چار ٹائم نماز ادا کرتا ہے، اور جانوروں کی ذبحیت کا کام کرتا ہے، اور اناج کی سرکاری دوکان ہے، اور وہ اناج کارڈ والوں کو نہ دیتے ہوئے بلیک مارکیٹ کرتا ہے، اور خود کو بہت بڑا متقی اور پرہیزگار سمجھتا ہے، کیا ایسے آدمی کے پیچھے نماز ادا ہوسکتی ہے جو کہ کبھی کبھی امام کا کام انجام دیتا ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو شخص فجر کی نماز نہ پڑھتا ہو وہ فاسق ہے، ایسے آدمی کو امام بنانا مکروہ ہے، اور ایسے آدمی کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی۔

إن إمامة الفاسق مكروهة تحريما. (طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱۶۴) فقط

واللہ تعالیٰ أعلم۔ کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۶/ رجب ۱۴۰۹ھ

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے والے کی امامت

سوال: (۱) ایک شخص نے دو سگی بہنوں سے نکاح کرلیا، یہ نکاح ہوا یا نہیں؟

دوسری بات یہ کہ وہ نماز جمعہ یا دوسری نمازیں پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

ناحق قتل کرنے والے اور منکر قرآن کی امامت

سوال: (۲) جو آدمی کسی مسلمان کا ناحق خون بہائے یا قرآن کا منکر ہو، وہ بھی امامت کرا سکتا ہے یا نہیں؟ اور مسلمانوں کی مجلس میں ایسے شخص کو بیٹھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱): دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ ﴿وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾

اب اگر کسی آدمی نے ایسا کرلیا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ پہلے سے ایک بہن نکاح میں موجود تھی، اور دوسری سے نکاح کیا، اس کا حکم یہ ہے کہ پہلا نکاح باقی ہے، دوسرا باطل ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ بیک وقت ایک ہی عقد سے دونوں سے نکاح کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں سے علیحدگی اختیار کرلے۔

وإن تزوجهما معا أي الاختين أو مَن بمعناهما أو بعقدين ونسى النكاح الأول فرق القاضي بينه وبينهما. (درمختار) (قوله نسى الأول) فلو علم

فهو الصحيح، والثاني باطل، الخ. (شامي ۲/۳۱۰)

اگر وہ شخص دو سگی بہنوں کو اپنے پاس بیوی بنا کر رکھے ہوئے ہے تو مرتکبِ حرام ہے جو فاسق ہے، اس کی امامت جائز نہیں، ایسے آدمی کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی۔

ويكره ...... فاسق. (درمختار) (قوله فاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر، كشارب الخمر، والزاني، وآكل الربا، ونحو ذلك. الخ (شامی ۱/۴۱۴)

(۲): کسی مسلمان کا ناحق خون بہانا بھی کبیرہ گناہ ہے، اس لیے اس کا بھی یہی حکم ہے۔

جو شخص قرآن کا منکر ہو اس کے پیچھے نماز درست نہیں، اس نماز کا اعادہ ضروری ہے۔

وإن أنكر بعض ما علم من الدين ضرورةً كفر بها، فلا يصح الاقتداء به أصلاً. (درمختار على هامش الشامي ۱/۴۱۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسائل تراویح

تراویح پر اجرت کا حیلہ

سوال: رمضان المبارک میں معمول سا بن گیا ہے کہ تراویح کی نماز میں قرآن پڑھنے والے حفاظ کو رقم پیش کی جاتی ہے یا حفاظ صاحب خود طے کرتے ہیں، اگر قرآن کے پڑھنے سے رقم کمائی جانے پر پابندی لگائی جائے، تو وسیع پیمانے پہ ایک عظیم کارِ خیر میں حد درجہ کی کمی واقع نہ ہو جائے گی؟ شریعت اس سلسلہ میں کیا فیصلہ سناتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اجرت پر قرآن شریف پڑھنا درست نہیں ہے، اور اس میں ثواب (بھی) نہیں ہے، اور بحکم "المعروف کالمشروط" جس کی نیت لینے دینے کی ہے، وہ بھی اجرت کے حکم میں ہے اور ناجائز ہے، اس حالت میں صرف تراویح پڑھنا اور اجرت کا قرآن شریف نہ سننا بہتر ہے اور صرف تراویح ادا کر لینے سے قیام رمضان کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ (فتاویٰ دار العلوم ۴/ ۲۴۶ بحوالہ رد المحتار ۱/ ۶۸۷، مسائل تراویح ۲۷)

اصل مسئلہ یہی ہے، مگر وہ مشکلات بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیے جو ہر سال اور تقریباً ہر ایک مسجد کے نمازیوں کو پیش آتی ہیں، اس بناء پر قابل عمل شکل یہ ہے کہ جہاں لوجہ اللہ تراویح پڑھانے والا حافظ نہ ملے، وہاں تراویح پڑھانے والے کو ماہِ رمضان کے لیے نائب امام بنایا جائے اور اس کے ذمہ ایک یا دو نماز سپرد کر دی جائے، تو مذکورہ حیلہ سے تنخواہ لینا دینا جائز ہو جائے گا؛ کیونکہ امامت کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔ (از فتاوی

رحیمیہ ۱/ ۳۴۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تراویح پر اجرت

سوال: ہمارے یہاں (کولہاپور) میں اکثر و بیشتر دوسری جگہوں سے حافظ تراویح پڑھانے کے لیے تشریف لاتے ہیں اور وہ اپنی طرف سے کوئی اجرت وغیرہ مقرر کرتے نہیں؛ البتہ مسجد کے ذمہ داران حضرات کی طرف سے دوسرے عشرہ سے ۲۷ ویں شب کے چندہ کے نام سے ان کے چندے کا اعلان ہوتا ہے اور یہ اعلان مسلسل ۲۷ ویں تک جاری رہتا ہے اور یہ جمع شدہ چندہ حافظ صاحب، امام صاحب، مؤذن صاحب تینوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے، تو اس سلسلہ میں ہمارے وہاں ایک قاری صاحب (عالم ہے یا نہیں وہ معلوم نہیں) نے یہ اعلان کروایا کہ ان حافظوں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، تو کیا یہ صحیح ہے کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی؟ اور ان کے لیے چندہ جمع کرنا کیسا ہے؟ اور اگر صحیح نہیں، تو پھر ان کو پیسے دینے کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اصل حکم تو یہی ہے کہ طاعات پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے، مگر متأخرین نے بقاءِ دین کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر تعلیمِ قرآن، امامت، اذان وغیرہ چند چیزوں پر اجرت لینے دینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، جن چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جواز کا حکم ان ہی میں منحصر رہے گا، تراویح مستثنیٰ کردہ چیزوں میں نہیں ہے، اس لیے اصل مذہب کی بنیاد پر تراویح پر

اجرت لینا دینا ناجائز ہی رہے گا۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۴/۴۲۲)

بے شک تراویح پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے، لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں، اس سے اچھا یہ ہے کہ الم ترکیف سے تراویح پڑھی جائے، لوجہ اللہ پڑھنا اور لوجہ اللہ امداد کرنا جائز ہے، مگر اس زمانہ میں یہ کہاں ہے؟ ایک مرتبہ پیسے نہ دیئے جائیں تو حافظ صاحب دوسری دفعہ نہیں آئیں گے، تو اب للہ کہاں رہا؟ اصل مسئلہ یہی ہے مگر وہ مشکلات بھی نظر انداز نہ ہونی چاہئے، جو ہر سال اور تقریباً ہر ایک مسجد کے نمازیوں کو پیش آتی ہیں، قابلِ عمل حل یہ ہے کہ جہاں لوجہ اللہ تراویح پڑھانے والا حافظ نہ ملے، وہاں تراویح پڑھانے والے کو ماہِ رمضان کے لیے نائب امام بنایا جائے اور اس کے ذمہ ایک یا دو نماز سپرد کردی جائے، تو مذکورہ حیلہ سے تنخواہ لینا جائز ہوگا، کیونکہ امامت کی اجرت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ (از فتاوی رحیمیہ ۱/۳۴۹)

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تنخواہ کی مقدار متعین کردی جائے؛ تاکہ امامت کی اجرت مجہول نہ رہے، باقی تراویح میں قرآن خوانی پر اجرت طے کردی گئی ہو، تب بھی ناجائز ہے اور اگر بغیر طے کئے دی جاتی ہے تو اس میں دو گناہ ہیں: ایک قرآن پر اجرت کا گناہ۔ اور دوسرا جہالت اجرت کا گناہ۔ (احسن الفتاویٰ ۳/۵۱۴)

اور اس طرح سننے اور سنانے والے سب سخت گنہگار اور فاسق ہیں اور ایسے قاری کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ (احسن الفتاوی ۳/۵۱۵)

فرائض میں فاسق کی امامت کا یہ حکم ہے کہ اگر صالح امام میسر نہ ہو، یا فاسق امام کو ہٹانے کی قدرت نہ ہو، تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھ لی جائے، ترکِ جماعت جائز

نہیں؛ مگر تراویح کا حکم یہ ہے کہ کسی حال میں بھی فاسق کی اقتداء میں جائز نہیں، اگر صالح حافظ نہ ملے، تو چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھ لی جائے، اگر محلّہ کی مسجد میں ایسا حافظ تراویح پڑھائے، تو فرض مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کر کے تراویح الگ مکان میں پڑھیں۔ (احسن الفتاویٰ ۳/۵۱۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

تراویح پر اجرت اور حیلہ

سوال: حفاظ کرام کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو دائمی امام ہیں۔ دوسرے وہ جو نہ دائمی امام ہیں، نہ عارضی ہیں؛ بلکہ تنہا تراویح اس کے ذمہ ہے، آیا ان تمام حضرات کے لیے اجرت حرام ہے یا کہ کوئی ایسی شکل ہے جس میں اجرت لینا درست ہے، مثلاً: ہمارے علاقہ مہاراشٹر میں کثرت سے حفاظ یوپی، بہار، گجرات وغیرہ سے خالص رمضان شریف میں تراویح سنانے کے لیے آتے ہیں اور ان کے ذمہ چند فرض نمازیں بھی کردی جائے تو کیا ان کے لیے اجرت ماہ مبارک میں لینا جائز ہے یا کہ نہیں ہے؟

جس صورت میں اجرت لینا ناجائز ہے تو کیا اس طرح اجرت دے کر پڑھی تراویح فاسد ہوگی یا نہیں؟ اس کا اعادہ واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر بلا کسی اجرت کے مقرر کردیں، کوئی قرآن سنائے اور بغیر اعلان واظہار کے لوگ اس حافظ کو اپنی ذاتی طور پر ہر شخص بلا تعیین کچھ ہدیہ دے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور بعض جہلاء نے ایسے حافظ کے پیچھے نماز اور تراویح پڑھنے سے انکار، کیا جس کی اجرت مقرر نہ کی گئی ہو، اور ایک ہی مسجد میں علیحدہ علیحدہ ایک اوپر اور ایک نیچے جماعت تراویح شروع کیا، ان حضرات کا یہ فعل کیسا ہے؟ مسئلہ مندرجۂ بالا کچھ مفصلا جواب مع حوالات واضحہ ودلائل قویہ سے مزین فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

بے شک تراویح میں اجرت لینا دینا ناجائز ہے، لینے والا اور دینے والا دونوں گنہ گار ہوتے ہیں، اس سے اچھا یہ ہے کہ الم ترکیف سے تراویح پڑھی جائے، لوجہ اللہ پڑھنا اور لوجہ اللہ امداد کرنا جائز ہے؛ مگر اس زمانہ میں یہ کہاں ہے؟ ایک مرتبہ پیسے نہ دیے جائیں تو حافظ صاحب دوسری دفعہ نہیں آئیں گے، تو اب للہ کہاں رہا؟ اصل مسئلہ یہی ہے؛ مگر وہ مشکلات بھی نظر انداز نہ ہونی چاہئے، جو ہر سال اور تقریباً ہر ایک مسجد میں کے نمازیوں کو پیش آتی ہیں، اس بنا پر ایک قابل عمل شکل یہ ہے کہ جہاں لوجہ اللہ تراویح خواں حافظ نہ ملے، وہاں تراویح پڑھانے والے کو ماہ رمضان کے لیے نائب امام بنایا جائے اور اس کے ذمہ ایک یا دو نماز سپرد کی جائے، تو اس مذکور حیلہ سے تنخواہ لینا دینا جائز ہو جائے گا؛ کیونکہ امامت کی اجرت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کا فتوی ہے:

اگر رمضان المبارک کے مہینہ کے لیے حافظ کو تنخواہ پر رکھ لیا جائے اور ایک دو نمازوں میں اس کی امامت معین (مقرر) کردی جائے، تو یہ صورت جواز کی ہے؛ کیونکہ امامت کی اجرت (تنخواہ) کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ دہلی ۲۷/ شعبان ۱۳۷۰ھ۔

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ مفتی مظاہر علوم فرماتے ہیں:

اصل مذہب تو عدم جواز کا ہی ہے؛ لیکن حالت مذکورہ میں حیلۂ مذکور کی گنجائش ہے۔ (محمود گنگوہی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور ۵/ شعبان ۱۳۷۰ھ از فتاویٰ رحیمیہ ۱/ ۳۴۹، ۳۵۰)

تراویح کے لیے اجرت لینا اور دینا گناہ ہے؛ لیکن اس سے تراویح فاسد نہیں

ہوتی؛ البتہ تالی اور سامع ثواب سے محروم رہتے ہیں، اگر ان حافظ صاحب کو معلوم ہے کہ ان کو قرآن شریف سنانے پر کچھ روپیہ ملے گا اور لینا دینا معروف ہے، تو ان حافظ صاحب کو کچھ لینا قرآن شریف ختم کر کے درست نہیں ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم مکمل مدلل ۴/۲۶۴)

جن حضرات نے سوال میں مذکور علت کی بناء پر ایک ہی مسجد میں تراویح کی دوسری جماعت کی، ان کا یہ فعل شرعاً درست نہیں ہے، جہالت کی بات ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تراویح پڑھانے والے کے لیے چندہ

سوال: ایک شکل یہ بھی ہے کہ یہ مسجد میں با قاعدہ نظم وضبط کے ساتھ اعلان بھی کیا جاتا کہ ۲۷/ ستائیس شب کا چندہ با قاعدہ ہر مقتدی سے وصول کیا جاتا ہے، اس چندہ میں سے مسجد کے تمام اخراجات کے ساتھ ساتھ قرآن سنانے والے حافظ کو بھی اجرت اور مؤذن اور دائمی امام کو بھی دیا جاتا ہے، اس کی صورت جائز ہے یا ناجائز ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

مسجد کے اخراجات اور امام ومؤذن کی تنخواہ کے لیے چندہ کیا جائے اور مصلی حضرات بخوشی چندہ دیتے ہوں اور چندہ جبراً وصول نہ کیا جاتا ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ ۴/ ۴۲۷)

البتہ تراویح میں قرآن سنانے والے حفاظ کو اجرت دینا جائز نہیں ہے، اس لیے اس مقصد سے چندہ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تراویح میں سامع ضروری نہیں

سوال: نماز تراویح میں جو حافظ قرآن پاک سناتا ہے، اس کے پیچھے اگر سامع نہ ہو، تو کیا حکم ہے آیا سامع کا ہونا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر پڑھنے والے کا حفظ پختہ ہے، تو سامع ضروری نہیں۔ (احسن الفتاوی ۳/ ۵۲۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تراویح میں ختمِ قرآن کی شرعی حیثیت

سوال: تراویح میں قرآن سننا افضل ہے یا کہ الم ترکیف سے تراویح افضل ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صحیح مذہب اور قول اصح یہ ہے کہ تراویح میں ایک قرآن ختم کرنا سنت مؤکدہ ہے، قوم کی کاہلی کی وجہ سے اسے ترک نہ کیا جائے اور دو ختم کرنے میں فضیلت ہے اور تین ختم کرنا افضل ہے، جہاں فقہاء نے ایک ختم کو سنت لکھا ہے، اس سے ظاہراً سنت مؤکدہ مراد ہے، الخ (امدادالفتاویٰ ۱/ ۳۰۰) والختم مرة سنة مؤكدة. (نهاية شرح هدايه ۱/ ۱۳۱ ازفتاویٰ رحیمیہ ۴۰۵، ۴۰۶ والتفصيل هناك فارجع إليها) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

تراویح میں بیس رکعات کا ثبوت

سوال: کیا تراویح ۸/ رکعت ہے یا ۲۰/ رکعت؟ غیر مقلدین حضرات احناف

کی کتابوں سے ۸/رکعت کا ثبوت نکالتے ہیں، جیسا کہ انور شاہ کشمیریؒ نے ترمذی کی تقریر "عرف الشذي" ۲۲۹ میں لکھا ہے: ولا مناص من تسليم أن تراويحه عليه السلام كانت ثمانية ركعات. اور ۳۳۰ وأما النبي فصح عنه ثمان ركعات.

(۲) "مراقي الفلاح شرح نورالايضاح" میں فاضل ابوالاخلاص شرنبلالیؒ کہتے ہیں: صلاته بالجماعة سنة كفاية، لما ثبت أنه ﷺ صلى بالجماعة أحدى عشرة ركعة بالوتر.

(۳) اور فاضل طحطاویؒ درمختار کی شرح ۱/ ۲۹۶ میں لکھتے ہیں: لأن النبي ﷺ لم يصلها عشرين؛ بل ثمانيا، ولم يواظب على ذلك.

امام سیوطیؒ نے اپنی کتاب "المصابيح" طبع ہند کے ۴۳ میں لکھا ہے: الحاصل أن العشرين لم يثبت من فعله الخ.

عبدالحق محدث دہلویؒ "ماثبت بالسنة" ۸۸: "لیکن محدثین نے لکھا ہے کہ بیس والی روایت ضعیف ہے، صحیح تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی گیارہ ہے۔

ملاعلی قاریؒ مرقات: "فتحصل من هذا كله أن التراويح في الأصل أحدى عشرة ركعة". الخ۔

سید احمد طحطاوی حنفیؒ شرح درمختار: "وقد ثبت أن ذلك كان أحدى عشرة ركعة بالوتر، كما ثبت في الصحيح من حديث عائشة".

"منية المصلى" کی شرح "كبيرى" کے ۳۹۳ مطبوعہ لاہور میں لکھا ہے: "أنه عليه الصلوٰة والسلام قام بهم في رمضان فصلى ثمان ركعات وأوتر". الخ،

۳۹٤: فانه ﷺ صلى بهم ثمان ركعات واوتر الخ. ابن ماجہ: جابر رضی اللہ عنہ کی روایت آٹھ رکعت والی، امام ابن الہمامؒ في "فتح القدير شرح هدايه" ۲۰۵ میں ۸/ رکعت کا ثبوت ہے۔ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت جو یزید ابن رومان سے منقول ہے، تو کیا یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا؟ کیا سند منقطع ہے؟ کیا یہ طریقہ جس طریقہ پر یہ نماز پڑھتے ہیں، جبکہ عبدالحق بنارسی نے یہ جماعت بنائی، اس سے پہلے کوئی اس طریقہ سے نماز پڑھتا تھا؟ جیسا کہ احناف کی کتابیں شوافع کی کتابیں شاہد ہیں۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

"مراقي الفلاح" میں ہے: وهي عشرون ركعة بإجماع الصحابة رضی اللہ عنہم.

(اور تراویح کی بیس رکعتیں ہیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے) (مراقي الفلاح على هامش الطحطاوي ۲۲۵) اس کی مزید تفصیل دیکھنا چاہیں تو فتاویٰ رحیمیہ جلد اول ۲۸۲ سے لے کر ۳۴۳ کا مطالعہ فرمائیں، اس میں غیر مقلدین حضرات کے اس فریب کی مکمل پردہ دری کی ہے، ان تمام کتابوں سے؛ بلکہ فقہ حنفی کی دیگر معتبر کتابوں سے اور مستند علمائے احناف کے حوالہ سے اس کا بیس رکعات ہونا تفصیل سے ثابت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیس رکعت کے ثبوت کے سلسلہ میں فخر المحدثین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہم کی کتاب ''رکعات تراویح'' کا مطالعہ فرمائیں، اس مختصر فتویٰ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تراویح کی تین رکعت پڑھادی

سوال: تراویح کی دو کی بجائے امام نے تین رکعت پڑھی، اور سجدہ سہو کیا تو دوبارہ دو رکعت تو پڑھے گا؛ لیکن وہ مقدارِ قرآن جو اس نے ان دو رکعتوں میں پڑھا ہے، کیا اسے دوبارہ پڑھنا پڑھے گا یا اس سے آگے پڑھے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر دوسری رکعت پر قعدہ کیے بغیر تیسری کے لیے کھڑا ہو گیا تھا، اور تیسری پر قعدہ کر کے سلام پھیرا تو تراویح کی وہ دو رکعت معتبر نہ ہوئی، اعادہ ضروری ہے، اور جو قرآن اس میں پڑھا گیا ہے اس کا لوٹانا بھی ضروری ہے۔ (بحواله رد المحتار، فتاویٰ رحیمیہ ۴/۴۲۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

ہاؤس کی تراویح میں عورتوں کی شرکت

سوال: ہمارے یہاں ایک بڑے احاطہ میں ایک بڑا ہاؤس ہے، جس میں ہماری برادری کے تقریباً ۵۰-۶۰ مکانات (فلیٹ) ہیں، جس میں ہم رمضان المبارک میں احاطہ کی ایک کھلی جگہ میں تراویح ادا کرتے ہیں، جس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ جو حضرات مسجد کے دور ہونے کی وجہ سے تراویح ترک کر دیتے تھے، وہ لوگ ہاؤس میں ادا کر لیتے ہیں۔ قابلِ دریافت امر یہ ہے کہ جس جگہ مرد تراویح پڑھتے ہیں، اس کے متصل میں ایک حجرہ ہے، جس میں ہاؤس کی خواتین بھی پردہ کے اہتمام کے ساتھ تراویح کی جماعت میں شرکت کرتی ہیں، کیونکہ مشاہدہ ہے کہ ۹۰/ فیصد خواتین گھر میں تراویح نہیں پڑھتی ہیں، تو ایسی صورت میں شرعاً عورتوں کی تراویح میں شرکت اور ان کی تراویح کی نماز

کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

عورتیں اگر اسی ہاؤس کی ہوں کہ ان کا حجرہ میں تراویح کے لیے آنا خروج عن المکان نہ ہو، تو ان کی یہ شرکت درست ہے، ورنہ نہیں؛ اس لیے کہ عورتوں کے لیے جماعت میں شرکت کی ممانعت کی علت جو فقہاء نے بتلائی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے گھروں سے نکلنے ہی میں فتنہ ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اگر علتِ ممانعت وکراہت یعنی خروج عن المکان -جو سببِ فتنہ ہے- نہیں پائی جاتی، تو حکم یعنی ممانعت وکراہت بھی نہیں۔

أما المرأة فلأنها مشغولة بخدمة الزوج، ممنوعة عن الخروج إلى محافل الرجال؛ لكون الخروج سببا للفتنة، ولهذا لا جماعة عليهن، ولا جمعة عليهن أيضاً. (بدائع الصنائع ۱/۲۵۸)

ولا يباح للشواب منهن الخروج إلى الجماعات بدليل ماروى عن عمر رضي الله عنه انه نهى الشواب عن الخروج، ولان خروجهن إلى الجماعة سبب للفتنة، والفتنة حرام، وما أدى إلى الحرام فهو حرام. (بدائع الصنائع ۱/۱۵۷)

البتہ اگر ہاؤس کی عورتوں کی اس شرکت میں دوسری کوئی ایسی خرابی پائی جاتی ہو، جو علتِ ممانعت بن سکتی ہے، تو اس صورت میں ان کی یہ شرکت درست نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسائل سفر

شرعی مسافت

سوال: شرعی ۴۸ میل کے کتنے کلومیٹر ہوں گے (انگریزی میل کے حساب سے ۶ء اکلومیٹر ا میل) یعنی ۱۶ اکلومیٹر = ۱۰ میل۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مسافت سفر ۴۸ میل انگریزی ہے۔ (جواہر الفقہ ۱/ ۴۳۸) کلومیٹر کے حساب سے ۷۷ (ستتر) کلومیٹر ہوتی ہے۔ یہ یادرہے کہ شرعی میل اور انگریزی میل میں کچھ فرق ہے، شرعی میل کچھ بڑا ہوتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سفر میں نماز قضاء ہونے کا خوف ہوتو ٹرین چھوڑ دے

سوال: شرعی مسافر نماز قضاء ہوجانے کا خوف ہونے کی صورت میں، جبکہ ریل یا بس میں اتنی بھیڑ ہو کہ نماز پڑھنے کو جگہ نہ ہو اور وضو اور تیمّم بھی ممکن نہ ہو، ایسی صورت میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے اشاروں سے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ یہی صورت اگر ۴۸ میل سے کم سفر ہونے کی صورت میں پیش آئے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس ٹرین یا بس کو چھوڑ دے، نماز پڑھ کر دوسری ٹرین یا بس سے سفر کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسائل نماز جمعہ

جمعہ کے بعد کی سنت نہ پڑھی ہے تو بھی جمعہ کی نماز ہو جائے گی

سوال: اگر کوئی شخص جمعہ کی فرض نماز کے بعد چار سنت نہ پڑھے، تو اس کی جمعہ ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہو جائے گی، یعنی فرض اس کے ذمہ سے ساقط ہو جاوے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اردو میں خطبہ

سوال: خطیب جمعہ کے اول خطبہ میں اللہ کی حمد وثناء کے بعد اردو میں تقریر کرتا ہے اور اس تقریر میں وعظ نصیحت کرتا ہے، تو ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اردو میں خطبہ مکروہ تحریمی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۲/ ۲۹۵)

اس موضوع پر مستقل رسائل بھی موجود ہیں اور کتبِ فتاویٰ میں مفصل فتاوی بھی، ان کا مطالعہ مفید ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

خطبہ ختم ہونے سے پہلے کھڑے ہونے والوں کو بٹھا دینا

سوال: خطیب کے خطبہ ختم کرنے سے پہلے لوگوں کا کھڑا ہو جانا، اور کیا اس بات کا امام کو حق ہے کہ وہ کھڑے شدہ لوگوں کو بٹھائے؟ اور شریعت میں اس کے متعلق کوئی نکیر موجود ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب تک خطبہ ختم نہ ہوجائے وہاں تک اٹھنا درست نہیں ہے۔

وفي شرح الزاهدي: يكره لمستمع الخطبة ما يكره في الصلوٰة من أكل، وشرب، وعبث، والتفات، ونحو ذلك. اه وفي الخلاصة: كل ما حرم في الصلوٰة حرم حال الخطبة؛ ولو أمرا بمعروف، وفي السيد: استماع الخطبة من أولها إلى آخرها واجب. (طحطاوي على مراقي الفلاح۲۸۲)

امام ایسے لوگوں کو بٹھا سکتا ہے؛ بلکہ اس کو چاہئے کہ بٹھائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

خطبۂ جمعہ میں بنات مکرمات رضی اللہ عنہن کا ذکر مبارک

سوال: خطبۂ جمعہ میں کوئی خطیب حضور ﷺ کی چاروں بیٹیوں کا نام بالترتیب لے، تو کیا اس طرح کا خطبہ پڑھنا بدعت ہے یا نہیں؟ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ دلائل کی وضاحت کے ساتھ جواب مطلوب ہے، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

ہر زمانہ میں خطبہ کے مضمون کی ترتیب میں اسلام میں پیدا ہونے والے فتنوں سے مسلک اہلِ سنت والجماعت کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے؛ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماءِ مبارکہ اوران کے لیے دعا اوران کے مناقب خطبہ میں لانے سے روافض وخوارج پر تردید اور مسلک اہل سنت کا اعلان مقصود ہے، سابق زمانوں میں جو فتنے تھے ان کی تردید کے لیے انہی صحابہ کا ذکر کافی تھا جو مطبوعہ خطبوں میں مذکور ہیں، (دورِ حاضر کے) روافض کو حضرت فاطمہ کے سوا دوسری بنات مکرمات رضی اللہ عنہن سے بھی بغض ہے، اس لیے ان پر تردید کے پیشِ نظر خطبہ میں بنات مکرمات رضی اللہ عنہن

کے مناقب وفضائل کا ذکر اور ان کے لیے دعا ترضی کا معمول بنانا چاہئے، اس سے اکابر کے مسلک سے انحراف لازم نہیں آتا؛ بلکہ ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ ان کے خطبات جس نظریہ پر مبنی ہیں ان میں یہ اضافہ بھی اسی نظریہ کے تحت کیا گیا ہے۔

(احسن الفتاویٰ ۴/ ۱۴۶ بحذف وتغییر یسیر) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بڑی بستی میں جمعہ کے روز احتیاط الظہر پڑھنا

سوال: گاؤں ''بسو'' جس میں فی الحال دس ہزار کی آبادی ہے، اور اسّی نوے دکانیں ہیں، اور تقریباً تمام ہی ضروریات میسر ہیں، اور پچھتر سال سے اس گاؤں میں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے، ابتداء میں تقریباً تیئیس جگہوں سے فتویٰ طلب کیا گیا تھا، جن میں سے پندرہ جگہوں سے جواز کا فتویٰ آیا تھا، اور آٹھ جگہوں سے عدم جواز کا فتوی آیا تھا؛ لیکن اُس وقت پورے گاؤں کے لوگ بریلوی عقائد کے تھے، بعد میں دعوت وتبلیغ کی برکت سے کچھ لوگ اہل سنت والجماعت کے عقائد پر آ گئے، اور انھوں نے مسجد، مدرسہ میں اپنا حق طلب کیا، جس کی بناء پر اختلاف بڑھا، اور پانچ آدمی شہید ہو گئے؛ لیکن پھر مقدمہ میں فیصلہ یہ ہوا کہ نصف مدرسہ اہل سنت والجماعت کو سپرد کیا گیا، اور یہ لوگ مدرسہ میں الگ جماعت کر کے نماز پڑھنے لگے؛ لیکن جمعہ کی نماز سب کے ساتھ مسجد میں ادا کرتے تھے؛ تاکہ مسجد میں اپنا حق باقی رہے، اب پچھلے سال سے اہلِ سنت اپنی مسجد الگ بنا رہے ہیں جو تیار ہونے کے قریب ہے، اور اس میں بریلوی حضرات نے بھی چندہ دیا

ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنی چاہیے یا ظہر؟ جبکہ ظہر پڑھنے کی صورت میں بعضے وہ لوگ جو نیم اہلِ سنت ہیں، یعنی اہل سنت والجماعت کے عقائد ان میں راسخ نہیں ہیں، ان کی طرف سے شدید اختلاف کا خطرہ ہے، اور جمعہ کی نماز پڑھنے کی صورت میں جوڑ باقی رہے گا؛ نیز بریلوی حضرات بھی جمعہ پڑھنے کے لیے آئیں گے تو دین کی صحیح بات سن کر ان کے بھی قریب ہونے کی امید ہے، جمعہ پڑھنے کی صورت میں احتیاطاً ظہر پڑھنی ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آبادی کے شمار، دوکانوں کی تعداد اور روزمرّہ کی حوائج پوری ہوجانے کے اعتبار سے یہ بڑی بستی ہے، اس لیے وہاں جمعہ جائز ہے۔

وتقع فرضا في القصبات، والقرى الكبيرة التي فيها اسواق. (شامی ۱/۵۳۷، فتاویٰ محمودیہ ۲/۳۰۰)

جب جمعہ درست ہے تو ظہر پڑھنا نہیں چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسائل عیدین

عید میں زائد تکبیر کہہ دی

سوال: عید کی نماز میں امام صاحب نے پہلی رکعت میں ہاتھ باندھ کر ثناء پڑھنے کے بعد تین بار تکبیر کہنے کے بعد ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر چوتھی تکبیر کہنے کے بعد ہاتھ باندھ لیا، تو اس کا کیا حکم ہے شریعت میں؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب مرحمت فرمادیجئے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس طرح ایک زائد تکبیر کہی، ایسا کرنے کے باوجود نماز درست ہوگئی، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نمازِ عید میں پانچ تکبیراتِ زوائد کہنا

سوال: عید کی نماز چھ زائد تکبیروں کے بجائے پانچ تکبیروں سے جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ بھی دو عید سے مسلسل ایسا ہو رہا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عید کی نماز میں تکبیراتِ زوائد واجب ہیں، ہر ہر تکبیر زائد واجب ہے۔

وتكبيرات العيدين، وكذا أحدها. (درمختار) (قوله كذا أحدها) أفاد أن كل تكبيرة واجب مستقل. (شامی ۱/۳٤٦)

صورتِ مسئولہ میں جب امام نے ایک زائد تکبیر نہیں کہی، تو واجب چھوٹا، جس پر

سجدۂ سہو واجب ہوا؛ البتہ نمازِ عیدین میں مجمع زیادہ ہوتا ہے تو امام کو چاہئے کہ سجدۂ سہو نہ کرے۔

ولا يأتي الإمام بسجود السهو في الجمعة والعيدين دفعا للفتنة بكثرة الجماعة. (مراقي الفلاح) دفعا للفتنة، أي افتتنان الناس وكثرة الهرج. (بكثرة الجماعة) الباء للسببيه وهي متعلقة بقوله للفتنة، وأخذ العلامة الواني من هذه السببية أن عدم السجود مقيد بما إذا حضر جمع كثير، أما اذلم يحضروا فالظاهر السجود لعدم الداعي إلى الترك وهو التشويش. (طحطاوي على المراقي ٢٥٣، وكذا في الشامي ٥٥٦/١)

مسلسل دوعید سے ہورہا ہے، تو امام صاحب کو متنبہ کر دیا جائے، ممکن ہے، وہ غلط فہمی میں ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

عیدین میں جماعتِ ثانیہ کا حکم

سوال: ہمارے کولہاپور میں کثرتِ ازدحام اور جگہ کی تنگی ہونے کی بناء پر ایک ہی مسجد میں دوعید کی نماز پڑھی جاتی ہیں، بسا اوقات تو ایک ہی خطبے سے اور بسا اوقات دونوں نمازوں کے لیے دو خطبے الگ الگ ہوتے ہیں، تو کیا اس طرح دوسری نماز صحیح ہے؟ اگر صحیح نہیں ہے، تو کونسی شکل ایسی ہوسکتی ہے جس میں صحیح ہو؟ بالتفصیل ہر ایک شکل پر روشنی ڈالتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں۔

نوٹ: بسا اوقات تو ایک ہی مسجد میں تین تین چار مرتبہ بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

عید کی نماز عیدگاہ میں ادا کرنا سنتِ مؤکدہ متوارثہ ہے، آنحضور ﷺ مسجد نبوی کی

فضیلت کے باوجود علی سبیل المواظبت بر سبیل عبادت عیدین کی نماز عیدگاہ میں ادا فرماتے رہے، صرف ایک دفعہ بوجہ بارش آپ ﷺ نے مسجد میں پڑھی ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۱/۲۷۵)

شہر، قصبہ اور وہ قریۂ کبیرہ جو مثل قصبہ ہو، اور وہاں جمعہ وعیدین وغیرہ پڑھنے کی علماء نے اجازت دی ہو، وہاں آبادی سے باہر جنگل میں عیدگاہ بنانا ضروری ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۳/۷۵)

عیدگاہ نہ ہو اور مسجد میں بھی گنجائش نہ ہو، تو جنگل میں کوئی میدان تجویز کرلیا جائے، اور وہاں نماز عید ادا کی جائے، اگر ایسا میدان میسر نہ ہو، تو شہر میں کسی محفوظ میدان میں یا بڑے ہال یا بڑے مکان میں نماز عید پڑھی جائے ایک ہال یا ایک مکان کافی نہ ہو تو باقی نمازیوں کے لیے دوسری جگہ نماز کے لیے تجویز کردی جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۵/۳۶)

باقی ایک ہی مسجد میں دوبارہ، سہ بارہ جماعت کرنا مکروہ ہے۔ (۱)

بل یکرہ فعلھما، وتکرار الجماعة الخ. (درمختار علی ھامش الشامي ۱/۲۹۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

آبادی میں مسجد کے باہر نماز عید ادا کرنا

سوال: عیدین کی جماعت مسجد میں ہوتی تھی؛ مگر اب چند سالوں سے کثرت ناس وصبیان کی وجہ سے امام مسجد نے مسجد سے متصل شرقی جانب جو کھلی جگہ ہے، جس کو یہاں کی زبان میں ''اَڑان'' کہتے ہیں، اس میں نماز عید شروع کردی، اس ''اڑان'' میں لوگوں کی آمد ورفت، محلّہ کے بچوں کا کھیل کود، بچوں کا سائیکل چلانا وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے،

---

(۱) ''محمود الفتاویٰ'' جلد اول مسائلِ عیدین میں عنوان: ''عیدن میں جماعت ثانیہ کا جواز'' کے ذیل میں متعدد بار عیدین کی نماز کا جواز لکھا ہے، اُس کا تعلق ایک مخصوص صورت کے ساتھ ہے۔ (مرتب)

بالکل چھوٹے بچے کبھی کبھی پیشاب وغیرہ بھی کر دیتے ہیں؛ بہر حال عید کے موقع پر اس کی صفائی ہوتی ہے، اس پر دری بچھا کر چٹائی بچھا دی جاتی ہے، اس موقع پر اس جگہ کو عیدگاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، محض سوال یہ کہ سامنے مسجد چھوڑ کر صرف عیدین کی نماز ادا کرتے ہیں؛ جبکہ ایک اور شکل ممکن ہے وہ کہ تمام بالغین مسجد میں (مع صحن مسجد) رہیں اور بچوں کی صف باہر اڑان میں لگا دی جائے؛ بہر حال اس میں کراہت، حسن اور صحت وافضلیت وغیرہ کا کچھ فرق ہے یا نہیں؟ اور اس طرح کرنا کہاں تک درست ہے؟ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آبادی کے مکانات سے باہر میدان میں عید کی نماز پڑھنا مسنون ہے، اس لیے اگر کھلی جگہ ہی میں پڑھنا ہے تو آبادی سے باہر کوئی کھلی جگہ اس کام کے لیے پسند کر لی جائے؛ تاکہ یہ سنت ادا ہو، باقی آبادی کے اندر رہ کر مسجد یا مسجد سے باہر میدان میں یکساں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲/شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب أحكام الجنائز

قبر پر نماز جنازہ کب تک پڑھ سکتے ہیں؟

سوال: یہاں (مورسی) پر ایک آدمی کا خون ہو گیا، اس کی شناخت بھی ہو گئی کہ وہ مسلمان ہے؛ لیکن حکومت نے کسی وجہ سے اس کی لاش مسلمانوں کو نہیں دی، اس کو قبرستان کے باہر دفنا دیا گیا، اس کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھائی گئی، نماز جنازہ کے متعلق بتائیں، کیا مسئلہ ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جب تک اس کی لاش کے پھولنے پھٹنے کا غالب گمان نہ ہو، وہاں تک اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے اور اگر اتنی مدت دفن کرنے پر بیت چکی ہے کہ اس کی لاش کے متعلق خیال ہو کہ وہ پھول پھٹ گئی ہوگی، تو اس کی نماز اب نہ پڑھی جائے۔ (درمختار مع الشامی ۱/۶۵۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

جنازہ کی نماز میں ثناء کا ثبوت

سوال: احناف کے یہاں جنازے کی نماز میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھی جاتی ہے، کیا اس کا کہیں حدیث میں ثبوت ملتا ہے؟ حدیث میں آتا ہے "لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" الخ.

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

نماز جنازہ درحقیقت میت کی دعا کے لیے موضوع ہے، اور دعا میں پہلے حمد وثناء اور نبی کریم ﷺ پر درود ہونا چاہیئے، نمازِ جنازہ حقیقی نماز نہیں ہے، اسی لیے جن ارکان سے نماز مرکب ہے، وہ اس میں نہیں ہیں، مثلاً: رکوع، سجدہ وغیرہ چونکہ اس میں دعا ہوتی ہے اور عربی میں لفظ "صلوٰۃ" کا اطلاق دعا پر بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کو صلوٰۃِ جنازہ کہتے ہیں۔

"مؤطا امام مالک" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

مالك عن سعيد بن ابي سعيد المقبري رضي الله عنه عن أبيه رضي الله عنه أنه سأل أبا هريرة رضي الله عنه كيف تصلي على الجنازة؟ فقال أبوهريرة رضي الله عنه: أنا لعمر الله أخبرك أتبعها من أهلها، فإذا وضعت كبرت وحمدت الله، وصليت على نبيه ثم أقول الخ اسی طرح حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس میں قرأت نہیں کرتے تھے۔

(أوجز المسالك ٤/٢٣٠، ٢٣١)

جن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم (مثلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ) سے سورۂ الحمد کا پڑھنا منقول ہے، اس کو بھی حمد پر ہی محمول کیا جاوے گا، چنانچہ احناف کے یہاں بھی اگر کوئی آدمی پہلی تکبیر کے بعد سورۂ الحمد شریف بطریق حمد وثناء پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ (ایضاً)

جب صلوٰۃِ جنازہ حقیقۃً صلوٰۃ ہی نہیں ہے، تو "لا صلوٰة إلا بفاتحة الكتاب" والی حدیث کا مصداق نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع ١/٣١٤) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

رضا خانی سے مقابلہ میں مر گیا وہ شہید ہے؟

سوال: اگر بدعتی (رضا خانی) ہماری مسجد پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہیں، امام اور ٹرسٹیوں کو ہتھیار دکھاتے ہیں؛ حالانکہ قلیل ہیں، کیا ان سے ہم مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اگر اسی حالت میں کوئی مر گیا، کیا وہ شہید نہیں ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو آدمی آپ پر حملہ آور ہو اور آپ اپنی جان کی حفاظت میں اس سے مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو جائیں، تو شہید ہیں۔ "من قتل دون نفسه فهو شهيد"۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

کتاب الزکوٰۃ

مرغیوں پر زکوٰۃ

سوال: مرغوں اور مرغیوں پر وجوبِ زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟ ایک مولوی صاحب کا قول سنا ہے کہ مرغیوں میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور مرغوں میں واجب ہوگی؛ کیونکہ فارمر تجارت کی نیت سے خرید کر مرغے پالتے ہیں، مگر ان کی بات میں خلجان یہ ہے کہ (۱) صرف مرغے ہوتے ہیں اور ان میں افزائش نہیں ہوتی۔ (۲) قیمت سے خریدا ہوا فیڈ کھلایا جاتا ہے۔ (۳) دو ماہ تک پال کر بڑے کئے جاتے ہیں، پھر فروخت ہوتے ہیں۔ (۴) دو ماہ میں حولان حول نہیں ہوگا؛ لہٰذا مرغوں اور مرغیوں کی زکوۃ کے بارے میں تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

مرغے، مرغیاں اگر افزائش نسل کے طور پر رکھی ہیں، تو ان میں زکوۃ نہیں ہوگی، اور اگر تجارت کی غرض سے ہیں، تو مال تجارت کے حکم میں ہے، یعنی اس میں باعتبار قیمت زکوۃ واجب ہوگی۔

ولو للتجارة ففيها زكاة التجارة. (درمختار) .... أي بحكم مانوى بـه التجارة من العروض الشاملة للحيوانات، وبحكم السامة للحمل والركوب وهو وجوب زكوٰة التجارة في الأول، وعدمه في الثاني.. (شامي ۱۷/۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سادات کو زکوٰۃ وصدقات دینا

سوال: سید خاندان کے یتیم، مسکین، بیواؤں کو بیت المال میں سے ماہانہ وظیفہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ بیت المال میں زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، ہدایا؛ جمع کئے جاتے ہیں، قرآن وحدیث سے جواب دیجئے؛ نیز امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ جواب دیجئے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

احناف کے نزدیک زکوٰۃ اور صدقات واجبہ سادات کو نہیں دے سکتے؛ البتہ ہدیہ اور صدقاتِ نافلہ دینا جائز ہے، اس لیے بیت المال میں جو رقم ہدیہ یا صدقۂ نافلہ کے طور پر جمع ہوئی ہو، اس میں سے سادات کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔

ولا يدفع إلى بني هاشم. (هدايه)

فجروا على موجب ذلك في الواجبة الخ. (فتح القدير ۲/۲۷۳)

وأما الصدقة النافلة فقال في النهاية: ويجوز النفل بالإجماع. (ايضاً)

امام شافعیؒ کے نزدیک بھی زکوۃ کی رقم سادات کو دینا درست نہیں ہے۔

ولايجوز دفع الزكوٰة إلى هاشمي لقوله ﷺ: نحن أهل بيت لاتحل لنا الصدقة ...... أما ....فالزكوٰة حرام على بني هاشم، وبني المطلب بلا خلاف الخ. (شرح المهذب ۶/۲۲۷)

صدقاتِ نافلہ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی سادات کو دینا درست ہے۔

وتحل صدقة التطوع للاغنياء، ولبني هاشم الخ. (شرح

المہذب ۶/۲۳۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/شوال ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سونا ادھار خریدنے پر زکوٰۃ

سوال: زید نے بکر کے پاس سے کچھ سونا یعنی بقدرِ نصاب یا اس سے زائد ادھار لیا، سونا تو زید کی ملکیت میں آ چکا ہے، تو اب حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ آیا زید پر یا بکر پر؟ اور کیا یہ خرید وفروخت بھی صحیح ہے یا نہیں؟ اور صحیح نہ ہونے کی صورت میں زید کیا کرے؟ وضاحت کے ساتھ جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

یہ خرید وفروخت اگر روپیوں کے عوض ہوئی ہے، تو درست ہے اور جب وہ سونا زید کی ملکیت میں آ چکا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی زید پر ہی واجب ہوگی؛ البتہ اگر زید مقروض ہے اور قرض کی ادائیگی کے لیے نقد رقم نہیں ہے تو اتنی مقدار اس سونے کی قیمت میں سے کم کی جاوے گی اور بقیہ سونے پر شریعت مطہرہ کے مقرر فرمودہ قانون کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (تکملہ فتح الملہم ۱/۵۸۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

زکوٰۃ وغیرہ کے وکیل کا رقم زکوٰۃ کو اپنے استعمال میں لانا

سوال: ایک صاحب نے ایک شخص کو کچھ رقم دے کر وکیل بنایا، جس میں زکوٰۃ

وچرم قربانی کی رقم وصدقہ وللہ کی رقم تھی اور وہ وکیل صاحب خود ضرورت مند ہیں تو کیا وہ رقم اور کونسی رقم اپنی ضرورت میں استعمال کرسکتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو رقم زکوٰۃ وصدقات وغیرہ کی تقسیم کرنے کے لیے اس کو وکیل بنایا گیا ہے، اس کو وہ خود اپنی ضرورت میں استعمال نہیں کرسکتا، چاہے خود ضرورت مند کیوں نہ ہو۔

وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لالنفسه. (درمختار ۳/۱۸۸ زکریا)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیوی کی زکوٰۃ بیوی ہی ادا کرے

سوال: ایک آدمی کی آمدنی ماہانہ پچیس سو روپیہ ہے اور اس کا خرچ مہنگائی کے لحاظ سے آمدنی کے برابر ہوجاتا ہے اور کچھ بچت ہو ہی جاتی ہے اور اس کے پاس تقریباً بارہ تولہ سونا ہے، جوکہ اس کی بیوی کے میکے سے آیا ہے اور بیوی کہتی ہے کہ آپ زکوٰۃ اپنی آمدنی سے ادا کریں، میں آپ کو سونا بیچنے نہیں دوں گی، وہ آدمی زکوٰۃ کس طرح ادا کرے؟ اور زکوٰۃ جوکہ عموماً ساڑھے سات تولہ پر واجب ہے، تو زکوٰۃ ساڑھے بارہ تولے کی ادا ہوگی، یا پورے ۲۰/ تولے کی ادا کرنی ہوگی؟ اس آدمی پر تقریباً ۱۷/ ہزار روپئے کا قرض ہے، اور اس شخص کا پراویڈنٹ فنڈ تقریباً ۳۰۰۰۰ (تیس ہزار) روپئے ہے، تو کیا فنڈ پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، اور ہے تو اس شخص کو کل کتنی زکوٰۃ اور کس طرح ادا کرے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سونا بیوی کی ملکیت ہے، اس لیے اس کی زکوٰۃ

بیوی پر واجب ہے، جتنا سونا ہے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا ضروری ہے، اگر بارہ تولہ ہے تو اس کا چالیسواں حصہ، اور اگر بیس تولہ ہے تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکالا جائے، اگر وہ چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں واجب ہوا، اس کی جگہ پر اس کی قیمت کے روپئے زکوٰۃ کی نیت سے فقراء کو دے گی، تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، سونا جب بیوی کی ملکیت ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی اسی پر واجب ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم جمع ہے، اس کی تفصیل کیجئے، کیا یہ ساری رقم وہ ہے جو اس کی تنخواہ سے جبری طور پر کاٹی گئی تھی، یا اس میں کچھ ایسی بھی ہے جو اس نے اختیاری طور پر کٹوائی تھی؟ نیز اس میں اس کی تنخواہ میں سے کاٹی ہوئی رقم کتنی ہے اور اضافہ کتنا ہے؟

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

آرڈر پر کام لینے والا زکوٰۃ کیسے ادا کرے؟

سوال: ایک آدمی جس کا کاروبار یہ ہے کہ وہ آدمی ایک آدمی سے آرڈر لیتا ہے اور دوسرے کاریگر کو وہ کام دیتا ہے اور کاریگر کو اس کا معاوضہ دیتا ہے؛ مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، جس آدمی سے وہ آرڈر لیتا ہے، وہ آتا ہی نہیں ہے، یا پھر اسے وہ کام پسند نہیں آتا ہے، کاریگر کو اس کی مزدوری تو دینی ہی پڑتی ہے، جس سے کبھی بہت نقصان بھی ہوتا ہے، یہ آدمی زکوٰۃ کس طرح ادا کرے، یعنی کہ سالانہ آمدنی میں سے وہ تمام نقصانات کو نفی کر کے زکوٰۃ ادا کرے، یا پھر پوری آمدنی پر ادا کرے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر کاروبار تجارت کا ہے، تو ختم سال پر اس کے پاس جتنی رقم اور مال موجود ہے،

اس کی زکوٰۃ ادا کرے، اور اگر تجارت نہیں ہے تو پھر اس کی نوعیت واضح فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوٰۃ دکان پر یا مال پر؟

سوال: ایک آدمی جس کے پاس دکان ہے اور وہ مال سے بھری ہوئی ہے، اس آدمی کو زکوٰۃ کس طرح نکالنی چاہئے؟ کیا اسے صرف مال کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، یا کہ دکان کی قیمت پر بھی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو مال تجارت اس کے پاس موجود ہے وہ اور ساتھ ہی جو رقم ہے، دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی، دکان کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حاجت مند کے لیے دی ہوئی رقم خود رکھنا

سوال: زید نے عمر سے کہا کہ یہ سو روپیہ کسی حاجت مند کو دینا، اب عمر خود حاجت مند ہے، تو وہ ان روپیوں کا استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

نہیں۔

وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لالنفسه. (شامي ۱۸۸/۳ زكريا)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مستحق کو زکوٰۃ میں پنکھا دے کر وقف کروانا

سوال: ایک آدمی نے کہا، ہم تینوں بھائیوں کی جانب سے مدرسہ میں پنکھا وقف کریں گے، پھر انھوں نے اپنے زکوٰۃ کے پیسوں سے دو پنکھے لا کر ایک شخص کو دیے، جو مستحقِ زکوٰۃ تھا اور اس کو کہا کہ ایک پنکھا اپنے پاس رکھ اور ایک پنکھا اپنی جانب سے مدرسہ میں وقف کردے، اس نے وقف کردیا، تو آیا زکوٰۃ ادا ہوگی یا ادا نہ ہوگی؟ اور اگر زکوٰۃ ادا ہو تو پنکھا کا وقف کرنا کس کی جانب سے ہوگا؟ اگر جس کو دیا اس کی جانب سے وقف کرنا ہو، تو جس نے کہا ہے وقف کروں گا اس پر وقف کا قرضہ باقی رہے گا یا نہیں؟ شرعاً مفصل و مدلل جواب عنایت فرمائیں مع حوالہ۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں جس کو وہ پنکھے دیے گئے تھے، اس نے اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہوئے ان میں سے ایک پنکھا مسجد میں وقف کیا، تو زکوٰۃ ادا ہوگئی اور یہ پنکھا اسی کی طرف سے وقف ہوا اور اگر اس نے اپنے آپ کو وکیل سمجھتے ہوئے یہ پنکھا اپنی طرف سے نہیں؛ بلکہ دینے والے کی طرف سے وقف کیا تو اتنی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی اور یہ پنکھا دینے والے کی طرف سے وقف ہوا، صورتِ اولیٰ میں بھی ان پر کوئی ذمہ باقی نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے جو الفاظ کہے تھے، وہ نذر ہی نہیں ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ذوالحجۃ ۱۴۱۰ھ

شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی نے اپنی بہن کو کچھ رقم دی زکوٰۃ کس پر واجب ہے؟

سوال: ہندہ نے پچیس ہزار کی رقم اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے شوہر

کی رقم میں سے - جو اس کو خرچ کے لیے دی جاتی تھی - لے جا کر اپنی چھوٹی بہن کو مکان خریدنے کے لیے دی، اب سوال یہ ہے کہ ہندہ کو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے شوہر کی اجازت کے بغیر اس نے ایسا قدم اٹھایا تو عند اللہ گنہگار ہوگی یا نہیں؟ اس رقم کی زکوٰۃ ہندہ پر عائد ہوگی یا نہیں؟ بہت ضروری ہے، براہِ کرم جلد از جلد جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

گھریلو مصارف کے لیے جو رقم شوہر بیوی کو دیتا ہے، اس میں سے بغیر اجازت شوہر کسی کو دینا چاہے تو نہیں دے سکتی، اجازت کبھی تو صریح ہوتی ہے اور کبھی عرف کی وجہ سے حکماً ہوتی ہے، مثلاً: اس رقم میں سے کسی بھکاری کو کچھ دے دینا وغیرہ، صورتِ مسئولہ میں جو رقم ہندہ نے بچائی ہے، وہ شوہر کی ملک ہے، اس لیے جائز نہیں تھا کہ وہ رقم اپنی بہن کو دیتی، اب جبکہ وہ دے چکی ہے، وہ اس کی ضامن ہے، شوہر اس سے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے؛ نیز اس رقم کی زکوٰۃ ہندہ پر نہیں؛ بلکہ شوہر پر واجب ہے، اس لیے کہ اس کا مالک شوہر ہے، اور اگر وہ رقم شوہر نے ہندہ کو اس کے ذاتی مصارف کے لیے دی تھی، تو اس کی مالک ہندہ ہے، اگر اس نے اس میں سے کچھ بچا کر اپنی بہن کو دیا تو درست ہے؛ البتہ اس کے لیے مناسب تھا کہ اس سلسلہ میں شوہر سے مشورہ کرتی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

زکوٰۃ سے تنخواہ دینا

سوال: ادھنا پریم نگر جھونپڑ پٹی میں مکتب کی شکل میں مدرسہ شروع کیا ہے، مسلمانوں کے ۳۰/ گھر ہیں، سب غریب اور مزدور طلبہ ہیں، چار سو روپیہ مہینے کا پڑھانے

کے لیے معلم رکھا ہے، ایک کارخانے والے صاحب نے معلم کی تنخواہ دینے کے لیے کہا ہے، لیکن پیسے زکوٰۃ کے ہیں، تو کیا زکوٰۃ کے پیسے میں سے معلم کی پگار دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو معلوم کریں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

زکوٰۃ کی رقم کسی معلم کی تنخواہ میں دینا درست نہیں ہے، اگر دیں گے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی؛ البتہ اگر وہ معلم غریب ہے، تو اس کو ویسے ہی بغیر کسی عوض کے اس رقم کا مالک بنایا جاسکتا ہے؛ مگر اس کے عوض اس سے کسی قسم کی خدمت لینا جائز نہیں ہے۔

(شامی ۲/۳۴۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مدرسہ کے طلبہ کو زکوٰۃ دی جائے؟

سوال: مدرسہ میں جو رقم بطور زکوٰۃ کے دی جاتی ہے، اس کے حلالہ کے لیے غریب طلباء کو دینا ہی ضروری ہے یا مالدار کو بھی دے کر کے حلالہ کر سکتے ہیں؟ نیز جو رقم للہ دی گئی ہے، اس رقم کے ذریعہ سے مدرسہ کی بلڈنگ وغیرہ باندھ سکتے ہیں یا بلڈنگ کے لیے مستقل چندہ کرنا ضروری ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

وہ رقم جس طالب علم کو دی جارہی ہے اس کا مستحقِ زکوٰۃ ہونا ضروری ہے، اب اگر وہ طالبِ علم بالغ ہے، تو اتنا کافی ہے کہ خود اس کی ملکیت میں بقدرِ نصاب کچھ نہ ہو،

چاہے اس کا باپ مالدار ہی کیوں نہ ہو، اور اگر وہ طالب علم نابالغ ہے تو اس صورت میں اگر اس کا باپ مالدار (مالکِ نصاب) ہے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

ولا إلى طفله بخلاف ولده الكبير. (درمختار) (قوله ولا إلى طفله) أي الغني، فيصرف إلى البالغ ولو ذكرا صحيحا، قهستانى. فأفاد أن المراد بالطفل غير البالغ ذكرا كا ن أو انثىٰ في عيال أبيه أو لا على الاصح. (شامی ۷۲/۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چندہ کی رقم ملکیت کی صورت میں مہتمم استعمال کرسکتا ہے

سوال: مدرسہ کی چندہ کی رقومات کا مالک مہتمم کو بنا دینے کی صورت میں کیا مہتمم ان رقومات سے اپنی ذاتی استعمال کے لیے اسکوٹر، موٹر کار یا ان رقومات کو پاور لوم میں استعمال کرنا کیا جائز ہے؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

اگر زکوٰۃ دینے والے نے مہتممِ مدرسہ کو یہ کہہ کر مال زکوٰۃ دیا کہ میں آپ کو زکوٰۃ کا مالک بنا رہا ہوں، آپ جہاں چاہیں استعمال کرسکتے ہیں، تو اس صورت میں مہتمم اپنی مرضی سے جہاں خرچ کرنا چاہے اس کو اختیار ہے، اور اگر مہتمم کو یہ رقم طلبہ کی خدمات میں خرچ کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو اس صورت میں مہتمم اس رقم کو امورِ مذکورہ فی السوال میں خرچ نہیں کرسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زکوٰۃ کی ادائیگی میں قرض لیے ہوئے سرسوں کا دام کس دن کا وضع کرے؟

ہم تجارت کا پیشہ کرتے ہیں، اور ہر سال زکوۃ کا حساب یکم شوال کو کرتے ہیں،

ہمارے مینج مینٹ میں اس سال پہلی بار زکوٰۃ کا حساب کرنے کی ذمہ داری مجھ پر آئی ہے، حسبِ ذیل دو مسئلوں میں دقت محسوس کررہا ہوں تو آپ سے ان دو مسئلوں کا استفتاء مطلوب ہے۔

سوال: (۱) ہم نے رمضان کے قبل ۱۰۰ رکونٹل سرسوں بطورِ قرض ایک دوسری پارٹی کے پاس سے لیا تھا، اور شرط کی تھی کہ ہم اس سرسوں کو بیچ دیں گے، اور آپ کو جس وقت ضرورت ہوگی تب ہم ایسا ہی مال آپ کو واپس دیں گے، وہ مال ہم نے ایک کونٹل سات سو روپئے کے دام سے بیچ دیا تھا، اور اس وقت اس کا دام چھ سو روپئے چل رہا ہے، اور جس وقت اس پارٹی کو دینا ہوگا، اس وقت نہ جانے کیا دام ہوگا، اور اس پارٹی کو دینے کے لیے ابھی تک ہم نے سرسوں خریدا نہیں ہے، تو ہم پر یہ جو قرض ہے وہ جس دام سے ہم نے بیچا ہے اس دام سے گنا جائے گا یا یکم شوال کو جو دام ہے اس دام سے گنا جائے گا یا جس وقت ہم خرید کر اس پارٹی کو دیں گے اس وقت جو دام ہوگا وہ گنا جائے گا؟ رہنمائی فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) قرض میں مستقرض کے ذمہ وہی چیز واجب سمجھی جاتی ہے جو اس نے بطورِ قرض لی ہے۔ فقہ کا قاعدہ ہے: ”الاقراض تقضی بامثالها“ اس لیے آپ پر سرسوں ہی واجب الاداء ہیں، آپ جب زکوٰۃ ادا کریں اس وقت ایک سو کوینٹل سرسوں کا جو بھاؤ بازار میں ہو، اتنی رقم وضع کرنے کے بعد بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کریں۔

مبیع کی قیمت قسط وار وصول کی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال: ایک آدمی نے ایک زمین بیچی، جس آدمی کو زمین دی، وہ قسط وار اس کی قیمت ادا کرتا ہے، جس آدمی نے زمین بیچی ہے اس نے ایک دن مقرر کر رکھا ہے زکوٰۃ ادا

کرنے کے لیے، (صاحب نصاب آدمی ہے) اب جب وہ دن آیا تو اس کی زمین کی کل قیمت کی وصولیابی نہیں ہوئی تھی، جب زکوٰۃ ادا کرے گا تو صرف اتنے حصے کی ادا کرے گا جو وصول ہو چکا، یا ابھی جو رقم آنی باقی ہے اس کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا؟ مہربانی فرما کر حل فرما دیجئے۔ جزاك الله.

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

جو رقم ابھی تک وصول نہیں ہوئی ہے اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب نہیں ہے؛ بلکہ جب وہ وصول ہوگی اس وقت گذشتہ تمام مدت کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

وتجب عند قبض أربعين درهما من الدين القوى، كقرض، وبدل مال تجارة، فكلما قبض أربعين درهما يلزمه درهم، وعند قبض مأتين منه لغيرها أي من بدل مال لغير تجارة، وهو المتوسط كثمن سائمة وعبيد خدمة و نحوهما مما هو مشغول بحوائجه الأصيلة، كطعام وشراب واملاك ويعتبر مامضى من الحول قبل القبض في الأصح. (درمختار) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

زکوۃ کی رقم پر مالکانہ قبضہ شرط ہے جمہور فقہاء کا اتفاق، اسکول کی فیس میں زکوۃ کی رقم صرف کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ تنظیمیں اجتماعی شکل میں زکوۃ جمع کرتی ہیں، اور اسے مذہب وتعلیم کے نام پر مختلف

امور میں تقسیم کرتی ہیں مثلا:

(۱) زکوۃ کی رقم سے بڑی بڑی کانفرسوں کا انعقاد کرنا، جن میں بے جا اسراف کیا جاتا ہے۔

(۲) زکوۃ کی رقم سے ٹی-وی چینل چلانا۔

(۳) زکوۃ کی رقم سے عوامی پروگراموں کا انعقاد کرنا۔

(۴) زکوۃ کی رقم سے صاحب نصاب آدمی کا سفر کرنا۔

(۵) زکوۃ کی رقم سے سی-ڈی، ڈی-وی-ڈی تیار کرنا۔

(۶) زکوۃ کی رقم سے بین المذاہب پروگرام کا منعقد کرنا۔

(۷) زکوۃ کی رقم سے اسلامک اسکول چلانا۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا امور زکوۃ کے مصرف ہو سکتے ہیں؟

اور ایک اسکول کی فیس مثلاً دس ہزار روپے ماہانہ ہے، اور بچہ پانچ ہزار ماہانہ ادا کرر ہا ہے تو کیا مابقیہ فیس زکوۃ کی رقم سے ادا کرنا شرعاً درست ہے؟

جن لوگوں نے ایسے آرگنائزیشن (تنظیموں) کو زکوۃ دی جب کہ انہیں مذکورہ بالا مصرف کا علم تھا، تو ایسے لوگوں کی زکوۃ کا کیا حکم ہے؟ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوالات کے جوابات سے پہلے ایک بات اصولی طور پر یہ سمجھ لیں کہ زکوۃ کی رقم کا کسی مستحق کو مالک و قابض بنا کر دینا ضروری ہے۔

درمختار مع الشامی میں ہے۔ ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحۃ

كما مر، لايصرف الى بناء نحومسجد، ولاالى كفن ميت الخ. (درمختار)

(قوله تمليكاً) فلايكفى فيه الاطعام الا بطريق التمليك، ولواطعمه عنده ناويا الزكوة لاتكفى. ط الخ (قوله نحومسجد) كبناء القناطير، والسقايات، واصلاح الطرقات، وكرى الانهار، والحج والجهاد وكل مالاتمليك فيه زيلعى. (درمختارمع الشامی ۲/۶۸)

نیز درمختار میں ہے: هى لغة الطهارة والنماء، وشرعاً (تمليك) خرج الاباحة، فلواطعم يتيماً ناوياً الزكوة لايجزيه الا إذا دفع اليه المطعوم. (درمختار مع الشامی ۲/۲،۳)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کے لیے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دئے اگر کوئی مال ان ہی لوگوں کے فائدے کے لیے خرچ کردیا گیا تو زکوۃ ادانہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں؛ اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرف زکوۃ ہیں؛ مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن ۴/۴۰۹)

آپ نے اپنے سوال میں جن سات صورتوں کے متعلق دریافت فرمایا ہے، ان میں سے کسی میں بھی مستحق زکوۃ کو مالکانہ قبضہ دے کر اس کا مالک نہیں بنایا جاتا، اس لیے

ان تمام صورتوں میں زکوۃ کی رقم خرچ کرنے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔

اسکول کی فیس کی ادائیگی کے متعلق آپ نے جو دریافت کیا ہے اس میں تفصیل یہ ہے کہ اسکول میں پڑھنے والا وہ بچہ اگر بالغ ہے، اور وہ مستحق زکوۃ ہے، یعنی اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی (۶۱۲،۳۵۰ گرام) کی قیمت، یا اس قیمت کا زائد از ضرورت سامان نہ ہو تو اس کو بقیہ فیس کی ادائیگی کے لیے زکوۃ کی رقم دی جائے، تو درست ہے۔ اور اگر وہ نابالغ ہے اور اس کا باپ؛ نیز خود اس کی ملکیت میں مقدار نصاب مال زائد از ضرورت موجود نہیں تو اس کو بھی زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

سوال میں دریافت کردہ تنظیموں کو جنہوں نے زکوۃ کی رقم دی، اور انہوں نے سوال میں ذکر کردہ مصارف میں اس کو استعمال کیا تو دینے والوں کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اور وہ اپنے ذمہ سے سبک دوش نہیں ہوئے، ان کو چاہئے کہ دوبارہ شروع جواب میں بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق زکوۃ ادا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

أملاہ: احمد خانپوری، ۸/محرم الحرام ۱۴۳۰ھ، مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

الجواب صحیح عبد القیوم راجکوٹی، معین مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

سفرائے مدارس کو زکوۃ دینے کی مقدار

سوال: بفضلہ تعالیٰ ہمارے یہاں سالانہ زکوۃ کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے، ہم لوگ بہت سارے مدارس کے سفیروں (چندہ کرنے والوں) کو سالانہ خرچ کے اعتبار سے مختلف (۵۰۰، ۴۰۰، ۲۰۰) روپئے دیتے ہیں؛ لیکن بہت سے ہمارے (پڑوسی)

اعتراض کرتے ہیں کہ بہت سوں کو دینے سے کیا فائدہ؟ بلکہ کم کو زیادہ رقم عطا کرو؛ تاکہ ان کا فائدہ ہو، حالانکہ اس زمانہ میں سفراء پر اعتبار کم ہوتا ہے؛ لہٰذا اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ مشورہ سے مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی شخص کو اپنے گمان کے مطابق مستحق اور مصرف زکوۃ سمجھ کر زکوۃ دیدی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسی کا غلام یا کافر تھا، تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی، دوبارہ دینی چاہیے؛ کیونکہ غلام کی ملکیت تو آقا ہی کی ملکیت ہوتی ہے، وہ اس کی ملک سے نکلا ہی نہیں، اس لیے زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اور کافر زکوۃ کا مصرف نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اگر بعد میں یہ ثابت ہو کہ جس کو زکوۃ دی گئی ہے، وہ مالدار یا سید ہاشمی یا اپنا باپ یا بیٹا یا بیوی یا شوہر ہے، تو زکوۃ کے اعادہ کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ رقم زکوۃ اس کی ملک سے نکل کر محل ثواب میں پہنچ چکی ہے، اور تعین مصرف میں جو غلطی کسی اندھیرے یا مغالطہ کی وجہ سے ہوگئی وہ معاف ہے۔ (درمختار) (معارف القرآن ۴/۴۱۳)

''آپ کے مسائل اوران کا حل'' میں ہے: زکوۃ ادا کرتے وقت اگر گمان غالب تھا کہ یہ شخص زکوۃ کا مستحق ہے تو زکوۃ ادا ہوگئی۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل ۳/۳۹۸)

اس لیے سفراء کے متعلق جب تک ان کے صحیح ہونے کا یقین یا غالب گمان نہ ہو، ان کو زکوۃ نہ دی جائے۔

رہا مشورہ دینے والوں کا آپ حضرات کو یہ مشورہ دینا کہ مختلف جگہ پر تھوڑا تھوڑا

دینے کے بجائے ایک جگہ پر زیادہ دیا جائے، یہ ان کی ایک سوچ ہے، اگر آپ کو ان کا یہ مشورہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے، تو عمل کر سکتے ہیں، کوئی ضروری نہیں، ویسے بھی آپ تنہا ان کو زکوۃ کی رقم نہیں دے رہے ہیں؛ بلکہ اور حضرات بھی دیتے ہیں، اور اسی طرح وہ بھی تنہا آپ سے زکوۃ وصول نہیں کر رہے ہیں؛ بلکہ اور لوگوں کے پاس بھی جاتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

زکوۃ میں بیچنے کی قیمت کا اعتبار ہے

سوال: تجارت کی زکوۃ میں کونسی قیمت کا اعتبار ہوگا؟ جس قیمت میں خریدے اس کا اعتبار ہوگا؟ یا جس قیمت میں ہم بیچنا چاہتے ہیں اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً 50,000 میں خریدا اور 1,00,000 میں بیچنا چاہتے ہیں، حضرت والا سے جواب کی امید ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس قیمت پر بیچے گا اس حساب سے زکوۃ ادا کی جائے، یعنی زکوۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں قیمت فروخت کا اعتبار کیا جائے گا۔ (از احسن الفتاوی ۴/ ۲۹۹ - فتاوی محمودیہ کراچی ۹/ ۴۱۶، امداد الفتاوی ۲/ ۴۲، مسائل بہشتی زیور ۱/ ۳۱۹، فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۱۶۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

کتاب الصوم

انجکشن سے فسادِ روزہ کا شبہ

سوال: انجکشن کے اثرات اگر چہ منافذِ اصلیہ کے ذریعہ پیٹ تک نہیں پہنچتے، لیکن بعض انجکشن سے قوت وتوانائی حاصل کی جاتی ہے، تو کیا روزہ دار کے لیے اس کا استعمال درست ہوگا؟ اور کیا ایسا کرنے والے کا روزہ فاسد نہ ہوجائے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

کسی چیز کا بدن کے کسی حصہ کے اندر داخل ہوجانا مطلقاً روزہ کو فاسد نہیں کرتا؛ بلکہ اس کے لیے دو شرطیں ہیں: اول یہ کہ وہ چیز جوفِ معدہ میں یا دماغ میں پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ پہنچنا بھی مخارقِ اصلیہ، یعنی: منفذِ اصلی کے راستہ سے ہو، اگر کوئی چیز مخارقِ اصلیہ کے علاوہ کسی دوسرے کیمیائی طریقہ سے جوفِ معدہ یا دماغ میں پہنچادی جائے، تو وہ بھی مفسد صوم نہیں۔ انجکشن کے ذریعہ بلاشبہ دوا یا اس کا اثر پورے بدن کے ہر حصہ میں پہونچ جاتا ہے؛ مگر یہ پہنچنا منفذِ اصلی کے راستہ سے نہیں؛ بلکہ عروق (رگوں) کے راستہ سے ہے، یہ راستہ منفذِ اصلی نہیں؛ اسی لیے گرمی کے موسم میں کوئی شخص اگر ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا ہے تو پیاس کم ہوجاتی ہے، کیونکہ پانی کے اجزاء مسامات کے راستہ سے اندر جاتے ہیں، مگر اس کو کسی نے مفسدِ صوم نہیں قرار دیا، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ گلوکوز وغیرہ کے انجکشن ایسے ہیں کہ ان کے ذریعہ بدن کو غذا جیسی قوت پہنچ جاتی ہے، اس لیے ان کا حکم غذا کا سا ہونا چاہئے؟ جواب واضح ہے کہ قوت پہنچانا مطلقاً مفسد صوم نہیں، جیسے ٹھنڈک پہنچانا مفسد صوم نہیں؛ بلکہ منفذ اصلی کے راستہ سے کسی چیز کا جوف معدہ یا دماغ میں پہنچنا مفسد ہے، وہ انجکشن میں نہیں پایا جاتا، اگر چہ قوت اس سے پہنچ

جائے۔(آلات جدیدہ مفتی محمد شفیعؒ ۱۵۶،۱۵۷)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

روزہ کے کفارہ میں گھر کے ملازم کو آزاد کرنا

سوال: اگر کسی نے روزہ فاسد کرلیا، تو اس کو روزہ کی قضاء کرنا اور کفارہ ادا کرنا ضروری ہے؟ اب اس کو ایک غلام آزاد کرنا ضروری ہے؟ اس میں ایک صورت یہ ہے کہ اگر زید نے روزہ فاسد کرلیا اور کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس غلام تو ہے نہیں؛ البتہ اس کے گھر ایک کام کرنے والا نوکر جیسا کہ عام طور پر گھروں میں ہوتا ہے، تو اب وہ یہ چاہتا ہے کہ اس نوکر کو کام سے نکال دے اور ہر مہینہ اس کو تنخواہ دیتا رہے، (جتنی تنخواہ وہ پہلے اسے دیتا تھا) تو اس صورت میں اس کا کفارہ ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

گھروں میں کام کرنے والا ملازم آزاد ہے، غلام نہیں ہے؛ اس لیے سوال میں مذکورہ طریقہ اختیار کرنے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، ہمارے دور میں غلام نادر الوجود ہے، اس لیے اب اداءِ کفارہ کی صورت یہ ہے کہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو، تو ساٹھ مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کھانا کھلائے۔(شامی ۲/۱۱۹)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ہاتھ سے منی خارج کرنا مفسدِ صوم ہے

سوال: (۱) رمضان کے روزے کی حالت میں شہوت کے ساتھ منی کو گرانا، یا گرنا، اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ اگر ٹوٹتا ہے تو اس کی قضا یا کفارہ دینا ضروری ہوگا یا

نہیں؟ لیکن مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً نو یا دس سال سے اس گناہ میں مبتلا ہو تو اس کے لیے کیا کرے؟ توبہ کرنے سے معاف ہوگا یا اتنے سال کے روزے رکھنے پڑیں گے؟ اگر روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو یا مسکینوں کو کھلانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کے لیے بتائیے؛ تا کہ وہ شخص ان گناہوں کی وجہ سے اللہ سے ناراض نہ ہو پائے اور عبادت کرنا چھوڑ دے، برائے مہربانی جواب کارڈ پر جلد از جلد دیجئے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہاتھ سے منی خارج کرنا بہت سخت گناہ ہے، حدیث میں اس پر لعنت وارد ہوئی ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۴۴۵)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسائل رؤیت ھلال

دوربین سے رویتِ ہلال

سوال: دوربین سے چاند دیکھنا کیسا ہے؟ ممکن ہے آنکھوں سے نظر نہ آئے اور دُوربین سے نظر آجائے، تو کیا دوربین سے نظر آنے کے بعد رمضان کا فرض روزہ رکھا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ "صوموا لرويته" کے خلاف نہ ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس مسئلہ پر تفصیلی کلام حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے فرمایا ہے، حدیث پاک "صوموا لرويته الخ" پیش کر کے تحریر فرماتے ہیں: ''جس کا حاصل یہ ہے کہ: ریاضی کی تدقیقات اور ہیئت و نجوم کے حسابات میں جائے بغیر ہر شہر کے آدمی سادہ طور پر اپنی اپنی جگہ پر چاند دیکھنے کی کوشش کریں، چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کر کے مہینہ ختم کر لیں، چاند دیکھنے کے لیے اہتمام بھی صرف اتنا کہ کسی ایسی جگہ جہاں مطلعِ قمر میں کوئی چیز حائل نہ ہو، کھڑے ہو کر دیکھ لیں، اس سے زیادہ اہتمام کو پسند نہیں فرمایا''۔ (آلات جدیدہ ۱۷۳)

آگے فرماتے ہیں: ''عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ اور قرونِ خیر کے اس تعامل کی بناء پر ہمارے نزدیک کسی طرح مستحسن اور پسندیدہ نہیں کہ ہوائی جہازوں میں اڑ کر (یا دوربین کے ذریعہ) چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے''۔ (۱۷۴)

اپنے ایک دوسرے رسالہ ''رویتِ ہلال'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''حاصل اس ارشاد نبوی ﷺ کا یہ ہوا کہ تمام احکامِ شرعیہ جو چاند کے ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہیں، ان میں چاند کا ہونا یہ ہے کہ عام آنکھوں سے نظر آئے، معلوم ہوا کہ مدارِ احکام چاند کا افق

پر وجود نہیں ؛ بلکہ رویت ہے، اگر چاند افق پر موجود ہو؛ مگر کسی وجہ سے قابل رویت نہ ہو تو احکام شرعیہ میں وجود کا اعتبار نہ کیا جاوے گا۔ (۱۶-۱۵)

اب یہ بات کہ دوربین کے ذریعہ چاند دیکھا گیا تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ چاند اس قدر تھا کہ بغیر دوربین کے دیکھنے والے بھی اگر اہتمام وتوجہ سے کام لیتے تو انہیں نظر آجاتا تو اس صورت میں دوربین سے دیکھا گیا بھی معتبر ہوگا، ورنہ نہیں؛ اس لیے کہ بعض وہ دوربین جو آفتاب کی شعاع کو انسانی نگاہ کے درمیان حائل نہیں ہونے دیتی، ان کے ذریعہ تو چاند کسی بھی تاریخ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ (ماخوذ از رویت ہلال ۱۳)

چنانچہ ہوائی جہاز سے متعلق اسی قسم کی ایک صورت کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اتفاقی طور پر کوئی ہوائی جہاز کا مسافر چاند دیکھ لے اور آکر شہادت دے تو اس کی شہادت قبول نہ کی جائے، کیونکہ اس کی شہادت کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ؛ بلکہ نیچے کی ہوا میں گرد وغبار اور بخارات کی وجہ سے مستبعد نہیں کہ چاند نظر نہ آئے اور بلند جگہ پر ہوا صاف ہونے کی وجہ سے نظر آجائے۔ کما قال الشامي: وقد يرى الهلال من أعلى الأماكن مالا يرى من الأسفل فلا يكون تفرده بالروية خلاف الظاهر. (۱۲۷/۲) شرط یہ ہے کہ ہوائی پرواز اتنی اونچی نہ ہو کہ جہاں تک زمین والوں کی نظریں پہنچ ہی نہ سکیں؛ کیونکہ شرعاً رویت وہی معتبر ہے کہ زمین پر رہنے والے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں، اس لیے اگر بیس تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر کے کوئی شخص چاند دیکھ آئے، تو اس بستی کے لیے وہ رویت معتبر نہیں، جس سے عام انسان باوجود مطلع صاف ہونے کے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ (آلات جدیدہ ۱۷۴،۱۷۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

غائبانہ خبروں سے اور ہوائی جہاز میں اڑ کر رویتِ ہلال کا شرعی حکم

سوال: (۱) بعد سوال مسنون عرض ایں کہ ہمارے یہاں (بوتسوانہ) میں ۲۹ر شعبان اور ۲۹/ رمضان کو رویت نہ ہوسکی؛ نیز ہمارے پڑوسی ممالک مثلاً جنوبی افریقہ، زامبیا، زمبابوے وغیرہ میں بھی رویت نہ ہوئی؛ البتہ ملاوی جو ہمارے ملک سے تقریباً ہزار سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے، وہاں رویت ہوئی، اور ہمیں معتبر ذریعہ سے خبر ملی تو ہم ملاوی کی خبر سے عیدالفطر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سے مطلع فرمائیں۔

(۲) ہوائی جہاز کے ذریعہ فضاء میں جا کر رمضان اور عید کے چاند کو تلاش کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) زمین پر رویت نہ ہوسکی؛ البتہ دو معتبر حضرات نے ہوائی جہاز کے ذریعہ فضاء میں جا کر رویت کی تو اس رویت کی وجہ سے عید اور رمضان کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سے مطلع فرمائیں۔

(۴) مطلع ہمارے یہاں صاف تھا اور رویت نہ ہوسکی، تو ہم رویت کے سلسلے میں دوسرے شہروں اور ملکوں میں تحقیق کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) ہلال رمضان کے علاوہ عید، بقرعید یا کسی دوسرے مہینہ کے لیے ثبوتِ ہلال باقاعدہ شہادت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور شہادت کے لیے حاضر ہونا لازمی ہے، غائبانہ خبروں کے ذریعہ شہادت ادا نہیں ہوسکتی، خواہ وہ قدیم طرز کے آلات خبر رسانی خط وغیرہ ہوں یا جدید طرز کے ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ۔ (رویتِ ہلال ص۵۰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) اس لیے

محض ملاوی کی خبر پر آپ حضرات کے لیے عید الفطر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(۳،۲) رویتِ ہلال کے لیے شریعتِ مطہرہ نے جس طریقہ کی نشان دہی فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز میں اڑ کر چاند تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس قسم کا اہتمام شرعاً مطلوب نہیں، اس کے باوجود اگر کچھ لوگوں نے اس طرح چاند دیکھ کر اگر اس کی شہادت دی، تو شریعتِ مطہرہ کے مقرر فرمودہ ضابطۂ شہادت اور ثبوتِ رویت کے قانون کا لحاظ کرتے ہوئے اس شہادت پر عمل ہوسکتا ہے۔ (ماخوذ از قدیم نظام الفتاویٰ ۱/ ۲۲۸، ۲۲۹)

(۴) یہ طریقہ بھی شرعاً مطلوب نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۴/۱۱۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ

رؤیتِ ہلال کے ثبوت میں آلاتِ رصدیہ اور فلکی حساب معتبر نہیں

از مرتب: عبد القیوم راجکوٹی

محترم المقام استاذ المکرّم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتکم و مدظلکم

السلام علیکم ورحمة الله و برکاته

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، میں بھی الحمد للہ حضرت والا کی دعا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خیر وعافیت سے ہوں۔

غرض تحریر اینکہ امسال برطانیہ میں سعودی کی ۲۹ شعبان کی شام کو بعد نماز مغرب تین حضرات نے چاند دیکھنے کا دعوی کیا ہے، جبکہ فلکیاتی اعتبار سے اس دن رؤیت کا کوئی امکان نہ تھا بلکہ چاند غروب آفتاب سے پہلے ہو چکا تھا، ایسی حالت میں اکی دکی گواہی کی

بنیاد پر رمضان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں حضرت والا کے فتاوی کی عبارت اور دیگر اکابرین کی عبارت میں بظاہر تعارض نظر آرہا ہے۔

چونکہ جو حضرات سعودیہ کے متبعین ہیں وہ آپ کی عبارت سے اپنا موقف اور منشاء ثابت کرنے میں اور سعودیہ کی تائید میں کہ وہاں کی رؤیت کا نظام درست ہے اس کا سہارا لینے کا قوی امکان ہے اور ایسی گواہیاں کہیں سے بھی لا کر پیش کر دینگے، اس لیے ایک استفتاء ارسال خدمت ہے تا کہ اس کی توضیح وتشریح وانطباق فرمادیں۔ امید ہے کہ جناب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ احقر یوسف ساچا باٹلی انگلینڈ

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

آپ کے سوال کا خلاصہ احقر نے یہ سمجھا ہے کہ رؤیت ہلال کے ثبوت میں فلکی حساب کو دخل ہے یا نہیں؟ اگر دخل ہے تو محمود الفتاوی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلکی حساب کا ثبوتِ رؤیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی ثبوت رؤیت صرف اور صرف شہادتِ شرعیہ میں منحصر ہے، صرف فلکی حساب سے ثبوت رؤیت نہیں ہوسکتا۔ جبکہ دیگر اکابر علماء کے فتاوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ثبوت رؤیت میں فلکی حساب کو بڑا دخل ہے۔

اصل جواب سے پہلے چند امور بطور تمہید پیش کئے جاتے ہیں:۔

(الف) عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: انا امة امية لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الابهام فی الثالثة ثم قال الشهر هكذا وهكذا وهكذا يعنى تمام الثلاثين. متفق عليه. (فتاوی بینات ۱۹/۳)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم تو امت امیہ

ہیں، اوقات کی تعیین کے لیے حساب کتاب کی ضرورت نہیں، (بس اتنا جان لو کہ) مہینہ کبھی اتنا، اتنا، اتنا ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرمایا اور تیسری مرتبہ ایک انگلی بند فرمائی یعنی انتیس کا۔ اور کبھی اتنا، اتنا، اتنا ہوتا ہے یعنی پورے تیس دن کا۔ (فتاوی بینات:۳/۱۹)

حدیث بالا میں آں حضرت ﷺ نے لا نکتب ولا نحسب (ہم حساب کتاب نہیں کیا کرتے) کہہ کر اوقات کی تعیین کے باب میں حسابی تخمینوں کی حوصلہ شکنی فرمائی، کہیں دونوں ہاتھوں کے اشارہ سے الشهر هكذا وهكذا وهكذا (مہینہ اتنا اتنا اور اتنا ہوتا ہے) کہہ کر ماہ وسال کے سلسلہ میں حساب پر بالکلیہ بے اعتمادی کا اظہار فرمایا؛ ورنہ ظاہر ہے کہ اس مضمون کو سمجھانے کیلیے مہینہ کبھی ۲۹ کا ہوتا کبھی ۳۰ کا، دونوں ہاتھوں کو چھ دفعہ اٹھانے اور ھکذا کا لفظ چھ دفعہ دہرانے کی بہ نسبت ۲۹، ۳۰ عدد مختصر بھی تھا اور واضح بھی، اور آپ کے مخاطب ان ہندسوں سے نا آشنا بھی نہیں تھے۔

اكمال المعلم شرح صحيح مسلم لابى عبدالله محمد بن خلفه الوشتانى الأبى المالكىؒ (المتوفى ٨٢٧) ٣/٢٢٤ـط ـ!دار الكتب العلمية١٣٣٧ مانصه: وفى احاديث الاشارة الارشاد الى تقريب الاشياء بالتمثيل وهو الذى قصده ﷺ ولم يصنع ذلك لأجل ما وصفهم به من الامية لايحسبون ولايكتبون لأنهم لايجهلون الثلاثين والتسع والعشرين مع ان التعبير عنها باللفظ اخف من الاشارة المكررة وانما وصفهم بذلك سدا لباب الاعتداد بحساب المنجمين الذى تعمده العجم فى صومها وفطرها وفصولها. (حاشيه فتاوى بينات ٣/٢٦)

(٢)عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه ان رسول الله ﷺ ذكر رمضان فقال

لاتصوموا حتی تروا الھلال، لاتفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروا لہ (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے رمضان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا (انتیس کا) چاند دیکھے بغیر نہ تو روزہ رکھنا شروع کرو اور نہ چاند دیکھے بغیر روزے موقوف کرو اور ابر یا غبار کی وجہ سے نظر نہ آئے تو اس کے لیے (تیس دن کا) روزہ رکھو۔ (ایضاً:۱۴)

حدیث بالا میں رؤیت کے بغیر کسی نوع کے حسابی تخمینہ پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ رکھنے اور افطار کرنے سے صاف صاف منع فرمایا، نیز رؤیت سے مراد سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنا مراد ہے، آسمان میں چاند کا وجود اور امکان کافی نہیں۔

خود ماہرین فلکیات کے یہاں بھی رؤیت ہلال کے معنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہی آتے ہیں، مزید یہ کہ ان کے یہاں اس رؤیت کے دو درجہ ہیں۔ طبعی، ارادی۔ اگر ہلال افق سے اتنی بلندی پر ہو کہ وہ بلا تکلف دیکھا جا سکے اسے وہ ''طبعی رؤیت'' قرار دیتے ہیں اور اگر اتنی بلندی پر نہ ہو بلکہ اتنا نیچے اور باریک ہو کہ اعلیٰ قسم کی دوربینوں کے بغیر اس کا دیکھنا ممکن نہ ہو اسے ''رؤیت ارادی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ فلکیات کی تصریحات کے مطابق قابل اعتبار طبعی رؤیت ہے نہ کہ ارادی۔ اور حضرات فقہاء کرام رحمھم اللہ تعالیٰ جو شریعت اسلامیہ کے حقیقی ترجمان ہیں وہ بھی اسی پر متفق ہیں کہ آں حضرت ﷺ کے ارشاد ''صوموا لرؤیتہ وأفطروا لرؤیتہ'' میں رؤیت حسی یعنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہی مراد ہے اور اسی پر تمام مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رویتِ ہلال کے معنیٰ سر کی آنکھوں سے دیکھنا قطعی

طور پر متعین ہیں، اس میں کسی شک شبہ اور تردید کی گنجائش نہیں۔ یہی معنی آنحضرت ﷺ کے مبارک عہد سے آج تک لیے جاتے رہے ہیں، یہی ائمہ لغت کی تصریح سے میل کھاتے ہیں، یہی فلکیات کی اصطلاح کے مطابق ہیں، یہی مزاج شناس شانِ نبوت (فقہائے کرامؒ) نے حدیث سے سمجھے ہیں اور چودہ صدیوں کی امت مسلمہ بھی اسی پر متفق ہے۔ (ایضاً:۱۱،۱۲،۱۳)

(ب) اگر یہ کہا جائے کہ شریعت نے احکام ہلال کا مدار رؤیت پر کیوں رکھا، فلکیاتی تحقیق پر کیوں نہیں رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اچھی طرح بلا چوں و چرا شرعی حکم مان لیں اور عمل کریں۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:۔

اس میں تو کوئی شک شبہ نہیں کہ اصل مدار، ثبوت احکام شرعیہ فرعیہ کا، نصوص شرعیہ ہیں، جن کے بعد ان کے امتثال اور قبول کرنے میں ان میں کسی مصلحت وحکمت کے معلوم ہونے کا انتظار کرنا بالیقین حضرت حق سبحانہ وتقدس کے ساتھ بغاوت ہے۔

(احکام اسلام عقل کی نظر میں:۲۵)

لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ احکام شرعیہ میں بہت سے مصالح اور اسرار مستور ہیں، ان کا معلوم ہو جانا بعض طبیعتوں کے لیے عمل کے لیے معین اور ضعفاء کے لیے تسلی بخش ثابت ہوتا ہے، اسی بناء پر احکام ہلال کا مدار رؤیت پر رکھنے کی مصلحتیں بیان کی جاتی ہیں، یہ مصالح صرف رؤیت پر مرتب ہوسکتی ہیں فلکیات پر نہیں۔

(۱) دوسری قوموں کی ماہ وسال کا مدار تقویمی حسابوں پر تھا، شارع نے اس امت کی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لیے جس طرح اور بہت سی چیزوں میں ان کی

مشابہت سے امت کو بچانا چاہا اسی طرح ان کی تقویمی مشابہت سے بھی امت کو محفوظ رکھنا چاہا؛ اس لیے ان کو ایک مستقل نظامِ تقویم دیا۔

(۲) یا ہوسکتا ہے کہ چونکہ دوسرے حسابی طریقوں سے سال کی تعیین فطری اور تحقیقی نہیں تھی بلکہ اختراعی اور تقریبی تھی، چنانچہ انہیں اس کی کمی بیشی کو برابر کرنے لیے ''لیپ'' کی اصطلاح ایجاد کرنی پڑی، اس کے برعکس اسلام دین فطرت تھا، اس نے چاہا کہ امت اسلامیہ کے ماہ وسال کی تعین کے لیے ''رؤیت'' اور مشاہدہ کا فطری طریقہ مقرر کیا جائے، کیونکہ یہ اختراعی اور تقریبی طریقے اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتے تھے۔

(۳) یا ممکن ہے اس امر کی رعایت رکھی گئی ہو کہ اسلام کے پورے نظام کی بنیاد تکلف اور تعمق پر نہیں ہے بلکہ سادگی اور سہولت پر رکھی گئی ہے، اس لیے اسلام کے نظامِ تقویم کو بھی مشاہدہ اور رؤیت جیسے آسان اور سادہ اصول پر مبنی کیا گیا؛ تاکہ اس نظام کے ''جزو کل'' میں مناسبت رہے اور اس باب میں امت تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ ہو جائے۔

(۴) یا ممکن ہے کہ اس چیز کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ نظامِ تقویم بہر حال اوقات کی تعیین کا ایک ذریعہ ہے اور جو قوم ذرائع میں منہمک ہو کر رہ جائے اکثر و بیشتر مقاصد اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور فطری طور پر ان کی صلاحیتیں ذرائع ہی میں کھپ کر ضائع ہو جاتی ہیں، اس لیے چاہا گیا کہ امت مسلمہ کو نظامِ تقویم ایسا دیا جائے جس میں منہمک ہو کر مقصدی صلاحیتیں کھو بیٹھنے کا ذرا بھی اندیشہ نہ ہو، بس آنکھ کھولی، چاند دیکھ لیا، تقویم درست ہو گئی اور سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے، نہ ضرب کی ضرورت نہ تقسیم کی، نہ محکمۂ موسمیات قائم کرنے کی ضرورت نہ اس پر ریسرچ کی۔

(۵) یا ممکن ہے کہ یہ امر پیش نظر ہو کہ اس امت میں امیر ہوں گے، غریب بھی، عالم بھی، جاہل بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور بیشتر عبادات اور معاملات کا مدار نظام تقویم پر ہے، اس لیے چاہا گیا کہ جس طرح نظام تقویم سے متعلقہ احکام کے مکلّف امت کے سب ہی طبقات ہیں اسی طرح ان کو نظام تقویم بھی ایسا دیا جائے جس پر ہر شخص اپنے مشاہدہ کی روشنی میں پورے شرح صدر کے ساتھ یقین کر سکے۔

(۶) یا ممکن ہے کہ شارع کو جو یقین ہلال کے باب میں مطلوب ہے وہ رؤیت اور مشاہدہ پر ہی مرتب ہو سکتا ہے، اس کی نظر میں حسابی جنتری اس یقین کے پیدا کرنے میں ناکافی ہو۔

(۷) یا ہو سکتا ہے کہ شارع نے اس امر کو پسند نہ فرمایا ہو کہ روزہ وافطار سب کریں؛ مگر ان کے اوقات کی تعیین ایک خاص گروہ کے رحم وکرم پر ہو، اس لیے نظام تقویم ایسا مقرر فرمایا کہ ایک عامی بھی اپنے وقت کی تعیین ٹھیک اسی طرح کر سکتا ہے جس طرح ایک ماہر فلکیات، اور بدوی بھی اسی طرح اپنے اوقات کا حساب لگا سکتا ہے جس طرح ایک شہری؛ بلکہ بعید نہیں کہ ماہر فلکیات یا عالم کی نظر کمزور ہو اور ایک عامی بدوی کی نظر تیز ہو، اس صورت میں خود ماہر فلکیات یا عالم کو مسکین ان پڑھ کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ (فتاویٰ بینات: ۳/ ۲۹، ۳۰)

(ج) ہر دور میں فقہاء نے رمضان وعیدین کا دار ومدار رؤیت ہلال پر رکھا ہے، تدقیقات فلسفیہ اور قواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ اور حساب پر نہیں رکھا۔ ذیل میں معتبر کتب کی چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

چوتھی صدی کے مشہور حنفی فقیہ مفسر اور اصولی عالم امام ابو بکر جصاص رازیؒ

(م ۳۷۰ھ) اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد اختلف فی معنی قول النبی ﷺ فان غم علیکم فاقدروا له فقال القائلون اراد به اعتبار منازل القمر فان کان فی موضع القمر لو لم یحل دونه سحاب وقترة وروی یحکم بحکم الرؤیة فی الصوم والافطار وان کان علی غیر ذلك لم یحکم له بحکم الرؤیة وقال آخرون فعدوا شعبان ثلاثین یوما اما التا ویل الاول فساقط الاعتبار لامحالة لایجابه الرجوع الی قول المنجمین ومن تعاطی معرفة منازل القمر ومواضعه و هو خلاف قول الله تعا لی (یسئلونك عن الاهلّة قل هی مواقیت للناس)فعلق الحکم فیه برویةالاهلة ولما کانت هذه عبادة تلزم الکافة لم یجزان یکون الحکم فیه متعلقا بمالا یعرفه الا خواص من الناس ممن عسی لا یسکن الی قولهم والتاویل الثانی هو الصحیح وهو قول عامة الفقهاء وابن عمر راوی الخبر وقد ذکر عنه فی الحدیث انه لم یکن یا خذ بهذا الحساب. (احکام القرآن: ۱ / ۲۰۱، دارالکتب العربی بیروت)

پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ شمس الائمۃ الحلوائیؒ (م ۴۴۸ھ) فرماتے ہیں:

من قال بانه یرجع الی قول اهل الحساب عند الاشتباه بعید واستدل بحدیث من اتی کاهنا (الی قوله) الشرط عندنا فی وجوب الصوم والافطار رؤیة الهلال ولا یوخذ فیه بقول المنجمین ثم رقم لمجدالائمة الترجمانی وقال فقد اتفق اصحاب ابی حنیفة والشافعی انه لا اعتماد علی قول المنجمین فی هذا. (شرح منظومه ابن وهبان ۱:۲۹۱ مطبوعة الوقف المدنی دیوبند)

آٹھویں صدی کے مشہور فقیہ علّامہ عالم ابن علاء انصاری اندرپتی دہلویؒ (م۷۸۶ھ) فرماتے ہیں:

ذکر فی التھذیب فی کتاب الصوم: یجب صوم رمضان برؤیۃ الھلال او باستکمال شعبان ثلاثین، ولا یجوز تقلید المنجم فی حسابہ لا فی الصوم ولا فی الافطار وھل للمنجم ان یعمل بحساب نفسہ؟ ففیہ وجھان احدھما انہ یجوز والثانی لا یجوز. (الفتای التاتارخانیہ ۲: ۳۵۷ مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد)

نویں صدی کے مشہور محدث علامہ ابن حجر عسقلانی شافعیؒ (م۸۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب ھنا حساب النجوم وتسییرھا، ولم یکونوا یعرفون من ذلک ایضاً الا النزر الیسیر، فعلق الحکم بالصوم وغیرہ بالرؤیۃ لرفع الحرج عنھم فی معاناۃ حساب التسییر واستمر الحکم فی الصوم ولو حدث بعدھم من یعرف ذلک، بل ظاھر السیاق یشعر بنفی تعلیق الحکم بالحساب اصلاً، ویوضحہ قولہ فی الحدیث الماضی (فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین) ولم یقل فسئلوا اھل الحساب، ولحکمۃ فیہ کون العدد عند الاغماء یستوی فیہ المکلفون فیرتفع الاختلاف والنزاع عنھم، وقد ذھب قوم الی الرجوع الی اھل التسییر فی ذلک وھم الروافض، ونقل عن بعض الفقھاء موافقتھم، قال الباجی: واجماع السلف الصالح حجۃ علیھم، وقال ابن بزیزۃ: وھو مذھب باطل فقد نھت الشریعۃ عن الخوض فی علم النجوم

لانهـا حدس وتخمين ليس فيها قطع ولاظنّ غالب،مع انه لو ارتبط الامر بها لضاق اذ لا يعرفها الاالقليل.(فتح البارى:٤/١٢٧ مطبوعه دار المعرفة بيروت)

دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم مصریؒ (م ۹۷۰ھ) اپنی مشہور کتاب "النهر الفائق" میں تحریر فرماتے ہیں:

ان صـوم رمضان لا يلزمه الا باحد هذين فلا يلزم بقول المؤقتين انه يـكـون فـى السماء ليلة كذا وان كانوا عدولا فى الصحيح كما فى الايضاح، قال مجد الائمة (الترجمانى)وعليه اتفق اصحاب ابى حنيفة و الشافعى الخ.

(النهر الفائق: ٢/١٠ مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت)

لاعبرة بقول المنجمين قال فى غاية البيان و من قال يرجع فيه الىٰ قولهم فقد خالف الشرع لانه روى عنه ﷺ انه قال من اتى كاهنا او منجما فصدقه بما قال فهو كافر بما انزل على محمد. (البحر الرائق: ٢/٤٨٢ دار المعرفه بيروت)

گیارہویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ علامہ عبدالرحمٰن بن محمدؒ (م ۱۰۷۸ھ)-جو داماد کے لقب سے مشہور ہیں-تحریر فرماتے ہیں:

وفـى القهستانى ان ما قال اهل التنجيم غير معتبر فمن قال انه يرجع فـى ذلك الىٰ قولهم فقد خالف الشرع. (مـجـمـع الانهر فى شرح ملتقى الابحر: ١/٢٣٧ مطبوعه دار احياء التراث بيروت)

بعینہ یہی عبارت "جامع الرموز:۱/۳۵۶ مطبوعہ ایچ ایم کراچی" میں ہے

بارہویں صدی کے مشہور عالم ربانی اسرار شریعت کے ماہر حضرت شاہ ولی

صاحب محدث دہلویؒ (م۱۱۷۶ھ) رقمطراز ہیں:

مبنی الشرائع علی الامور الظاھرة عند الامیین دون التعمق والمحاسبات النومیة، بل الشریعة واردة باخمال ذکرھا وھو قوله ﷺ: انا امة امیة لا نکتب ولا نحسب. (حجة الله البالغة: ۲/ ۵۱ مطبوعة ادارة الطباعة المنیریة دمشق)

تیرہویں صدی کے مشہور فقیہ عالم خاتم الفقہاء علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامیؒ (م۱۲۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

(لا عبرة بقول الموقتین) ای فی وجوب الصوم علی الناس بل فی المعراج لا یعتبر قولھم بالاجماع. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۰۰ مطبوعة کوئٹة)

علامہ شامیؒ نے ایک رسالہ "تنبیه الغافل و الوسنان علی احکام ھلال رمضان" تحریر فرمایا ہے، اس میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، جس میں مذاہب اربعہ کی معتبر کتابوں کی عبارتوں سے اجماع ثابت کیا ہے کہ رؤیت ہلال میں اہل حساب کا قول معتبر نہیں، ملاحظہ کیجئے:

الفصل الثالث فی بیان حکم قول علماء النجوم و الحساب: فنقول قد صرح علماؤنا و غیرھم بوجوب التماس الھلال لیلة الثلاثین من شعبان فان رأوه صاموا والا اکملوا العدة فاعتبروا الرؤیة او اکمال العدة اتباعا للاحادیث الآمرة بذلك دون الحساب والتنجم وقد اتفقت عبارات المتون وغیرھا من کتب علمائنا الحنفیة علی قولھم یثبت رمضان برؤیة ھلاله و بعد شعبان ثلاثین (الی قوله) فلا یلزم بقول الموقتین انه یکون فی السماء لیلة کذا وان

كـانـوا عـدولا فـي الـصـحيح كما في الايضاح قال مجد الأئمة وعليه اتفق اصحاب ابي حنيفة الا النادر و الشافعي الخ. (رسائل ابن عابدين: ١/٢٤٤، ٢٤٥)

آگے مالکیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

واما عند المالكية ففي مختصر الشيخ خليل انه لايثبت بقول المنجم الخ.

اسی صفحہ پر شافعیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

(واما عند الشافعية) ففي الانوار للارد بيلي ولا يجب بمعرفة منازل الـقـمـر لا عـلـى العارف بها ولا غيره انتهى۔ وفي ينابيع الاحكام ولا عبرة بـقـول الـمنجم مطلقا فلا يصوم وان علم بالحساب انه اهل على الاظهر اذ تحكيمه قبيح شرعاً. (ايضاً ١:٢٤٧)

حنابلہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

فـفـي الـغـاية وشـرحهـامن باب صلاة الـكسـوف ولا عبـرة بقول الـمـنجمين في كسوف ولا غيره مما يخبرون به ولا يجوز العمل به لانه من الرجم بالغيب فلا يجوز تصديقهم في شئ من المغيبات انتهى. (ايضاً: ١/ ٢٤٩)

چودہویں صدی میں سائنس نے خوب ترقی کی۔ چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں نت نئی تحقیقات پیش کیں، قرآن اور احادیث کے بہت سے وہ واقعات اور احوال جو سابق دور میں سمجھ سے بالاتر تھے، جدید سائنس کی تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان کردیا۔ بایں ہمہ چودہویں صدی کے علماء ومفتیان کرام نے بھی رؤیت ھلال کا دارومدار شرعی ثبوت پر رکھا، حساب وآلات رصدیہ پر نہیں۔

ذیل میں چودہویں صدی کے علماء کرام ومفتیان کرام کی عبارت پیش کی جاتی ہے:

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں:

قوله (فان غم عليكم فا قدروله)فالفطرو الصوم عندنا يدور بالرؤية حقيقة،او نقلها المعتبر شرعاً، ولاعبرة عندنا بالتقويم، الخ. (فيض البارى: ۱۵۲/۳ مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل)

خاتم الفقہاء حضرت مولانا محمد عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

احادیث صحیحہ بکثرت اس باب میں وارد ہیں کہ مدار صوم وافطار رؤیت ہے، اس وجہ سے بدون ثبوت رؤیت کے صرف ارباب توقیت کے قول پر اعتماد کرنا ناجائز ہوگا اور صحیح اور معتبر قول انہیں فقہاء کا ٹھہرے گا جو ارباب توقیت کے قول پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔

قال النبى ﷺ صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته فان اغمى عليكم فاكملوا العدد. (اخرجه مسلم)

وقال ﷺ الشهر تسع وعشرون ليلةً فلا تصوموا حتى تروه فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين. (اخرجه البخارى)

وقال ﷺ صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته فان حالت دونه غيابة فاكملوا ثلثين يوما. (اخرجه الترمذى)

وقال ﷺ انا امة امية لانكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا. (الحديث)

الغرض ان احادیث سے یہ ثابت ہے کہ شرعاً مدار صوم وافطار رؤیت ہے، ورنہ

اکمال سی یوم۔ پس اعتبار قول منجمین میں مخالفت احادیث کی لازم آتی ہے اور قول ارباب توقیت بوجہ ورودان روایات کے حجت ملزمہ نہیں ہوسکتا۔ (مجموعہ فتاوی کتاب الصوم: ۱/ ۲۸۰، ۲۸۱، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ)

مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے رؤیت ہلال کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ (القول المشهور فی هلال خير الشهور) تحریر فرمایا اس میں لکھتے ہیں:

لا اعتبار لحساب المنجمين والحاسبين فی الهلال وقد اختلفوا فی ذلك، فالذی عليه الاكثرون هو عدم اعتبار قولهم لا فی حق نفسه ولا فی حق غيره. (مجوعه رسائل لكهنوی: ۲/ ۵)

دارالعلوم کے سب سے پہلے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ (م ۱۳۴۷ھ) کے کئی فتاویٰ اس پر شاہد ہیں، فرماتے ہیں:

''اصل چیز رؤیت وشہادت ہے، علم ہیئت کے قواعد اور جنتری پر دارومدار غلط ہے، ملاحظہ کیجئے: فتاوی دارالعلوم دوسرا باب رؤیت ہلال کے ذیل میں عناوین: (۱) حساب ہیئت کی بنا پر روزہ شروع کر دینا کیسا ہے؟ (۲) باعتبار ہیئت چاند کا اعتبار درست ہے یا نہیں؟ (فتاوی دارالعلوم مدلل: ۶/ ۳۶۷ تا ۳۷۰ مطبوعہ دارالعلوم دیوبند)

عزیز الفتاوی میں بعنوان ثبوت ہلال کے بارہ میں قواعد ریاضیہ شرعاً معتبر نہیں۔

(عزیز الفتاوی: ۱/ ۳۸۳، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (م ۱۳۷۷ھ) کا ایک فتویٰ ملاحظہ کیجئے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اس ملک جنوبی افریقہ میں رؤیت ہلال کے متعلق جدید تعلیم یافتہ حضرات کا اصرار ہے کہ چاند کی پیدائش کے متعلق سائنس جدید نے جونئی دریافت اور تحقیق کی ہے اسی پر عمل کرتے ہوئے رمضان وعید وغیرہ کرتے رہنا چاہئے۔اور ارشاد نبوی ﷺ ’’صوموا لرؤیتکم و افطروا لرؤیتکم‘‘ پر اس وقت تک عمل ضروری تھا جب تک اس تحقیق جدید کا انکشاف نہیں ہوا تھا مگر اب مذکورہ حدیث پر عمل متروک ہونا چاہئے اور چاند کی پیدائش کی پیروی کرنی چاہئے، جو تحقیق کبھی غلط نہیں ہوسکتی ہے، کیا ان حضرات کی دلیل قابل تسلیم ہے؟

جواب: یہ کوئی نئی تحقیق اور نیا نظریہ نہیں ہے۔سائنس قدیم میں بھی اسکی تحقیق ہو چکی ہے لیکن احکام کی بنیاد پیدائش ہلال پر نہیں رکھی گئی، بلکہ رؤیت ہلال پر رکھی گئی ہے، روزے، حج، زکوۃ وغیرہ جملہ مسائل اسی رؤیت پر مبنی ہیں، پیدائش ہلال پر نہیں۔

ولا عبرة بقول الموقتین ولو عدولاً علی المذھب.(در مختار ۳۸۷/۲)

(فتاویٰ شیخ الاسلام: ۵۶: ۵۷ مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ (م ۱۳۹۶ھ) کا ایک رسالہ ’’رؤیت ہلال‘‘ کے نام سے ہے۔اس میں عنوان ’’ریاضی کے حسابات اورآلات رصدیہ کے نتائج بھی یقینی نہیں‘‘ کے ذیل میں لکھا ہے:

چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہر نجوم وفلکیات ابوریحان البیرونی جوشہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدت دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے اوران فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے۔اس نئی روشنی اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اس کی

امامت سب کے نزدیک مسلّم ہے، روسی ماہرین نے اس کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے۔

ان کی مشہور کتاب ”الآثار الباقية عن القرون الخالية“ ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے اس میں آلات رصدیہ کے ان نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرین فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ان علماء الهيئة مجمعون علٰى ان المقادير المفروضة فى اواخر اعمال رؤية الهلال هى ابعاد لم يوقف عليها الا بالتجربة وللمناظر احوال هندسية يتفاوت لاجلها المحسوس بالبصر فى العظم والصغر و فى ما اذ تأملها متأمل منصف لم يستطع بت الحكم على وجوب رؤية الهلال او امتناعها. (آثار باقیہ، ص: ۱۹۸، طبع ۱۹۲۳ء، لیزک)

ترجمہ: علمائے ریاضی و ہیئت اس پر متفق ہیں کہ رؤیت ہلال کے عمل میں آنے کے لیے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں وہ سب ایسی ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اور مناظر کے احوال مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہوسکتا ہے۔ اور فضائی و فلکی حالات ایسے ہیں کہ ان میں جو بھی ذرا غور کرے گا تو رؤیت ہلال کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کر سکے گا۔

اور کشف الظنون میں بحوالۂ زیچ شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ یہی لکھا ہے کہ ان معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشنگوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جا

سکے۔(کشف الظنون ۲/ ۹۶۹)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ رصد گاہوں اور آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رؤیت ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کہلاسکتی، بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے، تو اس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اور بھی تائید ہوگئی جو رسول امی ﷺ نے اس معاملہ میں اختیار فرمایا کہ ان کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو الجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رؤیت ہونے یا نہ ہونے پر احکام شرعیہ کا مدار رکھ دیا جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کر سکے۔(رؤیت ہلال: ۳۰، ۳۲)

علامہ ظفر احمد صاحب عثمانیؒ (م ۱۳۹۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

ویدل علی بطلان تاویلهم قوله ﷺ "فان حال بینکم وبین منظره سحاب اوقترة فعدوا ثلاثین"، فامر علیه السلام بعد ثلاثین (مطلقاً) مع جواز الرؤیة لو لم یحل بیننا وبینه سحاب او قترة، ولم یوجب الرجوع الی قول المنجمین، فا لقائل باعتبار منازل القمر وحساب المنجمین خارج عن حکم الشریعة ولیس هذاالقول مما یسوغ الاجتهاد فیه، لدلالة الکتاب ونص السنة، واجماع الفقهاء بخلافه. (احکام القرآن ۱/ ۱: ۱۹۵ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ (م ۱۳۹۷ھ) نے بیان ان العبرة للرؤیة لا للحساب عنوان کے ذیل میں لکھا ہے:

والعبرة عندالائمة الثلاثة للرؤیة وما یقوم مقامها وعند بعضهم یعتبر حساب منازل القمر عند اهل الحساب ایضاً کما ذکره فی العمدة. (معارف السنن: ۶/ ۷)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ (م ۱۴۱۷ھ) تحریر فرماتے ہیں:

احکام وارکان اسلام کو ایسے سادہ طریقہ پر قائم کیا گیا ہے جس کا سمجھنا بلا تکلف آسان ہو، ہیئت وحساب یا دیگر دقیق علوم پر قائم نہیں کیا گیا ہے کہ جن کے سمجھنے کے لیے بڑے آلات وتکلفات کی ضرورت پیش آئے۔ اگر ایسے علوم پر قائم کرنا مقصود ہوتا تو حضرت نبیٔ کریم ﷺ پر ان کی بھی وحی آتی اور آپ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی بھی تعلیم دیتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انکی تبلیغ واشاعت فرماتے۔ علامہ سبکی شافعیؒ نے اہل توقیت کے قول کو معتبر مانا ہے مگر خود شوافع ابن حجر، رملی، شہاب، رحمہم اللہ تعالی وغیرہ نے ہی ان کی تردید کی ہے اور علامہ ابن عابدینؒ نے ''معراج'' سے اجماع نقل کیا ہے کہ اہل توقیت کا قول معتبر نہیں۔ (فتاوی محمودیہ کراچی: ۱۰/ ۱۱۸)

مفتیٔ گجرات حضرت سید مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ (م ۱۴۲۲ھ) اپنے ایک طویل فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

حضور اقدس ﷺ نے مہینہ کی آمد کو رؤیت ہلال پر موقوف رکھا ہے، نئے چاند کے افق پر موجود ہونے یا اس کے نظر آنے کے صرف عقلی اور حسابی امکان کو دار و مدار نہیں بنایا۔ (فتاوی رحیمیہ: ۷/ ۲۷۷ مطبوعہ رحیمیہ راندیر)

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانویؒ (م ۱۴۲۱ھ) فرماتے ہیں:

قمری مہینے کا شروع ہونا چاند دیکھنے پر موقوف ہے، فلکیات کے فن سے اس میں اتنی مدد تو لی جاسکتی ہے کہ آج چاند ہونے کا امکان ہے یا نہیں، لیکن جب تک رؤیت کے

ذریعہ چاند ہونے کا ثبوت نہ ہو جائے محض فلکیات کے حساب سے چاند ہونے کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، مختصر یہ کہ چاند ہونے میں رؤیت کا اعتبار ہے، فلکیات کے حساب کا اعتبار بغیر رؤیت کے نہیں۔ (آپ کے مسائل اور انکا حل: ۳/۲۶۱ مطبوعہ نعیمیہ بکڈپو دیوبند)

فقیہ العصر حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ (م ۱۴۲۲ھ) فرماتے ہیں:

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں اگرچہ ناخواندہ عوام کی اکثریت تھی مع ہذا حساب داں بھی موجود تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قضاء کا واقعہ مشہور ہے سترہ اونٹوں کو جس اسلوب سے تقسیم فرمایا ہے اس سے آج کل کے دورِ ترقی کے اکثر محاسبین بھی ناواقف ہیں، بہت کم لوگ اس کی حقیقت جانتے ہیں۔ غرضیکہ وہ زمانہ محاسبین سے بالکل خالی نہ تھا اس کے باوجود آپ ﷺ کا ثبوت ہلال میں حساب کو باطل قرار دے کر رؤیت کو شرط قرار دینا اس پر کھلی دلیل ہے کہ شرعاً اثبات ہلال کے لیے حسابی طریقہ استعمال کرنا جائز نہیں اور اس پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ (احسن الفتاوی: ۴/۴۹۲ مطبوعہ دارالاشاعت دہلی)

علماء وفقہاء کی عبارات بالا کا مضمون مشترک ہے، ان عبارات پر غور کرنے سے حسب ذیل امور مستفاد ہوتے ہیں:

(۱) قمری مہینہ کی تبدیلی میں دارومدار چاند نظر آنے (یعنی چاند سر کی آنکھوں سے دیکھنے) پر ہے۔

(۲) صرف فلکی حساب اور آلات رصدیہ پر ثبوت ہلال کا مدار رکھنا شرعاً جائز نہیں۔

(۳) آلات رصدیہ کے ذریعہ ثبوت ہلال میں مدد لی جاسکتی ہے۔

(۴) تعارض کے وقت یعنی رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت نہ ہو اور اہل حساب کی

تحقیق اس کے برعکس ہوتو ترجیح شق اول (شرعی ثبوت) کوحاصل ہوگی۔ لان مبنی الشرائع علی الامور الظاھرۃ.

آلات رصدیہ یہ سائنسی ایجاد کے کرشمے اور تجربے ہیں جن کے بارے میں خود ان کے موجد برملا اظہار کرچکے ہیں کہ یہ حرف آخر نہیں، بلکہ ہر تجربہ دوسرے نئے تغیرات کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور ہر نئی تحقیق سابق تحقیق کو باطل کردیتی ہے جبکہ شرعی قوانین مستحکم ہوتے ہیں اور سائنسی تغیرات کے سامنے روبزوال نہیں ہوتے۔ اگر حساب اور آلات کے نتائج کو شرعی قوانین کی طرح قطعی اور یقینی کا درجہ دے دیا گیا تو شرعی قوانین میں شکوک وشبہات پیدا ہونا مستبعد نہیں۔

ذیل کے واقعہ سے امکان شبہات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے: حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کے سفر مصر وشام کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:۔

اسی دوران ایک مشہور عربی رسالہ کے دفتر میں مولانا بنوری کی ملاقات علامہ جوہری طنطاوی مرحوم سے ہوگئی، جن کی تفسیر الجواہر اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے، بعض لوگوں نے تو امام رازی کی تفسیر کبیر پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ فیہ کل شيء الا التفسیر (یعنی اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''تفسیر کبیر'' کے بارے میں یہ جملہ بہت بڑا ظلم ہے، ہاں! اگر موجودہ دور میں کسی کتاب پر یہ جملہ کسی درجہ میں صادق آسکتا ہے تو وہ علامہ طنطاوی مرحوم کی ''تفسیر الجواہر'' ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب تفسیر کی نہیں؛ بلکہ سائنس کی کتاب ہے اور سائنس کی باتوں کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کے شوق

میں علامہ طنطاوی مرحوم نے بعض جگہ آیات قرآنی کی تفسیر میں ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔

علامہ طنطاوی مرحوم سے حضرت مولانا بنوری کا تعارف ہوا، تو انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ کیا آپ نے میری تفسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ ہاں! اتنا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی بنیاد پر کتاب کے بارے میں رائے قائم کرسکتا ہوں۔ علامہ طنطاویؒ نے رائے پوچھی تو مولانا نے فرمایا آپ کی کتاب اس لحاظ سے تو علماء کے لیے احسان عظیم ہے کہ اس میں سائنس کی بے شمار معلومات عربی زبان میں جمع ہوگئی ہیں، سائنس کی کتابیں چونکہ عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں، اس لیے عموماً علمائے دین ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، آپ کی کتاب علماء دین کے لیے سائنسی معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے؛ لیکن جہاں تک تفسیر قرآن کا تعلق ہے اس سلسلے میں آپ کے طرزِ فکر سے مجھے اختلاف ہے، آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عصر حاضر کے سائنس دانوں کے نظریات کو کسی نہ کسی طرح قرآن کریم سے ثابت کر دیا جائے۔ اور اس غرض کے لیے آپ بسا اوقات تفسیر کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کرتے، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سائنس کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں، آج آپ جس نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہوسکتا ہے کل وہ خود سائنس دانوں کے نزدیک غلط ثابت ہو جائے، کیا اس صورت میں آپ کی تفسیر پڑھنے والا شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ قرآن کریم کی بات معاذ اللہ غلط ہوگئی، مولانا نے یہ بات ایسے مؤثر اور دل نشیں انداز میں بیان فرمائی کہ علامہ طنطاوی مرحوم بڑے متأثر ہوئے اور فرمایا: ایها الشیخ لست عالماً هندیاً وانما انت ملك انزل الله من السماء لاصلاحی (مولانا آپ کوئی

ہندوستانی عالم نہیں ہیں بلکہ آپ کوئی فرشتے ہیں جسے اللہ تعالی نے میری اصلاح کے لیے نازل کیا ہے) یہ واقعہ میں نے مولانا سے بارہا سنا اور شاید بینات کے کسی شمارے میں بھی مولانا نے اسے نقل کیا ہے۔ (نقوش رفتگاں: ۹۱، ۹۲)

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں۔

آپ کے استفتاء کا خلاصہ تین امور پر مشتمل ہے:

(۱) فلکیاتی اعتبار سے رؤیت ہلال کا امکان نہ ہو تو چاند دیکھنے والوں کی گواہی قابل قبول ہے یا نہیں؟

(۲) سعودیہ کے متبعین "محمود الفتاوی" کی عبارت سے اپنا موقف ثابت کرنے میں غلط فائدہ اٹھاویں اس کا قوی امکان ہے، لہٰذا اس کا انسداد کیجئے۔

(۳) "محمود الفتاویٰ" اور دیگر اکابر کی عبارات میں بظاہر تعارض ہے۔ "محمود الفتاویٰ" سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت ہلال کے سلسلے میں حساب داں یعنی فلکی تحقیقات کا اعتبار نفیاً صحیح ہے نہ اثباتاً، جبکہ دیگر اکابر کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات فلکی تحقیقات کو نفیاً معتبر مانتے ہیں، اس میں کونسی بات صحیح ہے؟ (سوال کی تنقیح پوری ہوئی)

پہلے سوال کا جواب:

احکام شرعیہ کا دارو مدار حجت شرعی پر ہے، گواہی شرعی حجت ہے، فلکی حساب حجت شرعی نہیں محض تخمینہ ہے، تخمینہ سے کسی امر کا ثبوت نہیں ہوسکتا، البتہ قبول شہادت کے لیے محل شہادت ہونا ضروری ہے اور شہادت کا محل انتیس شعبان ہے، لہذا اٹھائیس شعبان کو اگر گواہوں نے گواہی دی کہ ہم نے آنکھوں سے چاند دیکھا ہے تو ثقہ و عادل

ہونے کے باوجود ان کی گواہی قابل قبول نہیں ہے جیسے دو آدمی اس بات کی گواہی دیں کہ زید نے عمرو کو قتل کیا، گواہ ثقہ بھی ہیں؛ مگر تحقیق سے پتہ چلا کہ عمرو تو زندہ ہے تو یہ گواہی قابل قبول نہیں؛ اس لیے کہ عمرو محل شہادت نہیں۔

لو شهد الشاهدان بخلاف ما قامت عليه القرينة فالمعتبر هو الشهادة ما لم يكذبها الحس كما لو شهدا بان زيداً قتل عمروا ثم جاء عمرو حيا. (رسائل ابن عابدین/۱۲۹)

اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ قرائن اور شہادت میں تعارض کی صورت میں ترجیح شہادت کو حاصل ہے نہ کہ قرائن کو، بشرطیکہ وہ شہادت برمحل ہو اور اگر وہ شہادت بے محل ہو جیسا کہ مذکورہ مثال میں تو ایسی شہادت قابل قبول نہیں۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

''چاند کا نکلنا سب مقامات پر بیک وقت نہیں ہے، بلکہ اس میں قدرت کا پیدا کیا ہوا اختلاف ہے، کہیں ایک دن پہلے طلوع ہوتا ہے، کہیں دو دن پہلے اگر شرعی اصول کے مطابق ایک ملک میں چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے اور دو عادل شاہد بذریعۂ ہوائی جہاز ایسے ملک میں آ کر شہادت دیں جہاں اس روز اٹھائیس تاریخ ہو تو شاہدوں کے عادل وثقہ ہونے کے باوجود ان کی شہادت قابل سماعت نہیں ہوگی، شہادت کے لیے محل ہونا ضروری ہے، اس کا محل یوم الشک ہے یعنی ۲۹ ر تاریخ۔ اور ۲۸ ر تاریخ کو تو شہادت لی بھی نہیں جائیگی، نہ شاہد کا ذب قرار دیا جائیگا، اگر چار آدمی عادل معتبر کسی شخص کے متعلق گواہی دیں کہ ہم نے اس کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے، لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ

شخص مجبوب ہے یعنی اس کے پاس آلہ ہی موجود نہیں بلکہ مقطوع ہے تو ان شاہدوں کی وجہ سے اس شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا، نہ شاہدوں پر حدِ قذف جاری ہوگی۔ و کذا لو شهدوا علی زناه فوجدوه مجبوبا(لم يحد). (الدر المختار کتاب الحدود۔باب الشهادت علی الزنا ۲/۳۳ بحوالہ فتاوی محمودیہ کراچی:۱۰/۶۳، محمود الفتاوی:۲/۹۳)۔

فلکیاتی حساب سے ۲۹ ؍تاریخ کو چاند کی رؤیت کا امکان نہ ہو اور شرعی گواہ سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو نئے ماہ کا ثبوت ہو جائے گا۔

علامہ شامیؒ نے اس کی تصریح بایں الفاظ فرمائی ہے:

و فی فتاویٰ الشهاب الرملی الکبیر الشافعی سئل عن قول السبکی لو شهدت بينة برؤية الهلال ليلة الثلاثين من الشهر و قال الحساب بعدم امکان الرؤية تلك الليلة عمل بقول اهل الحساب لان الحساب قطعی و الشهادة ظنية و اطال فی ذلك فهل يعمل بما قاله ام لا وفيما اذا رؤی الهلال نهاراً قبل طلوع الشمس يوم التاسع و العشرين من الشهر و شهدت بينة برؤية هلال رمضان ليلة الثلاثين من شعبان فهل تقبل الشهادة ام لا لان الهلال اذا كان الشهر كاملاً يغيب ليلتين او ناقصاً يغيب ليلة او غاب الهلال ليلة الثالثة قبل دخول وقت العشاء لانه ﷺ كان يصلی العشاء لسقوط القمر الثالثة هل يعمل بالشهادة ام لا؟ فاجاب بان المعمول به فی المسائل الثلاث ما شهدت به البينة لان الشهادة نزلها الشارع منزلةا ليقين وما قاله السبکی مردود رده عليه جماعة من المتأخرين. (شامی:۲/۱۰۰، رسائل ابن عابدين:۱/۲۴۸)

آپ نے تحریر فرمایا ہے:

”برطانیہ میں سعودی کی ۲۹/شعبان کی شام کو بعد نماز مغرب تین حضرات نے چاند دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے، جب کہ فلکیاتی اعتبار سے اس دن رؤیت کا امکان نہ تھا بلکہ چاند غروب آفتاب سے پہلے ہو چکا تھا“۔

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ برطانیہ میں اس روز اسلامی کونسی تاریخ تھی؟ اگر برطانیہ میں ۲۸/شعبان تھی تب تو یہ گواہی قابل سماعت نہیں جیسا کہ گذرا اور اگر برطانیہ میں ۲۹/تاریخ تھی اور غروب آفتاب سے پہلے چاند دیکھا تھا تو ان کی گواہی سے رمضان کا ثبوت ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ گواہ دیندار ہوں اور مطلع غبار آلود ہو۔

عمدۃ الفقہ میں ہے:

رمضان کا چاند ابر و غبار وغیرہ کے دن ایک آدمی کی گواہی سے ثابت ہو جاتا ہے جیسا کہ متون وشروح میں اس کا بیان ہے (مؤلف) پس اگر آسمان پر (چاند کے مطلع کی جگہ پر) ابر وغیرہ کوئی علت ہو جو رؤیت سے مانع ہو تو رمضان کا چاند دیکھنے میں ایک شخص کی گواہی قبول کر لی جائے گی بشرطیکہ وہ عادل، مسلمان، عاقل اور بالغ ہو۔ (عمدۃ الفقہ ۳/ ۲۲۸)

اور اگر آسمان پر کوئی علت نہ ہو (یعنی مطلع صاف ہو) تو ایسی بڑی جماعت کی گواہی قبول ہوگی جن کے خبر دینے سے یقین حاصل ہو جائے، یعنی اس خبر سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے اور بڑی جماعت کے لیے کوئی تعداد مقرر نہیں ہے بلکہ یہ امام کی رائے پر موقوف ہے، یہی صحیح ہے۔ (ایضا: ۳/ ۲۳۲)

ہدایہ میں ہے: واذا كان بالسماء علة قبل الامام شهادةالواحدالعدل فی

رؤية الهلال رجلا كان او امرأة حرا كان او عبدا لانه امر دينى فأشبه رواية الاخبار ولهذا لا يختص بلفظ الشهادة وتشترط العدالة لان قول الفاسق فى الديانات غير مقبول إلخ. واذا لم تكن بالسماء علةلم تقبل الشهادة حتى يراه جمع كثير يقع العلم بخبرهم لان التفردبالرؤية فى مثل هذه الحالة يوهم الغلط فيجب التوقف فيه حتى يكون جمعا كثيرا بخلاف ما اذا كان بالسماء علة لانه قد ينشق الغيم عن موضع القمرفيتفق للبعض النظر. (ھدایہ اولین:۲۱۵/۲۱۶مطبوعہ اشرفی بک ڈپو دیوبند)

بدائع الصنائع میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنه:ان رجلا جاء الىٰ رسول الله ﷺفقال ابصرت الهلال فقال: اتشهد ان لا الٰه الا الله و ان محمدا رسول الله؟ قال نعم قال قم يا بلال فأذن فى الناس فليصوموا غدا...فقد قبل رسول الله ﷺ شهادة الواحد على هلال رمضان ولنا فى رسول الله ﷺ أسوة حسنة.(بدائع الصنائع:/۲۲۱،۲۲۲)

مذکورہ حدیث کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے:

”اخرجه ابو داؤد فى سننه فى الصوم“ باب فى شهادة الواحد على رؤية الهلال برقم: ٢٣٤٠ـوالترمذى فى جامعه فى الصوم“باب ما جاء فى الصوم بالشهادة برقم ٦٩١ـ والنسا ئى فى المجتبى من السنن ٤/ ١٣٢ فى الصوم باب ماجاء فى الصوم بالشهادة. وابن ماجة فى سننه فى الصيام باب ماجاء فى الشهادة على رؤية الهلال برقم١٦٥٢ .(حاشیہ بدائع الصنائع ۲/۲۲۲)

آپ نے تحریر فرمایا ہے: ''جبکہ فلکیاتی اعتبار سے اس دن کو (۲۹ رشعبان کو) رؤیت کا کوئی امکان نہ تھا''

فلکی حساب سے امکان ہو یا نہ ہومگر شرعی حساب سے ۲۹/شعبان کو چاند کا امکان بلکہ وقوع ہے، نص سے اس کا ثبوت ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزرا کہ ان آنے والے صحابی نے ۲۹ رشعبان کا چاند دیکھا تھا، نیز حضور ﷺ کے قول اور فعل دونوں سے ۲۹ رشعبان کو امکان رؤیت کا ثبوت ہے۔

قولی حدیث میں الشهر هكذا وهكذا وهكذا پیش کر دینا کافی ہے جیسا کہ سابق اوراق میں گذرا۔

فعلی احادیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

عن عائشة رضـ: كان رسول الله ﷺ يتحفظ من شعبان ما لا يتحفظ من غيره ثم يصوم لرؤية رمضان فان غم عليه عد ثلاثين يوما ثم صام. (ابو داود كتاب الصوم: ۱/۳۱۸)

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: کہ حضرت نبیٔ کریم ﷺ جتنا ماہ شعبان کے چاند کا اہتمام فرماتے تھے اتنا کسی دوسرے ماہ کا نہیں فرماتے تھے، پھر (انتیس شعبان کا) چاند دیکھ کر رمضان کا روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن مطلع غبار آلود ہونے (اور کہیں سے رؤیت کی اطلاع نہ ملنے) کی صورت میں (شعبان) کے تیس دن پورے کیا کرتے تھے۔

دیکھئے! آپ ﷺ کا ۲۹/ شعبان کو چاند کا اہتمام فرمانا خود امکان رؤیت پر صریح دلیل ہے۔ رہی یہ بات کہ غروب آفتاب سے پہلے چاند دیکھا جائے تو یہ چاند کس دن کا

شمار ہوگا سابق دن کا یا آئندہ دن کا؟ اس کے متعلق حضرات فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ وہ چاند آنے والے دن کا ہے، مثلاً بدھ کے روز انتیس شعبان کی تاریخ ہے اسی روز غروب آفتاب سے کچھ پہلے چاند دیکھا گیا تو جمعرات کو رمضان کی پہلی تاریخ شمار ہوگی۔

نورالایضاح میں ہے: ولا عبـرة برؤية الهلال نهارا سواء كان قبل الزوال او بعده وهو لليلة المستقبلة فى المختار. (نور الایضاح ۱۴۰ مطبوعہ معراج بک ڈپو دیوبند)

بدائع الصنائع میں ہے:

وقـال ابـو يـوسفؒ: ان كان بعد الزوال فكذالك، وان كان قبل الزوال فهـو لـليـلةالـمـاضية ويـكـون ذالك اليـوم من رمضان والمسألة مختلفة بين الصحابةوروى عن عمر رضی اللہ عنہ، وابن مسعود رضی اللہ عنہ، وابن عمر رضی اللہ عنہ، وانس رضی اللہ عنہ مثل قـولهـمـا. وروى عن عمر رضی اللہ عنہ رواية اخـرىٰ مثـل قـولـه، وهو قول على رضی اللہ عنہ، وعـائشةؓ، وعـلـىٰ هـذا الـخـلاف هـلال شوال اذا رأوه يوم الشك وهو يوم الثـلاثيـن من رمضان قبل الزوال او بعده فهو لليلة المستقبلة عندهما ويكون اليـوم من رمضان، وعنده ان رأوا قبل الزوال يكون لليلة الماضية ويكون اليوم يـوم الفطر، والاصل عندهما انه لا يعتبر فى رؤية الهلال قبل الزوال ولا بعده

وانما العبرة لرؤيته قبل غروب الشمس وعنده يعتبر. (بدائع الصنائع: ۲/۲۲۳، ۲۲۴)

خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوا کہ غروب شمس سے پہلے دیکھا ہوا چاند معتبر ہے، لہٰذا ایسے چاند کی رؤیت کی بنیاد پر جو گواہی دی جاوے وہ بھی معتبر ہے۔

آپ کے استفتاء میں بظاہر تعارض ہے، پہلے تحریر فرمایا ''فلکیاتی اعتبار سے اس

دن رؤیت کا کوئی امکان نہ تھا'' بعد میں لکھا'' بلکہ چاند غروب آفتاب سے پہلے ہو چکا تھا'' جب امکان ہی نہ تھا تو غروب آفتاب سے پہلے چاند کیسے پیدا ہوا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے سوال کا جواب:

ایسا لگتا ہے کہ جناب والا نے ''محمود الفتاوی'' کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے، حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے فتاوی میں کئی جگہ سعودیہ کا فیصلہ در باب رؤیت ہلال شرعی ضابطہ پر نہ اترنے اور قابل قبول نہ ہونے کی صراحت ہے، ملاحظہ کیجئے:

(۱) ایک ضروری وضاحت: میں نے اپنے سابق جواب میں جو کچھ لکھا اور اس افہام اور تفہیم میں بھی جو عرض کیا، اس سے میرا مقصد سعودیہ کے اعلان کی حمایت نہیں ہے، بلکہ نفس مسئلہ کی وضاحت اور شرعی حیثیت کا تعین ہے، رہا سعودی اعلان درست ہے یا نہیں؟ تو جب تک ان کے طریق کار کا علم نہ ہو جائے اس سے پہلے اس سلسلہ میں کچھ کہنا یا لکھنا قبل از وقت ہے الخ۔ (محمود الفتاوی اردو: ۲/ ۱۶۷، مطبوعہ مکتبۂ انور ڈابھیل)

(۲) ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

حکومت سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ جس انداز سے ہو رہا ہے وہ اہل علم کے درمیان موضوع نزاع ہے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے اس سلسلہ میں جو رائے قائم فرمائی ہے، وہ ایک موزوں اور صائب رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''حکومت سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے خلاف بھی ہوتا ہے؛ اس لیے وہ پاکستان کے لیے حجت نہیں''۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۴۱۶)

جب وہ فیصلہ مسلک حنفی کے خلاف ہونے کی وجہ سے پاکستان کے لیے حجت

نہیں تو برطانیہ میں مقیم احناف کے لیے کیسے حجت ہوگا؟۔ (محمود الفتاوی:۲/۱۸۰)

(۳) سعودیہ کے متعلق بعض حضرات کا اصرار ہے کہ وہ لوگ حساب پر چلتے ہیں، رؤیت اور شہادت محض عقلی تسلی ہے، اس صورت میں اس پر مدار رکھنا بھی موجب خلفشار ہوسکتا ہے۔ انتہی بلفظہ (محمود الفتاوی:۲/۲۰۵)

مذکورہ تینوں عبارتوں پر غور فرمالیں کہ ان عبارتوں سے سعودیہ کے متبعین کا منشاء ثابت ہورہا ہے یا متزلزل ہورہا ہے؟

حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے فتاویٰ میں جہاں سعودیہ کی رؤیت اور فیصلہ کو تسلیم کیا گیا اور اس پر عمل کی گنجائش لکھی ہے وہ مقید ہے مطلق نہیں، حضرات فقہاء کا مسئلہ کو مقید کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں وہ قید نہ ہو اس کے لیے وہ حکم ثابت نہ ہوگا۔

وكذا يقال في مفهوم الروايات، فان العلماء جرت عادتهم في كتبهم، على انهم يذكرون القيود و الشروط و نحوها تنبيها على اخراج ما ليس فيه ذلك القيد ونحوه، وان حكمه مخالف لحكم المنطوق، وهذا مما شاع و ذاع بينهم بلا نكير و لذا لم ير من صرح بخلافه. (شرح عقود رسم المفتی: ۱۷۴، زکریا)

محمود الفتاویٰ سے اس کی دو مثال پیش کرتا ہوں:

سوال: (۱) بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عید الاضحیٰ سعودی عرب میں حج کے دوسرے دن برطانیہ میں منائی جائے، کیا حدیث شریف میں یا شریعت مطہرہ میں اس کی کوئی حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں جس دن حج ہو اس کے دوسرے دن برطانیہ میں عید الاضحیٰ منائی جائے؟

جواب (۱) حدیث میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے، البتہ اگر سعودی رؤیت کی خبر بطریق موجب برطانیہ پہنچ گئی تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ (محمود الفتاوی:۲/۱۳۰،۱۵۲)

سوال: (۲) سعودی عربیہ میں قران شمس وقمر سے پہلے اور قران شمس وقمر کے وقت یا قران شمس وقمر کے چند گھنٹوں ہی کے بعد رؤیت ہلال کا فیصلہ کیا جاتا ہے، آیا اسے معتبر مانا جائے گا یا نہیں؟ (ملخصاً)

جواب: (۲) صورت مسئولہ میں حکومت سعودیہ کا یہ فیصلہ ۲۹؍تاریخ کو شہادت رؤیت کی بنیاد پر ہے تو محل شہادت موجود ہے اس لیے قابل قبول ہے، ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ (محمود الفتاوی:۲/۹۴)

مذکورہ دونوں فتاوی میں حضرت مدظلہ نے ''رؤیت'' و ''شہادت'' کی قید لگائی، رؤیت اور شہادت سے شرعی رؤیت اور شرعی شہادت مراد ہے، شرعی رؤیت ہے سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنا، اور شرعی شہادت وہ ہے جو ضابطۂ شریعت کے مطابق ہو۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ سعودیہ کے متبعین کے لیے حضرت مفتی صاحب کے فتاوی تائید کے طور پر پیش کرنے کی کوئی سبیل نہیں، پھر بھی توڑ موڑ کر اگر کوئی پیش کرے تو اس کی ذمہ داری اسی پر ہوگی نہ کہ صاحب فتاویٰ پر۔

تیسرے سوال کا جواب:

آپ نے تحریر فرمایا: ''حضرت والا کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت ہلال کے سلسلہ میں حساب داں کی بات کا اعتبار نہ نفیاً صحیح ہے اور نہ اثباتاً جبکہ اوراکابر کے فتاوی ومضامین سے معلوم ہوتا ہے: وہ حضرات نفیاً اس کو معتبر مانتے ہیں''

غالبًا آپ کی مراد نفیاً اور اثباتاً سے اگر یہ ہے کہ نفیاً یعنی شرعاً صرف آلات رصدیہ سے ہونے والے ثبوت ہلال کی نفی کرنا درست ہے اور اثباتاً یعنی عقلاً ان آلات سے رؤیت کا ثبوت درست وممکن ہے۔

اگر یہی مراد ہے تو حضرت مدظلہ اور اکابر کے فتاویٰ میں واقعی کوئی تعارض نہیں، باقی ہمارے اکابر میں اس کا کوئی قائل نہیں کہ صرف اور صرف آلات رصدیہ کی بنیاد پر ثبوت ہلال شرعاً معتبر ہے۔

موجودہ دور کے مفتیان کرام درحقیقت ناقل فتاویٰ ہیں:

المفتی المجتهد فی المذهب،وهو المفتی حقیقة.اما غیره فهو ناقل.(شرح عقود رسم المفتی:۱۳۲)

وان ما عداهم یکتفی بالنقل،وان علینا اتباع ما نقلوه لنا عنهم،من استنباطاتهم غیر المنصوص عن المتقدمین،ومن ترجیحاتهم. (شرح عقود رسم المفتی:۱۳۸) اسی وجہ سے مفتی کے لیے فتوے میں کتاب کا حوالہ دینا ضروری ہے، حوالہ کے بعد مفتی عہدہ برآ ہوجاتا ہے، اور ساری ذمہ داری محولہ کتاب کے مصنف پر عائد ہوتی ہے۔

مفتی صاحب مدظلہ نے ''محمود الفتاویٰ'' میں تحریر فرمایا ہے:

''فلکی حساب کا رؤیت پر مثبت ومنفی کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، جس طرح فلکی حساب کے مثبت طور پر معتبر ومؤثر نہ ہونے کو آپ تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح منفی طور پر بھی وہ مؤثر ومعتبر نہیں۔ ''لا عبرة بقول الموقتین فی الصوم'' کا یہی مطلب فقہاء کرام نے لیا ہے۔'' (انتہی بلفظہ)

ملاحظہ کیجئے: مفتی صاحب نے نفیاً مؤثر ہونا اپنی طرف سے نہیں لکھا فقہائے کرام کی عبارات کی روشنی میں لکھا ہے، علاّمہ شامی کی عبارت "ان الشارع لم يعتمد الحساب بل ألغاه بالكلية" (شامی: ۲/ ۱۰۰) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

جو حضرات علامہ شامیؒ کی مشہور و معروف کتاب "رد المحتار" کو معتبر مانتے ہیں اور فقہ حنفی میں جامع و مستند سمجھتے ہیں، اپنے فتاویٰ میں اس کے حوالے دیتے ہیں، ان کو علاّمہ شامیؒ کی بات تسلیم کر لینا چاہئے اور بصورت دیگر اس کا جواب دینا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض درحقیقت صاحبِ محمود الفتاویٰ پر نہیں بلکہ علامہ شامی اور دیگر فقہاء پر ہے۔ فافهم و تدبر. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد عبدالقیوم راجکوٹی، ۳۰/ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

چاند کی شہادت کو فلکی حسابات کی بنیاد پر رد کرنا اور روزہ کی قضاء نہ کرنا

از مرتب: عبدالقیوم راجکوٹی

محترم المقام حضرت مولانا مفتی صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ خیریت طرفین

سوال: عرض یہ ہے کہ ہمارے یہاں برطانیہ میں رمضان ۱۴۳۱ھ کے موقع پر ۲۹ ویں شعبان ۱۴۳۱ھ بمطابق ۱۰ اگست ۲۰۱۰ء منگل کی شام "برمنگھم" شہر کے تین حضرات نے رمضان کا چاند دیکھا، جن کی گواہیاں مرکزی رویت ہلال کمیٹی برطانیہ کے وفد نے "برمنگھم" جا کر گواہوں سے روبرو مل کر لیں، ان گواہوں کی خصوصیات میں سے

ایک تو یہ ہے کہ یہ تینوں صاحب ترتیب ہیں، جبکہ ایک گواہ عالم دین، دوسرا حافظ قرآن ہے اور تیسرے گواہ تبلیغی جماعت میں عرصے سے دعوت کے کام میں جڑے ہوئے ہیں، ان تینوں حضرات کی گواہی چاند کمیٹی کے وفد نے ان سے مل کر سنی اور تحریری دستخط بھی لیے، جس کی تفصیل ساتھ میں روانہ کردہ گواہی کے کاغذات میں موجود ہے، یاد رہے کہ اس سے قبل بھی چاند کمیٹی کے اعلانات کے پچھلے پچیس سالہ ۲۹/ ویں دن کے تسلسل کی شام کو برطانیہ میں- جو کہ بہت چھوٹا ملک ہے، بہ شمول دارالعلوم بری کے ۸/ نیز دارالعلوم لیسٹر کے ۳/ طلباء-بیس مواقع پر چاند کی رویت وشہادت ہوئی ہے جن تمام کا ریکارڈ ہماری ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔

بہر حال بعض حضرات نے اس گواہی کو یہ کہہ کر تسلیم نہیں کیا کہ: یہ شہادت مفروضہ فلکیاتی نیومون تھیوری کے حسابات کے خلاف ہونے کی وجہ سے مشکوک و متہم ہے؛ کیونکہ فلکیاتی حساب کے مطابق اس چاند کے دکھائی دینے کے امکانات اس وقت بالکل نہ تھے، اس کے علاوہ چاند کمیٹی نے گواہوں سے جو گواہی لی وہ رمضان شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد لی وغیرہ! حالانکہ نصوص وفتاویٰ کے مطابق مذکورہ وجوہ کی بنیاد پر اس شام رمضان کی ''عدمِ فرضیت'' کا شرعاً کوئی جواز نہیں۔

یاد رہے کہ چاند کمیٹی نے مذکورہ شہادت کے بعد اپنے اعلانات میں ''فقہاء و مفتیانِ کرام کے ثبوتِ ہلال کے مسئلہ میں فلکیات کے عمل دخل کی تردید میں جو فتاویٰ آپ حضرات کے ہیں (جو ہماری ویب سائٹ پر الگ سے وکتب میں بھی ہیں) انہیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس چھوٹ جانے والے روزہ کی قضاء کے لیے بھی عوام کو مطلع

کیا، مگر بعض لوگ مفروضہ نیومون تھیوری کے حسابات جو (۴۳۱ھ ق م کیمیتون فلسفی کی سوچ و نظریہ ہے اور جو) اسلام کی آمد سے پہلے ۳۵۸ء کے یہودی ربائی حالیل دوم نے دینِ موسوی میں تحریف کر کے جسے دخیل بنایا تھا، اسے شہادتِ ہلال کے لیے ''کسوٹی'' مانتے ہیں اور دلیلاً آیتِ شریفہ الشمس و القمر بحسبان پیش کرتے ہیں، اس طرح انہوں نے مذکورہ شہادت کو رد کر کے روزہ کی قضاء کرنے کا بھی انکار کر دیا! اس طرح نعوذ باللہ ماقبل اسلام اور ماقبل مسیح کی فلسفیانہ تھیوری کو نصوص کے خلاف استعمال کیا، جسے آپ ﷺ نے حدیث امّی سے رد کر دیا تھا! اب وہ عوام جن کا روزہ شہادت کی بنیاد پر چھوٹ گیا ہے وہ گومگو کی حالت میں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ''ہمارا روزہ قضاء نہ کرنے کا وبال ان لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اس کی قضاء کے لیے منع کیا ہے''!

اس تفصیل کے ضمن میں ذیل کے سوالات کے جوابات درکار ہیں:

سوال: (۱) کیا برمنگھم کے مذکورہ گواہوں کی شہادت کو چاند کے فلکی حسابات اور اس کی نیومون تھیوری کی کسوٹی کی بنیاد پر رد کرنا جائز ہے؟

(۲) جن لوگوں کا روزہ مذکورہ شہادت کی بنیاد پر چھوٹ گیا ہے اس کی قضاء وہ یہ سمجھ کر نہ کریں کہ ''اس کا وبال ہم پر نہیں ہوگا بلکہ جنہوں نے منع کیا ہے ان پر ہوگا''، تو کیا ان کا یہ عذر شرعاً قابل حجت ہے؟ یا پھر ان پر قضاء ضروری ہے؟ بینوا و توجروا، جزاکم اللّٰہ.

فقط والسلام۔

بقلم: مولوی یعقوب احمد مفتاحی

(ناظم حزب العلماء یوکے و مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی برطانیہ)

مؤرخہ: یکم محرم الحرام ۱۴۳۲ھ مطابق ۷ دسمبر ۲۰۱۰ء بروز منگل

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) فلکی حساب کی بنیاد پر شرعی شہادت کو رد کرنا جائز نہیں، ہر دور میں فقہاء نے رمضان وعیدین کا دارو مدار رؤیت ہلال پر رکھا ہے، تدقیقات فلسفیہ اور قواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ اور حساب پر نہیں رکھا۔

(اس سلسلہ کی عبارات فقہیہ آپ کے مرسلہ دوسرے استفتاء کے جواب میں ملاحظہ فرمالیں)۔

جن لوگوں نے فلکی حساب کو معیار بنا کر آیت کریمہ الشمس و القمر بحسبان سے استدلال کیا ہے، یہ استدلال بھی درست نہیں۔ مذکورہ آیت کریمہ سورۂ رحمٰن میں ہے، انسان کے لیے حق تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس آیت میں علویات کی نعمتوں میں سے شمس وقمر کا ذکر خصوصیت سے شاید اس لیے آیا ہے کہ عالم دنیا کا سارا نظام کاران دونوں سیاروں کی حرکات اوران کی شعاعوں سے وابستہ ہے، اور لفظ حسبان بضم الحاء بعض حضرات نے فرمایا کہ حساب کے معنی میں مصدر ہے، جیسے غفران، سبحان، قرآن، اور بعض نے فرمایا کہ حساب کی جمع ہے، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ شمس وقمر کی حرکات جن پر انسانی زندگی کے تمام کاروبار موقوف ہیں، رات دن کا اختلاف، موسموں کی تبدیلی، سال اور مہینوں کی تعیین، ان تمام کی حرکات اور دوروں کا نظام محکم ایک خاص حساب اور اندازے کے مطابق چل رہا ہے، اور اگر حسبان کو حساب کی جمع قرار دیا جائے تو معنی یہ ہونگے کہ ان میں سے ہر ایک کے دورے کا الگ الگ حساب ہے، مختلف قسم کے حسابوں پر یہ نظام شمسی اور قمری چل رہا ہے، اور حساب بھی ایسا محکم و مضبوط کہ

لاکھوں سال سے اس میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ (معارف القرآن:٦/٢٤٤)

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ شمس وقمر کی سیر ایک خاص حساب اور ضابطہ اور مضبوط نظام کے ماتحت ہے، یہ دونوں اس حساب سے سر مو تجاوز نہیں کر سکے، لیکن اس خاص حساب کی تفصیل تو قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ اہل ہیئت و ریاضی جس حساب کے دعوے دار ہیں وہی مراد ہو۔ (محمود الفتاویٰ:٢/١٤٣)

اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے وہی حساب مراد ہے، تب بھی یہ دعوی کہ ''وہ حساب یقینی اور قطعی ہے'' محل نظر ہے، سائنس کے نظریات یقین اور مشاہدہ کے بجائے ظن اور تخمین پر مبنی ہیں، سائنس کی ایسی تحقیقات جو قرآن وحدیث کی تصریحات سے ٹکراتی ہوں قابل قبول نہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تصریحات پر عمل کیا جائے اور سائنسی معلومات پر عمل نہ کیا جائے۔

کیوں چاند میں کھوئے ہو، الجھے ہو ستاروں میں
حل کو ڈھونڈو قرآن و حدیث کے اشاروں میں

(٢) شرعی شہادت کی بنیاد پر رمضان کا فیصلہ کیا گیا، فیصلہ کرنے والے حضرات نے یہ فیصلہ اصول شرع کی روشنی میں کیا ہو، تو جو لوگ ان کے متبعین ہیں ان کے لیے فیصلہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔

ولو احتجم و ظن ان ذلك يفطره ثم اكل متعمدا عليه الكفارة لان الظن مااستند الى دليل شرعى الا اذا افتاه فقيه بالفساد لان الفتوى دليل شرعى فى حقه (الىٰ قوله) لان على العامى الاقتداء بالفقهاء لعدم الاهتداء فى حقه الى معرفة الاحاديث (هدايه اولين:٢٢٦)

ان کا یہ کہنا ’’اس کا وبال ہم پر نہیں ہوگا بلکہ جنہوں نے منع کیا ہے ان پر ہوگا‘‘ درست نہیں، اگر انہوں نے روزہ قضاء نہیں کیا تو گنہگار رہوں گے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:-

سوال: اگر مطلع بالکل صاف ہو اور رؤیت ہلال عید الاضحیٰ کیلیے پورا پورا اہتمام کرنے کے باوجود دور نزدیک کہیں بھی کسی شخص نے ۲۹ کا چاند نہیں دیکھا؛ مگر قاضی نے بعض لوگوں کے کہنے پر ۵ یا ٦ تاریخ کو ۲۹ کی رؤیت ہلال کا اعلان کیا اور لوگوں نے اس کے مطابق ۱۰/ ذی الحجہ کو نماز وقربانی ادا کیا، تو ایسی صورت میں فریضۂ صلوۃ واضحیہ ادا ہو جائیں گے یا نہیں؟ اور اعلان قاضی کا وثوق نہ کرکے ۳۰ کے چاند کے مطابق صلوۃ واضحیہ ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟ ملخصاً

الجواب: جو لوگ اس قاضی کے ماتحت ہیں اور قاضی نے شرعی شہادت سے اعلان کیا ہے تو ان کے ذمہ اس پر عمل واجب ہے، اس کے خلاف کرنے سے گنہگار ہوں گے۔ (مأخوذ از فتاوی محمودیہ جدید: ۱۰/ ۱۲۰ تا ۱۲۲)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد عبد القیوم راجکوٹی

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱/ صفر ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

چاند کے فیصلہ میں اختلاف کی صورت میں نماز عید میں تعدّد وا عتکاف کا حکم

از مرتب: عبد القیوم راجکوٹی

سوال: یہاں باٹلی میں مسلمانوں کے چاند کے فیصلے میں دو جماعتیں ہیں،

ایک گروہ جمعیۃ علماء یوکے (سعودی عربیہ) کی رویت کا اعتبار کرتے ہوئے رمضان اور عیدین کے تعین کا اعتبار کرتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ باٹلی کے مفتیان کرام اور علماء عظام پر مشتمل چاند کمیٹی کے اعلان کا اعتبار کرتے ہوئے رمضان اور عیدین کا تعین کرتا ہے اور عموماً جمعیۃ العلماء کا اعلان دوسرے گروہ کے اعلان سے ایک دن پہلے ہوتا ہے، اب دونوں گروہ ایک ہی شرعی مسجد میں اپنے اپنے اعلان کے مطابق عیدین ادا کرنا چاہتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) اگر پہلے گروہ نے ایک دن پہلے عید کی نماز ادا کر لی، تو پھر دوسرے دن اسی مسجد میں دوبارہ وہی عید کی نماز دوسرا گروہ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اور معتکفین کا کیا حال ہوگا؟

بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

کسی مسئلہ میں معتبر علمائے کرام کی رائے میں اختلاف ہو تو عامی شخص کے لیے یہ حکم ہے کہ جن کی رائے پر اعتماد ہو اس پر عمل کرے۔ وان کان عامیاً اتبع فتویٰ المفتی فیه الاتقیٰ الأعلم. (شرح عقود رسم المفتی: ۱۰۷) لیکن دوسرے گروہ کی رائے کی تغلیط اور ان پر تنقید نہ کرے، ہمارے اکابر کا ایسے مسائل میں یہی معمول رہا ہے، لہذا ہمیں ان کا اتباع کرنا چاہئے، جس سے دین پر ثابت قدمی میں بڑی تقویت ملتی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ آیت کریمہ ﴿وكلاً نقص عليك من أنبآء الرسل ما نثبت به فؤادك﴾ ترجمہ: اور پیغامبروں

کے قصوں میں سے ہم یہ سارے قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں) (سورۂ ہود) کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: اس میں دلیل ہے کہ مقبولین کے قصص کو قلوب کی تثبیت وتقویت وتنشیط میں خاص اثر اور دخل ہے؛ اسی لیے بزرگوں نے اولیاء کی حکایات جمع کرنے کا خاص اہتمام فرمایا ہے۔ (بیان القرآن ۵/ ۶۷)

مختلف فیہ مسائل میں عمل کی بجائے باوقار فقہی مسائل کی آڑ میں ذاتیات کو ہدف بنانا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کو کون نہیں جانتا، ان کے محتاط طرز فکر وعمل سے شاید ہی کوئی نا آشنا ہوگا، ایک موقع پر حضرت انگلینڈ تشریف لے گئے، وہاں اہل علم کے مابین سحری کے آخری وقت کے متعلق اختلاف چل رہا تھا، اس کے حل کے لیے حضرت کی طرف رجوع کیا گیا، حضرت نے پانچ سو علماء کی موجودگی میں نہایت ہی محتاط فیصلہ صادر فرمایا، جو ہمارے لیے مشعل راہ ہے، اسی طرح عید الفطر کے چاند میں اختلاف کی صورت میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا محتاط عمل معتکفین کے لیے قابل توجہ وعمل ہے، لہذا اصل جواب سے پہلے حضرت فقیہ الامتؒ کا فیصلہ اور حضرت شیخ کا عمل نقل کیا جاتا ہے، اس کو غور سے پڑھیے اور عملی جامہ پہنایئے، ملاحظہ کیجیے:

''کرامات وکمالات اولیاء'' (افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا یوسف متالا صاحب دامت برکاتہم ومدظلہم) میں لکھا ہے:

حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی کا فیصلہ

آج سے کوئی پچیس برس پہلے، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ

(مفتیٔ اعظم ہندوستان) جب یہاں تشریف لائے تھے، تو علماء نے مجھ سے کہا کہ یہاں جھگڑا اچل رہا ہے ٹائم ٹیبل کا - اس وقت بھی گرمی میں روزے تھے، کوئی کہتا ہے کہ سحری ختم ہوتی ہے ڈیڑھ بجے، کوئی کہتا ہے ڈھائی بجے، کوئی کہتا ہے ساڑھے تین بجے - تو کوئی چار سو، پانچ سو علماء اکٹھے ہوئے تھے، صرف علماء، پاورڈ اسٹریٹ مسجد، بریڈفورڈ میں۔ سارے فتاویٰ سن کر حضرت نے فیصلہ لکھوایا مفتی مقبول صاحب سے کہ لکھو کہ احتیاط اس میں ہے کہ ڈیڑھ بجے روزہ شروع کیا جائے، لیکن جو ڈھائی بجے شروع کرتے ہیں، جو ساڑھے تین بجے شروع کرتے ہیں، ان کا روزہ بھی درست، اور ڈیڑھ بجے کے بعد جو فجر کی نماز پڑھتے ہیں، ان کی نماز بھی درست، آگے دلیل لکھوائی، فرمایا کہ اس وجہ سے کہ ہم لوگ تو مقلد ہیں، اور مقلد کا کام فتوے پر عمل کرنا ہے، اور یہ تینوں، ڈیڑھ اور ڈھائی اور ساڑھے تین، تین ٹائم ٹیبل والوں کے پاس تینوں طرح کے فتاویٰ ہیں، تو وہ اپنے فتوے پر عمل کر رہے ہیں کسی کو پوچھ کر کے، تو ان میں سے کسی کو غلط نہ کہا جائے۔ کتنی پیاری بات! کتنا پیارا فتویٰ!

انتشار سے بچانے کا اہتمام

ہم نے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ [مراد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب] کے یہاں ۶۳ء میں سب سے پہلے رمضان گذارا تھا، جب حضرتؒ نے سب سے پہلے دفتر کی مسجد میں پورے مہینہ کا اعتکاف فرمایا تھا، انتیس روزے ہوئے اور رات کو ایک بجے کے قریب دیہاتیوں کا ایک وفد آیا، سب لوگ اپنی اپنی عبادت میں مصروف تھے رات کو، اور یہ بہت سارے لوگ پگھڑ باندھے ہوئے آئے، بھئی کیا ہوا؟ تو کہنے لگے کہ چاند کی خبر لے کر آئے ہیں، شہادت لے کر آئے ہیں، تو حضرت کو اطلاع کی معتکف میں، حضرت

نے فرمایا کہ مفتی محمود صاحبؒ کے پاس بھیجو، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ بھی سہارنپور میں معتکف تھے، مگر دوسری حکیموں والی مسجد میں جہاں مولانا عاقل صاحب اور مولانا سلمان صاحب کا مکان ہے اس کے قریب جہاں حضرت ہمیشہ نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے، اس میں مفتی محمود صاحبؒ معتکف تھے، اس وفد کو وہاں بھیجا، شہادت والوں کو حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے ان سے تحقیق کی، چاند کیسے دیکھا؟ کہاں پر دیکھا؟ کیا وقت تھا؟ سب تحقیق کے بعد حضرتؒ کو اطمینان ہو گیا، تو حضرت نے فرمایا کہ بھئی چلو! اٹھاؤ ہمارا سامان، حضرت اعتکاف میں تھے، اعتکاف سے مفتی صاحب باہر آ گئے، کسی سے یہ نہیں فرمایا کہ بھئی چلو، فیصلہ لکھو کہ میں فیصلہ کرتا ہوں کہ چاند ہو گیا اور کل عید ہے۔

وہاں سے خدام نے آ کر حضرت (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب) کو اطلاع دی کہ مفتی محمود صاحب نے ان سے شہادت لی اور مفتی صاحب تو اپنے معتکف سے گھر میں کمرہ میں چلے گئے، تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا! تو اس کے بعد پھر حضرت بھی کچے گھر آ گئے، مگر وہاں شہر کے کچھ حضرات نے کہا کہ ہمارے پاس تو کوئی آیا نہیں، انہوں نے اس فیصلہ کو نہیں مانا، وہ اَڑ گئے، اور انہوں نے کہا کہ نہیں، ہم تو کل عید کا اعلان نہیں کریں گے، اب ایک ہی شہر سہارنپور میں حضرت شیخ کا دولت کدہ، حضرت کی مسجد اور مظاہر علوم کا دفتر، دنیا کی بڑی مرکزی جگہ، اور وہاں سے گویا ایک فیصلہ ہوا اور شہر والے جو وہاں کے قاضی وغیرہ تھے، پرانے زمانے سے چلے آ رہے تھے، انہوں نے جب یہ فیصلہ کیا کہ کل کو روزہ ہے تو حضرت نے فرمایا مہمانوں سے کہ دفتر کی مسجد میں جہاں اعتکاف تھا، وہاں اشراق کے وقت عید کی نماز ہو گی، مہمان عید کی نماز پڑھ کر جا سکتے ہیں، اور میں ان کے ساتھ عید کی نماز آج

نہیں پڑھوں گا، آئندہ کل کو عید کی نماز پڑھوں گا، جہاں مظاہر علوم کے مدرسہ کی مسجد ہے، تو وہاں دوسرے دن، اگلے دن حضرت نے عید کی نماز پڑھی، کوئی جھگڑا نہیں، عید کی نماز تو آج بھی پڑھی جاسکتی ہے، دوسرے دن بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ (کرامات وکمالات اولیاء: ۱/ ۸تا۱۰)

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:

(۱) دوسرا گروہ دوسرے دن اسی مسجد میں نماز عید ادا کرسکتا ہے، یہ جماعت ثانیہ نہیں، اس لیے کہ دوسرے دن عید کی نماز پڑھنے والوں کے لیے وہ عید کا پہلا ہی دن ہے۔

(۲) یہی حکم معتکفین کے متعلق ہے کہ جس گروہ کے اعلان پر اعتماد ہو اسی کے مطابق اپنا اپنا اعتکاف پورا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد عبدالقیوم راجکوٹی، ۲۶/محرم الحرام ۱۴۳۲ھ معین مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، صدر مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

ثبوت ہلال کی بابت مرکز اسلام پر اتحاد کا جھنڈا گاڑنے کی ناکام کوشش

فلکیاتی حساب کی بنیاد پر "جم غفیر" کی شرط میں کمی بیشی

انگلینڈ میں غیر سعودیہ کی رؤیت کے قائلین کا طریقۂ کار کیا نبوی طریقہ کے خلاف ہے؟

از مرتب: عبدالقیوم راجکوٹی

سوال: (۱) کیا فلکیاتی مفروضہ حسابات کی تھیوری اور میتونی سائکل حساب کے مفروضہ نیومون اور اس کے مفروضہ امکان رؤیت حسابات کو شرعی ثبوت ہلال کے

لیے اثباتاً، نفیاً یا اعانۃً جمِ غفیر کی بنیاد کے طور پر مشروط کیا جاسکتا ہے؟

(۲) چونکہ ہمارے ہاں مقامی طور پر شاذ و نادر ہی رؤیت ہلال ہوتی ہے (جس پر ہمارا چوبیس سالوں سے زیادہ کا رؤیت ہلال کا ریکارڈ بھی موجود ہے، دیکھئے ہماری ویب سائٹ کا ہوم پیج) اس لیے اختلاف مطالع کے عدم اعتبار کی بنیاد پر فتاویٰ کے مطابق سعودیہ سے نبوی طریقہ پر مبنی ثبوتِ ہلال کے اعلان کی بنیاد پر مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کی طرف سے برطانیہ میں شرعی اعلان پر عمل کئے جانے کی سہولت موجود ہے، باوجود اس کے مراکش اور ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کے چاند کی رؤیت وثبوت ہلال کا ایسا فیصلہ جو نبوی طریقہ کے برخلاف مذکورہ فلکیاتی نیومون کے متیونی حساب کے امکان رؤیت کی بنیاد سے مشروط ہوتا ہو! ایسے کسی فیصلہ پر عمل کرنا کروانا کیا شرعاً جائز ہے؟

(۳) جیسے کہ بعض احناف نے حالتِ صحو میں جمِ غفیر کی شہادت کے لیے شرعی اجتہاد کیا تھا، اس اجتہاد کے حوالہ سے ''جس ۲۹ ویں کی شام متیونی فلکی حساب کی نیومون تھیوری کے مطابق امکانِ رؤیت نہ ہو'' تو اس شام کو اس مردود وغیر منصوص حساب کی بنیاد پر ''شرعی منصوص شہادت'' کو مردود قرار دے کر جمِ غفیر کی شہادت سے اسے مشروط قرار دیا جائے تو یہ مبنیٰ جیسے کہ قطعاً غیر شرعی ونصاً مردود ہے کیا ایسے ناجائز مبنیٰ اور اس کی اعانت کو منصوص نبوی طریقہ وشہادت کے لیے شرط قرار دے کر اس دن ''شرعی شہادت کی قبولیت کے بجائے جمِ غفیر کی شہادت کی شرط'' عائد کی جاسکتی ہے؟ جبکہ احناف نے جو ''شرعی اجتہاد'' کیا تھا اس میں فلکیاتی مردود و ناجائز حساب ہرگز اس کا مبنیٰ نہیں تھا بلکہ وہاں تو مبنیٰ ''صحابہ کی منصوص عدالت کے مقابل غیر صحابہ (یا غیر خیر القرون) کی منصوص عدمِ عدالت''

اس کی بنیاد تھی، گویا ان کا یہ اجتہاد اور اس کا مبنی دونوں باتیں منصوص ومشروع تھیں، جبکہ ''فلکی حساب سے امکانِ رؤیت نہ ہوتو اس دن جمِ غفیر کی شہادت ضروری ہونی چاہئے'' والی سوچ میں، صحابہ وغیر صحابہ کے درمیان منصوص عدالت (الصحابة کلهم عدول) کے مثل ''مشروع ومنصوص تفریق'' کا شائبہ تک بھی نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد یعنی ''فلکی امکان رؤیت'' تو مردود من النص (حدیث امی) ہے۔ بینوا و توجروا فقط والسلام

(ملخصاً) (مولوی یعقوب احمد مفتاحی)

ناظم حزب العلماء یوکے ومرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی برطانیہ

مؤرخہ: ۱۸/ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ ۶/نومبر ۲۰۰۹ء شبِ جمعہ

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱-۳) رؤیت ہلال کا مسئلہ ہر دور میں مختلف فیہ رہا ہے اور رہے گا، اس اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کرنا سعیٔ لا حاصل ہے، بالخصوص ایسے ممالک میں جہاں چاند کی رؤیت کا امکان کم ہو اور سوئے قسمتی سے جہاں کے لوگوں میں ذہنی آزادی ہو، ہر شخص اپنی رائے اور عندیہ کا قائل کرنے میں کوشاں ہو، وہاں اختلاف کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں، آپ نے اپنے استفتاء میں مذکورہ بالا دونوں سبب کا خود اعتراف فرمایا ہے، لیجئے آپ ہی کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

''ہمارے یہاں یورپ میں خاص کر برطانیہ میں موسم کے حالات کی وجہ سے پہلے چاند کی رؤیت شاذ ونادر ہی ہوتی ہے''

اس سے پہلے تحریر فرمایا: ''حالات اس نہج تک خراب ہو چکے ہیں کہ خاص کر

جدید مسلم نوجوان نسل کہ جنہیں سائنس کے نام پر عقائد اسلام پر قدم جمائے رکھنے میں بظاہر مشکل پیش آ رہی ہے، خاص کر رؤیت ہلال کے نصوصی مسئلہ میں اس کی بنیاد پر ان کے قدم لڑکھڑاتے نظر آ رہے ہیں، جو یقیناً علمائے اسلام ونصوص کے محافظین کے لیے ایک بہت بڑی تشویش کی بات ہے۔ الخ“

لہذا ایسے سنگین حالات میں رؤیت ہلال کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اتحاد کا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا اور اسے مرکز اسلام پر گاڑنے کی کوشش کرنا بظاہر بے سود ہے۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے چاند کے مسئلہ میں اختلاف کے دس اسباب ذکر فرمائے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں:

چاند کے مسئلہ میں گڑبڑ اور اختلافی صورت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی، قرون مشہود لہا بالخیر خلافت راشدہ کے دور میں بھی یہ رہا، اس اختلاف کو ختم کرنے کی سعی قدرت کا مقابلہ کرنا ہے، اس لیے کہ:

پہلا سبب اختلاف تو یہ ہے کہ چاند کبھی انتیس کو نظر آتا ہے کبھی تیس کو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جب چاند نظر آتا ہے ہر جگہ کا مطلع صاف نہیں رہتا، کہیں صاف کہیں غبار آلود؛ اس لیے کہیں نظر آیا کہیں نظر نہ آیا۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ ہر مہینہ کا چاند برابر نہیں ہوتا، کبھی باریک کبھی موٹا۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ ہر مہینہ کا چاند ایک جگہ سے نظر نہیں آتا، کبھی مغرب سے مائل بہ جنوب، کبھی عین مغرب میں، کبھی مائل بہ شمال نظر آتا ہے۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی سب کی نظر ایک نہیں، کسی کی قوی کسی کی

ضعیف، کوئی بغیر چشمہ کے دیکھے کسی کو چشمہ سے بھی نظر نہ آوے۔

چھٹا سبب یہ ہے کہ گواہی دینے والے سب یکساں نہیں، کسی کی گواہی مقبول کسی کی مردود۔

ساتواں سبب یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس کی بات ماننے کو سب تیار ہو جائیں، جس کا شکوہ آپ کو بھی ہے۔

آٹھواں سبب یہ ہے کہ ہر جگہ رؤیت ہلال کمیٹی موجود نہیں، نہ بنانے کے لیے تیار ہیں، باوجود یہ کہ بار ہا درخواست کی گئی۔

نواں سبب یہ ہے کہ جہاں رؤیت ہلال کمیٹی موجود ہے وہاں بھی اس کے تمام ارکان مسائل شرع کے ماہر و احکام سنت کے پابند نہیں۔

دسواں سبب یہ ہے کہ ہر ریڈیو پر اپنا قبضہ نہیں کہ پابندی عائد کی جاسکے کہ اعلان کیا جائے یا نہ کیا جائے، نہ ہر جگہ عالم کو اس کا مکلّف کیا جاسکتا ہے کہ ریڈیو اسٹیشن پر آکر خود اعلان کرے نہ یہ اس کے قبضہ میں ہے۔

ان اسباب عشرہ کے پیش نظر آپ ہی بتائیں کہ یہ مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ (فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۱۷)

مذکورہ اسباب عشرہ کے ساتھ دو سبب کا اضافہ احقر کی طرف سے بھی کر لیجئے۔

گیارہواں سبب یہ ہے کہ آلات رصدیہ کی خبر کو یقین کا درجہ دینا کہ جب تک حسابی قواعد سے امکان رؤیت نہ ہو ثبوت ہلال ناممکن ہے۔

بارہواں سبب یہ ہے کہ ہر گروہ کا اپنی بات دوسرے پر تھوپنے کی دھن سوار ہونا،

گو اس میں فقہ کے منصوص مسئلہ کی خلاف ورزی لازم آتی ہو۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:

(۱-۳) فلکیاتی حساب شرعی حجت نہیں، نہ اثباتاً نہ نفیاً، لہٰذا ثبوت ہلال کے لیے اس کو مشروط نہیں کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کی صریح عبارتیں آگے آرہی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ رمضان کا چاند دو باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ ثابت ہو جائیگا، یا تو انتیس شعبان کو چاند نظر آجائے گا، یا پھر تیس دن پورے کئے جائیں گے اور اس پر علمائے امت کا اجماع ہے، رمضان کے علاوہ باقی اور مہینوں کے چاند کے ثبوت کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ ان باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ ثابت ہو جائے؛ البتہ رمضان اور دیگر مہینوں میں ابر وغبار وغیرہ کے روز اس بارے میں فرق ہے کہ چاند کی رؤیت میں کتنے آدمیوں کا قول مانا جائے؟ جس کی تفصیل یہ ہے: رمضان کا چاند ابر وغیرہ کے دن ایک آدمی کی گواہی سے ثابت ہو جاتا ہے جیسا کہ متون وشروح میں اس کا بیان ہے، اور اگر آسمان میں ابر نہ ہو یعنی مطلع صاف ہو تو ایسی بڑی جماعت کی گواہی قبول ہوگی جن کے خبر دینے سے یقین ہو جائے یعنی اس خبر سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے، عیدالفطر کے چاند میں آسمان پر ابر یا غبار وغیرہ کی موجودگی میں گواہوں کے عادل ہونے کی شرط کے ساتھ شہادتِ اموالِ نصاب (یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں) اور لفظ اشھد (میں گواہی دیتا ہوں) اور حد قذف سے بچا ہوا ہونا بھی شرط ہے، اور اگر آسمان صاف ہو تو جب تک ایک جماعت گواہی نہ دے تب تک گواہی مقبول نہ ہوگی جیسا کہ رمضان کے چاند کا حکم ہے۔ (مأخوذ از عمدۃ الفقہ ۱۵۳ تا ۱۶۱)

حنفی فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ انتیس شعبان کا چاند ہو یا انتیس رمضان کا، ابر کے روز ثبوت رمضان میں ایک عادل آدمی کی شہادت اور عید الفطر کے لیے دو عادل کی شہادت کافی ہے، جم غفیر کی شرط نہیں۔ فقہاء کی عبارتیں حسب ذیل ہیں:

ہدایہ میں ہے: واذا كان بالسماء علة قبل الامام شهادة الواحد العدل في رؤية الهلال رجلاً كان او امرأة حراً كان او عبداً لانه امر ديني فيشبه رواية الاخبار. (هدايه اولين ۲۱۵)

بدائع میں ہے: وان كانت السماء متغيمة تقبل شهادة الواحد بلا خلاف بين اصحابنا. (بدائع الصنائع ۲/ ۲۲۱)

کنز میں ہے: وقبل بعلة خبر عدل ولوقناًاوانثى لرمضان وحرين اوحروحريتين للفطر. (كنز الدقائق بهامش البحر الرائق ۲/ ۲۸٦)

درمختار میں ہے: وقبل بلا دعوىٰ و بلا لفظ اشهد و بلا حكم و مجلس قضاء لانه خبر لا شهادة للصوم مع علة كغيم و غبار خبر عدل. الخ(در مختار مع رد المحتار ۳/ ۳۵۲)

مبسوط میں ہے: ولوشهدرجل واحدبرؤية هلال رمضان وبالسماء علة قبلت شهادته اذا كان عدداً اھ. (المبسوط ۲/۱۵۳)

المحیط البرہانی میں ہے: الواحد اذا شهد بهلال رمضان فان كانت السماء متغيمة تقبل شهادة الواحد اذا كان مسلماً اھ. (المحيط البرهانى ۳/۳۳۸)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ان كان بالسماء علة فشهادة الواحد علىٰ

ھلال رمضان مقبولة اھ. (الفتاویٰ الھندیه ١/١٩٧)

فتاویٰ قاضی خان میں ہے: شھادة الواحد علیٰ ھلال رمضان مقبولة اھ.

(فتاویٰ قاضی خان بھامش الھندیه١/ ١٩٦)

شرح الوقایہ میں ہے: وقبل بلا دعویٰ ولفظ اشھد للصوم مع غیم خبر فرد.اھ.(شرح الوقایه١/ ٢٤٦)

تبیین الحقائق میں ہے: ای اذا کـان بـالسـمـاء عـلة یقبل فـی ھلال رمضان خبر واحد عدل.اھ.(تبیین الحقائق١/٣١٩)

الـواحد اذا شھد برؤیة ھلال رمضان فان کانت السماء متغیمة وفی الھدایة او غبار او نحوه یقبل شھادة الواحد.(فتاویٰ تاتار خانیه ٣/٣٥٨)

فقہاء کی مذکورہ تصریح کے خلاف انتیسویں کی شام کو فلکی حساب سے امکان رؤیت نہ ہو، ایسے موقع پر ثبوت ہلال کے لیے فلکی حساب کو بنیاد بنا کر جم غفیر کو شرط قرار دینا درست نہیں؛ بلکہ اس طرح فقہ کے مطلق مسئلہ کو مقید کرنا شان تقلید کے بھی خلاف ہے، ہم مقلد ہیں، حنفی فقہاء نے اپنی معتبر کتب میں جو لکھا ہے اس کا اتباع ضروری ہے، یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں کہ فقہاء کی کتابوں میں یہ عادت رہی ہے کہ وہ قیود وشروط وغیرہ اس بات پر تنبیہ کرنے لیے ذکر فرماتے ہیں کہ جہاں یہ قید وشرط نہ پائی جائے وہ حکم سے خارج ہے، اور مسکوت کا حکم منطوق کے برخلاف ہے، اور یہ بات فقہاء کے درمیان بلا نکیر شائع وذائع ہے، اور اسی وجہ سے کوئی ایسا آدمی نہیں مل سکتا جس نے اس کے خلاف تصریح کی ہو۔

وکـذا یقال فی مفھوم الروایات،فان العلماء جرت عادتھم فی کتبھم،

علیٰ انهم یذکرون القیود و الشروط و نحوها تنبیهاً علیٰ اخراج ما لیس فیه ذلك القید و نحوه،و ان حکمه مخالف لحکم المنطوق و هذا مما شاع و ذاع بینهم بلا نکیر؛ و لذا لم یر من صرح بخلافه. (شرح عقود رسم المفتی ۱۷۴)

رسم المفتی فی زماننا من اصحابنا اذا استفتی عن مسئلة ان کانت مرویة عن اصحابنا فی الروایات الظاهرة،بلا خلاف بینهم،فانه یمیل الیهم، و یفتی بقولهم،ولا یخالفهم برأیه،وان کان مجتهداً متقناً؛ لان الظاهر ان یکون الحق مع اصحابنا،ولا یعدوهم،و اجتهاده لا یبلغ اجتهادهم،ولا ینظر الیٰ قول من خالفهم،ولا تقبل حجته ایضاً،لانهم عرفوا الأدلة ومیزوا بین ما صح و ثبت وبین ضده.(شرح عقود رسم المفتی ۱۱۸،۱۱۹)

جم غفیر کو شرط قرار دینے کی جو وجہ آپ نے تحریر فرمائی ''احناف نے جو شرعی اجتہاد کیا تھا اس میں فلکیاتی مردود و نا جائز حساب ہرگز اس کا مبنی نہیں تھا بلکہ وہاں تو مبنی صحابہ کی منصوص عدالت مقابل غیر صحابہ (یا غیر خیر القرون) کی منصوص عدم عدالت''اس کی بنیاد تھی۔ انتهی بلفظه

فی الجملہ صحیح ہے لیکن دور حاضر میں مجتہدین جیسے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لہٰذا اس مسئلہ کے حل کا جو مبنی (اجتہاد) تھا، دور حاضر میں مفقود ہے،اور اگر بالفرض فقہاء کی تصریح کے خلاف آپ کی یہ بات تسلیم کر کے انتیسویں کے چاند کے ثبوت کے لیے جم غفیر کی شرط لگا دی جائے تو اسی مسئلہ کے دوسرے پہلو میں بھی ترمیم کا سوال اُٹھ سکتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے: انتیسویں کے روز اگر آسمان پر کوئی علت نہ ہو (یعنی مطلع صاف ہو)

تو چاند کے ثبوت کے لیے جم غفیر شرط ہے، جو لوگ فلکی حساب کے دلدادہ اور شریعت کو موجودہ ایجادات کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں، جس کا آپ نے بھی شکوہ کیا ہے، وہ کہیں گے کہ اس مسئلہ میں جم غفیر کی شرط فقہاء نے غلبۂ ظن حاصل کرنے کی خاطر لگائی ہے، فقہاء کے دور میں موجودہ وسائل اور ایجادات نہیں تھے، اس لیے غلبۂ ظن حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جم غفیر کی شرط لگائی تھی، موجودہ ترقی یافتہ سائنس سے غلبۂ ظن نہیں، بلکہ یقین یا عین الیقین حاصل ہو جاتا ہے، لہذا جم غفیر کی اب ضرورت نہیں، یہ صرف احتمال نہیں؛ بلکہ واقعہ ہے کہ سائنس کی بات پر اس قدر لوگوں نے اذعان و یقین کر رکھا ہے کہ اس کی بنیاد پر سر کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے چاند اور رؤیت عامہ کا انکار کر دیا ہے، انگلینڈ سے آیا ہوا استفتاء - جو ایک ذمہ دار عالم نے یہاں دار الافتاء میں بھیجا تھا - کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

’’حضرت آج کل رؤیت کا لفظ بھی کثرت وشدت سے یہاں انگلینڈ میں بیان کیا جا رہا ہے، میں نے اس کا مطلب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ افق پر فلکی حساب سے رؤیت ہلال کا امکان ہونا ہے، اگر ایسا امکان نہیں ہے تو انتیسویں کو بھی رؤیت نہیں ہو سکتی، اگر کوئی شخص اس صورت میں رؤیت کا دعوی کرتا ہے تو وہ خاطی یا کاذب اور موہوم و مشکوک اور متہم سمجھا جائے گا، بعض حضرات تو اس امکان اور عدم امکان کو اتنا قطعی و یقینی اور ضروری سمجھتے ہیں کہ انہوں نے قسم کھالی کہ اگر عدم امکان کی صورت میں پورا شہر بھی رؤیت کا دعوی کرے تو ہم نہیں مان سکتے۔ انتهى بلفظه.‘‘

اس ہٹ دھرمی کو ملاحظہ کیجئے اور دور ترقی کے دلدادہ پر ماتم کیجئے، خلاصہ یہ ہے

کہ جس صورت میں جم غفیر شرط نہیں ہے، وہاں جدید اجتہاد کی روشنی میں یا فلکی حساب کی بنیاد پر اگر مشروط قرار دیا گیا تو جدید اور ترقی یافتہ ذہن کے حاملین کی طرف سے جس صورت میں جم غفیر مشروط ہے، وہاں سے اس شرط کو غیر ضروری ہونے کا مطالبہ بھی ہوسکتا ہے، اس طرح کے شبہات و مطالبات سے اگر فقہی اجتہادی مسائل میں قطع و برید کی گئی تو ذخیرۂ فقہ کی خیر نہیں، فقہ پر سے اعتماد ہی اٹھ جائے گا، احناف نے انتیسویں کے چاند کے ثبوت کے لیے جم غفیر کی شرط لگائی، اس کا مبنی صرف اور صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدالت نہیں جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں؛ بلکہ یہ اجتہاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے مؤید ہے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتیسویں کو ایک آدمی کی شہادت پر ثبوت ہلال کا فیصلہ فرمانا) اس نوع کی احادیث یوم غیم پر محمول ہیں؛ لہذا یہ اجتہاد مؤید بالنص ہے، اس مسئلہ کا مبنی ''نرا اجتہاد احناف'' کہنا درست نہیں، اگر چہ مقلد کے لیے ''مجتہد کا نرا اجتہاد'' اور کتب فقہ میں لکھے ہوئے مسائل حجت ہیں، ہماری معلومات کے مطابق وہ مؤید بالنص ہوں یا نہ ہوں۔ مقلد کی تعریف ہے:

اخذ بقول الغیر بغیر معرفۃ دلیله. (شرح عقود رسم المفتی ۱۳۲)

مذکورہ مسئلہ کے مؤید بالنص ہونے کی دلیل حسبِ ذیل عبارت ہے:

محدث ناقد حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے ''ترجمۃ الباب'' باندھا ''باب افتراض الصوم بشهادة مسلم واحد عدل او مستور اذا كان بالسماء علة'' اس کے ذیل میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی ''عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال ترأيا الناس الهلال فاخبرت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم انی رأيته فصام، وامر الناس بصيامه. رواه ابو داؤد و الدارمی قال ميرك نقلاً عن التصحيح: ورواه الحاكم

و قال: علیٰ شرط مسلم،ورواہ البیھقی.اھ. وصحح ابن حبان،و قال النووی:اسنادہ علی شرط مسلم.(مرقاۃ۲/ ۵۰۷)

قال المؤلف دلالۃ الحدیث الاول من فعلہ ﷺ ان شھادۃ المسلم الواحد العدل تکفی لایجاب الصوم ظاھرۃ،و کون ابن عمر رضی اللہ عنہ عدلاً معلوماً لہ ﷺ غیر خفی،و التقیید بعلۃ فی السماء لیس مذکوراً فی الحدیث لکن الدلیل علیہ ما ذکرہ صاحب الھدایۃ و نصہ: واذا لم تکن با لسماء علۃ لم تقبل الشھادۃ حتی یراہ جمع کثیر یقع العلم بخبرھم لا ن التفرد بالرؤیۃ فی مثل ھذہ الحالۃ یوھم الغلط فیجب التوقف فیہ حتی یکون جمعاً کثیراً بخلاف ما اذا کان بالسماء علۃ لانہ قد ینشق الغیم عن موضع القمر فیتفق للبعض النظر اھ. (۱/۱۹۵،۱۹۶)

ذلک ان تستدل علیہ بما رواہ ابو داؤد وسکت عنہ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ذکر النبی ﷺ فیہ (ای فی حدیث ایوب رضی اللہ عنہ المذکور فی السنن قبل)قال: وفطرکم یوم تفطرون،و اضحاکم یوم تضحون،وکل عرفۃ موقف، وکل منی منحر،وکل فجاج مکۃ منحر،وکل جمع موقف.اھ. (۱/۳۲۵)

وفی سنن الترمذی:قال ﷺ "الصوم یوم تصومون، والفطر یوم تفطرون،و الاضحی یوم تضحون" وفیہ ایضاً: غریب حسن، وفسر بعض اھل العلم ھذا الحدیث فقال: ان ما معنی ھذا الصوم و الفطر مع الجماعۃ و عظم الناس.اھ.۔(۱/۹۳)

وتقريره انه عليه الصلاة و السلام اضاف الصوم و الفطر والاضحية الى الجماعة فى قوله "تصومون و تفطرون و تضحون" فلا بد فى اصل الحكم من الجماعة الكثيرة او جميع المسلمين الموجودين فى بلدة مثلاً فى هذه الاحكام الا اذا عرض عارض ككون السماء مغيمة مثلاً فله حكم آخر ثابت بالشرع كحديث المتن. (اعلاء السنن ۹/۱۰۹ تا ۱۱۰)

ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ فرماتے ہیں: وقبول خبر الواحد فى الصوم محمول على ما اذا كان فى السماء علة. (بذل المجهود ۱۱/۱۴۱)

فلکیاتی حساب ثبوت ہلال میں حجت نہیں اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، اگر اعانۃً جم غفیر کی بنیاد کے طور پر فلکیاتی حساب کو مشروط کہا جائے تو اس کا حجت ماننا لازم آتا ہے جو درست نہیں، فقہاء کی عبارات حسب ذیل ہیں:

چوتھی صدی کے مشہور حنفی فقیہ مفسر اور اصولی عالم امام ابو بکر جصاص رازیؒ (م ۳۷۰ھ) اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد اختلف فى معنى قول النبي ﷺ فان غم عليكم فاقدروا له فقال القائلون اراد به اعتبار منازل القمر فان كان فى موضع القمر لو لم يحل دونه سحاب وقترة وروى يحكم بحكم الرؤية فى الصوم والافطار وان كان على غير ذلك لم يحكم له بحكم الرؤية وقال آخرون فعدوا شعبان ثلاثين يوما اما التاويل الاول فساقط الاعتبار لامحالة لايجابه الرجوع الى قول المنجمين

ومن تعاطى معرفة منازل القمر ومواضعه و هو خلاف قول الله تعا لى ﴿يسئلونك عن الاهلّة قل هى مواقيت للناس﴾فعلق الحكم فيه بروية الأهلة ولما كانت هذه عبادة تلزم الكافة لم يجزان يكون الحكم فيه متعلقا بمالا يعرفه الّا خواص من الناس ممن عسى لا يسكن الى قولهم والتاويل الثانى هو الصحيح وهو قول عامة الفقهاء وابن عمر راوى الخبر وقد ذكر عنه فى الحديث انه لم يكن يا خذ بهذا الحساب.(احكام القران ۱ / ۲۰۱، دارالکتب العربی بیروت)

پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ شمس الائمۃ الحلوائیؒ (م ۴۴۸ھ) فرماتے ہیں:

من قال بانه يرجع الى قول اهل الحساب عند الاشتباه بعيد واستدل بحديث من اتى كاهنا (الى قوله) الشرط عندنا فى وجوب الصوم والافطار رؤية الهلال ولا يوخذ فيه بقول المنجمين ثم رقم لمجدالائمة الترجمانى وقال فقد اتفق اصحاب ابى حنيفة والشافعى انه لا اعتماد على قول المنجمين فى هذا.(شرح منظومه ابن وهبان ۱۲۹مطبوعة الوقف المدنى ديوبند)

آٹھویں صدی کے مشہور فقیہ علاّمہ عالم ابن علاء انصاری اندرپتی دہلویؒ (م ۷۸۶ھ) فرماتے ہیں:

ذكر فى التهذيب فى كتاب الصوم: يجب صوم رمضان برؤية الهلال او باستكمال شعبان ثلاثين،ولا يجوز تقليد المنجم فى حسابه لا فى الصوم ولا فى الافطار وهل للمنجم ان يعمل بحساب نفسه؟ففيه وجهان احدهما انه يجوز والثانى لا يجوز۔(الفتاى التاتارخانيه۲/۳۵۷مطبوعه مجلس دائرة

المعارف عثمانیہ حیدرآباد)

نویں صدی کے مشہور محدث علامہ ابن حجر عسقلانی شافعیؒ (م۸۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسييرها،ولم يكونوايعرفون من ذلك ايضاً إلا النزراليسير،فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم فى معاناة حساب التسيير واستمر الحكم فى الصوم ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك،بل ظاهرالسياق يشعر بنفى تعليق الحكم بالحساب اصلاً،ويوضحه قوله فى الحديث الماضى(فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين)ولم يقل "فسئلوااهل الحساب" ولحكمة فيه كون العدد عند الاغماء يستوى فيه المكلفون فيرتفع الاختلاف والنزاع عنهم،وقد ذهب قوم الى الرجوع الى اهل التسيير فى ذلك وهم الروافض،ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم،قال الباجى:واجماع السلف الصالح حجة عليهم،وقال ابن بزيزة:وهو مذهب باطل فقد نهت الشريعة عن الخوض فى علم النجوم لانها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولاظنّ غالب،مع انه لو ارتبط الامر بها لضاق اذ لا يعرفها الاالقليل.(فتح البارى ١٢٧/٤ مطبوعه دار المعرفة بيروت)

دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم مصریؒ (م۹۷۰ھ) اپنی مشہور کتاب "النهر الفائق" میں تحریر فرماتے ہیں:

ان صوم رمضان لا يلزمه الا باحد هذين فلا يلزم بقول المؤقتين انه

یـکـون فـی السماء لیلة کذا وان کانوا عدولا فی الصحیح کما فی الایضاح، قال مجد الائمة (الترجمانی)وعلیه اتفق اصحاب ابی حنیفة و الشافعی الخ.

(النهر الفائق۲/۱۰مطبوعه دار الکتب العلمیة بیروت)

لاعبرة بـقـول المنجمین قال فی غایة البیان و من قال یرجع فیه الیٰ قـولهم فقد خالف الشرع لانه روی عنه ﷺ انـه قـال من اتی کاهنا او منجما فصدقه بما قال فهو کافر بما انزل علی محمد (البحر الرائق۲/ ۲۸۴،دار المعرفه بیروت)

گیارہویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ علامہ عبدالرحمٰن بن محمدؒ (م ۱۰۷۸ھ)- جو داماد کے لقب سے مشہور ہیں- تحریر فرماتے ہیں:

وفـی القهستانی ان ما قال اهل التنجیم غیر معتبر فمن قال انه یرجع فـی ذلك الـیٰ قولهم فقد خالف الشرع (مـجـمـع الانهـر فی شرح ملتقی الابحر۱/۲۳۷، مطبوعه دار احیاء التراث بیروت)

بعینہٖ یہی عبارت ''جامع الرموز:۱/ ۳۵۶ مطبوعہ ایچ ایم کراچی'' میں ہے۔

بارہویں صدی کے مشہور عالم ربانی اسرار شریعت کے ماہر حضرت شاہ ولی صاحب محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) رقمطراز ہیں:

مبـنـی الشـرائـع عـلـی الامـور الظاهر ة عـنـد الامییـن دون التعمق والـمحاسبات النجومیة، بل الشریعة واردة باخمال ذکرها وهو قوله ﷺ: انا امة امیة لا نکتب ولا نحسب.(حجة الله البالغة۲/ ۵۱ ،مطبوعة ادارة الطباعة المنیریة دمشق)

تیرہویں صدی کے مشہور فقیہ عالم خاتم الفقہاء علامہ سید محمد امین ابن عابدین

شامیؒ (م۱۲۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

(لا عبرة بقول الموقتين) اى فى وجوب الصوم على الناس بل فى المعراج لا يعتبر قولهم بالاجماع. (رد المحتار على الدر المختار ۲/ ۱۰۰ مطبوعه كوئٹة)

علامہ شامیؒ نے ایک رسالہ "تنبيه الغافل و الوسنان على احكام هلال رمضان" تحریر فرمایا ہے، اس میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، جس میں مذاہب اربعہ کی معتبر کتابوں کی عبارتوں سے اجماع ثابت کیا ہے کہ رؤیت ہلال میں اہل حساب کا قول معتبر نہیں، ملاحظہ کیجئے:

الفصل الثالث فى بيان حكم قول علماء النجوم و الحساب: فنقول قد صرح علماؤنا و غيرهم بوجوب التماس الهلال ليلة الثلاثين من شعبان فان رأوه صاموا والا اكملوا العدة فاعتبروا الرؤية او اكمال العدة اتباعا للاحاديث الآمرة بذلك دون الحساب والتنجم وقد اتفقت عبارات المتون وغيرها من كتب علمائنا الحنفية على قولهم يثبت رمضان برؤية هلاله و بعد شعبان ثلاثين (الى قوله) فلا يلزم بقول الموقتين انه يكون فى السماء ليلة كذا وان كانوا عدولا فى الصحيح كما فى الايضاح قال مجد الأئمة وعليه اتفق اصحاب ابى حنيفة الا النادر و الشافعى الخ. (رسائل ابن عابدين ۱/ ۲۴۴، ۲۴۵)

آگے مالکیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

واما عند المالكية ففى مختصر الشيخ خليل انه لايثبت بقول المنجم الخ.

اسی صفحہ پر شافعیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

(واما عند الشافعية) ففي الانوار للارد بيلي ولا يجب بمعرفة منازل القمر لا على العارف بها ولا غيره انتهى. وفي ينابيع الاحكام ولا عبرة بقول المنجم مطلقا فلا يصوم وان علم بالحساب انه اهل على الاظهر اذ تحكيمه قبيح شرعاً. (ايضاً ۱/ ۲٤۷)

حنابلہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ففي الغاية وشرحهامن باب صلاة الكسوف ولا عبرة بقول المنجمين في كسوف ولا غيره مما يخبرو ن به ولا يجوز العمل به لانه من الرجم بالغيب فلا يجوز تصديقهم في شئ من المغيبات انتهى. (ايضاً ۱/ ۲٤۹)

چودہویں صدی میں سائنس نے خوب ترقی کی۔ چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں نت نئی تحقیقات پیش کیں، قرآن اور احادیث کے بہت سے وہ واقعات اور احوال- جو سابق دور میں سمجھ سے بالاتر تھے- جدید سائنس کی تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان کردیا۔ بایں ہمہ چودہویں صدی کے علماء ومفتیان کرام نے بھی رؤیت ہلال کا دارومدار شرعی ثبوت پر رکھا، حساب وآلات رصدیہ پر نہیں.

ذیل میں چودہویں صدی کے علماء کرام ومفتیان کرام کی کتابوں کے حوالے پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) فیض الباری ۳/ ۱۵۲، مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل (۲) مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنویؒ جلد اول کتاب الصوم ۲۸۰-۲۸۱، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ (۳) مجموعہ رسائل لکھنوی ۲/ ۵ (۴) فتاویٰ دارالعلوم مدلل ٦/ ۳٦۷ تا ۳۷۰، مطبوعہ دارالعلوم دیوبند (۵) عزیز الفتاویٰ ۱/ ۳۸۳، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

(۶) فتاویٰ شیخ الاسلام ۵۶، ۵۷، مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند (۷) رؤیت ہلال ۳۰، ۳۲ (۸) احکام القرآن ۱/ ۱۹۵، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی (۹) معارف السنن ۶/ ۷ (۱۰) فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۰/ ۱۱۸ (۱۱) فتاویٰ رحیمیہ ۷/ ۳۷۷، مطبوعہ رحیمیہ راندیر (۱۲) آپ کے مسائل اوران کا حل ۳/ ۲۶۱، مطبوعہ نعیمیہ بک ڈپو دیوبند (۱۳) احسن الفتاویٰ ۴/ ۴۹۲، مطبوعہ دارالاشاعت دہلی۔

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون. (ترجمہ: اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو) (سورۂ نحل)۔ اسی وجہ سے آداب استفتاء میں لکھا ہے: ''جو مسئلہ معلوم نہ ہو وہ مسئلہ پوچھنا چاہئے، اس ذہن یا طریقہ سے استفتاء پیش کرنا کہ اس کا حکم وہی بتلایا جائے جو مستفتی کا منشاء ہے، درست نہیں''۔ یہ بھی لکھا ہے کہ: ''مستفتی کے ذہن میں پیش آمدہ سوال کا کوئی جواب ہو تو بھی استفتاء میں ظاہر نہ کرے''۔

ينبغي للمستفتي أن يتأدب مع المفتي و يبجل في خطابه و جوابه (الى ان قال) ولا يقل اذا اجابه هكذا "قلت انا" او "كذا وقع لي". (شرح عقود رسم المفتي، فصل في آداب المستفتي و صفته و احكامه ۳۵)

استفتاء میں مذکورہ امور کی رعایت نہیں کی گئی، جو لوگ بلا دلیل شرعی سعودیہ کی رؤیت کے قائل نہیں، ان کے بارے میں آپ نے تحریر فرمایا ''باوجود اسکے مراکش اور ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کے چاند کی رؤیت وثبوت ہلال کا ایسا فیصلہ جو نبوی طریقہ کے برخلاف مذکورہ فلکیاتی نیومون کے متوفی حساب کے امکان رؤیت کی بنیاد پر مشروط ہوتا ہے! ایسا کسی کے فیصلہ پر عمل کرنا اور کروانا شرعاً جائز ہے''؟ انتهى بلفظه۔

نقل کردہ عبارت میں مفتی کا کام خود مستفتی نے انجام دے دیا ہے، یعنی مراکش اور ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کے فیصلہ پر ”نبوی طریقہ کے خلاف“ کا حکم آپ نے خود لگا دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے جو فیصلہ نبوی طریقہ کے خلاف ہو اس پر عمل کرنا یا کروانا جائز نہیں، خود مستفتی بھی اس جواب سے واقف ہے۔ لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب واقعۃً وہ فیصلہ نبوی طریقہ کے خلاف ہو، جو لوگ مراکش یا ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کی رؤیت کے قائل ہیں، کیا وہ حضرات فیما بینہ وبین اللہ اپنے یہاں ثبوت ہلال کے طریقۂ کار کو نبوی طریقہ کے برخلاف سمجھتے ہیں؟ یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ اگر جواب اثبات میں ہو جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو ماضی میں مراکش کو بنیاد بنا کر ۲۰/سال عیدین ورمضان کے ثبوت پر جو عمل کیا گیا تھا، اس کا کیا حکم ہوگا؟ فافھم وتدبر. اسکا فیصلہ سوچ سمجھ کر خود ہی کرلیں۔

اس سال ۱۴۳۱ھ کے رمضان میں حزب العلماء کے فیصلہ ”ایک روزہ کی قضاء“ پر عوام کا جو ردعمل ہوا کہ ہمارا روزہ قضا نہ کرنے کا وبال ان لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اس کی قضا سے منع کیا ہے جس کا ذکر آپ کے دوسرے استفتاء میں ہے، وہ بھی مدنظر رکھیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد عبد القیوم راجکوٹی، ۱۲/صفر المظفر ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مسائل اعتکاف

اعتکاف کے چند مسائل:

(۱) پانی گرم ہونے تک ٹھہرنا (۲) مسجد کے باہر ٹھہرنا
(۳) ناپاک کپڑا دھونا (۴) غسل جمعہ کے لیے نکلنا

سوال: (۱) رمضان میں اعتکاف کی حالت میں نہانے کی حاجت ہوگئی، ٹھنڈے پانی سے نہانے میں طبیعت خراب ہونے کا اندیشہ ہے، تو معتکف مسجد کے صحن میں پانی گرم کرنے تک ٹھہر سکتا ہے؟

(۲) معتکف نے مسجد سے باہر کسی سے بات کرلی، یا سلام کا جواب دیا، تو کیا اعتکاف فاسد ہوگیا؟

(۳) معتکف اپنے کپڑے دھو سکتا ہے یا نہیں؟

(۴) معتکف جمعہ کا غسل کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) دوسرے کو پانی گرم کرنے کے لیے کہہ دے اور وہاں تک خود تیمّم کر کے مسجد میں ٹھہرا رہے۔

(۲) چلتے چلتے بات کرلی تو اعتکاف نہیں ٹوٹا، اگر اس غرض سے ٹھہر گیا تو ٹوٹ جاوے گا۔

(۳) کپڑا ناپاک ہوگیا ہو تو دھو کر پاک کرسکتا ہے۔

(۴) غسل جمعہ کے لیے مسجد سے باہر نہیں نکل سکتا؛ البتہ جمعہ سے قبل ضرورتِ شرعیہ وطبعیہ کے لیے باہر گیا، تو واپسی میں غسل جمعہ کرسکتا ہے، جلدی غسل سے فارغ

ہوکر مسجد آجائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

بیڑی پینے سے روکنے پر اعتکاف چھوڑ دیا گنہگار کون ہوگا؟

سوال: موضع پونا، ہمارے محلّہ کی مسجد میں ماہِ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں بہت سے حضرات اعتکاف کیا کرتے تھے، اس درمیان مسجد کے امام صاحب نے کہا کہ اعتکاف کرنے والے بیت الخلاء وغیرہ جگہوں میں جاکر بیڑی سگریٹ وغیرہ ہرگز نہیں پی سکتے، جس کے نتیجہ میں جماعت والوں نے دوسال سے اعتکاف کرنا ہی چھوڑ دیا، تو بیڑی وغیرہ پینے میں شرعی کیا حکم ہے؟ اور اعتکاف ترک کردینے سے گنہگار کون ہوں گے؟ جس کی رہبری فرماکر کرم فرمائیں، بڑی عنایت ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیڑی بلاضرورت پینا مکروہ ہے، بضرورت درست ہے، اور کراہت بھی بدبو کی وجہ سے ہے، اور درجۂ حرام میں نہیں ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۱۲/۵) یہ تو بیڑی پینے کا مطلق حکم ہوا، چاہے معتکف ہو یا غیر معتکف، اب اگر کوئی معتکف آدمی بیڑی پینے کا عادی ہے تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اعتکاف کرنے سے پہلے ہی بیڑی چھوڑنے کی کوشش کرے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو تعداد اور مقدار کم کردے، اور اگر کچھ پینی ہی پڑے تو جس وقت استنجاء اور طہارت کے لیے نکلے، اس وقت بیڑی کی حاجت پوری کرے، خاص بیڑی پینے کے لیے نہ نکلے؛ مگر جب مجبور ہوجائے اور طبیعت خراب ہونے کا خوف ہو تو اس کے لیے بھی نکل سکتا ہے، کہ ایسی اضطراری حالت کے وقت یہ طبعی ضرورت میں شمار ہوگا، اور مخل ومفسد اعتکاف نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲۰۲/۵)

معلوم ہوا کہ اعتکاف کرنے والا مذکورہ بالا طریقہ سے بیڑی پی سکتا ہے، اس لیے امام صاحب نے مطلق ممانعت کا جو حکم بتلایا وہ درست نہیں ہے، اور اسی کے نتیجہ میں اس مسجد میں عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کی سنت جو سنتِ کفایہ ہے چھوڑی جارہی ہے، جس کا ذریعہ امام صاحب بنے، اس لیے وہ اس گناہ کا ذریعہ بننے پر گنہگار ہوئے، اور سنتِ کفایہ چھوڑنے کا جو گناہ ہے اس میں امام صاحب کے ساتھ تمام محلّہ والے بھی داخل ہیں، آئندہ کے لیے توبہ واستغفار کر کے دوبارہ اس سنت کو جاری کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

معتکف کا غسل کے لیے نکلنا

سوال: (۱) اعتکاف کی حالت میں غسل کرنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ یہ جو مشہور ہے کہ استنجاء کے بہانہ سے جا کر غسل کر کے آئے، درست ہے یا نہیں؟

معتکف کا نمازِ جنازہ کے لیے نکلنا

(۲) یہ نیت کر کے اعتکاف کرے کہ اگر کوئی رشتہ دار کا انتقال ہو تو میں جنازہ میں شریک ہوں گا، وہ رشتہ دار اسی گاؤں میں یا دوسری جگہ رہتا ہو تو جا سکتا ہے کہ نہیں؟

معتکف کا بیڑی پینے کے لیے نکلنا

(۳) بیڑی، سگریٹ پینے کے لیے جانے کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) حالتِ اعتکاف میں فرض غسل کے لیے نکل سکتا ہے، ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے کے واسطے مسجد سے باہر جانا جائز نہیں، اگر چلا گیا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا، غسل جمعہ کرنے کے لیے بھی معتکف کو مسجد سے باہر جانا جائز نہیں؛ البتہ غسل

جمعہ سے قبل ضرورت طبعیہ، مثلاً: پیشاب، پاخانہ کے لیے باہر گیا تو واپسی میں غسل کر سکتا ہے؛ لیکن جلدی غسل سے فارغ ہو کر مسجد میں آجائے۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید۱۰/۲۸۱)

(۲) اس نیت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور جنازہ میں شرکت کے لیے جائیگا، تو اعتکاف فاسد ہو جاوے گا؛ البتہ نذر کے اعتکاف میں بوقت نذر یہ استثناء کیا ہو تو معتبر ہوگا۔

لو شرط وقت النذر أن يخرج لعيادة مريض وصلاة جنازة وحضور مجلس علم جاز. (درمختار مع رد الحتار ۲/۴۴۸)

(۳) اگر مجبور ہو جائے اور نہیں پینے کی صورت میں طبیعت خراب ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو نکل سکتا ہے؛ ورنہ نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید۱۰/۲۳۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بقعۂ مدخولہ میں اعتکاف

سوال: مسجد (جماعت خانہ) کی دیوار منہدم کر کے وسیع کر دی گئی تو بقعۂ مدخولہ کا کیا حکم ہے؟ آیا وہاں اعتکاف درست ہے یا نہ؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

توسیع کا مقصد ظاہر ہے کہ رقبۂ مسجد میں اضافہ کرنا ہے، گویا بقعۂ مدخولہ کو مسجد میں شامل کرنے کی نیت موجود ہے، اور جب بقعۂ مدخولہ بھی حصۂ مسجد بن گیا تو اس میں اعتکاف درست ہونے میں کیا تردد ہو سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

کتاب النکاح

کم سے کم مہر

سوال: کم سے کم مہر باعتبارِ چاندی کے کتنے تولہ چاندی سے رائج ہوتی ہے؟
اوراس زمانہ میں ہندوستان کے رائج سکہ کے حساب سے مہر کتنے روپئے ہوتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

عورت کے مہر کی کم سے کم مقدار جو حنفیہ کے نزدیک دس درہم ہے، دوتولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے۔ (جواہر الفقہ ۱/۴۲۳،۴۲۴)

جدید وزن کے اعتبار سے احتیاطی طور پر بتیس گرام ہوگی، چونکہ چاندی کے بھاؤ میں روزانہ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اس لیے جس روز مہر مقرر کیا جارہا ہے اس روز بازار سے بھاؤ معلوم کر کے بتیس گرام چاندی کا جو بھاؤ ہو وہ مقرر فرمالیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

دوسرا نکاح کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا

سوال: (۱) کیا نکاح ثانی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت لینا ضروری ہے؟

(۲) اگر بیوی دوسرا نکاح نہ کرنے پر بضد ہو تو شوہر کیا کرے؟

(۳) کیا بغیر اجازت پہلی بیوی کے دوسرا نکاح کرسکتا ہے؟

(۴) کن حالات میں دوسرا نکاح کرنا چاہئے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) ضروری نہیں۔

(۲) استخارہ کر لے۔ (۳) کر سکتا ہے۔

(۴) باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة﴾ یعنی اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر بس کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے جبکہ شریعت کے مطابق سب بیویوں میں برابری کر سکے، اور سب کے حقوق کا لحاظ رکھ سکے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھی جائے، .... حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے چار عورتوں تک نکاح میں رکھنے کی اجازت دے دی، اور اس حد کے اندر جو نکاح کئے جائیں گے وہ صحیح اور جائز ہوں گے؛ لیکن متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں اس میں عدل ومساوات قائم رکھنا واجب ہے، اور اس کے خلاف کرنا گناہ عظیم ہے، اس لیے جب ایک سے زائد نکاح کا ارادہ کرو تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لو کہ سب کے حقوق عدل ومساوات کے ساتھ پورا کرنے کی قدرت بھی ہے یا نہیں، اگر یہ احتمال غالب ہو کہ عدل ومساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو ایک سے زائد نکاح پر اقدام کرنا اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ میں مبتلا کرنے پر اقدام ہے، اس سے باز رہنا چاہئے، اور اس حالت میں صرف ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنا چاہئے۔ (معارف القرآن ۲/۲۹۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی

سوال: میں نے ایک لڑکی سے شادی کیا، اور لڑکی ہمیں پسند نہیں ہے، اور

دونوں کا جوڑا برابر نہیں ہے تو یعنی ہم دوسری شادی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ دوسری شادی کرنے کے بعد پہلی عورت کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

اگر آپ عدل وانصاف کا تقاضہ پورا کرتے ہوئے دونوں بیویوں کے حقوق کو ادا کر سکتے ہیں، تو دوسری شادی کی اجازت ہے۔ لقوله تعالىٰ ﴿فانكحوا ماطاب لكم من النساء مثنى وثلث ورباع فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة الخ﴾ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

غیر کفو میں نکاح

سوال: زید اکیس سال کا ہے، اس نے پڑوسی کی لڑکی سے پیار کیا، اور اس کے والدین سے نکاح کی درخواست کی، لڑکی کے والد نے رشتہ نامنظور کرتے ہوئے لڑکی کی منگنی کہیں اور کردی، لڑکا لڑکی گھر سے فرار ہو جاتے ہیں، اور لڑکے نے اپنے چند دوستوں کی مدد سے شرعی نکاح کیا، لڑکی نے اپنی عمر کے لیے کورٹ کا تصدیق نامہ پیش کیا اور بتایا کہ وہ ۱۹/سال کی ہے، نکاح درست ہوا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

اگر لڑکا کفو نہیں ہے تو ولی کی رضامندی کے بغیر یہ نکاح (مفتی بہ قول کی بناء پر) درست نہیں ہوگا۔

ويفتى في غير الكفو بعدم جوازه أصل، وهو المختار للفتوىٰ لفساد الزمان. (درمختار) هذا إذا كان لها ولي لم يرض به قبل العقد فلا يفيد الرضا

بعده، بحر. وأما إذا لم يكن لها ولي فهو صحيح، نافذ، مطلقا اتفاقا. (درمختار شامی ۲/۳۲۳،۳۲۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بدچلن عورت سے جبراً نکاح کرنا

سوال: ایک عورت جو کہ بدچلن تھی، نکاح سے پہلے غیر مسلم کے ساتھ گھر سے کئی روز لاپتہ تھی، اس کے بعد کسی بھی طرح فوراً نکاح کر دیا گیا، اس کے بعد چار بچے کی ماں بنی، اس کے بعد بیوہ ہوگئی، چار سال کے عرصہ میں اس کے یہاں کئی لوگوں کا آنا جانا تھا، اس صورت میں بیوہ عورت ایک بچہ کی ماں بنی، اس عورت نے ایک شادی شدہ شخص پر الزام لگایا کہ یہ بچہ اس کا ہی ہے، اور گاؤں کے بعض لوگ اس آدمی پر دباؤ ڈال کر نکاح کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں جبکہ وہ آدمی اپنے بے گناہی کا ثبوت دینے کے لیے تیار ہے، مگر کوئی اس کی ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں، اور بہت مجبور کیا جارہا ہے، اور اس میں ۱۰۰۰۰/روپیہ مہر اور چار بچہ کی پرورش کی ذمہ داری پر مجبور کیا جارہا ہے؛ جبکہ بیوہ عورت کے بدچلن ہونے کے ثبوت موجود ہیں، اس صورت میں اس شخص کو کیا کرنا چاہئے؟ جواب معلوم کرائیں۔

بدچلن عورت الزام لگائے بغیر گواہ کے، تو نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۱۰۰۰۰/روپیہ مہر اور چار بچے جبراً سپرد کیا جاوے، ایسا کرنا جائز ہے یا حرام یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

شرعی ثبوت کے بغیر کسی پر زنا کی تہمت لگانا گناہ کبیرہ ہے، اور اس عورت کی ایسی بات کو بنیاد بنا کر اس آدمی پر نکاح کے لیے دباؤ ڈالنا حرام ہے، جو لوگ ایسا کریں گے گنہ گار

ہوں گے، جب وہ چار بچے اس آدمی کی اولاد نہیں ہیں؛ بلکہ مرنے والی کی اولاد ہیں تو ان بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اس آدمی پر نہیں ہے؛ بلکہ جو لوگ ان بچوں کے ذی رحم محرم رشتہ دار ہیں، ان پر بچوں کا نفقہ ہوگا؛ بشرطیکہ ان بچوں کی ملک میں ایسا مال موجود نہ ہو جس سے ان کا نفقہ ادا کیا جاسکے۔

جب جبراً کسی کے ساتھ نکاح کرادینا گناہ ہے، تو اس طرح دس ہزار روپیہ زرمہر اس پر ڈالنا بھی گناہ ہے؛ البتہ اگر جبراً نکاح کرادیا ہے، اور اس نے زبان سے قبول کرلیا تو وہ نکاح درست ہوگیا، اور دس ہزار مہر اس نے خوشی سے منظور نہیں کیا ہے تو اس عورت کا مہر مثل واجب ہے، اور زیادتی باطل ہوگی۔ (شامی ۵/۹۵)

مہر مثل کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے باپ کے گھرانے میں سے کوئی دوسری عورت دیکھو جو اس کے مثل ہو، یعنی: اگر یہ کم عمر ہے، تو وہ بھی نکاح کے وقت کم عمر ہو، اگر یہ خوبصورت ہو تو وہ بھی خوبصورت ہو، اس کا نکاح کنوارے پن میں ہوا، اور اس کا نکاح بھی کنوارے پن میں ہوا ہو، نکاح کے وقت جتنی مالدار یہ ہے، اتنی ہی وہ بھی تھی، جس دیس کی یہ رہنے والی ہے اسی دیس کی وہ بھی ہے، اگر یہ دیندار، ہوشیار، سلیقہ دار، پڑھی لکھی ہے تو وہ بھی ایسی ہی ہو؛ غرض جس وقت اس کا نکاح ہوا ہے، اس وقت ان باتوں میں وہ بھی اسی کے مثل تھی جس کا اب نکاح ہوا، تو جو مہر اس کا مقرر ہوا تھا وہی اس کا مہر مثل ہے۔ (بہشتی زیور ۴/۱۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بوری شیعہ سے نکاح کرنا

سوال: ہمارے یہاں ایک لڑکا بورا (شیعہ) قوم کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے، لڑکا سنی جماعت کا ہے، تو اسے اس موقعہ پر کیا کرنا چاہیئے؟ لڑکی والے کہتے ہیں کہ ہمارا ملا نکاح پڑھائے گا تو کیا ان کا ملا نکاح پڑھاوے تو صحیح ہوگا یا نہیں؟ اپنے امام صاحب نکاح پڑھائیں تو لڑکی کو مسلمان بنانا چاہیئے یا نہیں؟ مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب دیجئے، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ہمارے علاقہ میں جو شیعہ بورے ہیں ان کا تعلق اسماعیلی فرقے سے ہے، اور اسماعلیہ کے متعلق تمام علمائے مذاہب اربعہ کا اتفاق ہے کہ ان کے ساتھ عقدِ مناکحت درست نہیں ہے۔ (شامی ۳/۳۲۶) اس لیے اگر وہ لڑکی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہے تو یہ نکاح شرعاً درست نہیں ہوگا؛ البتہ اگر وہ لڑکی اپنے عقیدہ سے توبہ اور براءت کر کے اہل سنت کے عقائد اختیار کر لے تب اس کے ساتھ نکاح درست ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عدت میں شوہرِ اول سے نکاح کرنا

سوال: زید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، اور طلاق کی عدت گزرنے کے بعد زید نے اپنی طلاق شدہ بیوی سے ہمبستری کی؛ چنانچہ وہ حاملہ ہوگئی پھر تین ماہ بعد

حالت حمل میں اس نے دوسرے مرد سے حلالہ کے لیے نکاح کیا، شوہر ثانی نے حلالہ کے بعد اس کو کچھ دنوں بعد تین طلاقیں دے دی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عورت کا نکاح شوہر (زید) اول سے (حالتِ مدت) عدت میں کر سکتے ہیں؟ جبکہ حمل بھی اسی شوہر اول کا ہی ہے یا عدت طلاق کی مدت (وضع حمل) گزارنا ضروری ہے؟ اگر عدت کے گزرنے کا انتظار کرتے ہیں تو مزید حرام کاری ہوتے رہنے کا خطرہ یقینی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

شوہرِ اول زید کے تین طلاق دے دینے اور عدت گزرنے کے بعد اس نے مطلقہ کے ساتھ ہمبستری کی، اور اس کے نتیجہ میں جو حمل ٹھہرا وہ زنا کا حمل ہے، اس لیے ایسی حاملہ کے ساتھ دوسرے مرد نے جو نکاح کیا وہ درست ہے؛ البتہ اس دوسرے شوہر کو چاہئے کہ جب تک وہ حاملہ ہے اس کے ساتھ وطی نہ کرے، اس کے باوجود اگر اس دوسرے شوہر نے اس عورت کے ساتھ وطی کر لی، اور اس کے بعد تین طلاق دے دی، تو عدت کے بعد اس عورت کا نکاح شوہر اول کے ساتھ ہو سکتا ہے، اور چونکہ یہ عورت بوقت طلاق حاملہ ہے، اس لیے اس کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ پیدا ہونے) تک ہے، عدت گزارے بغیر شوہر اول سے یا کسی اور سے نکاح نہیں ہو سکتا، حرام کاری کے اندیشہ کی وجہ سے عدت ساقط نہیں ہوتی، جماعت مسلمین کو چاہئے کہ ان کو حرام کاری سے باز رکھے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

خفیہ نکاح کے بعد علی الاعلان دوسرا نکاح

سوال: ایک لڑکا ہے، اس کی منگنی ہوچکی ہے؛ لیکن شادی سے پہلے وہ اپنی منگنی شدہ لڑکی سے تنہائی میں باتیں اور مذاق وغیرہ کرتا ہے، (جو قطعاً جائز نہیں ہے) لہذا یہ شخص اپنی منگنی شدہ لڑکی سے باتیں اور مذاق کرنا جائز قرار دینے کے لیے صرف اپنے دو دوستوں کو بطورِ گواہ، اور منگنی شدہ لڑکی کو تنہائی میں بلا کر نکاح کر لیتا ہے، یہ نکاح صرف میاں بیوی اور دو گواہ کے کوئی دوسرا جانتا نہیں ہے، اب وہ روزانہ تنہائی میں منکوحہ سے ملتا ہے اور باتیں مذاق وغیرہ کر لیتا ہے، اب وہ دوسرا نکاح علی الاعلان منکوحہ سے کرتا ہے؛ تاکہ تمام لوگوں کو اس کا علم ہو جائے، پہلے نکاح کے بعد دوسرا علی الاعلان نکاح کرنے میں کوئی حرج ہے کہ نہیں؟ پہلے نکاح کے صحیح ہونے میں ماں باپ کی ناراضگی مخل ہوگی یا کہ نہیں؟ مفصل اور مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر پہلا نکاح تمام شرائط ورکنِ نکاح پر مشتمل تھا، تو وہ درست ہوگیا، اب لوگوں کے علم کے لیے دوبارہ عقد نکاح کی ضرورت نہیں ہے، اطلاع کافی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

موعود نکاح کی شرعی حیثیت

سوال: ایک لڑکی نے کسی لڑکے سے کہا کہ میں تجھ سے ہی نکاح کروں گی؛ مگر والدین نے کسی اور سے نکاح کر دیا، یا لڑکے نے کہا میں تجھ سے ہی نکاح کروں گا؛ مگر لڑکے کے والدین نے دوسری لڑکی سے اس کا نکاح کرا دیا، کیا ایسی صورت میں لڑکا یا

لڑکی کسی اور سے نکاح کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں سامنے والا لڑکا یا لڑکی (جن سے نکاح کا وعدہ کیا گیا تھا) کسی دوسری لڑکی یا لڑکے سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

علاج کے ذریعہ خون جاری کر کے نکاحِ ثانی کرنا

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ ایک عورت چار بچوں کی ماں ہے، چوتھے بچے کی ولادت پر اس کے شوہر نے ولادت ونفاس کی مدت گذرنے کے بعد طلاقِ مغلظہ دی، اور اس عورت کی عادت یہ ہے کہ ہر بچہ کی ولادت کے بعد ڈیڑھ سال تک دمِ حیض آتا نہیں ہے، اب اس مرتبہ بھی یہی امکان تھا، اور مدتِ عدت کی طوالت کا اندیشہ تھا، اس لیے اس عورت کے اگلے شوہر ہی نے اس کو ڈاکٹری علاج کروایا، اور ایسی گولیاں دلوائیں کہ پہلے مہینے میں بیس دن کے بعد حیض کا خون مکمل تین رات تک آیا، پھر دوسری مرتبہ پھر گولیاں دیں، تو دوسرے بیس دن کے بعد خون آیا اور تین رات تک مستمر رہا، پھر تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی کیا کہ گولیاں دیں اور بیس دن تک خون نہیں آیا اور پھر تین دن رات خون مستمر رہا، تو اب صورتِ مذکورہ میں عورت کی مدتِ حیض پوری ہوگی یا نہیں؟ اس کے لیے نکاحِ ثانیہ کا جواز ہوگا یا عدمِ جواز؟ اور اس طریقے سے خون جاری کروانا حیض کے حکم میں شمار ہوگا یا نہیں؟ اور شرعاً یہ ممنوع ہے یا مباح؟ برائے کرم تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

(نوٹ): نکاحِ ثانی زوجِ اول سے نہیں؛ بلکہ دوسرے سے کرنا ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں اگر تینوں مرتبہ کا خون زوجِ اول کے طلاق دینے کے بعد آیا ہے، تو اس کی عدت پوری ہوگئی، اور اب اس عورت کے لیے نکاحِ ثانی کی اجازت ہے، یہ خون حیض ہی کہلائے گا، یہ ایک طریقہ کا علاج ہے جس کی شرعاً اجازت ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ ۵/ ۴۰۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ممسوسہ کی بیٹی سے نکاح

سوال: زید شادی شدہ ہے، اور اس کے کئی بچے بھی ہیں، زید نے اپنے ایک بھانجہ کو - جو کہ یتیم تھا - اپنے پاس بغرض نگرانی و پرورش کے رکھ لیا تھا، چند برسوں کے بعد زید کا بھانجہ افتخار جوان اور شادی کے لائق ہوگیا تھا، تو زید نے اپنی لڑکی سے اپنے بھانجہ محمد افتخار کی شادی کردی، اور اپنا داماد بنالیا، شادی کے بعد چند عورتوں اور کچھ مردوں کی زبانی - جو کہ سبھی لوگ زید کے رشتہ دار ہی ہیں - یہ معلوم ہوا کہ زید کی لڑکی اور اس کے بھانجہ افتخار کا نکاح جائز و درست نہیں ہوا؛ کیوں کی زید کی بیوی ہندہ اور اس کے بھانجہ افتخار کے اندر قبل سے ہی ناجائز تعلقات قائم تھے، اس کے چشم دید گواہان میں سے ایک گواہ محمد تاج الدین کی بیوی کا بیان ہے، کہ: ہم جب ایک بار اپنے بچہ کو تلاش کرتے ہوئے ہندہ کے گھر گئے، تو جب دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانک کر دیکھا کہ گھر کے اندر ہمارا بچہ چھپا

ہوا تو نہیں ہے، یہ واقعہ آٹھ بجے دن کا ہے کہ گھر کے اندر صندوق کی بغل میں زید کی بیوی ہندہ اور اس کا بھانجہ محمد افتخار دونوں آپس میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے، یہ دیکھتے ہی فوراً تاج الدین کی بیوی گھر کے بغل میں آکر محمد حیدر کی بیوی کے سامنے بولنے لگی کہ ابھی ابھی ہم نے زید کے گھر کے اندر ایک سینما دیکھی ہے، جس سے کہ ہمارا دل دھڑک رہا ہے کہ یہ کیا ہم نے دیکھ لیا، جاؤ تم بھی جا کر دیکھ لو، یہ سن کر جب حیدر کی بیوی زید کے گھر آئی تو دیکھا کہ زید کی بیوی ہندہ کپڑا دھونے بیٹھ گئی تھی، اور زید کا بھانجہ غسل کرنے جارہا تھا، اس کے بعد کا پھر یہ واقعہ کہ ایک ہی کمرہ کے اندر یکجائی وتنہائی میں ہندہ اور زید کا بھانجہ محمد افتخار کو ساتھ میں ایک ہی لحاف کے اندر سوئے ہوئے دیکھنے والوں میں؛ جبکہ سخت ضرورت پڑجانے کی وجہ سے مختلف دن وموقعوں پر یہ تینوں اشخاص چشم دید گواہان زید کی تلاش میں اس کے گھر گئے تھے تو دیکھا تھا، ان گواہان کا نام یہ ہے: محمد یونس ٹیلر ماسٹر، محمد یٰسین، محمد الفت حسین، الفت حسین زید کے یہاں ہی رہتا تھا، اور بنگلہ پر تانا بنتا تھا، یعنی اس کا کاریگر ہے، زید جب کٹھیار چلا گیا تھا، تو اس کا بچہ بہت زیادہ رورہا تھا، تو اسی وقت یہ دیکھنے گیا تھا کہ گھر میں آخر بچہ اتنا کیوں رورہا ہے؟ جب گھر کے اندر گیا تو دیکھا تھا کہ دونوں، یعنی ہندہ اور اس کے بھانجہ افتخار ایک ہی ساتھ سوئے ہوئے ہیں، اب ان تمام باتوں کے پیش نظر جواب طلب امر یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ مذکورہ کے مطابق زید کی لڑکی کا نکاح اس کے بھانجہ محمد افتخار کے ساتھ جائز ودرست ہوا یا نہیں؟ بحوالۂ کتب شرعیہ جواب دیا جائے۔

نوٹ: چشم دید گواہوں کے بیان کے وقت جو حضرات موجود تھے، ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: محمد ذوالفقار صاحب، محمد احسان صاحب، محمد شمس الضحیٰ

صاحب، محمد ضیاء اللہ صاحب، عبد السبحان صاحب۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں زید کے بھانجہ محمد افتخار سے دریافت کیا جائے کہ کیا اس نے زید کی بیٹی کے ساتھ اس کا عقدِ نکاح ہونے سے پہلے زید کی بیوی کے ساتھ ان افعال کا ارتکاب کیا ہے؟ اگر وہ اس کو تسلیم کرتے ہوئے اقرار کرلیتا ہے، تو اس کا نکاح زید کی بیٹی کے ساتھ درست نہیں ہوا۔

قبّل أم امرأته في أي موضع كان على الصحيح. جوهرة. حرمت عليه امرأته مالم يظهر عدم الشهوة ولو على الفم، كما فهمه في الذخيرة، وفي المس لاتحرم مالم تعلم الشهوة؛ لأن الأصل في التقبيل الشهوة، بخلاف المس والمعانقة كالتقبيل. (درمختار) (قوله قبل ام امرأته الخ) قال فى الذخيرة: وإذا قبلها أو لمسها أو نظر إلى فرجها، ثم قال لم يكن عن شهوة، ذكر الصدر الشهيد انه في القبلة يفتى بالحرمة مالم يتبين أنه بلاشهوة، وفي المس والنظر لا؛ إلا أن تبين أنه بشهوة؛ لأن الأصل في التقبيل الشهوة بخلاف المس والنظر .... وكان الامام ظهير الدين يفتى بالحرمة فى القبلة مطلقاً ويقول لا يصدق فى انه لم يكن بشهوة (قوله حرمت عليه امرأته الخ) اى يفتى بالحرمة اذا سئل عنها، ولا يصدق اذا ادعىٰ عدم الشهوة الا اذا ظهر عدمها بقرينة الحال. (شامی ۳۰۶/۲)

اور اگر محمد افتخار ان افعال کے ارتکاب کا منکر ہے تو محض ان گواہوں کے بیانات

کی بنیاد پر عدمِ صحتِ نکاح کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے کہ اختلافِ زمان کی وجہ سے نصابِ شہادت مکمل نہیں ہے۔ بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها: اتفاق الشهادتين فيما يشترط فيه العدد، فان اختلفا لم تقبل لأن اختلافهما يوجب اختلاف الدعوىٰ والشهادة، ولأن عند اختلاف الشهادتين لم يوجد الا احد شطرى الشهادة، ولا يكتفى به فيما يشترط فيه العدد، ثم نقول الاختلاف قد يكون فى جنس المشهور به، وقد يكون في قدره، وقد يكون فى الزمان، وقد يكون فى المكان وغير ذلك. (۲۷۸/٦)

آگے چل کر اختلافِ زمان ومکان کی وضاحت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

واما اختلاف الشهادة فى الزمان والمكان فانه ينظر ان كان ذلك فى الاقارير لا يمنع القبول، وان كان فى الافاعيل من القتل والقطع والغصب وانشاء البيع والطلاق والعتاق والنكاح ونحوها يمنع القبول. (۲۷۹/٦)

بحرالرائق میں ہے: واذا اختلف الشاهدان فى المكان او الزمان فى البيع و الشراء والطلاق والعتق والوكالة والوصية والرهن والدين والقرض والبراء ة والكفالة والحوالة والقذف تقبل، وان اختلفا فى الجناية والغصب والقتل والنكاح لاتقبل، والاصل ان المشهود به اذا كان قولا كالبيع ونحوه، فاختلاف الشاهدين فيه فى الزمان او المكان لا يمنع قبول الشهادة؛ لان القول مما يعاد ويكرر، وان كان المشهود به فعلا كالغصب و نحوه، او قولا؛ لكن الفعل شرط صحته كالنكاح فانه قول، وحضور الشاهدين فعل

وھو شرط، فاختلافھما فی الزمان او المکا ن یمنع القبول؛ لان الفعل فی زمان او مکان غیر الفعل فی زمان او مکان آخر فاختلف المشھود به. (۱۱۳/۷)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

منکوحہ سے نکاح حرام ہے

سوال: زید نے اپنی دختر کی شادی جب کہ اس کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی اور اس کے شوہر کی عمر تقریباً ۶۰ سے ۷۰ سال کی تھی، اس کے ہمراہ عقد کر دیا تھا، نکاح کے کم از کم دس روز تک وہ شخص، یعنی اس کا شوہر اس کے ہمراہ رہا، پھر اس کی بیوی کو چھوڑ کر تقریباً دو سال سے لا پتہ ہو گیا، اور اس کے جانے کے بعد سے آج تک کوئی خط و کتابت یا آنا جانا نہیں ہوا، پتہ نہیں وہ شخص زندہ ہے یا پھر انتقال کر گیا، اب اسی لڑکی کے لیے دوسرا رشتہ آیا ہے، اور اس کے والدین کرنے کے لیے تیار ہیں، اب نہ تو اس کے شوہر کا پتہ ہے، اور نہ اس نے کوئی طلاق تحریری یا زبانی دیا ہے، اب بتایئے کہ اس لڑکی کا نکاح دوسرے سے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

گزارش ہے کہ صحیح فتویٰ دے کر قرآن وحدیث کی روشنی سے آشنا کریں؛ تا کہ نکاح خوانی میں آسانی ہو۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ایسی عورت جو دوسرے کے نکاح میں ہو اس سے نکاح کرنا حرام ہے، جب تک کہ پہلا شوہر طلاق نہ دیدے اور عدت نہ گزر جائے، لقوله تعالیٰ ﴿والمحصنٰت من

النساء الخ﴾ (سورۂ نساء آیت ۲۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/شوال ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مجلس نکاح میں تحریر سے نکاح

سوال: انیس احمد نے نفیسہ بیگم کے ساتھ مندرجۂ ذیل طریقہ سے نکاح کیا کہ انیس احمد نے ایک تحریری مضمون تیار کیا، پھر اس کو نفیسہ بیگم کو دیا اور نفیسہ بیگم نے اس پر خوشی سے دستخط کر دی، اور ساتھ میں یہ بھی بیگم نے اپنے ہاتھوں سے لکھ دیا کہ یہ مضمون کا خلاصہ مجھے دو سال تک منظور ہے، (گویا دو سال کے اندر ناکح نے قبول نہیں کیا تو اس کے بعد از سرِ نو اجازت لی جائے) اس کے بعد انیس احمد نے ایک ماہ کے بعد یہ مضمون دو آدمیوں کے سامنے پڑھا، اور فوراً کہا کہ میں نے منظور کر لیا، تو کیا اس طرح کرنے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے؟ جن دو عاقل بالغ مسلمان مردوں کے سامنے پڑھا وہ دونوں حضرات بیگم کو جانتے بھی ہیں کہ فلاں بنت فلاں اور فلاں وطن ہے، جانبین میں کفو برابر ہے، دونوں کی عمریں سنِ بلوغت سے متجاوز ہیں۔

مضمون یہ ہے ”میں عاقلہ بالغہ اپنی دلی خوشی سے بغیر کسی کے زبردستی اور بغیر کسی کی شرم اور دباؤ کے اپنے دل کی بات زبان پر لا کر لکھ کر دیتی ہوں، کہ میں نے اپنی پوری ذات آپ کو............یعنی مکمل نام (فلاں بن فلاں) کو مہرِ فاطمی کے عوض عقد نکاح میں دے دیا، مہر ادھار مجھے منظور ہے، میرا پورا پتہ (فلاں بنت فلاں)، اللہ ہم دونوں کو عزت، محبت دے اور دین پر قائم رکھے“

مذکورہ بالا مضمون سائل کے کہنے کے مطابق حرف بہ حرف ہے، اب اگر نکاح منعقد ہوگیا تو مہرِ فاطمی کتنے روپیہ ہوتی ہے؟ نیز اس کی ادائیگی بوقتِ نکاح چاندی کی قیمت سے دینی ہوگی یا بوقتِ ادا کی قیمت پر ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں نکاح منعقد نہیں ہوا، اس لیے کہ نفیسہ بیگم کی طرف سے جو مضمون تیار کر کے انیس احمد کو دیا گیا اس مجلس میں انیس احمد خود موجود ہے؛ بلکہ مضمون کو تیار کرنے والا ہی وہ ہے، اب اگر اسی مجلس میں گواہ موجود ہوتے اور وہیں انیس احمد اس مضمون کو گواہوں کے سامنے پڑھ کر سنا دیتا اور پھر اپنی طرف سے منظوری کے الفاظ ادا کرتا، تب بھی نکاح درست نہ ہوتا، اس لیے کہ موجود آدمی کی طرف سے تحریر کافی نہیں ہے، اور تحریر دینے والی نفیسہ بیگم اور جس کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے وہ انیس احمد حاضر وموجود ہونے کی وجہ سے یہ تحریر شرعاً معتبر نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: ولا بكتابة حاضر؛ بل غائب الخ (درمختار)

علامہ شامیؒ اس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: (قوله ولا بكتابة حاضر) فلو كتب تزوجتك فكتبت قبلت لم ينعقد، بحر. والأظهر أن يقول فقالت قبلت الخ اذا الكتابة من الطرفين بلا قول لا تكفي؛ ولو في الغيبة تأمل. (شامی ۲/۲۸۸)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نکاح پر تعلیقِ طلاق کی تھی اس سے نکلنے کا حیلہ

سوال: (۱) زید نے قسم کھائی اگر میں نے ہندہ سے نکاح کیا، تو اسے تین طلاق، اگر ہندہ سے نکاح کرنا چاہے تو اس کی کیا شکل ہوگی؟

نکاحِ فضولی

(۲): نکاحِ فضولی کسے کہتے ہیں؟ اس میں دولہے کا منہ سے بولنا ضروری ہے یا صرف سر ہلانا کافی ہے؟

(۳): قبل از نکاح دولہے کو اشارہ کرے کہ تو بولنا مت، ہم نکاح پڑھ دیں گے۔

بینوا توجروا.

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱): صورتِ مسئولہ میں طلاق نہ ہونے کا حیلہ یہ ہے کہ زید خود نکاح نہ کرے، نہ کسی کو وکیل بنائے، نہ امر کرے؛ بلکہ کوئی دوسرا شخص بطورِ فضولی کے زید کا نکاح ہندہ سے کردے، اور زید اس نکاح کی منظوری قول کے ساتھ نہ دے بلکہ (اس فضولی نے بوقتِ نکاح جو مہر مقرر کیا ہے وہ پورا یا اس کا کوئی حصہ ہندہ کے پاس بھیج دے اس کے بعد) وہ ہندہ سے وطی کرلے، تو یہ اجازت بھی ہوجائے گی، اور زید کا نکاح بھی ہوجائے گا، اور طلاق بھی نہیں پڑے گی۔ (کفایت المفتی ٦/٢٦١ بتغيير يسير)

حلف لا يتزوج، فزوجه فضولي، فاجاز بالقول حنث، وبالفعل ومنه الكتابة خلافا لابن سماحةؒ لا يحنث به يفتى خانية. (درمختار) (قوله فاجاز بالقول) كرضيت وقبلت، نهر. وفى حاوى الزهدى: لو هنأه الناس بنكاح

الفضولی فسکت فهو اجازة. (قوله حنث) هذا هو المختار كما فی التبیین، وعلیه اکثر المشائخ والفتویٰ علیه كما فی الخانیة، وبه اندفع مافی جامع الفصولین من ان الاصح عدمه، بحر. (قوله بالفعل) كبعث المهر او بعضه بشرط ان یصل الیها، وقیل: الوصول لیس بشرط، نهر. وكتقبیلها بشهوة وجماعها؛ لكن یكره تحریما لقرب نفوذ العقد من المحرم، بحر. قلت فلو بعث المهر اولا لم یكره التقبیل والجماع لحصول الاجازة قبله الخ (شامی ۱۵۰/۳)

(۲): فضولی اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے آدمی کے لیے، ایسا تصرف کرے جس تصرف کی اس کو نہ تو شریعت کی طرف سے ولایت حاصل ہو اور نہ تو (اس غیر نے جس کی طرف سے وہ تصرف کر رہا ہے) اس کو اپنا وکیل بنایا ہو۔ هو من یتصرف لغیره بغیر ولایة ولا وكالة. (بحر الرائق ۱٤۷/۳) بوقتِ عقد دولہا وہاں موجود نہ ہو؛ بلکہ یہ اجنبی (فضولی) اپنے طور پر زید کا نکاح کر دے، بعد میں زید فعلاً (جواب سابق میں بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق) اجازت دے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مہر کی معافی کے بعد بیوی پاگل ہوگئی

سوال: ایک شخص نے شادی کی، اور شادی میں مہر بھی زیادہ طے کی، اور نکاح ہوگیا، اور پہلی رات بھی گذاری میاں بیوی نے، اور اسی رات میں بیوی نے مہر معاف کر دی، یعنی جو مہر کی رقم طے ہوئی تھی، اور بعد میں بیوی پاگل ہوگئی، اور بیوی پہلے ہی سے کچھ کم عقل اور

کم فہم تھی لوگوں کے کہنے کے مطابق؛لہذا اس مسئلہ کی صورت میں جو مہر معاف کردی لہذا شوہر پر مہر دینا واجب ہے یا نہیں؟ جواب مفصل ومدلل تحریر فرمائیں،عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر عورت نے بغیر جبر واکراہ اپنی مرضی سے مہر معاف کردیا تو وہ درست ہے، اور دیانۃً وہ معاف ہوگیا۔

وصح حطها لكله أو بعضه عنه قبل أو لا ويرتد بالرد. (درمختار)

ولا بد من رضاها، ففي هبة الخلاصة: خوفها بضرب حتى وهبت مهرها لم يصح. (شامی ۲/۳۶۶، ۳۶۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مطلّقہ کی اولاد کا نکاح سابق شوہر کی اولاد سے

سوال: زید کی شادی ہندہ کے ساتھ ہوئی تھی، کچھ عرصہ بعد زید نے ہندہ کو طلاق دے دیا، ہندہ نے دوسری جگہ شادی کرلی، اور زید نے بھی اپنی شادی کرلی، اب بہت عرصہ بعد دونوں کے یہاں اولاد ہوئی، اور دونوں کے اولاد جوان ہوگئے، اب ان دونوں نے آپس میں رشتہ ناطہ جوڑ کر لڑ کا لڑکی کا نکاح کردیا، مثلاً طلاق شدہ عورت کا لڑکا اور مرد کی لڑکی، کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

درست ہے۔﴿واحل لكم ماوراء ذلكم﴾ الخ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

منکوحہ کے نام کے ساتھ کس کا نام لکھا جائے؟

سوال: جب بچی مدرسہ یا اسکول میں پڑھتی ہے، تو اس وقت لڑکی کے نام کے ساتھ اس کے والد کا نام عموماً لکھا جاتا ہے، مثلاً فاطمہ بی بی بنت عبداللہ؛ مگر جب لڑکی کی شادی ہوجاتی ہے، تو اس کے بعد لڑکی کے والد کا نام اس کے نام کے ساتھ لکھا جائے گا یا اس کے خاوند کا نام لکھا جائے گا؟ شرعی مسئلہ کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مفصل ومدلل تحریر فرمائیں؟ عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شادی کے بعد اگر عورت کا تعارف باپ کی طرف نسبت کرتے ہوئے کرنا مقصود ہو، تو باپ کا نام ذکر کریں گے، مثلاً: فلانہ بنت فلان، اور اگر شوہر کی طرف نسبت کرتے ہوئے تعارف کرنا مقصود ہو، تو شوہر کا نام ذکر کریں گے، مثلاً: فلانہ زوجۂ فلان، مقصود تعارف ہے وہ جس سے حاصل ہوجائے، حدیث پاک میں دونوں طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ ''مشکوٰۃ شریف'' میں بحوالۂ ''ترمذی'' روایت موجود ہے: عن أنس رضی اللہ عنہ أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: حسبك من نساء العالمين مريم بنت عمران، وخديجة بنت خويلد، وفاطمة بنت محمد، و آسية امرأة فرعون. (۵۷۳)

دیکھئے! اس روایت میں چار عورتوں کا تذکرہ موجود ہے، جن میں سے تین کی نسبت باپ کی طرف کی گئی ہے اور ایک کی نسبت شوہر کی طرف ہے۔

عن جابر رضی اللہ عنہ أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: أريت الجنة، فرأيت امرأة أبي طلحة، وسمعت خشخشة أمامي فإذا بلال. رواه مسلم. (مشکوٰۃ ۵۷۴)

دیکھیے! اس روایت میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا والدۂ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نسبت ان کے شوہر کی طرف کی گئی۔

عن زينب امرأة عبدالله بن مسعود قالت: قال رسول الله ﷺ: تصدقن يا معشر النساء ولو من حليكن، قالت: فرجعت إلى عبدالله، فقلت: إنك رجل خفيف ذات اليد، و أن رسول الله ﷺ قد أمرنا بالصدقة، فأته، فاسئله، فان كان ذلك يجزئ عني وإلا صرفتها إلى غيركم؟ قالت: فقال لي عبدالله: بل إئتيه أنت، قالت فانطلقت، فاذا امرأة من الانصار بباب رسول الله ﷺ، حاجتي حاجتها، قالت: وكان رسول الله ﷺ قد ألقيت عليه المهابة، فقالت: فخرج علينا بلال، فقلنا له: إئت رسول الله ﷺ، فاخبره أن امرأتين بالباب تسألانك، أتجزئ الصدقة عنهما علي أزواجهما وعلى أيتام في حجورهما؟ ولا تخبره مَن نحن؟ قالت: فدخل بلال رضي الله عنه على رسول الله ﷺ فسأله، فقال له رسول الله ﷺ: من هما؟ قال: إمرأة من الانصار وزينب، فقال رسول الله ﷺ: أي الزيانيب؟ قال امرأة عبدالله الخ. (مشکوٰۃ ۱۷۱)

اس روایت میں حضور اکرم ﷺ کے دریافت فرمانے پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیتے ہوئے جو تعارف کرایا، اس میں شوہر کی طرف نسبت فرمائی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسائلِ حرمتِ مُصاہَرت

خسر کی ناپاک نظر سے بچاؤ کی خاطر الگ مکان میں رہنا

سوال: ایک اور بات! خدا مجھے معاف کرے، کسی کا عیب کھولنے کا مجھے حق نہیں؛ مگر کہنا ضروری ہے، میرے سسر کی نگاہ میں میں نے نوٹ کیا ہے، پاکی نہیں ہے، میں بفضلہٖ تعالیٰ بچ پائی، کیا اس پائنٹ کے سہارے میں ان سے الگ ہوسکتی ہوں یا پھر ضروری ہے الگ ہونا؟ میں ایک INLANDLETTER ساتھ روانہ کررہی ہوں، جلد از جلد مجھے جواب مرحمت فرمائیں، مجھے قدم اٹھانا ہے، اگر جواب میں دیری ہوئی، تو میں بڑی پریشانی میں گھر جاؤں گی۔ خدا حافظ

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ویسے بھی آپ کو شرعاً حق پہنچتا ہے کہ آپ اپنے شوہر کے ساتھ ایسے الگ مکان یا روم میں رہنے کا مطالبہ کریں، جس میں شوہر کے ماں باپ بھائی بہن وغیرہ نہ ہوں، سسر نے خدانخواستہ آپ کے جسم کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگا دیا (بشرطیکہ درمیان میں کوئی کپڑا حائل نہ ہو) یا بوسہ وغیرہ لے لیا، تو آپ اپنے شوہر کے لیے حرام ہوجائیں گی، اس لیے اگر آپ کو سسر کی طرف سے اندیشہ ہے تو خوب بچ کر رہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

اپنی بیٹی سے زنا

سوال: زید نے شادی ہندہ سے کی، تقریباً دس ماہ کا عرصہ گزر رہا ہے، اب زید

کومعلوم ہوا کہ ہندہ کا باپ عمر ہندہ سے ناجائز تعلق، یعنی زنا کرتا ہے، زید نے ہندہ سے معلوم کیا تو ہندہ نے انکار کیا، کہا کہ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے، پھر بعد میں زید نے اپنی بیوی ہندہ سے اصرار کر کے پوچھا تو ہندہ نے اقرار کیا کہ ہاں! شادی سے قبل ہی سے ہمارے باپ عمر کا ایسا تعلق ہے، یعنی زنا کرتا ہے، میں راضی نہیں ہوں، زبردستی زنا کرتا ہے۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ زید کا نکاح ہندہ سے ہوا کہ نہیں؟ اور اگر اولاد پیدا ہو تو وہ حرامی کہلائیگی کہ نہیں؟ اور اگر زید اپنی بیوی ہندہ کو میکہ نہ جانے دے اور اپنے خسر عمر کو اپنا گھر نہ آنے دے تو شریعت سے اس کا کیا حکم ہے؟ یا آپ کوئی ایسی صورت بتائیں کہ دونوں میاں بیوی آپس میں اچھی طرح زندگی گزاریں، تفصیل سے جواب دیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ درست ہوگیا، اور نکاح ہونے کے چھ ماہ بعد جو اولاد ہوئی یا ہوگی وہ بھی ثابت النسب کہلائے گی؛ البتہ عمر کا اپنی ہی بیٹی کے ساتھ زنا میں ملوث ہونا، اور اب تک اس پر اصرار یہ نہایت گھناؤنی اور بے حد قبیح حرکت ہے، زنا گناہ کبیرہ ہے، اور اپنی بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کس درجہ بری ہے اس کا تو اندازہ لگانا مشکل ہے۔ (العیاذ باللّٰہ تعالیٰ)

زید کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہرگز ہرگز ہندہ کو میکہ نہ بھیجے، اور اس کے باپ کو اس کے ساتھ اس طرح ملنے کا ہرگز موقع فراہم نہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بہو کو چھونے سے حرمتِ مصاہرت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرعِ متین زید نے اپنے بیٹے عمرو کی بیوی فاطمہ کو آج سے پندرہ سال پہلے زنا کی نیت سے پکڑا تھا، اور صرف ہاتھ کو پکڑا تھا کہ فاطمہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلی، اور زید کو زنا پر قدرت نہ دی، اب کسی نے عمرو سے کہہ دیا کہ تیری بیوی فاطمہ تیرے لیے حرام ہوگئی ہے؛ جبکہ عمرو کو فاطمہ کے بطن سے ۳؍ بچے ہو چکے ہیں، اور چوتھا حمل بھی ہے، اب اس حال میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ واقع میں عمرو کے لیے اس کی بیوی فاطمہ (زید کی اس حرکت سے) حرام ہوگئی یا حلال ہی ہے؟ حرام اگر ہوگئی ہو تو جدائی کس طرح ہو؟ اور اگر جدائی کرادی جائے تو ان بچوں کی پرورش کا ذمہ دار کون؟ اور یہ بچے حرام کے کہلائیں گے یا حلال؟ نیز عمرو اپنے والد کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھے؟ جواب جلد دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زید نے اگر اپنے بیٹے عمرو کی بیوی فاطمہ کا ہاتھ بلا حائل کے شہوت کے ساتھ پکڑا ہے، اور عمرو اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے تو عمرو کے لیے فاطمہ کو اپنے نکاح میں رکھنا جائز نہیں؛ بلکہ اس سے متارکت ضروری ہے، کیونکہ مصاہرت کی وجہ سے اس پر حرام ہوگئی (یہ حرمت بلا انزال ثابت ہوجاتی ہے)۔ وحرم أيضاً بالصهرية أصل مزنيته وأصل ممسوته بشهوة وفروعهن الخ (تنویر الابصار) وثبوت الحرمة بلمسها مشروط بأن يصدقها، ويقع في أكبر رأيه صدقها، وعلى هذا ينبغي أن يقال في مسه إياها لا تحرم على أبيه وإبنه إلا أن يصدقاه، أو يغلب على ظنهما صدقه.

فلو أنزل مع مس أو نظر فلا حرمة به يفتى. (درمختار) (قوله فلا حرمة) لأنه بالإنزال تبين أنه غير مفض إلى الوطء. الخ (شامی ۲/۳۰۴،۳۰۵) (شامی ۲/۳۰۴)

فاطمہ ثبوتِ حرمت کے بعد بھی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی، جب تک کہ قاضی دونوں میں تفریق نہ کردے یا شوہر متارکت نہ کرے، متارکت کی صورت یہ ہے کہ شوہر زبان سے کہہ دے کہ میں نے چھوڑ دی، اس کے بعد عدت گذار کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، متارکت سے پہلے جو اولاد ہوئی وہ حلال ہے، اور ان کا نسب عمرو سے ہی ثابت ہوگا، اور عمرو بحیثیت باپ کے اپنے بچوں کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔

وبحرمة المصاهرة لا يرتفع النكاح حتى لا يحل لها التزوج بآخر إلا بعد المتاركة وانقضاء العدة، والوطئ بها لايكون زنا. (درمختار) (قوله إلا بعد المتاركة) أي وإن مضى عليها سنون، كما في البزازية، وعبارة الحاوي إلا بعد تفريق القاضي أو بعد المتاركة............ اھ (قوله والوطء بها الخ) أي الوطئ الكائن في هذه الحرمة قبل التفريق والمتاركة لايكون زناً. قال في الحاوى: والوطئ فيها لا يكون زنا لأنه مختلف فيه وعليه مهر المثل بوطئها بعد الحرمة، ولاحد عليه ويثبت النسب اھ. (شامی ۲/۳۰۷)

باپ کے گناہ کا مرتکب ہونے کی وجہ سے بیٹے کے لیے باپ کی نافرمانی کی اجازت نہیں ہوجاتی، عمرو اپنے باپ کے ساتھ بدستور حسنِ سلوک واطاعت سے رہے۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ ۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

کتاب الطلاق والعدة

عورت ناجائز تعلقات رکھتی ہو تو شوہر کیا کرے؟

سوال: (۱) اگر عورت غلط ہو اور وہ دوسرے غیر قوم کے مرد سے غلط تعلقات رکھے، تو اس کے لیے کیا فتویٰ ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسی عورت گنہگار ہے، اپنے پروردگار کی نافرمان ہونے کے ساتھ شوہر کے ساتھ خیانت کرنے والی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد اپنی اس حرکت سے باز آجائے اور سچی توبہ کرلے، خصوصاً غیر قوم کے مرد کے ساتھ غلط تعلقات قائم کرنے کی صورت میں، اس کے اثر میں آکر ایمان سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سوال: (۲) یہ سب باتیں خود اس کا شوہر جان کر بھی اس عورت کو رکھنا چاہے، تو یہ کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شوہر پر ایسی عورت کو طلاق دینا واجب اور ضروری نہیں ہے۔ لا یجب علی الزوج تطليق الفاجرة. (الدر المختار ۳۰۳/۵، عالمگیری ۳۷۲/۵)

سوال: (۳) عورت یہ سب غلط کام کرنے کے بعد اپنے آپ کو پارسہ کہتی ہے اور اس کا شوہر اسے رکھنا چاہتا ہے، مگر وہ خود (عورت) طلاق لینا چاہتی ہے، تو کیا عورت طلاق لے سکتی ہے؟ کیا عورت کو طلاق کا حق ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس قسم کی غلط کاریوں کے باوجود اپنے کو پارسہ کہنا کذب و دروغ ہے۔ فقط

واللہ تعالیٰ أعلم.   کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ   ۲۴/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

''تو چلی جا مجھے نہیں چاہئے'' کہنا

سوال: میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا، میاں نے بیوی سے کہا ''تو چلی جا، مجھے نہیں چاہئے'' کیا طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟ جواب اثبات میں ہے تو کونسی طلاق؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

''تو چلی جا مجھے نہیں چاہئے'' الفاظِ کنایات میں سے ہے، اگر شوہر نے طلاق کی نیت سے کہے ہیں، تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ (شامی ۲/ ۵۰۵، فتاوی دارالعلوم مکمل مدلل ۹/ ۳۷۹، ۳۸۳) نیت تھی یا نہیں، اس سلسلہ میں شوہر کا قول اس کی قسم کے ساتھ معتبر ہوگا۔ (ایضاً) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ماں کے گھر جانے پر شرطی طلاق

سوال: یوسف نے اپنی بیوی سلمہ سے کہا: ''اگر تو میری اجازت کے بغیر تیری ماں کے گھر جائے گی تو تجھے تین طلاق ہے'' جبکہ یہ بات پورے گاؤں والوں نے جان لی کہ یوسف نے اپنی بیوی کو شرطیہ طلاق پر روک رکھا ہے، لیکن شرط لگانے کے وقت کوئی شرعی گواہ نہیں ہے، بعد میں اسماعیل اور الیاس دو آدمیوں نے اس سے کہا کہ تو نے اپنی بیوی سلمہ کو کیوں روک رکھا ہے؟ اس کی ماں کے گھر ملنے جانے دے، پھر یوسف نے کہا:

کہ ہاں میں اپنی بیوی کو اپنے گھر جا کر اس کی ماں کے گھر جانے کے لیے اجازت دیتا ہوں؛ لیکن یوسف نے اپنے گھر جا کر سلمہ کو اس کی ماں کے گھر جانے کی اجازت نہیں دی، اپنے گھر جا کر خاموش رہا، اس کے بعد دوسرے دن اسماعیل والیاس دونوں پھر سے ملے، اور یوسف سے کہا کہ تو نے تیری عورت سلمہ کو اس کے ماں کے یہاں جانے کی اجازت دی؟ یوسف نے کہا کہ ہاں اجازت دے دی، اس کے بعد یوسف نے گھر جا کر اجازت نہیں دی، اور سلمہ کو مار پیٹ کرنے لگا، اور کہنے لگا میں نے طلاق کے بارے میں تجھ کو کہا، وہ دوسروں کو کیوں کہہ دیا؟ سلمہ اس وقت فوراً اپنے ماں کے گھر چلی گئی بغیر اجازت شوہر کے، تو مذکورہ صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں یوسف کی بیوی سلمہ پر تین طلاق واقع ہو کر وہ اس کے حق میں حرام بحرمتِ مغلظہ ہوگئی۔

إنما يصح في الملك، كقوله لمنكوحة: إن زرتِ فأنت طالق، أو مضافا إليه، أي إلى الملك كان نكحتك فأنت طالق، فيقع بعده أي يقع الطلاق بعد وجود الشرط، وهو الزيارة في الأول الخ. (تبيين الحقائق ۲/۲۳۱) فقط

واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۵/ ذوالحجۃ ۱۴۰۹ھ

''جب بھی شادی کروں تو طلاق'' کہنا

سوال: اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ جب بھی میں شادی کروں تو میری بیوی کو

طلاق ہے، پھر جب شادی کی تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ نیز اگر کوئی شخص یہ کہے جب میں شادی کروں تو میری بیوی کو طلاق، ان دونوں مسئلوں میں کیا فرق ہے؟ جواب تحریر فرمائیں؛ نیز شادی کی کیا صورت ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اردو زبان میں ''جب'' ظرف کا معنی دیتا ہے، اور ساتھ ہی یہ شرط کا فائدہ بھی دیتا ہے، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اپنی کتاب ''اردو قواعد'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''جب اول بمعنی جس وقت، جیسے: 'جب میں آؤں تو انہیں اطلاع کر دینا'' (۲۸۹) اور جب کے ساتھ ''بھی'' کا اضافہ کر دینے سے اس میں تاکید پیدا ہوتی ہے، یعنی معنی وہی رہتا ہے؛ البتہ اس میں زور اور قوت بڑھتی ہے، چنانچہ کتابِ مذکور میں ہے ''ہی'' کی طرح ''بھی'' انہیں الفاظ کے متصل آتا ہے، جن پر زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ (۳۳۶) اس لیے ''جب'' اور ''جب بھی'' کا استعمال اردو زبان میں ایسا ہی جیسا ''متیٰ'' اور ''متی ما'' کا استعمال عربی زبان میں ہوتا ہے، اوران دونوں الفاظ کے متعلق ''کنز الدقائق'' میں تصریح ہے کہ: ''ففيها إن وجد الشرط انتهت اليمين. (كنز الدقائق) اس کی شرح فرماتے ہوئے علامہ ابن نجیمؒ رقمطراز ہیں: أي في الفاظ الشرط إن وجد العلق عليه انحلت اليمين وحنث وانتهت؛ لأنها غير مقتضية للعموم والتكرار لغة، فبوجود الفعل مرة يتم الشرط الخ'' (بحر الرائق ٤/ ١٠)

اس لیے مسئولہ دونوں صورتوں میں وہ آدمی جب شادی کرے گا اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو کر اس کی یمین ختم ہو جاوے گی، اب اگر ایک طلاق کی تصریح کی تھی یا مطلق

طلاق بولا تھا جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو حلالہ کی ضرورت نہیں، نکاح ثانی کرسکتا ہے، اور اگر تین طلاق کی تصریح کی تھی تو بغیر حلالہ نکاح ثانی نہیں کرسکتا ہے۔

شادی کی صورت یہ ہے کہ کوئی فضولی اس کا نکاح کردے، اور یہ اس کی قولاً اجازت نہ دے؛ بلکہ فعلاً اجازت دیدے، مثلاً عورت کے پاس مہر (معجّل) بھیج دے۔

(فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۲۷۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

''تو دوسرا شوہر تلاش کرلینا'' لکھنا

سوال: ایک میاں بیوی کے درمیان نکاح کے کچھ ایام کے بعد ہی سے کشیدگی ہورہی تھی، اور یہاں تک نوبت آئی کہ یہ کشیدگی کبھی کبھی وطی سے مانع ہوتی تھی، اب اس شوہر نے اپنے ایک ساتھی کے اوپر خط لکھا تھا کہ میں نے میری بیوی کو خط لکھا ہے، کہ تو دوسرا شوہر تلاش کرلینا، میں تجھے رکھنے والا نہیں ہوں اور میں دوسری شادی کرکے رہوں گا، اور اس نے کہا کہ میری نیت دھمکی کی تھی، تو کیا طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟ مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہے، تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی، ورنہ نہیں۔

ویؤید ما في الذخیرۃ: اذهبي وتزوجي لا یقع إلا بالنیة، وإن نوی

فهي واحدة بائنة، وإن نوى الثلث فثلث. (شامی ۲/۵۱۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

''طلاق دے دوں گا'' دھمکی ہے

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ محمد رفیق اور بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا صرف ۵۰/روپئے کو لے کر، میں نے میری بیوی سے پوچھا کہ یہاں سے پیسے گئے کہاں؟ اس بات کی حجت کو لے کر جھگڑا بڑھ گیا، گالیاں گلوچ ہوئی، بیوی کو بھی میں نے گالیاں دی، ہماری والدہ نے بھی گالیاں دی، اس طرح گالی کا جواب گالی سے میری بیوی نے دیا، اس لیے میں زیادہ غصہ میں آ گیا اس کی پٹائی کر دی، اور وہ جھگڑا اور بھی بڑھ گیا، سارے محلّہ کے لوگ ہماری طرف دیکھتے رہے، میں اپنے آپ کو بے عزت سمجھتا رہا، اس پر بھی میں نے بیوی سے کہا کہ تو منہ بند کر دے، نہیں تو غصہ میں اور بھی رہا، اس پر بھی اس نے منہ بند نہیں کیا، پھر میں نے کہا اب جو ہو گیا سو ہو گیا، اسی طرح ہوتا رہا تو میں طلاق دے دوں گا، طلاق دے دوں گا، اسی طرح ہوا تو طلاق دے دوں گا، برائے کرم منہ بند کر دے یہ میرے الفاظ ہے، کیا یہ طلاق ہو گئی؟ یہاں لوگ کہتے ہیں کہ طلاق ہو گئی، اور کچھ کہتے ہیں طلاق نہیں ہوئی، ہمارا مسئلہ سنگین طول پکڑ رہا ہے، جواب جلد از جلد مل جائے، میں نے طلاق نہیں دی تھی، صرف دھمکی دی تھی، مجھے کیا معلوم کہ معاملہ یہاں تک بڑھ جائے گا؟ میری بیوی کو چار ماہ کا حمل بھی ہے، مجھے بہت فکر ہے، آپ کسی بھی طرح یہ مسئلہ سلجھا دو۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر آپ نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ کہے ہیں: ''اگر اس طرح ہوتا رہا تو میں طلاق دے دوں گا، طلاق دے دوں گا، اس طرح ہوا تو طلاق دے دوں گا'' اس کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں کہا ہے، تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی یہ محض دھمکی ہے۔(کما یستفاد من الفتاویٰ المحمودیه ٤/ ١٣٠)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/شوال ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

شوہر کی اجازت کے بغیر لڑکی میکہ آ گئی فریقین کیا کریں؟

سوال: ہمارے محلّہ میں ایک لڑکی کی شادی ہوئے چار سال گزر گئے، ابھی تقریباً نو دس مہینے سے وہ اپنی سسرال سے اپنے میکے والدین کے پاس چلی آئی ہے، اسی عرصہ میں لڑکی کے سسرال والے لڑکی کو لینے آئے تھے؛ مگر لڑکی کے والدین اور خاندان والے لڑکی کو روانہ کرنے کے لیے منع کر رہے ہیں، اور لڑکی بھی صاف انکار کر رہی ہے، لڑکی کے والدین اور لڑکی طلاق لینے پر آمادہ ہے؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں کیا کیا جائے؟ تفصیل سے لکھیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کا اپنے میکے چلا آنا شرعاً ممنوع ہے، شوہر کی ناراضگی کو دور کرے، اگر کسی وجہ سے دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں تو دونوں طرف کے خاندان کے بڑے لوگوں کو درمیان میں ڈال کر تعلقات درست کرنے کی سعی کی جائے، عورت کی طرف سے بلا وجہ طلاق کا مطالبہ درست نہیں ہے، تمام کوششوں کے بعد

بھی اگر تعلقات سدھرنے کا امکان نہیں رہا تو لڑکی کچھ رقم دے کر شوہر سے طلاق حاصل کرسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

میاں بیوی میں تعلقات نہ ہونے کا اثر رشتۂ نکاح پر

سوال: کچھ عرصہ تک اگر شوہر اور بی بی میں کچھ بھی تعلقات نہ ہو، نہ کچھ بات چیت ہو، نہ نان نفقہ اور خرچ کی رقم دیتا ہو؛ غرض کہ کچھ بھی تعلقات نہ ہوں تو اس حالت میں شوہر اور بی بی کا رشتہ ختم ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر رشتہ ختم ہو تو کتنے عرصہ کے اندر تعلقات ختم ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں بھی دونوں کا رشتۂ نکاح ختم نہیں ہوا؛ بلکہ باقی ہے، جب تک شوہر طلاق نہ دے وہاں تک رشتہ ختم نہیں ہوسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

جبراً طلاق کی قسم کا حکم

سوال: اگر ہم نے کسی انسان کو زبردستی سے یہ کہلوایا کہ اگر میں اس سال میں یہاں سے بھاگ کر چلا گیا، تو میری ہونے والی بیوی کو تین طلاق، اس طرح قسم کھلائی تو قسم حانث ہوجائے گی یا نہیں؟ سامنے والے انسان کو ہم نے یہ نہیں بتلایا کہ کس جگہ جانے سے یا کس کے پاس جانے سے؟ تو یہ قسم ہے، اس بات کو ہم نے اپنے دل میں رکھا، تو کیا قسم واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر قسم واقع ہوگی، تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جبر اور اکراہ کے ساتھ جو قسم کھلائی گئی ہے، وہ بھی منعقد ہوگئی، درمختار میں ہے۔

ولو الحالف مکرها الخ. (درمختار علی هامش الشامی ۳/۵۳)

اس لیے صورتِ مسئولہ میں اگر وہ آدمی جس کو قسم کھلائی گئی تھی، وہاں سے بھاگ کر چلا گیا، تو وہ اپنی قسم میں حانث ہوگا اور اس کی ہونے والی بیوی پر طلاقِ مغلظہ واقع ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

جبراً تحریری طلاق

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرعِ متین مسئلہ طلاق میں؟ جو زیروکس کاپی میں گجراتی زبان میں لکھا ہوا ہے۔

معاملہ کورٹ تک پہنچ چکا ہے اور ہم لوگ شریعت کی روشنی میں اس کاغذ میں جو طلاق نامہ لکھا ہے، اس کا جواب چاہتے ہیں کہ زید نے جو مسمات ہاجرہ بانو کو طلاق نامہ بھجوادیا اور اس میں تین بار لفظ طلاق، طلاق، طلاق لکھا اور پہلی بیوی کا اور اس کے باپ کا نام ودیگر تفصیل لکھی، تو عرض یہ ہے کہ اس سے طلاق ہوئی یا نہیں؟ اور ہوئی تو کتنی ہوئی؟

شریعت کی روشنی میں کتابوں کے حوالہ کے ساتھ جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، صحیح سکہ ساتھ ہوتو اچھا؛ تاکہ کورٹ میں وکیل اور جج حضرات برابر سمجھ سکیں، جواب چاہے اردو میں ہو یا گجراتی میں، مفتی صاحب کی مرضی پر ہم سب راضی ہیں۔

نوٹ: سامان کی پہنچ لڑکے والے نے اپنی مرضی سے لکھا ہے، دولہن والے اس

سے بے خبر ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

طلاق نامہ میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں، اگر شوہر نے اپنی زبان سے بھی یہ الفاظ کہے ہیں، تو اس صورت میں تو اس کی بیوی پر تین طلاق واقع ہو کر وہ اس پر حرام مغلظہ ہو گئی، بغیر حلالۂ شرعی اس شوہر کے لیے اس عورت کے ساتھ نکاح درست اور جائز نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: ويقع طلاق كل زوج بالغ الخ (درمختار على هامش الشامي ٤٥٦/٢) لا ينكح مطلقة من نكاح صحيح نافذ كما سنحققه بها أي بالثلاث الخ (درمختار على هامش الشامي ٥٨٣/٢)

اور اگر اس نے زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے ہیں؛ البتہ بغیر کسی جبر و اکراہ شرعی اس نے خود لکھے ہیں، یا کسی سے لکھوائے ہیں، یا کسی کے لکھے ہوئے پر منظوری کے دستخط کئے ہیں، تب بھی اس کی عورت پر تین طلاق واقع ہو کر وہ اس پر حرام مغلظہ ہو گئی اور اگر کسی جبر و اکراہ شرعی کی وجہ سے اس نے لکھے یا دوسرے کے لکھے ہوئے پر دستخط کئے، تو اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوئی، جبر و اکراہ شرعی یہ ہے کہ اس کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی جائے، یا اس کے کسی عضو کو تلف کرنے کی یا ضرب شدید کی دھمکی دی جائے اور دھمکی دینے والا اپنی دھمکی پر عمل کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

حمل ساقط کرانے والی بیوی کو طلاق دینا

سوال: میرا نام شیخ شریف احمد کریم الدین ہے، میری شادی سن ۱۹۸۴ء

جولائی میں سلمہ سید چاند سے ہوئی، اللہ کے فضل سے میری چار اولاد ہیں، جن کی عمریں: ۵/سال، ۴/سال، ۳/سال، ڈیڑھ سال ہے، ان چار ڈیلیوری کی وجہ سے میری بیوی کی صحت بھی کمزور ہوگئی، اتفاق سے میری بیوی کو پانچواں حمل قائم ہوا، پچھلے ماہ اس کو ماہواری بھی نہیں آئی، یہ راز اس نے مجھ سے چھپایا، اپنے میکہ میں جاکر اس نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کیا، وہاں پر میری بیوی نے اپنا حمل بھی ساقط کروادیا اور آئندہ بچے نہ ہوں، اس کا آپریشن بھی کروایا، یہ سب باتیں مجھ سے چھپی ہوئی تھی، میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ کچھ پیٹھ میں تکلیف ہے اور ڈاکٹر نے چھوٹے سے آپریشن کے لیے کہا ہے اور یہ راز مجھ پر بعد میں کھلا کہ کوئی چھوٹا آپریشن نہیں تھا؛ بلکہ حمل ساقط کیا گیا ہے، اور آئندہ بچے نہ ہوں اس کا آپریشن کیا گیا ہے، یہ سب سن کر میں غصہ سے بے حال ہوگیا، میری رات کو نیند اڑ گئی، مجھے اپنی بیوی سے سخت نفرت ہوگئی، آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اسلام کی روشنی میں کیا اس کو طلاق دینے میں حق بجانب ہوں یا پھر میں اس سے زندگی بھر صحبت نہ کروں اور دوسری شادی کے بارے میں سوچوں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کی بیوی نے جو کچھ کیا، بہت غلط اور گناہ کا کام کیا ہے، اس پر ضروری ہے کہ اپنے اس گناہ پر توبہ واستغفار کرے اور آپریشن جو کرایا ہے، وہ اگر ایسا ہے کہ اس کی اصلاح ممکن ہے، مثلاً: دوبارہ آپریشن کرکے استقرارِ حمل کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، تو اصلاح بھی کرالے، اس کی اس حرکت پر آپ کو غصہ آیا، وہ بہت بجا ہے، معصیت پر غصہ آنا ایمان کا تقاضہ ہے اور اس کی اس حرکت پر آپ طلاق دینا چاہیں تو اس کی بھی اجازت

ہے؛ لیکن طلاق دینے سے پہلے دیگر پہلوؤں پر بھی غور کرنا ضروری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ طلاق دے کر آپ کسی ایسی پریشانی وزحمت کا شکار ہوں، جو موجودہ زحمت سے بڑھ کر ثابت ہو، آپ کو اس عورت سے چار بچے ہیں، چاروں خوردسال ہیں، اگر طلاق کے بعد عورت نے ان کی تربیت اور دیکھ بھال سے انکار کردیا، تو ان کی دیکھ بھال آپ کے لیے مستقل مسئلہ ہوگا، دوسری بیوی اگر لائے بھی، تو وہ شرعی اور قانونی اعتبار سے اس کی پابند نہ ہوگی، اخلاقی طور پر وہ یہ کام سنبھال بھی لے، تو اس میں کوتاہیاں ضرور ہوں گی، جو آپ کے لیے مستقل الجھن ثابت ہوں گی، اس بیوی کو اپنے نکاح میں باقی رکھتے ہوئے دوسری سے عقد کیا، تو دونوں کے حقوق کی ادائیگی، اور ان میں عدل ومساوات قائم کرنا بڑا مشکل ہوگا اور اس کے قائم نہ کرسکنے کی وجہ سے آپ مستحق وعید ہوں گے، اس لیے شریعت کی اس اجازت کو اختیار کرنے سے پہلے اس کے تمام عواقب ونتائج پر غور کرلیجئے، آپ میں تمام سے نمٹنے کی صلاحیت وقوت ہے، تو عمل میں لایئے، شریعت کا اصول ہے: ”إذا ابتلیت ببلیتین فاختر أهونهما“ (جب دو مصیبت میں گرفتار ہو تو ان میں جو ہلکی ہو اس کو اختیار کرو) آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اس عورت کا ذہن دینی بناتے، اتنے سال سے جب وہ آپ کے عقدِ نکاح میں ہے، تو اس کی دینی تربیت بھی آپ پر ہے: ﴿قوا انفسکم واهلیکم نارا﴾ (اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچاؤ) اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے اہل وعیال کی تربیت وتعلیم کو ضروری اور واجب بتلایا ہے، اس لیے مناسب تو یہ ہے کہ آج ہی سے آپ اس کی تعلیم اور احکامِ شرعیہ سے واقف کرانے پر توجہ اور محنت کیجئے کہ خود اس کو اپنی اس حرکت پر زندگی بھر ندامت کا احساس رہے۔ فقط واللہ

تعالیٰ أعلم۔ کتبہ: العبد احمد عفی عنہ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۶/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

حاملہ کو طلاق دینے کا عمدہ طریقہ

سوال: ہمارے محلّہ کا ایک لڑکا اپنی بیوی سے تنگ آکر اسے شرعی طریقے سے ایک طلاق دے دیا ہے، وہ طلاق ۹۰/۱۰/۹ کو دیا ہے، اس کا دوسرا طلاق کب دینا چاہئے، اور تیسرے طلاق کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ طلاق دینے کے بعد عدت کتنی ہوگی؟ وہ لڑکا مزدوری کرتا ہے، اور اس کی بیوی کو چار مہینے کا حمل ہے، اور ایک لڑکا تین سال کا ہے، شرعی طریقے سے اس کی عدت اور زچگی کا خرچ، بچے کے دودھ کا کیا مسئلہ ہوگا؟ ہمیں بتادیں، شرعی اصول کے مطابق تمہارا کیا فیصلہ ہوگا؟ مہربانی فرما کر ہمیں سمجھا دیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

طلاق کا مسنون طریقہ اور احسن وعمدہ طریقہ تو یہ ہے کہ جب اس نے اپنی حاملہ بیوی کو ایک طلاق دیدی ہے، تو اب آئندہ مزید کوئی طلاق نہ دے؛ بلکہ اس کی عدت ختم ہوجانے دے، جب عدت پوری ہوجائے گی، تو آپ ہی آپ وہ عورت اس کے نکاح سے نکلی ہوئی سمجھی جاوے گی، اس کی عدت وضع حمل یعنی بچہ پیدا ہونے تک ہے، دورانِ عدت وہ عورت اسی گھر میں رہے گی، اور اس کا نفقہ اس شوہر پر رہے گا بچہ پیدا ہونے پر عدت ختم ہوجاوے گی پھر بچہ کا نفقہ باپ پر ہے، اگر باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ کو اس کی ماں دودھ پلائے تو اجرتِ رضاعت یعنی دودھ پلانے کی اجرت اس کو دینا پڑے گی، بچہ کی پرورش کا حق ماں کو ہے، اور جب تک اس نے اجنبی کے ساتھ شادی نہ کی ہو، وہاں تک

وہی پرورش کی زیادہ حقدار ہے، اور اس کو پرورش کی اجرت بھی دینی پڑے گی، یعنی: باپ پر ضروری ہے کہ بچہ کی ماں کو پرورش کی اجرت ادا کرے، اور بچہ کی پرورش کا یہ حق، اگر لڑکا ہے تو اس کی عمر سات سال کی ہونے تک حاصل ہے، اور اگر لڑکی ہے تو اس کے بالغ ہونے تک حاصل ہے۔ (عالمگیری) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حالتِ حمل میں طلاق دینا

سوال: ایک عورت کو اس کے شوہر کا حمل چار ماہ کا تھا، شوہر نے عورت کے نام رقعہ لکھا کہ تجھے طلاق، طلاق، طلاق اور چند آدمیوں کے سامنے بھی اقرار کیا کہ میں طلاق دے چکا ہوں، صورتِ مسئولہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں اس عورت پر تین طلاق واقع ہو کر وہ اپنے شوہر کے لیے حرام ہوگئی، شرعی حلالہ کے بغیر اب اس شوہر کا عورت سے نکاح درست نہیں ہے، حالت حمل میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ (شامی جلد ثانی) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

طلاق دینے کے بعد شوہر انکار کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: شوہر نے بیوی سے جھگڑا کرتے ہوئے کہا کہ کان کھول کر سن، اور سترہ بار سن، اگر آج سے تو تیری ماں کے گھر گئی تو تجھے تین طلاق (اس جھگڑے کے ہونے کے

وقت میں اہل محلّہ کی کثیر تعداد جوکہ غیر مسلم تھی، وہ اور شوہر کی ماں بھی موجود تھی) اس معاملہ کے چند دن بعد شوہر نے بیوی کو سخت مار ماری، جس کی تاب نہ لاکر بیوی اپنی ماں کے گھر چلی گئی، اور ابھی تک مذکورہ عورت اپنی ماں کے گھر ہے، اس کے بعد سے وہ شوہر کے گھر نہیں گئی، اور اب شوہر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے بیوی کو طلاق دی ہی نہیں؛ مگر طلاق کی شہادت اہلِ محلّہ - جوکہ غیر مسلم ہیں - اور شوہر کی ماں وغیرہ سب دے رہے ہیں، تو کیا ان صورتوں میں مذکورہ عورت کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟ مدلل مفصل جواب تحریر فرمائیے، آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر شوہر نے بیوی کو یہ الفاظ کہے کہ ''اگر آج سے تو تیری ماں کے گھر گئی تو تجھے تین طلاق'' اور اس کے بعد عورت اپنی ماں کے گھر چلی گئی تو اس پر تین طلاق واقع ہوگئی۔

وتنحل اليمين بعد وجود الشرط مطلقاً الخ (درمختار على هامش الشامى ٢/ ٥٤٤)

صورتِ مسئولہ میں اگر عورت نے خود ان الفاظ کو سنا ہے تو شرعاً اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے اوپر شوہر کو قابو دے؛ بلکہ جس طرح بھی ممکن ہو اس سے علیحدگی اختیار کرے اور ہرگز اپنے اوپر قابو نہ دے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۳۰)

في التاتارخانية عن الملتقط: إذا سمعت المرأة الطلاق ولم تسمع الاستثناء لايسعها ان تمكنه من الوطء. اھ. اى فيلزمها منازعته. (شامى ٢/ ٥٥٤)

شوہر کی ماں کی گواہی صورتِ مذکورہ میں شوہر کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول ہے؛ لیکن غیر مسلم کی گواہی معتبر نہیں ہے، اور صرف ایک عورت کی گواہی (شوہر کی

ماں کی گواہی) سے نصاب شہادت پورا نہیں ہوتا، اس لیے احوط یہ ہے کہ جب تک شوہر خود اقرار نہ کرے یا اور کوئی گواہ شرعی میسر نہ آئے، وہاں تک عورت دوسری جگہ نکاح نہ کرے، اور اپنے اوپر شوہر کو جماع وغیرہ کی قدرت نہ دے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۳۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۵/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

طلاق کی شرط پر حلالہ

سوال: زید نے اپنی بیوی زینب کو تین طلاق دی، اب زید اسی عورت زینب کو دوسری مرتبہ اپنے نکاح میں واپس لانا چاہتا ہے، تو زید نے حلالہ کی صورت اختیار کی، اور حلالہ کی صورت اس طرح اختیار کی کہ زید نے خالد کو کہا کہ تو زینب سے شادی کرلے، اور شادی کے فوراً بعد زینب کو طلاق دیدیں، خالد نے اسی طرح کیا جس طرح زید نے کہا، تو اس صورت میں حلالہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اگر حلالہ صحیح نہیں ہوا تو اس کی کیا صورت ہے؟ اوپر والی صورت کے مطابق زید یا خالد میں سے کون گنہگار ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زید نے جب اپنی زوجہ زینب کو تین طلاقیں دیدیں ہیں تو وہ اس پر حرام ہوگئی، اب بدون حلالہ کے زید کا نکاح زینب سے درست نہیں، حلالہ یہ ہے کہ شوہرِ اول کی عدت گزرنے کے بعد زینب کے ساتھ دوسرا مرد بلا شرطِ طلاق نکاح کرلے، اور وہ اس کے ساتھ وطی بھی کرے اس کے بعد وہ خود کسی وجہ سے طلاق دے دیوے یا اس کا انتقال ہوجائے، تو اب عدت گزرنے کے بعد اس عورت کے ساتھ شوہرِ اول کا نکاح درست ہے، اگر شوہر

ثانی نے وطی نہیں کی ہے تو وہ عورت شوہر اول کے لے حلال نہیں ہوئی، شوہر ثانی کے ساتھ طلاق کی شرط لگانا مکروہِ تحریمی ہے۔ (درمختار مع الشامی ۲/ ۵۸۶، ۵۸۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

طلاق کی شرط پر حلالہ

سوال: ایک مرد نے اپنی عورت کو طلاقِ مغلظہ دی، یعنی تین طلاق صاف الفاظ میں دے دی ہے، اور تقریباً طلاق کے بعد ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اب وہ مرد دوبارہ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے، اور طلاق مغلظہ کی بناء پر صرف نکاح کافی نہیں ہے؛ بلکہ حلالہ شرط ہے، تو حلالہ شرعی طور پر کس طرح ہونا چاہئے؟ کیا آج کل جو ہمارے یہاں چل پڑا ہے کہ جس سے حلالہ کروایا جاتا ہے اس کو پہلے اس سے نکاح کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اور کہیں چھپ کر نکاح کر دیتے ہیں، اور نکاح سے پہلے اس کو تاکید بھی کی جاتی ہے کہ اس سے وطی کے بعد یا دو تین دن کے بعد طلاق دے دیں، تو اسی طرح جو ہمارے عرف میں حلالہ چل رہا ہے کر دیا جائے، اور اس کی عدت کے بعد شوہر اول سے نکاح کر دیا جائے تو وہ عورت اب شوہر اول کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر شوہر نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تو وہ عورت شوہر پر حرام ہوگئی؛ البتہ اگر اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے مرد نے عدت گزرنے کے بعد نکاح کیا، اور اس کے ساتھ وطی بھی کی، اور پھر اس دوسرے شوہر کا انتقال ہوگیا یا کسی وجہ سے اس نے طلاق دیدی، تو اب عدتِ وفات یا عدت طلاق گزرنے کے بعد یہ عورت پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے، اسی کو شریعت کی اصطلاح میں حلالہ کہتے ہیں، باقی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح

کرتے وقت پہلے سے یہ شرط ٹھہرالینا کہ تو ایک دو دن اپنے پاس رکھ کر وطی کے بعد طلاق دے دینا یہ مکروہ تحریمی (حرام کے قریب) ہے، اور حدیث پاک میں اس پر لعنت بھی آئی ہے؛ لیکن اس کے باوجود وہ عورت اس صورت میں پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے گی، ہاں یہ سب گنہ گار ہوں گے۔ (شامی ۲/ ۵۸۶، فتح القدیر ۴/ ۱۸۲، ۱۸۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

وقوعِ شرط کے بعد منسوبہ پر طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال: زید اور خالد دونوں آپس میں دوست ہیں، اور دونوں کے دونوں شرابی ہیں، ایک دن دونوں آپس میں وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نے آج ہی سے شراب کو ترک کر دیا؛ لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر سے شراب پیتے ہیں، ایسا بہت سی مرتبہ ہوتا ہے کہ شراب پیتے ہیں اور اس کے بعد شراب کے ترک کا وعدہ کرتے ہیں، آخر ایک دن زید نے سوچا کہ طلاق کی قسم کھالوں تب جا کر میرے سے شراب ترک ہوگی، اخیر میں زید نے قسم کھالی کہ اگر میں شراب پیوں تو میری بیوی ہندہ کو طلاق، پھر کچھ دنوں کے بعد زید نے شراب پی لی، اس صورت میں کیا طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر طلاق واقع ہوگی تو کتنی؟ اگر نہیں واقع ہوگی تو کیوں نہیں واقع ہوگی؟ مدلل جواب دیجیئے۔

نوٹ: زید کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی، ہاں منگنی ہو چکی تھی، اور جس کے ساتھ منگنی ہوئی تھی اس کو کبھی نہ دیکھا تھا، اور نہ جانتا تھا، اور نہ پہچانتا تھا، ہاں اس کا نام لوگوں سے سنا تھا کہ اس کا نام ہندہ ہے، اس کی ماں کو بھی نہیں دیکھا تھا، ہاں باپ کو دیکھا تھا صرف دو تین مرتبہ، پھر دو مہینہ کے بعد زید کی شادی اسی لڑکی ہندہ سے ہوگی۔

ہوشیار: منگنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسی لڑکی سے شادی کرنا؛ بلکہ جانبین کو سکون ملتا ہے اس بات کا کہ لڑکی یا لڑکا ڈھونڈ نا نہیں پڑے گا، ہاں جانبین کو اختیار ہے اس بات کا کہ جب چاہے منگنی توڑ سکتے ہیں، اس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔

درمختار میں ہے: شرطه الملك حقيقة .... او حكما، ولو حكما كقوله لمنكوحته أو معتدته ان ذهبت فانت طالق، أو الاضافة إليه اى الملك الحقيقي الخ (درمختار على هامش الشامى ۵۳۷/۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۶/ رجب ۱۴۰۸ھ

کورے اسٹامپ پیپر پر دستخط سے طلاق

سوال: میرے اور میری بیوی کے درمیان بہت عرصہ سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا، میرا بھائی مجھے کہتا تھا کہ تو اس کو استعفی نامہ (طلاق نامہ) لکھ دے؛ لیکن میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، ایک مرتبہ میرے اور میری بیوی کے درمیان بہت سخت جھگڑا ہوا، اب تو میرا بھائی اور دوسرے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے کہ تجھے استعفی نامہ لکھنا ہی ہوگا؛ چنانچہ وہ چار اسٹامٹ پیپر لے کر آئے جو بالکل کورے تھے، اور مجھے مجبور کیا کہ اس پر انگوٹھے سے نشان کر دے، میں نے نشان کر دیا؛ لیکن زبان سے طلاق کا لفظ بالکل نہیں بولا، میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے زبان سے طلاق کا لفظ بالکل نہیں کہا، اور وہ اسٹامپ پیپر بھی بالکل کورے تھے، کیا اس صورت میں طلاق پڑ جائے گی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر بھائی کے جبر سے کورے اسٹامپ پیپر پر دستخط کر دئے ہیں، اور زبان سے طلاق کے الفاظ نہیں بولے ہیں، تو اس سے طلاق نہیں ہوئی۔

كل كتاب لم يكتبه بخطه ولم يمله بنفسه لا يقع الطلاق مالم يقر أنه كتابه. (شامی ۲/۴٦٥) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

وقوعِ طلاق میں اضافتِ معنویہ کافی ہے

سوال: زید کا اپنی بیوی سے معمولی بات پر گھریلو جھگڑا ہوا جو طوالت پکڑ گیا، اور زید نے غصہ کی حالت میں جب کہ اس کی بیوی گھر کے اندر تھی، زید باہر کے کمرے میں تھا، اور صرف طلاق طلاق دس مرتبہ کہا جو کہ بیوی نے سنا؛ لیکن بیوی نے اقرار نہیں کیا، اور اس وقت کچھ لوگ وہاں پر موجود تھے، زید کی بیوی حاملہ تھی ۴/۵ مہینے کا حمل تھا، اس حالت میں طلاق ہوئی یا نہیں؟ اگر طلاق ہوگئی تو کون سی، اگر نہیں ہوئی ہے تو اس کا کفارہ ہے یا نہیں؟

نوٹ: زید نے ''میں نے تجھے طلاق دیا یا دی'' ایسے الفاظ نہیں کہے صرف طلاق طلاق دس مرتبہ کہا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاقِ مغلظہ واقع ہو کر وہ زید پر حرام ہوگئی، بغیر حلالہ شرعیہ کے اب زید کا نکاح اس عورت کے ساتھ درست نہیں ہے، حالتِ حمل میں

بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

لا ينكح مطلقة من نكاح صحيح نافذ كما سنحققه بها اي بالثلاث لـو حرة، وثنتين لو أمة؛ حتى يطأها غيره، ولو مراهقاً بنكاح وتمضى عدته. (تنوير الابصار) و(العدة) في حق الحامل مطلقاً الخ (درمختار) اي سواء كان عن طلاق او وفاة الخ (شامی ۲/۶۵۵)

وقوعِ طلاق کے لیے فقہاء نے جس اضافت الی المرأۃ کو شرط قرار دیا ہے، اس سے مراد اضافتِ معنویہ ہے، خواہ نام سے ہو، خواہ ضمیر سے، خواہ دلالتِ حال سے، صورتِ مسئولہ میں شوہر کا بیوی کے ساتھ جھگڑا ہونا اضافتِ معنویہ کے لیے دلالت حالی ہے، جو وقوع طلاق کے لیے کافی ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ دارالعلوم، عزیز الفتاوی مطبوعہ ا/ ۴۷۷ وغیرہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

انسداد طلاق کے لیے کمیٹی بنانا

سوال: ہمارے گاؤں (کاکوسی) میں الحمدللہ مسجد اور مدرسہ کا نظام پورے گاؤں کے اتفاق اور اتحاد کے ساتھ چل رہا ہے، اور الحمدللہ پورا گاؤں متولی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اب مسجد اور مدرسہ کے امور کے علاوہ روزمرہ نئے نئے مسائل پیش آتے ہیں، من جملہ ان کے میاں بیوی کے درمیان تنازع اور طلاق کا مسئلہ ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس دور میں عورتوں کی کثرت ہے، جس کی بناء پر طلاق کے بعد فوراً دوسری شادی

ہوجاتی ہے؛ نیز بعض دفعہ کسی کی طرف سے شوہر کو اکسایا جاتا ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے، میں اپنی لڑکی سے تیرا نکاح کردوں گا؛ نیز ماں باپ کی دخل اندازی کی وجہ سے بھی شوہر طلاق دینے پر مجبور ہوجاتا ہے؛ باوجودیکہ میاں بیوی کے درمیان اتفاق ہے، اور بعض مرتبہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بھی طلاق دی جاتی ہے؛ نیز اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری برادری کا کاروباری تعلق زیادہ تر بمبئی سے ہے، اب ہمارے نوجوان بمبئی کے ماحول اور مغربی تہذیب سے متأثر ہوکر وطن آتے ہیں تو اپنی عورتوں کو ناپسند کرتے ہیں، جس کی وجہ سے گھر میں نااتفاقیاں شروع ہوجاتی ہیں اور بگاڑ ہوتے ہوتے بسا اوقات طلاق تک کی نوبت پہونچ جاتی ہے، یا پھر عورت اپنے حقوق سے محروم اور مظلوم ہوکر زندگی بسر کرتی ہے، اس مسئلہ کے حل کے لیے سارے گھر پریشان تھے؛ چنانچہ گاؤں کے ذمہ داروں نے پورے گاؤں کے لوگوں کو جمع کرکے ایک مٹینگ کی، اور اس میں طلاق کی کثرت نہ ہو، اس کے لیے کیا کیا جائے؟ سوچا گیا، متفقہ طور پر یہ بات طے ہوئی کہ ایک کمیٹی بنائی جائے، اور جس کے گھر میں بھی میاں بیوی کے درمیان نااتفاقی کی بات پیش آئے تو وہ کمیٹی سے رجوع کرے، اب کمیٹی طرفین کی بات سن کر غور کرے اور طرفین میں سے جس کا قصور ہو اس کو سمجھائے، اور اگر شوہر کے والدین کا اس میں قصور ہے تو ان کو سمجھائے، اور جوڑ کرنے کی کوشش کرے، اور اگر ان صورتوں میں سے کسی صورت سے کام نہیں چلتا تو کمیٹی شوہر سے کہہ دیتی ہے کہ تم اپنا حق طلاق استعمال کرسکتے ہو۔

اب اگر کوئی آدمی کمیٹی سے رجوع کئے بغیر طلاق دیدے تو اس کے بارے میں کیا کیا جائے؟ پورے گاؤں کے لوگوں سے مشورہ طلب کیا گیا تو بہت سے لوگوں نے

رائے دی کہ کمیٹی کو اختیار ہے چاہے پچاس ہزار کا جرمانہ لازم کرے، چاہے پچیس ہزار کا، چاہے پانچ ہزار کا، اور یہ جرمانہ چاہے مطلقہ کو دلوادے یا کسی اَور مصرف میں استعمال کرے، اس کا فیصلہ کمیٹی پر موقوف ہے، وہ جو مناسب سمجھے اقدام کرے۔

اس کے بعد پورے گاؤں کے لوگوں سے پوچھا گیا کہ کیا سب کو یہ منظور ہے؟ اگر کسی کو اختلاف ہو یا منظور نہ ہو تو وہ اپنے اختلاف کو ظاہر کردے، پورے گاؤں نے متفق علیہ اس کو منظور کرلیا، اور بارہ آدمیوں کی کمیٹی بنادی؛ چنانچہ اس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ دس بارہ جگہوں پر طلاق کی نوبت پہنچ چکی تھی، اور طے تھا کہ طلاق ہوجائے گی؛ لیکن الحمدللہ کمیٹی بننے سے گاؤں پر اتنا رعب پڑا کہ وہ طلاقیں رک گئیں، اور اب وہ خاندان خیروعافیت کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں، اب ہم کمیٹی والوں کے لیے مسائل درپیش ہیں کہ اگر کسی نے کمیٹی کے علم میں لائے بغیر ناحق طلاق دی تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کریں کیا؟ تعزیز بالمال جائز ہے؟ یا عدت کا نان نفقہ مثلاً پندرہ سو روپیہ ہوتا ہے، اس کو بڑھا کر پانچ ہزار مطلقہ کو دلوا سکتے ہیں؟ یا دو تین سال کے لیے اس لڑکے اور اس کے والیوں پر پابندی لگائی جائے کہ اس کی شادی نہ ہو، یا اور کوئی شکل شرعاً جواز کی ہو (کہ جس کے ذریعہ سے مطلقہ اور اس کے والیوں کے آنسوؤں کو پونچھا جاسکے، اور آئندہ اس جرم کی ہمت کسی اور کو نہ ہو، اور ناحق طور پر آئندہ نئی طلاقیں نہ ہوں) تو اس کو واضح فرمائیں، اگر مجرموں کو سزا نہیں دی جاتی تو پھر طلاقوں کا دروازہ کھل جاتا ہے، اور مجبوراً مسلم عورتیں کورٹوں میں جانا شروع کردیں گی، اور شاہ بانو والے کیس کی نوعیت ہم سب کے سامنے ہے؛ لہٰذا ہماری رہبری فرمائیں۔

نوٹ: آیا ہماری اس کمیٹی کو شرعی پنچ کی حیثیت دی جاسکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اسلامی اصول کا رخ یہ ہے کہ جن مرد وعورت میں اسلامی اصول کے مطابق ازدواجی تعلق قائم ہو وہ پائیدار اور عمر بھر کا رشتہ ہو، جس سے ان دونوں کا دنیا ودین بھی درست ہو، اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد کے اعمال واخلاق بھی درست ہوں، اسی لیے نکاح کے معاملہ میں شروع سے آخر تک ہر قدم پر اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ اس تعلق کو تلخیوں اور رنجشوں سے پاک صاف رکھنے کی، اور اگر کبھی پیدا ہو جائے تو ان کے ازالہ کی پوری کوشش کی گئی ہے؛ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بعض اوقات طرفین کی زندگی کی فلاح اسی میں منحصر ہو جاتی ہے کہ یہ تعلق ختم کر دیا جائے، اس لیے اسلام نے قوانینِ نکاح کی طرح طلاق کے بھی اصول وقواعد مقرر فرمائے؛ مگر ساتھ ہی یہ ہدایات بھی دے دیں کہ طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت مبغوض ومکروہ کام ہے، جہاں تک ممکن ہو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ حدیث میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تزوجوا ولا تطلقوا، فان الطلاق یهتز منه عرش الرحمن یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ طلاق سے عرشِ رحمٰن ہل جاتا ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو طلاق نہ دو بغیر کسی بدکاری کے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان مردوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف ذائقہ چکھنے والے ہیں، اور ان عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف ذائقہ چکھنے

والی ہیں۔ (قرطبی بروایت ثعلبی) اور دار قطنی نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے زمین پر جو کچھ پیدا فرمایا ہے، ان سب میں اللہ کے نزدیک محبوب غلاموں کو آزاد کرنا ہے، اور جتنی چیزیں زمین پر پیدا کی ہیں، ان سب میں مبغوض ومکروہ طلاق ہے۔ (از قرطبی)

بہر حال اسلام نے اگر چہ طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی؛ بلکہ تابمقدور اس سے روکا ہے لیکن بعض ضرورت کے مواقع میں اجازت دی، تو اس کے لیے کچھ اصول وقواعد بنا کر اجازت دی، جن کا حاصل یہ ہے کہ اس رشتۂ ازدواج کو ختم کرنا ہی ضروری ہو جائے تو وہ بھی خوب صورتی اور حسن معاملہ کے ساتھ انجام پائے، محض غصہ نکالنے اور انتقامی جذبات کا کھیل بنانے کی صورت نہ بننے پائے۔ (معارف القرآن ۸/ ۴۷۷، ۴۷۸ بحذف یسیر) بنا بریں معاملۂ طلاق میں ہونے والی بے اعتدالیوں اور حکمِ شرعی کی خلاف ورزیوں کے سدِ باب کے لیے آپ حضرات نے تمام باشندگانِ بستی کے اتفاقِ رائے سے جو کمیٹی تشکیل دی ہے یہ مستحسن اور قابلِ تعریف ہے۔ ارشاد ربانی ہے: تعاونوا علی البر والتقوی (نیکی اور خدا ترسی کے کاموں میں تعاون کرو) مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف یا ظلم وجور کی طرف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد نہ کرو؛ بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے؛ تاکہ ظلم وجور سے اس کی دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو۔

''صحیح بخاری ومسلم'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أنصر أخاك ظالما أو مظلوما یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم،

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو قرآنی تعلیم میں رنگے جا چکے تھے، انھوں نے حیرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! مظلوم بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے؛ مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو، یہی اس کی امداد ہے۔ (معارف القرآن ۳/۲۴) بر و تقویٰ پر تعاون اور امداد کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الدال علی الخیر کفاعله. یعنی جو شخص کسی کو نیکی کا راستہ بتاوے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اس نے خود کیا ہو۔ الخ (معارف القرآن ۳/۲۵)

امام بخاریؒ نے "الجامع الصحیح" کی "کتاب الادب" میں ایک باب قائم فرمایا ہے: "باب الاخاء والحلف" اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے علامہ عینیؒ کے حوالہ سے علامہ نوویؒ کا کلام نقل فرمایا ہے: قال النووي: لا حلف في الاسلام، معناه حلف التوارث وما يمنع الشرع منه، وأما المواخاة والمحالفة على طاعة اللّٰه تعالىٰ والتعاون على البر فلم ينسخ، إنما المنسوخ مايتعلق بالجاهلية. اھ

اس کے بعد فرماتے ہیں: ولا يبعد عندى أن يقال أن الاخاء والحلف يشمل ما اشتهر فی هذا الزمان باسم کمیٹی بنانا۔ (الابواب والتراجم ۶/۱۱۹) یعنی میرے نزدیک "الاخاء والحلف" دورِ حاضر میں جو کمیٹی بنائی جاتی ہے اس کو بھی شامل ہے، اور جیسا کہ علامہ نوویؒ کے کلام سے معلوم ہوا کہ احکامِ خداوندی کی بجا آوری اور امورِ خیر میں تعاون اور مواخات درست ہے، اس لیے آپ حضرات کا یہ اقدام قابلِ ستائش اور شرعاً درست ہے۔

اب کمیٹی کے کام کی نوعیت باقی رہ جاتی ہے تو سوال میں اس کی جو تفصیل مذکور ہے، وہ درست ہے؛ البتہ ارکان کمیٹی کے لیے ضروری ہے کہ یہ متعین کرنے میں بڑی احتیاط برتیں کہ شوہر نے جو طلاق دی ہے، وہ شرعاً درجۂ مباح میں آتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں شرعی ہدایات پیش نظر ہونی چاہئے؛ نیز نفس نکاح کے لیے شریعتِ مطہرہ نے جو ہدایات دی ہیں ان سے بھی تمام باشندگان بستی کو واقف کرنا ضروری ہے، اس سے بھی بہت سے واقعاتِ طلاق کی پیش بندی ہوسکتی ہے، بعض مرتبہ والدین لڑکے یا لڑکی کی رضامندی کے بغیر دونوں کو دباؤ ڈال کر رشتۂ نکاح سے جوڑ دیتے ہیں، بالآخر یہ رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے اور طلاق کی نوبت آتی ہے، آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق دینے والی صورت کو آپ شرعاً ممنوع سمجھ رہے ہیں؛ حالانکہ اگر لڑکی بانجھ ہے تو اس صورت میں طلاق کا مباح ہونا معلوم ہوتا ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ طبی معائنہ کرایا جائے کہ نقص کس میں ہے؟ وغیرہ۔

اب آخری اور بنیادی سوال یہ ہے کہ جو آدمی کمیٹی سے رجوع کئے بغیر طلاق دیدے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اس کے لیے مالی جرمانہ کی صورت مقرر کی گئی ہے وہ شرعاً درست نہیں۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''تعزیر بالمال امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ناجائز ہے۔ وعند ابی یوسفؒ یجوز التعزیر بأخذ المال للسلطان، وعندهما وباقی الائمة الثلاثة لایجوز، کذا في فتح القدیر، عالمگیری. اور اگرچہ امام ابویوسفؒ نے تعزیر بالمال کو جائز فرمایا ہے؛ مگر اس سے مراد یہ ہے کہ بادشاہ اس کے مال کو ایک مدت مناسبہ تک روک لے، اور

جب سمجھے کہ اب زجر حاصل ہوگیا پھر واپس کردے، نہ یہ کہ بالکل خود اپنے لیے یا بیت المال کے لیے ضبط کرلے۔

ومعنى التعزير بأخذ المال على القول به امساك شيء من ماله عنده مدة لينزجر، ثم يعيده الحاكم اليه، لا أن يأخذه الحاكم لنفسه او لبيت المال، كما يتوهمه الظلمة اذ لايجوز لاحد من المسلمين اخذ مال أحد بغير سبب شرعي، كذا في البحر الرائق، عالمگیری. پس یہ احمقانہ (مالی جرمانہ) لینا، اور اس کا مصارف مذکورہ میں یا کسی اور مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں؛ بلکہ جن سے لیا ہے ان کو واپس دینا لازم ہے، ہاں ایسے لوگوں کے زجر اور ایسی باتوں کو بند کرنے کے لیے یہ جائز ہے کہ ایسے لوگوں کو پنچایت اور برادری سے خارج کردیا جائے، اور جب تک وہ اس فعل سے توبہ نہ کریں ان کے ساتھ برادری کے تعلقات نہ رکھے جائیں" (کفایت المفتی ۲/۱۶۵)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

مالی جرمانہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں، منسوخ ہے، اگر لیا ہو تو اس کی واپسی لازم ہے، انسدادِ جرائم کے لیے ارشاد، تلقین، تذکیر، تزکیۂ باطن کی ضرورت ہے؛ تاکہ دل میں خوف وخشیت پیدا ہو،، جنت ودوزخ کا استحضار، قبر، قیامت، حشر، حساب کتاب، خدائے قہار کی عظمت اور اس کے انعامات کا مراقبہ لازم ہے؛ تاکہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی رغبت ہو، ورنہ محض سختی سے اصلاح نہیں ہوتی، اگر ہوتی ہے تو عارضی ہوتی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۵/۱۸۴، ۱۸۵)

"مال کا جرمانہ شرعاً ناجائز ہے، اگر مجرم کے ذمہ حقوق العباد ہے، تو ان کو ادا

کرے یا معاف کرائے، اور خدا کے سامنے صدقِ دل سے توبہ کرے، امید ہے کہ قصور معاف ہوجائے گا، اگر آئندہ بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اس کو ترک تعلق کی سزا دی جائے''۔ (فتاویٰ محمودیہ ۵/۲۱۱)

مال کا جرمانہ ناجائز ہے، احکامِ شرعیہ کی پابندی کے لیے کوئی دوسری سزا ترک تعلقات وغیرہ کی دی جائے۔ (ایضاً ۵/۲۲۲)

دوسری صورت جو آپ نے تجویز فرمائی ہے کہ عدت کا نان نفقہ مثلاً پندرہ سو ہوتا ہے اس کو بڑھا کر پانچ ہزار مطلقہ کو دلوانا، تو یہ بھی درست نہیں؛ اس لیے کہ جو علت تعزیر بالمال کے ممنوع ہونے کی تھی، وہی یہاں بھی موجود ہے۔ لقوله عليه الصلوٰة والسلام ''لايحل مال إمرأ مسلم امرئ إلا بطيبة من نفسه'' البتہ اگر شوہر یہ جانتے ہوئے کہ نفقۂ عدت کی مقدار تو پندرہ سو روپئے ہی ہے اور میرے اوپر زیادہ واجب نہیں ہے، اپنی دلی رضامندی سے بلا کسی دباؤ کے پانچ ہزار دیتا ہے، تو عورت کے لیے اس کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کتنے ہیں؟ نیز یہ چیز کمیٹی کے دائرۂ اختیار سے باہر کی ہے، جس سے یہاں بحث نہیں۔

تیسری صورت پابندئ نکاح والی جو دریافت فرمائی ہے، یہ بھی مزاج ومقتضائے شریعت کے خلاف ہے، احادیث میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا واقعہ، اور آیتِ قرآنی: ﴿ولا تعضلوهن ان ينكحن ازواجهن﴾ الخ (سورۂ بقرہ) کا نزول پیش نظر رہے، مشائخِ حنفیہ تو آیتِ کریمہ میں ﴿لاتعضلوهن﴾ کو ''لا تضيقوا عليهن في التزويج'' ہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ (احكام القرآن للتهانوى ۱/۵۳٦، احكام القرآن للجصاص ۱/٤۰۰)

جب شریعت نے اولیاء کو اس سے روکا ہے تو غیر اولیاء (جن میں کمیٹی بھی داخل ہے) کے لیے ایسا کرنا کب جائز ہوسکتا ہے؟ اس لیے آپ کے لیے ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، اور وہ ہے سماجی بائیکاٹ کی۔

لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رہیں: پہلی یہ کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے بقول ''جماعت سے خارج کرنا ان گناہوں کے ارتکاب سے ہوتا ہے جو قطعی حرام ہیں، اور جن سے مسلمانوں کی سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے''۔ (کفایت المفتی ۹/۹۴، ۹۵)

اس لیے طلاق دینے کی وہ صورتیں جو شرعاً حرام ہیں، ان میں تو آپ یہ سزا تجویز کرسکتے ہیں، اس کے علاوہ صورتوں میں نہیں۔

دوسری بات وہی ہے جو اوپر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدظلہم کے جواب میں نقل ہوچکی (جس پر سرخ خط کھینچ دیا گیا ہے) کہ یہ سزا کے سب طریقے عارضی طور پر مفید ہوتے ہیں، اصلی علاج یہ نہیں ہے، اصلی علاج تو سماج اور معاشرہ کی ایسی تربیت واصلاح ہے کہ سماج کے ہر فرد کے اندر ایمانی روح سرایت کرجائے، اور ہر حکم خداوندی کی بجا آوری کے لیے وہ دل وجان سے تیار ہو، اس موقعہ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا ارشاد جو اسی آیتِ طلاق کی تفسیر کے ذیل میں ہے نقل کرتا ہوں۔

فرماتے ہیں: قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لیے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے: جن میں سے پہلے جملے میں روزِ قیامت کے حساب اور جرائم کی سزا سے ڈرا

کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لیے آمادہ فرمایا۔ دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفاسد اور انسانیت کے لیے مضرتیں ہیں، ان کو بتلا کر قانون کی پابندی کے لیے تیار کیا۔ تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمھاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمھاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم کا یہ اسلوب اور طرز بیان صرف یہیں نہیں؛ تمام احکام میں جاری ہے کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب وعذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پیچھے ﴿اتقوا اللّٰه﴾ یا ﴿ان اللّٰه خبير بما تعملون﴾ ﴿ان اللّٰه بما تعملون بصير﴾ وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبۂ زندگی پر حاوی قانون ہے، اس میں حدود وتعزیرات کا بھی بیان ہے؛ لیکن اس کی ادا ساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرزِ بیان حاکمانہ سے زیادہ مربیانہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحقِ سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کہ انھوں نے ایک قانون بنا دیا اور شائع کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتتا ہے، اس کے علاوہ اس اسلوب قرآن اور اس کے مخصوص انداز بیان سے ایک دور رس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سننے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بناء پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی؛ بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ

تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اسی فکر کی بناء پر اس کا ظاہر و باطن، خفیہ وعلانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو؛ کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ قرآنی تعلیم نے جو اصولِ معاشرہ تیار کئے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا ہے۔ قرآنی نظامِ حکومت کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود وقیود کا ذکر ہے، تو دوسری طرف ترغیب وترہیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق وکردار کو ایسا بلند کیا گیا کہ قانونی حدود وقیود اس کے لیے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان میں جرم وسزا کے واقعات پر گہری نظر ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوئی، محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا، جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف وعظمت کا سکہ آپ کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔ (معارف القرآن ۱/ ۵۷۷، ۵۷۸)

اس لیے ارکان کمیٹی اور تمام ذمہ دار حضرات کو چاہئے کہ اسی روش پر گامزن ہوں، یہی اصل علاج ہے، علماء حضرات اس مقصد کو اپنا مشن بنائیں، اور اس کے لیے اپنے کو فارغ کریں، کبھی ضرورت پیش آئے تو تعزیری کارروائی حدودِ شرع کے اندر رہ کر انجام دیں، باقی محض تعزیرات والا طریقہ دیرپا نہیں ہے؛ بلکہ ایک مدت کے بعد شریعت

اور ذمہ داران کے خلاف بغاوت کا علم اٹھانے کا ذریعہ ہے، اور عورتوں کی اشک شوئی بھی حقیقی طور پر نہیں ہوگی، بہت بہت تو اتنا ہوگا کہ طلاق کا سدِ باب ہوگا؛ لیکن ازدواجی زندگی کی تلخی میں اضافہ ہوگا، بستی والوں سے اگر یہ بات بھی منظور کرالی جائے کہ امور متنازعہ میں فیصلہ صادر کرنے کا کام بھی کمیٹی انجام دے گی، تو اس کو شرعی پنچ کا بھی درجہ حاصل ہوجائے گا، اس صورت میں کمیٹی میں ایسے عالم کا ہونا بھی ضروری ہے جو مسائلِ فقہ کا ماہر ہونے کے ساتھ تجربہ کار بھی ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ڈرانے کے لیے طلاق نامہ لکھوانے سے طلاق

سوال: ایک شخص نے کاتب سے کہا کہ تم میری بیوی کے نام طلاق نامہ لکھو، اس نے طلاق نامہ لکھا، یہ معلوم نہیں کہ کتنی طلاقیں طلاق نامے میں لکھی گئیں، (یعنی ایک، دو، تین) اس کے بعد شخصِ مذکور نے اس پرچہ پر نہ دستخط کیے، نہ پڑھا اور نہ پڑھوا کر سنا اور نہ زبان سے کچھ کہا، اور اب یہ شخص قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نے کاتب سے طلاق لکھوا کر صرف اپنی بیوی کو ڈرانے اور دھمکانے کا ارادہ کیا ہے، بیوی کو طلاق دینے کی غرض سے بخدا ایسا نہیں کیا ہے، پھر اس طلاق نامہ کو اس شخص نے ڈاک میں ڈال دیا ہے، اب ایک ماہ کے بعد اس عمل مذکور کے یہ شخص اپنی بیوی کو لانا چاہتا ہے، اب آپ یہ مسئلہ بتائیں کہ مذکورہ صورت میں شخص مذکور کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اور اب بغیر تجدیدِ نکاح اس کو لاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب شوہر کو اس بات کا اقرار ہے کہ میں نے ہی کاتب سے طلاق نامہ لکھوایا ہے، اور روانہ کیا ہے، اس کے آخر میں دستخط بھی چاہے نہ کئے ہوں، تب بھی اس کی بیوی مطلقہ ہوگئی، محض ڈرانے دھمکانے کی نیت سے یہ کام کیا، پھر بھی وقوع طلاق میں کوئی تردد نہیں ہے، طلاق نامہ میں جتنی طلاقیں لکھی گئی ہیں اس کے مطابق طلاق واقع ہوگی۔

ولو قال للكاتب: أكتب طلاق إمرأتي، كان اقرارا بالطلاق وإن لم يكتب، ولو استكتب من آخر كتابا بطلاقها، وقرأه على الزوج، فاخذه على الزوج وختمه وعنونه وبعث به إليها، فاتاها وقع، إن أقر الزوج أنه كتابه، أو قال للرجل: إبعث به إليها، أو قال له أكتب نسخة وابعث بها إليها .... وكذا كل كتاب لم يكتبه بخطه ولم يمله بنفسه لا يقع الطلاق مالم يقر أنه كتابه. اهـ (شامی ۲/٤٦٥)

أو هازلا لا يقصد حقيقة كلامه. (درمختار) (قوله لا يقصد حقيقة كلامه) بيان لمعنى الهازل وفيه قصور، ففي التحرير وشرحه: "الهزل" لغة اللعب، واصطلاحا: أن لا يراد باللفظ، ودلالته المعنى الحقيقي ولا المجازى؛ بل أريد به غيرهما، وهو مالا تصح ارادته منه، وضده الجد الخ (شامی ۲/٤٥٩)

وكذا كونه عامدا ليس بشرط؛ حتى يقع طلاق الخاطئ، وهو الذي يريد أن يتكلم بغير الطلاق، فسبق لسانه بالطلاق، لأن الفائت بالخطأ ليس إلا القصد، وأنه ليس بشرط لوقوع الطلاق. (بدائع الصنائع ۳/۱۰۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

زبردستی کی طلاق کا حکم

سوال: (۱) ایک شخص سے مار پیٹ کر کے اس کی بیوی کو تین طلاق جبراً دلوادی، یہ طلاق شریعت کی رو سے واقع ہوئی یا نہیں؟ اور شخص مذکور یعنی جس کو جبراً مار پیٹ کر طلاق دلوائی اس کے دو بچے بھی ہیں، اور تقریباً بیس ہزار کے زیورات بھی چھین کر لے گئے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر شوہر نے اپنی زبان سے طلاق کا تلفظ کیا ہے، تو یہ طلاق واقع ہوگئی۔

أو مكرها فإن طلاقه صحيح. (درمختار) (قوله فإن طلاقه صحيح) أي طلاق المكره. (شامی ۴۵۶/۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیوی کو تنگ کرنے والے سے خلاصی کی صورت

سوال: ایک شادی شدہ عورت ہے، جس کا ایک لڑکا بھی ہے، اور اس عورت کا شوہر اس کو بہت تنگ کرتا ہے، مارتا ہے اور پریشان کرتا ہے، اس لیے لڑکی اپنے باپ کے گھر میں آکر بیٹھی ہے، اور اس کو باپ کے گھر میں ایک سال ہوگیا، اس مدت میں اس کے شوہر نے ایک دوسرا نکاح کرلیا، اب لڑکی والے پریشان ہوکر طلاق مانگ رہے ہیں؛ مگر وہ طلاق دینے سے انکار کررہا ہے، اس صورت میں لڑکی کیا کرے؟ کیا اسی طرح اپنی زندگی غم کے گھونٹ پی پی کر گزارے یا اپنے شوہر کے گھر جا کر اپنی زندگی کو اور پریشانی میں ڈالے یا کچھ اور کرے، معاملہ ذرا سنگین ہے، اس لیے جلد جواب روانہ کرنا، دعائے خیر میں اس سیاہ کار کو یاد فرمانا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر لڑکی کے لیے اپنے موجودہ شوہر کے ساتھ رہ کر زندگی گزارنا دشوار ہے، تو مناسب یہ ہے کہ بااثر ورسوخ ذمہ دار حضرات کو درمیان میں ڈال کر اپنا مہر (اگر اس کی ادائیگی باقی ہے تو اس) کے عوض میں، یا وصول کر چکی ہے تو اتنی مقدار دے کر خلع کر لے، اور عدت کے بعد دوسری جگہ نکاح کرے۔ لقولہ تعالیٰ ﴿فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ﴾ الخ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

شرابی شوہر سے خلاصی کی صورت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ فریدہ اپنے شرابی شوہر سے تنگ آ کر علاحدگی اختیار کرتی ہے، اور خلع لینا بھی اس کے لیے مشکل ہے؛ کیونکہ سماج کا سوال ہے، اور فریدہ کا شوہر بھی طلاق دینا نہیں چاہتا، ایسے نازک حالات میں فریدہ کا علاحدہ زندگی اختیار کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ صحیح ہے تو کرم اللہ کا! ورنہ اس کا نعم البدل طریقہ ارشاد فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فریدہ کا شوہر شرابی ہونے کی وجہ سے اس کے حقوق زوجیت ادا نہیں کرتا، جس کی بنا پر نباہ دشوار ہے، تو بہتر صورت یہ ہے کہ کسی طرح لالچ دے کر یا ڈرا کر شوہر سے طلاق لے لی جائے یا خلع کر لیا جائے، قرآن شریف میں آیا ہے۔ ﴿فان خفتم ان لا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ﴾ اسی کو خلع کہتے ہیں؛ لیکن اگر باوجود کوشش کے خلاصی کی کوئی صورت نہ بن سکے، تو پھر عورت اپنا مقدمہ قاضیٔ اسلام یا

مسلمان حاکم اور مسلمان حاکم نہ ہونے کی صورت میں جماعتِ مسلمین کے سامنے پیش کرے، پھر تحقیق کے بعد شرعی شہادت سے جب عورت کا دعوی صحیح ثابت ہو جائے تو اس کے خاوند سے کہا جائے کہ اپنی عورت کے حقوق اداء کرو یا طلاق دو، ورنہ تفریق کر دیں گے، اس کے بعد بھی اگر وہ خاوند کسی صورت پر عمل نہ کرے، تو قاضی یا مسلمان حاکم یا جماعت مسلمین ان کے درمیان تفریق کر دے، یہ تفریق طلاق کے حکم میں ہوگی، اس کے بعد عدت طلاق گزار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، اور جب تک اس طرح خلاصی حاصل کرنا ممکن نہ ہو وہاں تک عورت اپنے آپ کو شوہر کے ظلم و زیادتی سے بچانے کے لیے علاحدہ سکونت اختیار کر سکتی ہے؛ لیکن یہ طریقہ فتنہ سے خالی نہیں خاص کر اس زمانہ میں، اس لیے اوپر بتلائی گئی صورت پر ہی عمل کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۱۴/ جمادی الأخری ۱۴۳۰ھ، مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی، معین مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

خلع

سوال: کیا عورت اپنے شوہر یعنی خاوند سے طلاق لے سکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عقد نکاح ہونے کے بعد جب عورت شوہر کے نکاح میں آ گئی، تو اب اس پر طلاق واقع کرنے کا اختیار مرد کو ہے، عورت کو نہیں۔ "إنما الطلاق بید لمن أخذ بالساق". (لامع الدراری ۳/ ۲۶۴۔ المقاصد الحسنۃ ۱۰۷)

البتہ اگر عورت کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، تو اس صورت میں وہ شوہر کو کچھ رقم دے کر طلاق دینے پر راضی کر لے اور شوہر اس کو منظور کر کے علیحدہ کر دے، یہ درست ہے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''خلع'' کہتے ہیں؛ لیکن یہ بھی شوہر کی رضامندی و منظوری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حاملہ کی عدت

زید بیرون ملک بغرض معاش گیا ہے، اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کی اہلیہ کے اجنبی شخص عمرو سے ناجائز تعلقات پیدا ہوئے، اور اس کے نتیجہ میں زید کی اہلیہ حاملہ ہوئی، زید کو اس بات کا علم ہوا؛ لہذا زید نے طلاق دیدی، اور اب عمرو اپنی ناجائز طریقہ کی حاملہ عورت سے قبل از عدت نکاح کرنا چاہتا ہے، تو شرعِ اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟ جبکہ عمرو اپنی حرام کاری کے نتیجہ میں اپنے قرار شدہ نطفہ کو لفظ ہاں میں گردانتا ہے؛ نیز یہ عمل زید کے جانے کے بعد ایک طویل مدت سے ہوا ہے اور ہاں وجودِ ولدِ حرام کے بعد اسے کس کی طرف منسوب کریں گے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زید نے جس وقت طلاق دی، اس وقت اس کی بیوی حاملہ تھی تو اس کی عدت وضعِ حمل ہے۔

لقوله تعالیٰ ﴿واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن﴾ (سورہ طلاق) وفي حق الحامل مطلقا ولو امة او كتابية او من زنا، بان تزوج حبلى من زنا ودخل بها ثم مات او طلقها تعتد بالوضع، جواهر الفتاویٰ. وضع

جميع حملها الخ (درمختار علی الرد ۲/ ۶۵۵،۶۵۶)

عدت مکمل ہونے سے پہلے عمرو کا اس عورت کے ساتھ نکاح کرنا درست نہیں ہے۔

والسادس: المحرمة لحق الغير كمنكوحة الغير ومعتدته. (بحر الرائق ۳/ ۹۸)

وقوعِ طلاق کے دوسال کے اندر اندر اگر بچہ پیدا ہوا تو اس کی نسبت زید کی طرف کی جائے گی، اور اگر پورے دوسال یا اس کے بعد ہوا اور زید نے طلاق بائن دی تھی تو بچہ کی نسبت زید کی طرف نہ ہوگی، اور اگر طلاق رجعی دی تھی اور عورت نے ختمِ عدت کا اقرار نہیں کیا ہے، تو پورے دوسال یا اس کے بعد بھی بچہ کی نسبت زید کی طرف ہوگی۔
(کمافی الدر المختار علی هامش الشامی ۲/ ۶۷۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بعد طلاق عدت کی رقم واپس کردے تو شوہر کیا کرے؟

سوال: میں نے اپنی عورت کو آج سے تین ماہ پہلے تین طلاق دے دی، اور مہر بھی اس کی ادا کردی، اور عدت کا خرچ وغیرہ بھی بھیج دیا تھا، اب ان لوگوں نے قریباً ایک ماہ کے اندر مہر اور عدت کی رقم واپس کردی، اب میرے سسرال والے یہ کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی، اور میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے اپنی عورت کو تین طلاق، طلاق، طلاق دے چکا ہوں، اب اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں طلاق ہوئی کہ نہیں؟ اور یہ مہر وعدت کی رقم جو واپس کردی ہے اس کا کیا کیا جائے؟ اس کا خلاصہ شرع کے موافق جواب دیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ نے جب اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی، تو اب وہ اس پر واقع ہوگئی، اور آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوئی، شرعی حلالہ کے بغیر اس کے ساتھ نکاح درست نہیں، آپ

کے سسرال والوں کا یہ کہنا کہ طلاق نہیں ہوئی غلط ہے، آپ نے اس کو مہر اور عدت کی رقم دیدی تو آپ کا ذمہ بری ہوگیا، اب اگر وہ رقم دوبارہ آپ کو دے رہے ہیں تو آپ کو اختیار ہے چاہے قبول کریں یا نہ کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

شوہر کا انتقال سابق وطن میں ہوجائے تو عدت کہاں گزارے؟

سوال: شوہر اور اس کی اہلیہ دونوں ہر وقت بمبئی میں رہتے ہیں، ان کا سب کاروبار بمبئی میں ہے، کبھی کبھار وہ پالنپور بھی چلے جاتے ہیں، ان کا صرف پالنپور کے اندر گھر ہے، اب یہ دونوں (شوہر اہلیہ) بمبئی سے پالنپور جاتے ہیں، اور پالنپور کے اندر شوہر کا انتقال ہوجاتا ہے، تو اہلیہ عدت کہاں گزارے گی؟ عورت کو پالنپور کے اندر بہت سی دشواریاں ہیں، تب عورت عدت پالنپور میں گزارے گی یا بمبئی میں آکر گزارے گی؟ جواب کا طلب گار رہوں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس عورت کے لیے پالنپور ہی میں عدت گزارنا ضروری ہے۔ (درمختار شامی ۲/ ۶۷۶)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

دو بچوں کو دودھ پلانے کی مدت

سوال: ایک بچہ کی مدتِ رضاعت میں دوسرا بچہ پیدا ہوجاتا ہے، یعنی بچہ کی عمر

آٹھ یا نو ماہ ہے، کیا دوسرے بچے کے دودھ میں سے پہلے بچہ کو شرعاً دودھ پلا سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ دوسرا بچہ خوب سیر ہوکر دودھ پیتا ہے، اور پھر بھی وافر مقدار میں دودھ بچ جاتا ہے، کیا یہ فاضل دودھ اس بچہ کو پلایا جاسکتا ہے کہ جس کی عمر ابھی آٹھ یا نو ماہ کی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دونوں بچے اسی عورت کے ہیں، ماں ہونے کی حیثیت سے جس طرح دوسرے بچہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری اس عورت کی ہے، اسی طرح پہلے بچہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے، جب تک بچہ دودھ سے مستغنی نہ ہوجائے وہاں تک دودھ پلائے، پورے دوسال تک دودھ پلانا مستحب ہے۔

ثم الخلاف في التحريم: أما لزوم أجر الرضاع للمطلقة فمقدر بحولين بالاجماع الخ. (درمختار) (قوله أما لزوم أجر الرضاع الخ) وكذا وجوب الارضاع على الأم ديانة، نهر عن المجتبى. (شامی ۲/۴۳۸) (قوله ولم يبح الارضاع بعد مدته) اقتصر عليه الزيلعي وهو الصحيح كما في شرح المنظومة. بحر. لكن في القهستاني عن المحيط: لو استغنى في حولين حل الارضاع بعدهما الى نصف ولاتأثم عند العامة خلافا لخلف ابن ايوب اه ونقل أيضا قبله عن أجارة القاعدى أنه واجب إلى الاستغناء، ومستحب الى حولين. الخ (شامی ۲/۴۳۸)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: پوری مدت رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو، بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

(معارف القرآن ۱/۵۸۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بچوں کی پرورش کا حق

سوال: ستار محمد میمن اس نے اپنی عورت کو تین طلاق دے دی ہے بائنہ، چار گواہوں کے سامنے، وہ طلاق ۱۳/ ۱۱/ ۱۹۸۷ء سال کو دی ہے، فیملی کورٹ میں بھی یہ کیس چلا پونہ کے اندر، تو کورٹ کے جج نے بھی فیصلہ دے دیا کہ یہ طلاق مسلم لاء کے حساب سے ہوگئی ہیں، اور اب میرے چار بچے ہیں، تسلیم عمر دس سال کی لڑکی ہے، اس کے بعد انیس جس کی عمر آٹھ سال اور اعجاز اس کی عمر سات سال کی ہے، اور اسلم اس کی عمر پانچ سال کی ہے، اور چاروں بچوں کا کیس کورٹ میں چل رہا ہے، اور ان چار بچوں کا تابعہ بچوں کے والد نے مانگا ہے، شریعت کے حساب سے طلاق ہوجانے کے بعد بچے کس کے پاس رہیں گے، اس کا مفصل جواب دیجئے عین نوازش ہوگی، اور بچوں کے والد کی مالی حالت اچھی ہے، اور بچوں کے والد کے ماں، باپ، بھائی، بہن وغیرہ سب ہیں، اور اچھے لوگ ہیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

لڑکا سات سال اور لڑکی نو سال کی ہو وہاں تک اس کی پرورش کا حق ماں کو ہے، اس کے بعد، یعنی ماں نہ ہونے کی صورت میں نانی کو، پھر دادی کو ہے؛ البتہ اگر ماں بچہ کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح کرلے یا کسب وغیرہ کی وجہ سے بکثرت باہر نکلتی ہو جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، یا ایسے فسق وفجور میں مبتلا ہو کہ اس سے بچہ کے ضیاع کا

خطرہ ہوتو ماں کا حق ختم ہو کر اس کے بعد والی عورت یعنی نانی پر نانی وغیرہ کو ملتا ہے۔(درمختار شامی ۲/ ۶۸۷،۶۹۵) لڑکا پورے سات سال کا ہو جائے اور لڑکی پورے نو سال کی ہو جائے اس کے بعد باپ کے حوالہ کردی جائے،صورتِ مسئولہ میں تسلیم اور انیس تو باپ کے پاس رہیں گے، اعجاز کی عمر اگر پورے سات سال ہو چکی ہے تو وہ بھی باپ کے حوالہ کیا جائے، ورنہ سات سال پورے ہونے تک ماں کے پاس رہنے دیا جائے، اسلم جس کی عمر پانچ سال ہے وہ ماں کے پاس رہنے دیا جائے؛ یہاں تک کہ سات سال پورے کرلے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتاب البیوع

مرغیوں کی بیع وزناً عدداً میں تطبیق

سوال: نر مرغیوں کی بیع دو طرح مروج ہے: عدداً، وزناً۔ خردہ فروشی (رٹیل) میں عدد سے فروخت ہوتے ہیں؛ مگر تمام مرغے خردہ فروشی سے فروخت نہیں ہو پاتے، لازماً تھوک فروش تاجر سے فروخت کرنا پڑتے ہیں اور تھوک فروش تاجر وزن سے خریدتے ہیں، فارم عدد کے حساب سے فروخت کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، مگر وہ تاجر اپنے کسی فائدہ کی خاطر عدداً نہیں خریدتے، تو بدرجۂ مجبوری وزن سے فروخت کرنا پڑتا ہے، وزن کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بالعموم پانچ عدد مرغوں کی ٹانگیں ایک ساتھ باندھ کر خاص قسم کی ترازو کے کانٹے پر الٹا لٹکا کر تول لیا جاتا ہے، اسی سلسلہ میں مولانا سعید صاحب پالنپوری کا جواب ساتھ ہی ارسال خدمت ہے اور اسی سوال پر دارالافتاء سہارنپور کا جواب بھی ارسال خدمت ہے اور سہارنپور کے جواب میں قابلِ سوال یہ امر ہے کہ ماحول میں دیکھا جاتا ہے کہ وزناً مرغوں کی بیع مفضی الی النزاع نہیں ہوتی ہے؛ نیز اس وجہ سے بھی کہ فارم کے مرغے گوشت خوری میں مستعمل ہیں اور ایسے جانوروں کی خرید وفروخت کے وقت بائع مشتری ان سے حاصل ہونے والے گوشت کا اندازہ لگا کر قیمت کرتے ہیں اور صورتِ مسئولہ میں وزن کرنے سے طرفین کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کیا زندہ جانور کی وزناً بیع ممنوع ہونے کی وجہ، صرف مفضی الی النزاع ہونا ہی ہے، یا اور کوئی نص وغیرہ شرع شریف میں وارد ہے؟ اور بصورتِ جواز وزن کرنے کے مذکورہ طریقہ میں کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ اور ان دونوں جوابوں کے بارے میں جو کسی درجہ میں متضاد نظر آتے ہیں، وضاحت فرما کر رہبری فرمائیں، اللہ جل شانہ اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب مدظلہم نے جو وضاحت فرمائی ہے، اس سے دونوں جوابات میں تطبیق ہو جاتی ہے، فقہاء نے مچھلی کی بیع وزناً جائز لکھی ہے۔ (فتاویٰ عثمانی ۳/ ۹۸ تا ۱۰۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مرغیوں کی کھاد کی بیع

سوال: مرغیوں کی بیٹ مرغی خانہ میں جمع ہوتی رہتی ہے، جس کو فارم فروخت کرتے ہیں اور وہ بطورِ کھاد کے کھیتی میں مستعمل ہے، لہذا مرغیوں کے کھاد کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی بیع ناجائز ہے اور شکل جواز یہ ہے کہ اس میں کوئی بھوسا وغیرہ ملا کر اس طرح سودا کیا جائے کہ میں تم سے بھوسے کی قیمت لیتا ہوں اور دوسرے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ صاحبینؒ کے قول پر جواز کا فتویٰ ہے، لہذا اس بات میں قولِ فیصل تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مرغیوں کی کھاد کی بیع درست ہے۔

لایکره؛ بل یصح بیع السرقین أي الزبل. (درمختار) (قوله أي الزبل) وفي الشرنبلالية: هو رجيع ماسوى الانسان. (شامي ۵/ ۲۷۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ایجاب وقبول کے بعد قانونی کارروائی سے پہلے زمین بیچنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ محمود شافعی المسلک ہے، اس نے حامد شافعی المسلک سے زمین خریدی، ایجاب وقبول ہو گیا،

اور ثمن کا کچھ حصہ بھی ادا کر دیا، اور زمین میں غلہ بونا بھی شروع کر دیا، زمین ابھی حکومت کے قانون کے ذریعہ محمود کے نام رجسٹرڈ نہیں ہوئی تھی، زمین محمود کے نام رجسٹرڈ ہونے کے پہلے ہی محمود نے اس زمین کو خالد کو بیچ دیا، اور محمود نے حامد سے بات کر کے اس زمین کو حکومت کے قانون کے ذریعہ خالد کے نام رجسٹرڈ کرا دیا، اور حامد نے دستخط بھی کر دیا

اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) مسلک شافعی کے اعتبار سے یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

(۲) مسلک شافعی کے اعتبار سے اس بیع کے نفع میں جو رقم محمود کو ملی ہے، حلال ہوگی یا حرام؟

(۳) مسلک حنفی کے اعتبار سے یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

(۴) مسلک حنفی کے اعتبار سے اس بیع کے نفع میں حاصل شدہ رقم حلال ہوگی یا حرام؟

برائے مہربانی جوابات مدلل، مفصل، واضح بحوالۂ کتبِ معتبرہ مرحمت فرما کر بندہ کو ممنون و شاکر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایجاب وقبول کے بعد اس میں غلہ بونا بھی شروع کر دیا، تو اب اس زمین کے محمود کی ملک میں آنے میں کوئی تردد ہی نہیں ہے، اب جو اس نے وہ زمین خالد کے ہاتھ فروخت کی بیع بالکل درست اور صحیح ہے، اور اس بیع سے حاصل شدہ نفع بھی محمود کے لیے حلال ہے، قانونی مجبوری کی وجہ سے وہ زمین محمود کے نام پر نہیں ہوئی، اس سے بیع پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ (درمختار مع الشامی جلد رابع)

مذکورہ حکم فقہ حنفی کے اعتبار سے ہے، فقہ شافعی کے اعتبار سے اس کا کیا حکم ہوگا؟ یہ شافعی المسلک مفتی سے معلوم فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

زندہ جانور وزن کرکے بیچنا

سوال: زندہ جانور کو وزن کرکے کیلو کا حساب لگا کر زندہ ہی بیچنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اصل مسئلہ یہی ہے کہ زندہ جانور کو وزن کرکے فروخت کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر وزن کرنے سے مقصود صرف قیمت کی تعیین ہو، یعنی مال کا کسی درجہ اندازہ کرکے قیمت تجویز کی جائے، تو اس کی گنجائش ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ خریدنے کے بعد کبھی دوبارہ نہیں تولتے، اور اگر تولیں بھی اور کچھ کم زیادہ نکلے تو اس کا حساب نہیں کرتے، یہ سب اس بات کے قرائن ہیں کہ مقصود وزن نہیں ہے، صرف اندازہ ہے قیمت کی تعیین کے لیے؛ لہٰذا اس طرح وزن کرکے اندازہ کرکے قیمت تجویز کرکے قیمت پر مدار رکھ کر اور وزن کو بعد میں کالعدم قرار دے کر زندہ جانور فروخت کرنے کی گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مٹی کا تیل زیادہ دام سے بیچنا

سوال: ہماری دوکان میں گھاسلیٹ کا پرمٹ ہے، تو وہ کوٹا پورا نہیں پڑتا ہے، تو بلیک سے زیادہ پیسہ سے گھاسلیٹ لینا پڑتا ہے، تو میں اپنے دوست سے ایک پرمٹ لایا،

اس کے پاس کوٹا زیادہ تھا، تو اس نے میری دوستی کے خاطر وہ پرمٹ کا کوٹا دیا ہے، اور اس میں بلیک کا گھاسلیٹ لیتے ہیں، اس اعتبار سے آٹھ آنہ (۵۰/ پیسہ) نفع رہتا ہے، تو وہ پچاس پیسہ کے اعتبار سے میرے پاس کچھ رقم جمع ہے، وہ کاروبار میں ڈالا نہیں ہے، اور ایسی باتیں ہمارے سامنے آئی، تو کیا میں اس نفع والی رقم جو نوکروں کو پیسہ دیا ہے، اس میں وصول کرسکتا ہوں، اور اگر یہ رقم والد صاحب یا کاروبار میں ڈال دیتا ہوں تو جو نوکروں کو پیسہ دیا ہے وہ میرے جیب سے جاتا ہے، اور نوکروں کو پالیسی کے خاطر دینا پڑتا ہے، اور بعد میں والد صاحب دینے سے انکار کرتے ہیں، تو ایسی منافع والی رقم میں لے سکتا ہوں، وضاحت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کی طرف سے جو مٹی کا تیل برائے فروخت دکاندار کو دیا جاتا ہے، اس میں اگر یہ شرط ہے کہ اتنے دام میں ہی بیچا جائے، تو اس صورت میں زیادہ دام لے کر بیچنے کی اجازت نہیں؛ اس لیے کہ یہ حکومت کے ساتھ دھوکہ ہے، اور مومن دھوکہ نہیں دیتا "المؤمن لا يَخْدَعُ ولا يُخْدَعُ" زائد رقم جن لوگوں سے آپ نے وصول کی ہے، وہ اگر معلوم ہیں تو ان کو دیدی جائے، اگر معلوم نہیں تو اس کا صدقہ کردیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ٹی-وی اور ریڈیو کی بیع کے حکم میں فرق

سوال: کیا ٹی وی کی بیع جائز ہے؟ بائع نہ اس کو دیکھتا ہے، نہ اس کو پسند کرتا ہے؛ لیکن کوئی دوسرا پیشہ نہ ہونے کی بناء پر اس کو اختیار کئے ہوئے ہے، اگر ناجائز ہے تو اور چیزیں جو شریعت میں معصیت شمار ہوتی ہیں، مثلاً: ریڈیو یا ایسا کپڑا جس سے پتلون

ونا جائز لباس بنتا ہے اس کی بیع بھی ناجائز ہونی چاہیے، یا درزی ان چیزوں کو سیتا ہے تو وہ بھی گویا "تعاون علی الاثم والعدوان" کا فعل انجام دے رہا ہے۔

مندرجۂ بالا سوالوں کا جواب مفصل و مدلل تحریر فرمائیں عین کرم ہوگا۔ فقط والسلام۔

المستفتی: عبدالقیوم راجکوٹی، متعلم جامعہ درجۂ ششم

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ٹی وی آلاتِ لہو ولعب میں سے ہے، اس کا عمومی استعمال یہی ہے، اس لیے اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲۹۲/۶) ریڈیو آلات لہو وطرب میں داخل نہیں، ناجائز طریقہ پر استعمال کرنے کا جرم ان پر عائد ہوگا جو اس کو ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں؛ لہٰذا اس کا فروخت کرنا مباح ہے۔ (ایضاً ۲۶۹/۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۸ھ

بیع فاسد کے ثمن کو قرض میں شمار نہیں کر سکتے

سوال: رمضان سے قبل ہم نے اپنے استعمال کے لیے لوہا خریدا ہے، جس وقت خریدا اس وقت دام مقرر کر لیا تھا، اور ابھی تک مال کی ڈیلیوری نہیں لی ہے، ڈیلیوری دس شوال کو لینے کی شرط ہے، اور دس شوال کو ہم ڈیلیوری لینے والے ہیں، سودا کرنے کے بعد اسی وقت ہم نے پانچ ہزار روپے دئے تھے، جو مال کی کل قیمت میں شمار کیا جائے گا جو چالیس ہزار کے قریب ہوں گے، تو یکم شوال کو جو یہ مال لینے کا باقی ہے اس کی قیمت قرض میں شمار کی جائے گی یا نہیں؟ اور پانچ ہزار روپئے جو ہم نے پہلے سے دیئے ہیں، اس کے لیے کیا مسئلہ ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس شرط کے ساتھ جو بیع ہوئی وہ فاسد ہے، اس لیے کہ مبیع کو مؤجل رکھنا بیع سلم ہے، اور بیع سلم میں ثمن عاقدین کے جدا ہونے سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے، جو یہاں پایا نہیں گیا، جب بیع فاسد ہوئی تو آپ پر نفسِ عقد کی وجہ سے ثمن واجب نہیں ہوئی، اس لیے آپ اس مقدار رقم کو قرض میں شمار نہیں کر سکتے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/شوال ۱۴۰۸ھ

مشترکہ ملکیت میں بیع اور وصیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں:

کہ کریم محمد ابن ولی محمد نے اپنی زمین اور گھر اپنی حیات ہی میں اپنے حقیقی بھائی محمد یوسف ابن ولی محمد کو کورٹ سے لکھوا کر دیدی، اس لیے کہ کریم محمد کو کوئی اولاد وغیرہ نہ تھی، نہ لڑکا، نہ لڑکی، اور کریم محمد نے بھائی سے کہا کہ زمین اور گھر میری حیات میں میرے پاس رہیں گے، اور میرے مرنے کے بعد تم لے لینا، کچھ عرصہ کے بعد کریم محمد بھائی کا انتقال ہو گیا، تو ان کی بیوی دینے کے لیے تیار نہ تھی؛ بلکہ ضائع کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اور اس میں دو فریق ہو گئے، ایک ان کی بیوی کی طرف، ان کی بیوی کا نام نوری ہے، تو نوری بہن کا فریق اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ ان کے بھائی یوسف کو کچھ نہ ملے، اور ان کا بھائی یوسف اور ان کا فریق اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ مجھے میرے بھائی نے اپنی زندگی میں دیا ہے؛ لہذا مجھے ملنا چاہئے، اور یوسف بھائی نے کورٹ میں مقدمہ کیا کہ میں اس کا بھائی ہوں، اور

ہماری شریعت کے اعتبار سے میں وارث ہوں؛ لہذا مجھے حق ملنا چاہئے جو میرا ہے، یہ لڑائی مسلسل دوسال چلتی رہی، کوئی نتیجہ نہیں نکلا، دوسال کے بعد اس بات پر صلح ہوئی کہ شرعی اعتبار سے کریم محمد بھائی کی ملکیت وارثوں میں تقسیم کی جائے، تو یہ طے ہوا کہ شرعی اعتبار سے یوسف بھائی کے آٹھ آنی حصہ ان کے بھائی کی ملکیت میں سے ہے، اور چار آنی کریم محمد بھائی کی بیوی، اور چار آنی کریم محمد اور یوسف بھائی دونوں کی ایک بہن ہے جن کا نام رتن ہے ان کی؛ لیکن اس وقت بھی صلح کرنے والے لوگوں میں یہ بات طے ہوئی کہ ابھی بارہ آنی وارثوں کو دیدیں گے تو چار آنی ملکیت میں نوری بہن کا گذارا ہونا مشکل ہے؛ لہذا نوری بہن کے مرنے کے بعد اس طرح حصے کئے جائیں؛ بلکہ نوری بہن کے دیور سے لوگوں نے کہا کہ یوسف بھائی! ابھی آپ کی آٹھ آنی اپنی بھابھی نوری بہن کے پاس رہنے دو، چار آنی پر ان کا گذارا نہیں ہوگا، اور آپ کی بھابھی کے انتقال کے بعد آپ کی آٹھ آنی حصہ ہم دے دیں گے، تو یوسف بھائی نے کہا کہ ٹھیک ہے، اس کے بعد تین سال گذرے اور نوری بہن نے اپنی موت سے چھ ماہ پہلے پوری زمین احمد بھائی کو بیچ دی، اور خریدار احمد بھائی نے وہ کاغذات، یعنی دستاویز کسی کو ظاہر نہیں کئے، اور جب نوری بہن کا انتقال ہوا تو اس کے بعد پتہ چلا کہ نوری بہن نے زمین احمد بھائی کو بیچ دی ہے، تو پھر میں احمد بھائی سے ملا اور کہا کہ بھائی آٹھ آنی ملکیت کے ہم وارث ہیں، اور وہ آٹھ آنی نہ تو ان کو بیچنے کا حق تھا، اور نہ تم کو خریدنے کا کوئی حق تھا، ہماری آٹھ آنی ہم نے ان کو موت تک استعمال کے لیے دی تھی، تو احمد بھائی نے کہا کہ نوری

بہن نے مجھے بیچی ہے اور میں نے خریدی ہے، اور دستاویز بھی ہو چکا ہے، چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا؛ چونکہ نیت خراب تھی، دو لاکھ کی ملکیت بیس ہزار میں خریدی تھی، اور بیس ہزار بھی ابھی دیئے نہیں، اور نوری بہن مرگئی، پھر ہم نے پوری زمین احمد بھائی سے کورٹ کی مدد لے کر چھڑائی، اور اس میں پچیس ہزار روپئے خرچ ہوا، اور یہ خرچہ نوری بہن نے ہمارے حصہ کی ملکیت بیچ دی جس کے نتیجہ میں ہوا، تو اس صورت میں نوری بہن کے چار آنی حصہ میں سے ہم خرچ لے سکتے ہیں؟ اور اگر لے سکتے ہیں تو کتنا لے سکتے ہیں؟ اور اس سے پہلے کہ جہاں پر صلح ہوئی وہاں تک تیس ہزار خرچہ ہوا وہ بھی ہمارے حق کے طلب میں ہی ہوا ہے، تو اس صورت میں شریعت خرچ لینے کی اجازت نوری بہن کے حصہ میں سے دیتی ہے یا نہیں؟

تنقیح

احمد بھائی نوری بہن کے انتقال کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے یہ زمین نوری بہن سے خریدی تھی، تو وضاحت طلب یہ ہے کہ اس خریداری کا کوئی شرعی ثبوت احمد بھائی کے پاس موجود ہے؟ نیز کیا احمد بھائی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ پوری زمین نوری بہن کی ملک نہیں ہے؛ بلکہ اس میں دیگر ورثاء کا حصہ ہے؟ آپ سوال میں ان دونوں امور کی وضاحت فرمائیں اس کے بعد ہی آپ کے سوال کا جواب دیا جا سکے گا۔

جوابِ تنقیح

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ نوری بہن نے ایک گھر اور زمین جس میں ان کا چوتھائی حصہ تھا اور تین چوتھائی دوسرے کے تھے، اولاً انھوں

نے مرنے سے تین سال پہلے مدرسہ کے لیے اپنے حصہ کے وقف کی وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد اس گھر اور زمین کو مدرسہ میں وقف دینا، پھر انھوں نے اپنے انتقال سے چھ ماہ پہلے حالت صحت وہوش میں اپنے حصہ کی اور دوسروں کے حصہ کی، یعنی پوری زمین ایک آدمی کے ہاتھ بیچ دی، اور اس مشتری کا پہلے ہی سے قبضہ تھا، وہی اس زمین کو جوتتا تھا، اور مشتری نے پیسے ادانہیں کئے اور نوری بہن کا انتقال ہوگیا، پھر وہ پوری زمین دوسرے حصہ داروں نے کسی اور شخص کو بیچ دی، اب نوری بہن کے حصہ کی رقم مدرسہ میں وقف کے طور پر اس سے چھوڑا کر دی جاوے یا خریدار کو دی جاوے یا نوری بہن کے وارثوں کو دی جائے؟ شریعت میں اس کا جو بھی حکم ہو اس سے ہمیں آگاہ فرمادیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نوری بہن نے اپنے انتقال سے پہلے جو بیچنے کا معاملہ کیا ہے، اگر اس کا شرعی ثبوت موجود ہے، تو نوری بہن کے حصہ میں بیع درست ہوئی، اور وفات سے پہلے شئے موصیٰ بہ موصی کی ملک سے نکل چکنے کی وجہ سے وصیت باطل ہوگئی، اور دیگر شرکاء کے لیے اتنی زمین کا مشتری کی اجازت کے بغیر کسی اور شخص کو بیچنا درست نہیں ہے، اتنے حصہ کا مالک وہی مشتری ہے جس نے نوری بہن کے پاس سے اس زمین کو خریدا تھا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال: بعدہٗ عرض کہ آپ نے اس فتوے میں دو باتوں کی وضاحت چاہی تھی

دونوں باتوں کی وضاحت حسبِ ذیل ہے:

پہلی بات آپ نے یہ پوچھی کہ جس کے ہاتھ نوری بائی نے زمین بیچی ہے اس کا ثبوت کورٹ کے اعتبار سے دستاویز ہے، یعنی اگیرمینٹ ہے، اور دوسری بات وضاحت طلب یہ تھی کہ وہ خریدنے والا یعنی مشتری جانتا تھا کہ اس زمین میں دوسرے شرکاء کا حق ہے مکمل طور پر اس کو اس مذکورہ بات کا علم تھا یہ دو باتیں مکمل ہوگئیں، مزید ایک اور وضاحت آپ کے سامنے آجائے اس کی تفصیل نیچے ہے:

احمد بھائی سے زمین چھڑانے کے سلسلہ میں تیس ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے، اس میں سے تیرہ ہزار روپیہ احمد بھائی نے نقد، دوسرے ورثاء کے پاس سے لیے، اس بات پر کہ میرا جو خرچہ ہوا ہے یعنی دستاویز کا، اور وکیل کو روکنے کا جو خرچہ ہوا ہے، آپ سب ورثاء مجھ کو خرچہ دیدو تو میں زمین واپس کردوں اور میں اپنا قبضہ زمین پر سے چھوڑ دوں اور تمھارے حوالہ کردوں، اوران کا خرچہ جو ہوا ہے وہ تیرہ ہزار روپیہ ہے؛ چنانچہ ورثاء نے مل کر تیرہ ہزار روپیہ دیدئے اور زمین قبضہ میں لے لی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کی وضاحت سے یہ بات صاف ہوگئی کہ بوقت شراء احمد بھائی کو یہ معلوم تھا کہ اس خریدی جانے والی ملکیت میں دیگر ورثاء کا حصہ ہے، اس کے باوجود اس نے یہ معاملہ کیا اور بعد میں اس نے اپنا قبضۂ غاصبانہ باقی رکھا، اوراس کو چھڑانے کے لیے ورثاء کو مصارف برداشت کرنا پڑے تو اب یہ مصارف احمد بھائی کے پاس سے وصول کرنا جائز ہے۔ (امدادالفتاویٰ ۳/۱۲۳)

بلکہ احمد بھائی نے ورثاء سے جو تیرہ ہزار وصول کیئے ان کا لینا احمد بھائی کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں تھا، صریح حرام ہے، احمد بھائی کو چاہیئے کہ وہ تیرہ ہزار واپس کریں، رہا نوری بہن کا چوتھائی حصہ اور ان کا بیچنا تو اگرچہ نوری بہن نے دیگر ورثاء کا حصہ احمد بھائی کے ہاتھ بیچا، وہ درست نہیں تھا؛ لیکن نوری بہن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ متسبب کی ہے جبکہ احمد بھائی مباشر ہیں، اس لیے ساری ذمہ داری احمد بھائی پر عائد ہوتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تمباکو کے اصلی ڈبہ میں نقلی مال فروخت کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ پر:

کوئی کمپنی تمباکو بناتی ہے، کمپنی کا تمباکو ڈبے سے ختم ہونے کے بعد ہم یا کوئی اپنی طرف سے زردہ بنا کر اصل کمپنی کے ڈبہ میں بھر کر پیک کر کے فروخت کرے تو کیا جواز کی شکل یہ ہوگی؟ دوسری شکل یہ ہے کہ اصل ڈبہ میں اپنا بنایا یا کسی اور کا بنا ہوا زردہ پیک کر کے مارکٹ میں فروخت کرتے وقت دوکان دار سے بتلا دیں کہ یہ ڈپلیکیٹ ہے، یعنی نقلی ہے، اس وقت کیا شکل ہوگی؟ تیسرے خالی اصلی ڈبے نقلی زردہ بنانے والے کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں کہ نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں خریدار اس ڈبہ میں بند تمباکو کو اصل کمپنی کی چیز سمجھ کر خریدتا

ہے، جس میں دھوکہ ہے، اس لیے جائز نہیں ہے۔ دوسری صورت میں آپ تو دوکان دار کو مال کے نقلی ہونے سے واقف کر دیتے ہیں؛ لیکن دوکان دار اگر اس کو اصلی میں کھپائے گا تو اس کا ذریعہ آپ بنے ہیں، اس لیے یہ بھی جائز نہیں۔ ﴿ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾۔ تیسری صورت کا بھی یہی حکم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت

سوال: (۱) کوئی بھی کمپنی جو حلال کام کرتی ہے اس کا شیئرز خریدنا اور بیچنا جبکہ اس کمپنی کے نقصان اور نفع میں ہم برابر کے شریک ہیں، کیسا ہے؟

(۲) اگر کسی نے سونا و چاندی خرید کر پورا پیسہ ادا کر دیا، اور کاغذ پر دستخط بھی کر دیا، تو کیا وہ شخص کمپیوٹر کے ذریعہ خرید کر کاغذی حق حاصل کرنے کے بعد عین سونا و چاندی کو قبضہ کئے بغیر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا حقیقی قبضہ ضروری ہے؟

(۳) تانبا، پیتل، المونیم، گڑ، شکر اور ہلدی؛ وغیرہ خرید کر پورا پیسہ دیکر کاغذی حق بذریعہ کمپیوٹر لیکر خریدنا اور بیچنا یا تجارت کرنا کیسا ہے؟ جبکہ وہ نفع اور نقصان میں برابر شریک ہیں؛ نیز اشیاء منقولہ کی خرید وفروخت قبضہ کیے بغیر درست ہے یا نہیں؟ کیا اس میں بھی حقیقی قبضہ ضروری ہے یا حکمی قبضہ کافی ہے؟ اسی کاروبار کے بارے میں لوگوں کو مشورہ دینا کہ کون شیئر کہاں خریدنا ہے اور کہاں فروخت کرنا ہے تاکہ فائدہ ہو شرعاً کیا حکم ہے؟

(۴) معلوم ہوا کہ ہر شیئر کمپنی کو بطور سیکورٹی گورنمنٹ میں رقم جمع کروانی پڑتی

ہے، اوراس پرسود بھی ملتا ہے تو کیا رقم جمع کرنا اور سود لینا درست ہے یا نہیں؟

(۵) میں نے شیئر کے کاروبار کے لیے اپنا ویب سائیڈ تیار کروایا ہے، اخباروں میں اس کا اشتہار آتا ہے، اس وجہ سے لوگ مجھ سے رابطہ قائم کرکے مشورہ لیتے ہیں اور اس کا مجھے معاوضہ ملتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اگر کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہے؛ مگراس کے ساتھ ضمنی طور پر سودی لین دین بھی کرتی ہے، مثلاً بینک میں پیسہ رکھ کر سود بھی حاصل کرتی ہے، اور اسے حلال نفع میں شامل کرتی ہے (آج کل شاید ہی کوئی کمپنی اس سے محفوظ ہو) تو ایسی کمپنی نے ابتداءً جو شیئرز جاری کیے انہیں دوشرطوں سے خریدنا جائز ہے:

[۱] شیئرز خرید کر اس کمپنی کا حصہ دار (شیئر ہولڈر) چونکہ اس سودی معاملہ میں کمپنی کا معاون و مددگار بن رہا ہے، اوراس کا پیسہ بھی اس گناہ میں استعمال ہورہا ہے، لہذا اس پرواجب ہے کہ اپنی استطاعت کے بقدر اس کمپنی کے شرکاء کے سالانہ اجلاس میں سود کے خلاف آواز ضرور اٹھائے یا کم ازکم ہر مرتبہ کے اجلاس میں ایک بار اس بات کا اظہار ضرور کرے کہ وہ اس سودی معاملہ پر راضی نہیں، یا ای میل کے ذریعہ سے کمپنی کو خط لکھا کرے کہ کمپنی سودی لین دین یکسر ختم کردے، اگرچہ اس کی رائے اور آواز پر کان نہ دھرا جائے؛ مگر یہ اپنا فرض ادا کرتا رہے۔

[۲] شیئرز ہولڈر کمپنی کے ویب سائٹ پر انکم اسٹیٹمینٹ کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کمپنی نے کل نفع میں سے کتنے فیصد سود کی مد میں حاصل کیا ہے؟

چنانچہ شیئر ہولڈر نفع وصول کرنے کے بعد اپنے حصہ کے تناسب سے اپنے نفع میں سے سودی نفع کے بقدر رقم فقراء پر بلانیت ثواب صدقہ کردے، اگر سودی نفع کی مقدار کے بارے میں تحقیق وجستجو کے باوجود بھی علم نہ ہوسکے، تو اندازہ سے رائے قائم کرے اور جتنی مقدار کا گمان غالب ہو، وہ صدقہ کردے۔

یہ شرائط تو اس شخص کے بارے میں تھیں جو کمپنی کی طرف سے جاری کردہ شیئرز اس سے براہ راست لے کر گھر بیٹھے نفع حاصل کرنا چاہتا ہو؛ البتہ جب کمپنی ایک مرتبہ تمام شیئرز جاری کردے، اور اب کوئی شخص ان کی خرید وفروخت کے ذریعہ نفع کمانا چاہتا ہے تو اس کاروبار کے جواز کے لیے مزید تین شرطیں ہیں:

[۱] کمپنی نے شیئرز کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم سے کچھ خام مال یا عمارت وغیرہ خرید لی ہو، یعنی کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے وجود میں آچکے ہوں، کل اثاثے محض نقد (کرنسی) کی صورت میں نہ ہوں، بصورت دیگر شیئرز کی اصل قیمت پر خرید وفروخت تو جائز ہوگی، کمی بیشی پر نہیں؛ نیز شیئرز کی قیمت پر قبضہ بھی اس مجلس میں ضروری ہوگا، ادھار پر معاملہ جائز نہ ہوگا۔

[۲] شیئرز سرٹیفکٹ پر قبضہ ہوچکا ہو یا کسی بھی طرح یقینی طور پر شیئرز ہولڈر کی بقدر حصص ملکیت کمپنی میں ثابت ہوچکی ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ کمپنی کو اگر بالفرض نقصان ہوا تو اس نقصان کا ضمان قانوناً شیئرز ہولڈر پر بھی آتا ہو، چنانچہ شیئرز پر حقیقۃً قبضہ کے بغیر یا یقینی طور پر ملکیت ثابت ہوئے بغیر انہیں آگے بیچنا جائز نہیں۔

بعض حضرات کا شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق پورے معاملہ میں درحقیقت

خریدنا اور بیچنا بالکل مقصود ہی نہیں ہوتا، ان کے پیش نظر سرٹیفکٹ وصول کرنا ہوتا ہی نہیں، اور نہ ہی یہ حضرات سرٹیفکٹ وصول کرتے ہیں؛ بلکہ محض زبانی کلامی اس پوری کارروائی سے مقصد انتہاء اور نتیجہ کے اعتبار سے فرق برابر کرنا ہوتا ہے، تو یہ صورت بھی جوا اور سٹہ بازی ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

[۳] سپاٹ سیل کرے، شارٹ سیل، فارورڈ اور فیوچر سیل اور ہیجنگ جائز نہیں۔

(جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/۱۰۶ تا ۱۰۸)

(۳،۲): سونا، چاندی، تانبا، پیتل، المونیم، گڑ، شکر اور ہلدی وغیرہ اشیائے منقولہ میں سے ہیں، اس لیے اس پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو بیچنا درست نہیں۔

القاعدة أنه اذا اشترى شخص منقولاً؛ فانه يشترط ليصح بيعه اياه، ان يكون قبضه، فان لم يكن قبضه فلايصح بيعه اياه، ودليل ذلك:

(۱) ماروى ان النبي ﷺ نهى عن بيع مالم يقبض، والنهى يوجب فساد المنهى عنه.

(۲) ولانه بيع فيه غررالانفساخ بهلاك المعقودعليه، لانه اذاهلك المعقود عليه قبل القبض يبطل البيع الاول، فينفسخ الثانى، لانه بناه على الاول، وقد نهى رسول الله ﷺ عن بيع فيه غرر. (احكام المعاملات المالية فى المذهب الحنفى ۲۹۰،۲۹۱)

ومن اشترى شيأفلايجوزله ان يبيعه قبل ان يقبضه...... والكلام فى المبيع قبل القبض فى فصول: احدهافى الطعام، فانّه ليس لمشترى الطعام ان

يبيعه قبل ان يقبضه؛ لماروى ان النبى ﷺ نهى عن بيع الطعام قبل ان يقبض، وكذلك ماسوى الطعام من المنقولات لايجوز بيعه قبل القبض عندنا.

(المبسوط للسرخسی ۱۳/۹،۱۰)

قبضہ خود کرے یا اپنے وکیل کے ذریعہ سے کرے تو بھی معتبر ہے؛ البتہ آپ نے اپنے سوال میں حکمی قبضہ کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس سے آپ کی مراد کیا ہے؟ جب تک وہ واضح نہ ہو جائے، جواب مشکل ہے۔

جس صورت میں قبضہ کیے بغیر فروخت کرنے کی وجہ سے بیع درست نہیں ہوتی، اس صورت میں ایسی بیوعات کے سلسلہ میں تعاون کرنا بھی درست نہیں۔

(۴) اس کا جواب نمبر ۱ میں آچکا ہے۔

(۵) جائز شیئروں کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں لوگوں کو مشورہ دینا اور اس پر معاوضہ حاصل کرنا درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

عقدِ مزارعت میں یوریا کھاد کی شرط لگانا

(۱) مبسوطِ سرخسی میں مزارعت کے بارے میں سرقین (دیسی کھاد) کی شرط مزارع پر کرنے کو مفسدِ عقد قرار دیا ہے، خواہ بیج مزارع کی طرف سے ہو یا رب الارض کی طرف سے، اور سرقین ڈالنے کی شرط رب الارض پر کرنے کو اس صورت میں مفسدِ عقد قرار دیا ہے جبکہ بیج مزارع کی طرف سے ہو، اور اگر بیج رب الارض ہی کی طرف سے ہو تو اس شرط کو جائز کہا ہے۔ (مبسوط للسرخسی باب الشروط اللتی تفسد المزارعة ۲۳/۸۱،۸۲) لیکن ہمارے زمانے میں انگریزی کھاد (ڈی۔اے۔پی یوریا) کا رواج بھی عام ہے، اور لوگ

اس کا شرعی حکم بکثرت دریافت کرتے رہتے ہیں؛ چونکہ یہ انگریزی کھاد حادث ہے، اس لیے اس کا حکم صراحۃً کسی کتاب میں نہیں ملتا ہے، مسبوط میں دیسی کھاد کی شرط لگانے کے بارے میں جو تفصیل اوپر ذکر کی گئی ہے، اس میں پہلی تین صورتوں میں مزارعت کے فساد کا حکم لگانے کے ساتھ ساتھ اس کی علت بھی بیان کی ہے، اور چوتھی صورت میں صحتِ مزارعت کا حکم لگانے کے ساتھ وجہِ صحت بھی بیان فرمائی ہے، مزارع پر القاءِ سرقین کی شرط کو فاسد قرار دینے کی علت یہ بیان فرمائی ہے۔ لأنه إن شرط ذلك على العامل فقد شرط عليه ما تبقى منفعته في الارض بعد مضى مدة المزارعة، وشرط عليه اتلاف عين مال لا يقتضيه عقد المزارعة، وذلك مفسد للعقد. یہ علت اس صورت میں بیان فرمائی ہے جبکہ بیج بھی عامل کی طرف سے ہو، اور اگر بیج رب الارض کی طرف سے ہو تو مزارع پر سرقین کی شرط کو فاسد قرار دینے کی علت یہ بیان فرمائی ہے۔ لأنهما شرطا على العامل ماتبقى منفعته بعد مضى مدة المزارعة.

تنقیح: پہلی صورت میں فساد کی دو علتیں بیان فرمائی ہے، جن میں سے ہر ایک فساد کی مستقل علت ہے کہ ان میں سے ایک علت کا پایا جانا بھی فساد کے لیے کافی ہے۔ اور دوسری صورت میں فساد کی ایک علت کو بیان کیا ہے اور ایک کو (پڑھنے والے کی فہم پر اعتماد کرتے ہوئے) چھوڑ دیا ہے؛ کیونکہ دونوں صورتوں کا ذکر پہلے کیا ہے، اور دوسری صورت کو بعد میں ذکر کیا ہے؛ لہذا ان دونوں علتوں میں بیان کردہ دو علتوں میں سے ایک علت کا پایا جانا حکم بالفساد کے لیے کافی ہوگا، اور انگریزی دونوں کھادوں میں یہ علت فساد "شرط عليه اتلاف عين مال لا يقتضيه عقد المزارعة" پائی جاتی ہے؛ لہذا

سرقین کی شرط کی طرح انگریزی دونوں کھادوں کی شرط مزارع پر کرنا مفسدِ عقد ہونا چاہئے یا نہیں؟

اور سرقین کی شرط رب الارض پر کرنے کو فاسد قرار دینے کی وجہ (جبکہ بیج عامل کا ہو) یہ ذکر کی ہے۔ لأن هذا من عمل الزراعة فاشتراطه على رب الارض يكون مفسدا للعقد.

تنقیح: یہ علت بھی انگریزی دونوں کھادوں پر صادق آتی ہے، تو کیا اس صورت میں رب الارض پر انگریزی دونوں کھادوں کی شرط لگانا بھی مفسد عقد ہوگا یا نہیں؟

اور سرقین کی شرط رب الارض پر کرنا اس صورت میں جائز بتلایا ہے جبکہ بیج بھی رب الارض کا ہو اور جواز کی علت یہ بیان فرمائی ہے۔ لأن القاء السرقين والعذرة فى الارض يكون قبل الزراعة وقبل الكراب ايضاً، وان لزم العقد فى جانب صاحب البذر عند القاء البذر فى الارض فكانه استاجره للعمل بنصف الخارج بعد ما فرغ من القاء العذرة والسرقين.

تنقیح: یہ علت انگریزی دونوں کھادوں پر صادق نہیں آتی؛ کیونکہ ڈی۔اے۔پی۔ تو بیج کے ساتھ زمین میں داخل کیا جاتا ہے (زراعت سے پہلے نہیں ڈالا جاتا) اور یوریا کھیتی کے اگنے کے بعد ڈالا جاتا ہے جب صحت کی علت ان کھادوں میں نہیں پائی جاتی تو پھر ان کو شرط لگانے کا کیا حکم ہوگا؟ اور کس علت کی بناء پر؟

(۲) آج کل کھیتی کے اگنے کے بعد مختلف قسم کے مضر حشرات الارض سے کھیتی کی حفاظت کے لیے پاؤڈر بھی ڈالا جاتا ہے، مزارعت کی صورت میں یہ پاؤڈر ڈالنے کی

شرط عامل پر کرنا کیسا ہے؟

فقہاء نے کھیتی کی حفاظت مزارع پر قرار دی ہے، تو کیا مزارع پر لازم ہوگا کہ اپنے پیسوں سے پاؤڈر خرید کر ڈالے؟ اور پاؤڈر کے خرچ کی ذمہ داری دونوں پر کرنا کیسا ہے؟ اور اگر یہ شرط رب الارض پر کی جائے تو کیا حکم ہوگا؟

المستفتی: محمد آدم بھیلونی (خادم شعبۂ افتاء جامعہ نذیریہ) مقام کاکوسی ضلع مہسانہ شمالی گجرات

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) سوال میں اٹھائے گئے نکات پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقدِ مزارعت سے متعلق چند اصولی باتوں پر ایک نظر ڈال لی جائے:

[۱] وہ تمام کام جن کا تعلق عملِ مزارعت سے ہے، یعنی اصلاح زرع کے لیے وہ ضروری سمجھے جاتے ہیں ان کی ذمہ داری مزارع پر ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے: ومنها: ان كل ما كان من عمل المزارعة مما يحتاج الزرع اليه لاصلاحه فعلى المزارع؛ لان العقد تناوله، وقد بيناه. (بدائع الصنائع ۱۸۲/۶)

عالمگیری میں ہے: واما احكامها: منها: ان كل ما كان من عمل الزراعة مما يحتاج الزرع اليه لاصلاحه فعلى المزارع. (عالمگیری ۲۳۷/۵)

[۲] اگر مالک زمین نے مزارع پر کسی ایسے کام کی شرط لگائی جس کا اثر اور جس کی منفعت مدت زراعت کے بعد بھی باقی رہتی ہے، تو ایسی شرط مفسدِ عقدِ مزارعت ہے، مثلاً کھیت کے لیے دیوار یا باڑ لگانا یا نئی نہر کھودنا یا کھاد ڈالنا وغیرہ۔

بدائع الصنائع میں ہے: ومنها: ان يشترط صاحب الارض على المزارع عملا يبقى اثره ومنفعته بعد مدة المزارعة، كبناء الحائط والسرقند واستحداث حفر النهر ورفع المسناة ونحو ذلك مما يبقى اثره ومنفعته الى ما بعد انقضاء المدة؛ لانه شرط لا يقتضيه العقد. (بدائع الصنائع ١٨١/٦)

[۳] کوئی ایسا کام جو عمل مزارعت کے قبیل سے نہیں ہے، اس کی شرط مزارع یا مالک میں سے کسی ایک پر لگانا بھی مفسد عقد ہے۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: وفي الاصل اذا شرطا في المزارعة على المزارع او على رب الارض ماليس من اعمال المزارعة يفسد المزارعة. (١٩٢/٤)

اس موقعہ پر صاحب خلاصۃ الفتاویٰ نے اس کی بھی تصریح فرمادی ہے کہ کونسا کام اعمالِ مزارعت کے قبیل سے ہے اور کون سا نہیں ہے؟ فرماتے ہیں:

وعمل المزارعة ماينبت وينمى فى الخارج، ومالا ينبت ولا ينمى فى الخارج فهو ليس من اعمال المزارعة. (١٩٢/٤) **یعنی** وہ کام جو پیداوار کو اگانے یا اس کو بڑھانے میں دخیل و مؤثر ہے وہ عمل مزارعت سے تعلق رکھتا ہے، اور جو اس قسم کا نہیں ہے وہ اعمالِ مزارعت میں سے نہیں ہے۔

[۴] عقد مزارعت میں یہ ضروری ہے کہ زمین عامل کے حوالے اس طرح کر دی جائے کہ اس میں مالکِ زمین کا کوئی عمل دخل نہ رہے، اسی لیے مالک زمین پر کام کی شرط لگانا مفسد عقد مزارعت ہے؛ اس لیے کہ اس قسم کی شرط مزارع کی طرف تخلیہ وتسلیم ارض سے مانع ہوگی۔

بدائع میں ہے: ومنها: ان تكون الارض مسلمة الى العامل مخلاة، وهو: ان يوجد من صاحب الارض التخلية بين الارض وبين العامل حتى لو شرط العمل على رب الارض لا تصح المزارعة لانعدام التخلية، وكذا اذا اشترط فيه عملهما فيمنع التخلية جميعا لما قلنا، ولهذا لو شرط رب الارض الخ (۱۷۸/۶)

[۵] بیج اور عملِ زراعت کے علاوہ دیگر تمام مصارف دونوں کے ذمہ بقدرِ حصص مشترکہ طور پر واجب ہیں۔

بدائع میں ہے: ومنها: ان كل ما كان من باب النفقة على الذرع من السرقين وقلع الحشارة ونحو ذلك فعليهما على قدر حقهما، وكذلك الحصاد والحمل الى البيدر والدياس وتذريته لما ذكرنا ان ذلك ليس من عمل المزارعة حتى يختص به المزارع. (۱۸۲/۶، عالمگیری ۲۳۷/۵)

[۶] عقدِ مزارعت میں جس کی طرف سے بیج ہوتا ہے (چاہے مالک زمین ہو یا مزارع) اس پر نفس ایجاب وقبول سے یہ عقد لازم نہیں ہوجاتا؛ چنانچہ اس کے بعد بھی اگر وہ بیج ڈالنے سے پہلے پہلے اس عقد سے کنارہ کشی اختیار کرے تو اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا، جبکہ اس کے مقابل پر نفس ایجاب وقبول سے ہی عقد لازم ہوجاتا ہے، اور اب اس کے لیے بلا عذر شرعی کنارہ کشی اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

ومنها: إن هذا العقد غير لازم فى جانب صاحب البذر، لازم فى جانب صاحبه، لو امتنع بعد ما عقد عقد المزارعة على الصحة، وقال لا اريد زراعة الارض له ذلك سواء كان له عذر او لم يكن، ولو امتنع صاحبه

ليس له ذلك الا من عذر. (بدائع ١٨٢/٦)

اس کے بعد چونکہ سوال میں زیرِ بحث یہ ہے کہ کھاد کی ذمہ داری جب مالک یا مزارع میں سے کسی ایک پر متعین طور پر ڈالی جائے تو کیا حکم ہے؟ اس موقعہ پر اس کی تنقیح ضروری ہے کہ اس ذمہ داری میں دو امر آتے ہیں: ایک کھاد کی مالیت، اور دوسرا اس کھاد کو زمین میں ڈالنے کا عمل، اور کتبِ فقہ کی عبارتوں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھاد کی مالیت سے قطعِ نظر صرف کھاد زمین میں ڈالنے کے عمل کی ذمہ داری بھی اگر مزارع پر مشروط کی گئی تو عقد مزارعت فاسد ہو جاتا ہے۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: وفى الفتاوىٰ النسفي: لو شرط القاء السرقين فى المزارعة والمعاملة يفسد العقد، ولو لم يشترط لا يلزم العامل، فالحيلة ان يستاجر على اصلاح المسنيات وحفر الانهار والقاء السرقين باجرة يسيرة غير مشروطة فى العقد، ونقل السرقين عن البذرة ونواحيها ان كان متفاوتا؛ ولكن تفاوت ذلك قليل. (١٩٣/٤)

دیکھئے یہاں القاء سرقین کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو عمل پر دلالت کرتا ہے؛ نیز آگے چل کر جو حیلہ بتلایا ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ صرف عمل مراد ہے، اس لیے کہ اجارہ منافع میں ہوتا ہے اعیان میں نہیں ہوتا، اور مالیت سرقین اگر مراد ہوتو وہ از قبیل اعیان ہونے کی وجہ سے اجارہ ہی درست نہ ہوگا، اس لیے لا محالہ القاء سرقین کا عمل مراد لینا ہوگا، اسی طرح اوپر اصولی باتوں کے ضمن میں نمبر۲ پر بدائع کی عبارت ہم نقل کر آئے، اس میں تصریح ہے کہ "ان يشترط صاحب الارض على

المزارع عملا یبقی اثرہ ومنفعتہ الخ" اوراس کی مثال میں جوامور ذکر کئے گئے ہیں ان میں بناء حائط، رفعِ مسناۃ، ساتھ ساتھ السرقند کو بھی شامل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں کھاد کی مالیت والی حیثیت کو نہیں؛ بلکہ اس کی عمل والی حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے؛ نیز مبسوط کے زیرِ بحث مسئلہ میں جہاں اس عقد فاسد کا حکم بیان کیا ہے، وہاں بھی ان دونوں حیثیتوں کا الگ الگ لحاظ فرما کر حکم جاری کیا ہے۔ ولصاحب الارض اجر مثل ارضه واجر مثل عمله فيما عمل من ذلك، وقيمة سرقينه ان كا ن ذلك من قبله.

دیکھئے یہاں صاحب ارض کے عمل القاء سرقین کی اجرت الگ اور مالیت سرقین کی قیمت الگ دلائی گئی، جس سے ان دونوں کے الگ الگ ہونے کا پتہ چلتا ہے، اس لیے ضروری ہوگیا کہ شرط سرقین میں ان دونوں امور کا لحاظ کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا جائے۔

اب آپ کے اٹھائے ہوئے نکات کو دیکھتے ہیں، شرط سرقین میں اگر اس کی مالیت والی حیثیت کو دیکھا جائے تو اس شرط سے عقد مزارعت فاسد ہو جاوے گا؛ اس لیے کہ عقد مزارعت میں جتنے بھی مصارف آتے ہیں، ان کی ذمہ داری دونوں پر بقدر حصص مشترکہ طور پر ہے، جیسا کہ اصولی باتوں کے ذیل میں نمبر ۵ پر گزر چکا، اور قیمت سرقین کو متعین طور پر دونوں میں سے کسی ایک پر ڈالنا مقتضاءِ عقد کے خلاف ہے۔ اب اگر یہ اشکال ہو کہ پھر چاروں صورتوں میں عقد فاسد ہو جانا چاہئے؛ حالانکہ ایک صورت (شرطِ سرقین علی رب الارض اور بذر من قبلہ) میں جواز وصحت کی تصریح موجود ہے، تو اس کا جواب خود دلیل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور آخر میں ہم انشاء اللہ اس پر بحث کریں گے۔

اور اگر شرط سرقین میں اس کی عملی حیثیت کو دیکھا جاوے تو اس صورت میں بھی

یہ شرط عقد مزارعت کے حق میں مفسد ثابت ہوگی، مالک کے حق میں تو اس لیے کہ یہ عمل مزارعت کے قبیل کی چیز ہے، اور اصول نمبر۴ کے مطابق اس قسم کی شرط جو مزارع کی طرف تخلیہ وتسلیم ارض سے مانع ہو مفسد عقد ہے، اور مزارع پر یہ شرط لگانا اس لیے مفسد ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو اعمال مزارعت کے قبیل سے ہونے کے باوجود، اس کا اثر اور اس کی منفعت مدت مزارعت کے ختم کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اور اصول نمبر۲ کے مطابق یہ بھی مفسد ہے۔

انگریزی کھاد اور دیسی کھاد میں مالیت والے پہلو کو مدنظر رکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اور عمل والے پہلو کے اعتبار سے دونوں میں صریح فرق موجود ہے، اور وہ بھی دو طریقہ سے: پہلا تو یہ کہ دیسی کھاد ڈالنے والے عمل کا اثر اور اس کی منفعت مدت مزارعت کے ختم کے بعد بھی باقی رہتی ہے؛ چنانچہ دیسی کھاد ہر سال اور ہر فصل کے لیے ڈالنا نہیں پڑتا؛ بلکہ عموماً ایک یا دو سال کے فاصلے سے ڈالا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ کھاد ڈالنے کے بعد اس کا اثر اور اس کی منفعت دو تین سال تک باقی رہتی ہے، جبکہ انگریزی کھاد ہر فصل کے لیے ڈالا جاتا ہے، اگلی فصل میں کھاد ڈالنے کا جو عمل ہو اتھا بعد والی فصل تک بھی اس کا اثر باقی نہیں رہتا، تو گویا شرطِ سرقین مزارع پر لگانے کی صورت میں اس کے عملی پہلو کی وجہ سے جو فساد آتا تھا، اس کی علت یہاں موجود نہیں ہے، دوسرا فرق وہ جس کی آپ نے سوال میں نشان دہی فرمائی ہے۔

اس تفصیل کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں، انگریزی کھاد میں:

(الف) مزارع پر شرط سرقین لگانے کا مطلب اگر یہ ہو کہ مالیت بھی اس کی اور عمل القاء کی ذمہ داری بھی اس پر، تو ظاہر ہے کہ پہلی حیثیت کا تقاضہ یہی ہے کہ عقد مزارعت فاسد ہو جائے۔ شرط علیه اتلاف عین مال لا يقتضيه عقد المزارعة وذلك مفسد للعقد. چاہے بیج مزارع کی طرف سے ہو یا مالک کی طرف سے۔

البتہ اس کی عملی حیثیت کے اعتبار سے فساد نہیں آوے گا گویا "فقد شرط عليه ماتبقى منفعته فى الارض بعد مضى مدة المزارعة" والی علت مفقود ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر عقد مزارعت کے اصول کے مطابق کھاد کے مصارف تو مالک و مزارع دونوں کے بقدر حصص برداشت کئے؛ لیکن عمل القاء کی ذمہ داری مزارع پر مشروط کی گئی تو اس سے عقد فاسد نہیں ہوگا۔

تنبیہ: فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اذا شرط رب الارض والبذر من المزارع ان يسرقنها، قيل: تفسد المزارعة عند المتقدمين ولا تفسد عند المتأخرين، والفتوىٰ على قول المتأخرين، قاله الخجندى وعزيز ابن ابى سعيد كذا فى جواهر الاخلاطى (عالمگیری ۲٤٤/٥) اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: وحكى عن القاضى الامام عبدالواحد انه قال ان شرط (اى السرقين) على المزارع جاز من ايهما كان البذر الخ (خلاصة الفتاوىٰ ۱۹۲/٤، عالمگیری ۲٤٤/٥)

احقر کے خیال میں عالمگیری میں مزارع پر عمل سرقند کی شرط کو غیر مفسد قرار دینا مفتیٰ بہ بتلایا ہے، تو اگر اس کو عمل القاء پر محمول فرمائیں تو انگریزی کھاد میں متقدمین ومتأخرین دونوں کے قول پر عمل ہو جاوے گا۔

(ب) مالک پر شرط سرقین کی صورت میں اگر بیج بھی اس کی طرف سے ہو تو جائز بتلایا ہے، اور اس کی علت بتلائی ہے:

وهذا لان القاء السرقين والعذرة فی الارض يكون قبل الزراعة وقبل الكراب ايضاً وان لزوم العقد فی جانب صاحب البذر عند القاء البذر فی الارض فكانه استاجره للعمل بنصف الخارج بعد مافرغ من القاء العذرة والسرقين.

اس تعلیل کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ صورت اس لیے جائز ہوئی کہ (مالک کے ذمہ بیج ہے اور اصول نمبر ۶ کے مطابق صاحب بذر پر قبل القاء بذر محض ایجاب وقبول سے عقد لازم نہیں ہوتا) صاحب زمین پر عقد لازم ہو اس سے پہلے پہلے وہ عمل سرقین سے فارغ ہو چکا ہے، تو گویا تسلیم وتخلیہ ارض الی المزارع میں کھاد والی شرط سے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، اور صحت مزارعت کے لیے جس قسم کا تخلیہ ارض ضروری ہے وہ لزوم عقد کے وقت حاصل ہے، کیونکہ وہ عمل سرقین سے اس سے قبل ہی فارغ ہو چکا ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعلیل دیسی کھاد کی صورت میں درست ہے، اور انگریزی کھاد چونکہ بیج کے ساتھ یا بعد میں ڈالا جاتا ہے تو وہاں یہ تعلیل درست نہیں ہو پاتی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی کھاد میں یہ جواز والی صورت باقی نہیں رہے گی جیسا کہ اگر بیج مزارع کی طرف سے ہو، اور شرط سرقین مالک پر لگائی جاوے تو وہ اس لیے ناجائز ہوتا ہے کہ یہ عمل زراعت میں سے ہے، اور عمل زراعت کے قبیل کی کوئی چیز مالک پر مشروط کرنا مانع عن التخلیہ ہونے کی وجہ سے مفسد عقد ہے، (دیکھئے اصول نمبر ۴) اسی لیے صاحبِ مبسوط نے اس کی تعلیل میں فرمایا ہے: ان شرط علی رب الارض فذلك بمنزلة شرط الكراب، والثنيان عليه

لان هذا من عمل الزراعة فاشتراطه على رب الارض يكون مفسدا للعقد.

اور اس سے پہلے شرط کراب وثنیان کے ذیل میں وہ خود تصریح فرما چکے ہیں:

واشترط على رب الارض كرابها او الكراب والثنيان فان كان البذر من العامل فالمزارعة فاسدة؛ لان العقد فى جانب الارض يلزم بنفسه، وموجبه التخلية بين الارض والمزارع، واشتراط الكراب والثنيان عليه يفوت موجب العقد فيفسد به العقد، ثم الكراب من عمل الزراعة واشتراط بعض عمل الزراعة على رب الارض مفسدا للعقد. الخ

اور یہ سب بحث شرط سرقین کی عملی حیثیت سے ہوئی، اور مالیت والی حیثیت کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ عقد فاسد ہو۔

(۲) مضر حشرات الارض سے کھیتی کو بچانے کے لیے ڈالے جانے والے پاؤڈر کی ذمہ داری بھی مالک ومزارع پر بقدر حصص مشترکہ طور پر آتی ہے، اس لیے کہ یہ از قبیل مصارف ہے، اور اصول نمبر ۵ کے مطابق مصارف دونوں پر بقدر حصص مشترک ہیں؛ البتہ اس کو کھیتی میں ڈالنے کی ذمہ داری مزارع پر ہونی چاہئے، دونوں میں سے ایک پر اس کو مشروط کرنا مفسد عقد ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

هذا مافهمت من عبارات الكتب الفقهية، فان كان صوابا فمن الله تعالى، وان كان غير ذلك فمنى ومن الشيطان. **فقط واللہ تعالیٰ أعلم.**

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

احکام سود

سود کی حرمت

سوال: (۱) نفسِ سود لینا دینا حرام ہے یا منفعت؟

(۲) سود جب مطلقاً حرام ہے، تو بعض صورتوں میں اس کی گنجائش کہاں سے آئی اور کس بناء پر آئی؟

(۳) کیا کسی کا یہ قول ہے کہ ''اگر شہر میں مستحقین زکوٰۃ نہ ہوں تو مالِ زکوٰۃ دریا میں ڈال دیا جائے'' اگر یہ قول ہو اور صحیح ہو تو اس پر قیاس کر کے سود کی رقم کو بھی ضائع کر دیا جائے تو کیا مضائقہ؟

(۴) سود کی رقم اگر سود ہی میں دی جائے تو کیا حکم ہے؟ مثلاً ایک شخص کی کچھ رقم بینک میں جمع ہے جس کا سود اس کو ملے گا، اور دوسری طرف اس نے بینک سے رقم سود پر لی ہے جس کا سود اس کو بھرنا ہے، تو پہلی رقم دوسری صورت میں دی جائے تو کیا حکم ہے؟ امید ہے کہ حضرت والا مفصل جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱-۲) سود کی حرمت منصوص اور قطعی ہے۔ حرم الربوا وغیر ذلك من الآیات والاحادیث الصریحة فی هذا الباب.

اصل تو یہ ہے کہ بینک میں رقم ہی نہ ڈالی جائے، کسی مجبوری کی وجہ سے جمع کرانی پڑے تو فاضل رقم وہاں سے وصول کر کے غرباء کو دیدی جائے، اس نیت سے کہ اللہ تعالیٰ اس کے وبال سے محفوظ رکھے، اگر سرکاری محکمہ سے حاصل شدہ فاضل رقم غیر واجبی ٹیکس

میں سرکار کو دیدی جائے تو یہ بھی درست ہے؛ بلکہ صدقہ سے مقدم ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ)

(۳) ایسا کوئی قول احقر کے علم میں نہیں ہے۔

(۴) جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سود کی رقم سود میں دینا

سوال: کیا سود کی رقم سود میں دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

یونٹ ٹرسٹ میں رقم جمع کرنا

سوال: ایک دینی ادارہ ہے، یہ ادارہ ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' میں اپنی رقم رکھنا چاہتا ہے؛ تاکہ اس رقم سے حاصل ہونے والے منافع کو مدرسین کی تنخواہ کے لیے استعمال کر سکے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہمارے علم کے مطابق ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' زیادہ تر اپنی رقوم بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کو سود پر دیتا ہے، اس لیے اس میں رقم رکھنا؛ نیز اس کے حاصل شدہ منافع کو

مدرسین کی تنخواہ میں استعمال کرنا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیمہ کی رقم کا حکم

سوال: کسی ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہوگیا جس کا بیمہ کرایا گیا تھا، اور اس ٹرک کا کلینر (CLEANER) جائے حادثہ پر ہی وفات پا گیا، اب انشورنس کمپنی اس ٹرک کی بھرپائی کرتی ہے؛ نیز مرحوم کے ورثاء کو ایک معین رقم دیتی ہے، تو کیا اس رقم کا لینا مرحوم کے ورثاء کے لیے جائز ہے؟ اگر جائز ہو تو کیوں؟ اور ناجائز ہو تو کیوں؟ مفصل و مدلل؛ نیز عام فہم زبان میں جواب سے مستفیض فرمائیں، علاوہ ازیں علمائے شوافع کی تحقیق کو بھی پیش کریں تو عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیمہ میں سود اور قمار کا ارتکاب ہوتا ہے، اور دونوں بہ نص قطعی حرام ہیں، اس موضوع پر علمائے کرام کی مستقل تصانیف موجود ہیں۔ (مثلاً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ ''بیمۂ زندگی'' جو آپ کی کتاب جواہر الفقہ کا جلد دوم کا جزء بھی ہے) اس کا مطالعہ فرمالیں، اس سلسلہ میں علمائے شافعیہ کی کوئی تحقیق نظر سے نہیں گزری۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مقروض کو سودی رقم دینا

سوال: ایک صاحب ملازم ہے، اور آمدنی کے ذرائع ملازمت کے سوا کچھ نہیں

ہے، اور وہ صاحب مقروض ہے، اور بال بچوں کا بوجھ بھی زیادہ ہے، تو کیا وہ اپنے قرض میں سود کی رقم دے سکتا ہے؟ یہ مسئلہ آپ سے پوچھا گیا تھا آپ نے مزید وضاحت چاہی کہ سود کی رقم کا مصداق کونسی رقم ہے، یقین فرماوے کہ سود کی رقم کا مصداق وہ رقم ہے کہ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے بھینسوں والوں کا حکومت کے بارے میں تنازع تھا کہ حکومت کرایہ زیادہ مانگ رہی تھی، اور بھینسوں والے کم دینا چاہتے تھے، مگر حکومت کی چلی اس کے حکم پر پورا کرایہ دیا گیا، اور آٹھ سال کے بعد بھینسوں والے مقدمہ میں جیت گئے، تو حکومت زائد رقم اور جو اتنے سال اس کے پاس رہی اس کا سود دے رہی ہے، تو یہ سود مراد ہے۔ (کرایہ گجرات سے بمبئی لے جانے کا ریلوے میں)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسے آدمی کو وہ رقم بطور تملیک دیدی جائے، اس کے بعد وہ اس سے اپنا قرض ادا کر سکتا ہے۔ (اشباع الکلام) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لون کی رقم لینا

سوال: من جانب سرکار لون کی رقم ملتی ہے، مکان بنانے یا جانور وغیرہ خریدنے کے لیے، ان میں سے دو حصے واپس کرنے پڑتے ہیں، اور ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے تو اس رقم کے متعلق کیا حکم ہے، لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

لون کی واپس کی جانے والی کل مقدار اس کی ملنے والی مقدار کے برابر یا اس سے کم ہے تو اس کا لینا درست ہے، ورنہ سود ہے جو جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دکان کا بیمہ کرانا

سوال: ہمارے کپڑے کی دوکان ہے جس میں تقریباً ہمارا ذاتی مال دوڈھائی لاکھ روپئے کا بھرا رہتا ہے، یعنی: اسٹاک رہتا ہے، آج کل ماحول بڑا خراب ہوگیا، دنگے فسا کا ماحول بن گیا ہے، ہم اس مال کا بیمہ کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بیمہ کمپنی بذات خود مکان، دوکان، کارخانہ، فیکٹری اور انسان کی جان کی حفاظت اور نگرانی نہیں کرتی، اس لیے اس معاملہ کو عقد اجارہ میں داخل کر کے اشتراط ضمان علی الاجیر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، یہ معاملہ سود اور قمار سے مرکب ہے؛ بایں وجہ اس میں سود اور قمار دونوں قسم کے گناہ ہوتے ہیں، اور گناہ بھی بڑے سنگین ہیں، جن کو حلال سمجھنا کفر ہے؛ مگر سوال میں جن خطرات کی نشان دہی کی گئی وہ بھی واقعہ ہیں، اور بیمہ کرانے کی صورت میں فسادیوں کی نظر بد سے دوکان وغیرہ کی بہ ظن غالب حفاظت ہو جاتی ہے، اس لیے قانونِ فقہ "الضرر یزال" کے پیش نظر خطرے کی چیزوں کا بیمہ کرانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ بیمہ کمپنی میں جو رقم جمع کرائی ہے اس سے زیادہ جو رقم ملے وہ غرباء اور محتاجوں میں بلانیت ثواب تقسیم کردی جائے، اپنے کام میں ہرگز نہ لی جائے۔

(فتاویٰ رحیمیہ ۱۳۳/۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سودی رقم کا مصرف

سوال: جماعت المسلمین محلّہ جونا بازار مجگاؤں جماعت کے کئی ہزار روپئے مختلف بینکوں میں موجود ہیں، اس رقم پر ملنے والی سود کی رقم کو مدرسہ کے کس مد میں استعمال کرسکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

بلا ضرورت اور مجبوری بنک میں رقم جمع کرانا جائز نہیں ہے، اگر کسی ضرورت یا مجبوری کی وجہ سے اس کی نوبت آ گئی، تو اس پر سود کے نام سے جو زائد رقم حاصل ہوتی ہے تو اس کو غرباء و مساکین کو بطورِ تملیک دینا ضروری ہے، اور دیتے وقت نیت ثواب کی نہ ہو؛ بلکہ اس کے وبال کو دور کرنے کی ہو، اگر ادارہ پر حکومت نے کوئی ناجائز ٹیکس لازم کر دیا ہے تو حکومتی بینک سے حاصل شدہ اس زائد رقم کو اس ناجائز ٹیکس کی ادائیگی کے نام سے حکومت کو واپس کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سودی رقم کا مصرف

سوال: غیر مسلم سرکار سے ربوا لینا دینا جائز ہے کہ نہیں؟ اور ہمارے ملک میں یہ قاعدہ جاری ہے کہ بینکوں میں روپیہ رکھنے والوں کو ربوا کے طور پر روپئے دیئے جاتے ہیں، تو اس کا لینا جائز ہے؟ اور اس کا خرچ کرنا اپنے ذاتی مفاد کے لیے جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

سود کی حرمت فروعی اور استنباطی نہیں؛ بلکہ منصوص اور قطعی ہے۔ ﴿وحرّم الربوا﴾ (اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے) سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا رقعہ لکھنے والے، سود کی گواہی دینے والے؛ سب پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے۔

عن جابر رضي الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، وموكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال هم سواء. رواه مسلم. (مشكوٰة شريف ٢٤٤)

بہتر یہ ہے کہ بینک میں روپیہ داخل نہ کیا جائے، اگر اور کوئی صورت نہ ہو تو

بدرجۂ مجبوری بینک میں بھی روپیہ داخل کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۰۰)

اگر بینک میں رقم جمع کی ہے، تو فاضل رقم وہاں سے وصول کر کے غرباء کو دیدی جائے اس نیت سے کہ اللہ پاک اس کے وبال سے محفوظ رکھے۔ (ایضاً ۲۰۳)

اپنے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سود کا مصرف

سوال: جو پیسہ بینکوں میں رکھا جاتا ہے، اور جو اس کا سود ملتا ہے اس کا استعمال کہاں کہاں جائز ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں دھرم پور میں نگر پنچایت کی طرف سے گاؤں کے پانی نکالنے کے لیے گٹر بنوایا جارہا ہے، جس میں ہر گھر والے سے کچھ رقم لی جارہی ہے، تو آیا بینک کا بیاج جو پیسہ گٹر یوجنا میں دے سکتے ہیں کہ نہیں؟ ایک خلاصہ یہ بھی ہے کہ ایک جنرل گٹر ہوگا جس میں ہر گھر والے کا کنکشن جوڑا جائے گا، تو اپنے گھر کے باڑے سے جنرل پائپ تک اپنے راس المال میں سے خرچ ہو، اور جنرل میں بیاج یا دونوں میں بیاج چل سکتا ہے؟ برائے کرم جلد از جلد جواب دیں، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی ضرورت شدیدہ کے پیشِ نظر بینک میں رکھی ہوئی رقم پر جو سود ملتا ہے اس کو اس کے وبال کو دور کرنے کی نیت سے (بلا نیت ثواب) غرباء و مساکین کو بطور تملیک دیدیا جائے، گٹر یوجنا میں یہ رقم نہ دی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سبسڈی لینا

سوال: امسال ایک سرکاری لون لی جاتی ہے، اس کو "سبسڈی" کہا جاتا ہے، اس میں سود ہے؛ مگر سود کم ہے، فائدہ زیادہ جیسے: کسی نے دو ہزار لیے تو اب بینک میں بارہ سو دینے کے، ویاج ایک سو جیسا دینا ہوتا ہے، مطلب لینے والے کو سات سو کا نفع ہوا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سوال میں مذکورہ صورت شرعی طور پر سود کی تعریف میں نہیں آتی، مثلاً: پروجیکٹ سے کسی نے چار ہزار روپئے کنواں بنوانے یا مکان بنوانے کے لیے نقد لیے، محکمۂ پروجیکٹ نے اپنے قاعدے کے ماتحت ایک ہزار روپئے بالکل صاف معاف کر دیا، اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقعہ دیا، پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کی، اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا؛ مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی، تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا؛ کیونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ "فضل خال عن العوض الخ" یا "کل قرض جر نفعا" وغیرہ ربوا کی تعریف صادق آسکے۔ (نظام الفتاویٰ ۱/ ۲۶۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سبسڈی والی لون لینا

سوال: مسئلہ کہ آدمی کے پاس کم زمین ہونے کی بناء پر اس کو حکومت کی طرف سے سبسڈی مل رہی ہے، اور اس میں لون کا لینا شرط ہے، مثال کے طور پر ۸۴۰۰/ آٹھ ہزار چار سو کی لون ملتی ہے، اس میں سے ۲۱۰۰/ دو ہزار ایک سو اس کو سبسڈی کٹ ہو جاتی

ہے، اوراس میں بھی رشوت تو دینا ہوتا ہے، تین سواس کورشوت دینا ہوتا ہے، اور رشوت دیئے بغیر کام ہوتا نہیں، اور تین سال کے ہفتوں سے سود کے ساتھ وصول کر لی جاتی ہے، ۹۶۰/نوسوساٹھ روپیہ سود کے ہوجاتے ہیں، ۲۱۰۰/دو ہزار ایک سوسبسڈی میں سے ۹۶۰/نوسوساٹھ روپیہ سود کے، تین سو روپیہ رشوت کے، کل ۱۲۶۰/ایک ہزار دوسوساٹھ روپیہ ہوجاتے ہیں، ۸۴۰/آٹھ سو چالیس کا فائدہ ہے تو اس طرح کی لون جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب بھی تحریر فرماویں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہ شخص ضرورت مند ہے، تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے۔ (نظام الفتاویٰ ۱/۲۵۶)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۱/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

سودی رقم سے کتاب خرید کر غیر مسلم کو دینا

سوال: ہمارے شہر گلبرگہ میں جامع مسجد مجلس کے تحت ایک عوامی دینی لائبریری چلتی ہے، اس کی ترقی کے لیے رقم جمع ہوتی رہتی ہے، اس کو ہم بینک میں جمع کردیتے ہیں، بینک ہم کو اس رقم کا سود دیتی ہے، ہمارے ارکانِ کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ ان سودی رقم سے دینی کتابیں جن کا ترجمہ انگریزی یا ہندی یا دیگر زبان میں ہو، ان کتابوں کو خرید کر دوسرے مذہب کی لائبریری کو برائے ہدیہ دیں، اس سے صرف مقصد یہ ہے کہ کتابوں کی رقم کتابوں پر لگے اور دینِ حق کی اشاعت ہو، کیا کمیٹی کا اس طرح کرنا جائز ہے؟ لائبریری کی رقم سے دینی کتابیں جن کا ترجمہ انگریزی یا ہندی زبان میں ہو، ان کو خرید کر غیر قوم

کے سنجیدہ طبقہ میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں بطور ہدیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم واجب التصدق ہونے کی وجہ سے فقراء اور مساکین کو بلا نیت ثواب، محض اس کا وبال دور کرنے کی غرض سے بطورِ تملیک (مالک بنا کر) دے دی جائے، سوال میں بیان کردہ طریقہ درست نہیں۔ (اشباع الکلام امداد المفتیین ۴۵۳)

اگر ان کی طرف سے ان کو دی جانے والی ان دینی کتابوں کی بے ادبی اور توہین کا اندیشہ نہ ہو، تو دے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

بیمہ کمپنی سے کمیشن لینا

سوال: میں لائف انشورنس کا ایجنٹ ہوں، ہم کو کمپنی تنخواہ نہیں دیتی؛ بلکہ ہم جتنا کام کریں گے، اس کے حساب سے کمپنی ہمیں کمیشن دیتی ہے، تو یہ کمیشن لینا ہمارے لیے جائز ہے یا نہیں؟ تاکہ اس سے بچا جائے۔ جواب حوالہ کے ساتھ ایسا دیں کہ دل مطمئن ہو جائے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

لائف انشورنس میں قمار اور سود دونوں خرابیاں لازم آتی ہیں، اس لیے وہ ناجائز اور حرام ہے، اس پر جو کمیشن ملے گا وہ بھی حرام کام میں اعانت پر مل رہا ہے، جو جائز نہیں ہے۔ ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (بقرہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

بینک کے سیونگ کھاتہ میں سود وصول کرنے کے لیے رقم جمع کرنا

سوال: آج کل مدارسِ اسلامیہ اور اوقافِ دینیہ کی بڑی بڑی رقوم بینکوں میں کرنٹ کھاتہ میں جمع کی جاتی ہیں اور کرنٹ کھاتہ میں جمع شدہ رقم پر بینک سے سود نہیں ملتا؛ مگر اپنی ان رقوم سے بینک والے سودی کاروبار کے ذریعہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان رقوم کو بطورِ قرض دے کر لوگوں سے بہت زیادہ سود وصول کرتے ہیں، تو بجائے اس کے ہماری ان بڑی بڑی رقوم سے صرف بینک والے فائدہ اٹھائیں، اگر ہماری یہ رقوم بینک میں سیونگ کھاتہ میں جمع کی جائیں اور بینک سے جو سود ملے، اس سے غریب محتاج مسلمانوں کے لیے خرچ کیا جائے، تو ہمارے ان مذہبی اداروں کی رقوم سے غریب مسلمانوں کو بھی بہت فائدہ ہوگا، تو کیا اس طرح بینک میں سیونگ کھاتہ میں پیسے جمع کرنا جائز ہے کہ نہیں؟ چونکہ عام طور پر سیونگ میں پیسے جمع کرنا ناجائز سمجھا جارہا ہے، اور فتاویٰ کی کتابوں میں یہ مسئلہ بھی نظر سے گزرا ہے کہ بینک سے ملنے والا سود بینک میں نہ چھوڑنا چاہئے؛ بلکہ اس کو وصول کرلینا چاہئے، امید ہے کہ تفصیلی جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

لوگ بینک میں جو رقوم جمع کراتے ہیں، بینک ان رقوم کو سودی کاروبار میں لگاتی ہے، اس لیے گویا رقوم جمع کرانے والے ایک حرام کام میں بینک کی اعانت کرتے ہیں، ارشادِ ربانی ہے: ﴿ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ لہذا بینک میں روپیہ جمع کرنا جائز نہیں، خواہ سود لینے کی نیت ہو یا نہ ہو؛ لیکن اگر کسی کا روپیہ مسئلہ معلوم ہونے سے پہلے جمع ہو، یا کسی قانونی مجبوری سے جمع کردیا ہو، تو اس کا سود بینک میں نہ چھوڑے؛ بلکہ لے کر غرباء اور فقراء پر صدقہ کردے۔ (فتاویٰ دار العلوم ۲/ ۸۵۰، ۸۵۱)

کسی عمل کی برائی اس لیے دور نہیں ہوجاتی کہ اس کا مقصد اچھا ہے، کسی قانونی مجبوری کی وجہ سے اگر بینک میں رقم جمع کرانی پڑی اور اس میں ایسی صورت ممکن ہے کہ جمع کرانے والے کے کھاتہ میں سود نہ آئے، تو پھر ایسی صورت کیوں اختیار کی جائے، جس میں سود لینے کی نوبت آتی ہو؟ اعانت علی الاثم والی صورت سے احتراز ممکن نہ ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ سود لینے والے جرم کا بھی ارتکاب کیا جائے، فقہ کا قاعدہ ہے: "الضرورة تتقدر بقدر الضرورة" خصوصاً جبکہ عوام کے موجودہ ذہن کی وجہ سے یہ قوی اندیشہ ہے کہ لوگ اسی مقصد کا نام لے کر بلا ضرورت بھی بینک میں پیسہ جمع کرانے کے جرم کے مرتکب ہونے لگیں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قرض کی ادائیگی میں زیادتی سود ہے

سوال: عمر نے زید سے دولاکھ روپئے بطور قرض لیے، اور کہا کہ میں ایک سال کے بعد دولاکھ کے بدلے میں ڈھائی لاکھ روپئے دوں گا، تو زید کو یہ پیسے، یعنی پچاس ہزار روپئے زائد لینا جائز ہے کہ نہیں؟ یا یہ کہتا ہے کہ میں پچاس ہزار روپئے میری طرف سے بطور ہدیہ دوں گا، تو زید کو یہ پیسے لینا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ سود ہے اس کا دینا اور لینا درست نہیں۔ "كل قرض جر نفعا فهو حرام" (شامی) عن النبی ﷺ قال: "اذا اقرض الرجل الرجل فلايأخذ هدية" رواه البخاری فی تاریخه، هكذا فی المنتقی. وعن ابی بردة بن ابی موسی رضی اللہ عنہ قال: قدمت المدينة، فلقيت عبدالله بن سلام رضی اللہ عنہ، فقال إنك بأرض فيها الربوا فاش،

فاذا کان لك علی رجل حق فاهدیٰ إلیك حمل تبن أو حمل شعیر أو حبل قت، فلا تأخذه؛ فإنه ربوا. رواه البخاری. (مشکوٰۃ ۲٤٦) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

سودی رقم سے ہاؤس ٹیکس بھرنا

سوال: میں ایک مسجد کے وقف میں خدمت دے رہا ہوں، وقف کے قانون کے حساب سے آمدنی بینک میں رکھتے ہیں، اب بینک میں سود خاصہ جمع ہوا ہے، تو اس سود کی رقم کو مسجد کے مکان جو کرایہ پر ہے اس کا میونسپلٹی میں ہاؤس ٹیکس بھر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب برائے کرم عنایت فرمائیں تو بڑا کرم ہوگا، اگر ٹیکس میں نہ دے سکتے ہوں تو اس رقم کا کیا کیا جائے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سرکاری بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم غیر واجبی ٹیکسوں میں سرکار ہی کو دیدی جائے، یا پھر محتاج غرباء کو دیدے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۰۳) ہاؤس ٹیکس کو غیر واجبی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ إن الدار لا مؤنة فیها اصلا. (شامی) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

مکان خالی کرنے کے لیے سودی رقم کرایہ دار کو دینا

سوال: میری اپنی میراث میں ملی ہوئی کچھ زمینیں ہیں، اور کچھ بنے ہوئے مکانات ہیں، زمینوں پر اپنی طرف سے مکان بنا کر کچھ لوگ رہتے ہیں، وہ زمین کا کرایہ نہیں دیتے، نہ زمین خالی کرتے ہیں، اگر ان سے مطالبہ کرتے ہیں تو وہ نقدی مانگتے ہیں،

جو زمین کی قیمت کے ۲۰/ فیصد ہے، مثال کے طور پر پلاٹ کی قیمت ۱۰۵۰۰/ ساڑھے دس ہزار ہے، تو اس کے مقابلے میں دو یا تین ہزار مانگتے ہیں، اسی طرح کرایہ دار مکان بھی خالی نہیں کرتے، اور کرایہ بھی نہیں دیتے، اور پیسے مانگتے ہیں، کیا انہیں دونوں قصوں میں اپنے یا دوسرے کے پاس سے سود کی رقم دے کر خالی کرا سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نہیں دے سکتے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سودی رقم سے بیت الخلاء بنانا

سوال: ایک آدمی بہت ہی غریب ہے اور ایک دوسرا آدمی جو بڑا ہی مالدار ہے اور اس کا پیسہ بینک کے اندر ہے اور اس کا سود نکلتا ہے جو کہ بہت ہے، اب وہ چاہتا ہے کہ بینک کے اندر سے جو سود مجھ کو ملنا چاہئے، وہ میں لیتا نہیں؛ لیکن اس پیسوں کے ذریعہ سے اس غریب آدمی کے گھر پر ایک بیت الخلاء اگر بنانا جائز ہو تو بنا دوں؛ تا کہ اس کی سہولت ہو جاوے اور میرے دل میں کوئی ثواب کی نیت بھی نہیں ہے، اس لیے مسئلہ کیا ہے؟ مفتیان حضرات اس پر روشنی ڈال کر مجھ کو سہولت کا موقع دیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی عذر کی وجہ سے بینک میں روپیہ جمع کیا گیا اور اس پر بینک کی طرف سے سود کے نام سے زائد رقم ملی، وہ بلا نیت ثواب کسی فقیر و مسکین کی ملک میں دیدی جائے، اس کے بعد وہ خود اپنی جس ضرورت میں لگانا چاہے لگا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ایضاً

سوال: آج کل جو بینک بچت میں بیاج کی رقم کا حساب چل رہا ہے، احقر اس کے لیے مسئلہ معلوم کرنا چاہتا ہے، اس پیسے کو کونسی جگہ خرچ کرنا چاہئے؟ یا یہ پیسہ بینک سے لیا جائے کہ نہ لیا جائے؟ اگر لیا جائے تو کیا یہ پیسہ کسی غریب مسلمان یا ہندو کی دوادارو میں خرچ کر سکتے ہیں؟ یا ان کا قرض ادا کر سکتے ہیں، یا کسی غریب بیوہ عورت کی امداد کر سکتے ہیں، یا کسی غریب لڑکے لڑکی کی شادی کرا سکتے ہیں؟ یا کسی ہندو یا مسلمان کو کپڑا بنوا کر دے سکتے ہیں، یا کسی غریب مدرسہ یا مسجد کی بیت الخلاء یا غسل خانہ بنا سکتے ہیں، یا کسی کے گھر کا بیت الخلاء یا غسل خانہ بنا سکتے ہیں، یا کسی نابینا کی امداد کر سکتے ہیں، یا عوام کی پریشانی کی وجہ سے راستہ میں کنواں یا نل یا راستہ میں بارش کے پانی کی وجہ سے کیچڑ وغیرہ رہتا ہو تو اس پیسے سے یہ سب چیزیں بنا سکتے ہیں، یا کسی کا قرض ادا کر سکتے ہیں؟ اس کی عزت اور پیشہ کی وجہ سے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بلا ضرورت اور بلا عذر بینک میں رقم نہ رکھی جائے، اگر کسی عذر کی وجہ سے وہاں رقم رکھی گئی اور اس پر بینک کی طرف سے جو سود ملتا ہے، وہ بلا نیت ثواب فقراء اور مساکین کو دیدیا جائے، اس کو مسجد یا مدرسہ کے بیت الخلاء یا غسل خانہ کی تعمیر میں لگانا درست نہیں ہے، جن فقراء اور مساکین کو یہ رقم دیدی جائے، وہ اپنی ملک میں آنے کے بعد اپنی یا دوسرے کی کسی بھی ضرورت میں لگانا چاہیں، لگا سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سودی رقم سے بیت الخلاء بنانا

سوال: (۴) ایک بستی ہے، وہاں چار پانچ گھر ہے، یعنی وہ بستی غریب کی ہے، تو اپنے سود کے روپیہ سے سنڈاس بنوا سکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ روپیہ کس کام میں خرچ کر سکتے ہیں؟ اور بستی کے لوگ مہینہ میں آٹھ سو، ہزار روپیہ تک مہینہ کماتے ہیں، وہاں سود کے روپیہ سے سنڈاس بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ سود کا روپیہ کس کام میں خرچ کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سود کی رقم بلا نیت ثواب اس کا وبال دور کرنے کے لیے کسی محتاج، فقیر، مسکین کو دیدی جائے، وہ مالک بننے کے بعد جہاں چاہے اپنی مرضی سے خرچ کر سکتا ہے، آپ ابتداءً کسی بھی تعمیری کام میں اس کو نہیں لگا سکتے۔ (ماخوذاشباع الکلام للمفتی محمد شفیعؒ امداد المفتیین ۴۵۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

حکومتی ادارہ انسٹی ٹیوٹ سے سودی قرض لینا

سوال: فائنانس انسٹیٹیوٹ کی تفسیر یہ ہے کہ حکومت کمزور طبقات کو معاشی طور پر بلند کرنے کے لیے کچھ شرائط کے ساتھ قرض رقم دیتی ہے، دراصل یہ کام مرکزی حکومت کے ماتحت ایک ادارہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے، اس ادارہ کی صوبائی شاخیں بھی ہوتی ہیں، جو مرکز سے امداد حاصل کر کے اپنے صوبہ کے کاروبار کرنے کے خواہش مند حضرات کو حسبِ ذیل شرائط کے ساتھ قرض دیتی ہے:

(۱) جتنی رقم کا کاروبار کرنا ہو، اس کا ایک تہائی خود کاروبار کرنے والے کو اپنے ذاتی مال سے لگانا ہوگا۔

(۲) جیسے جیسے وہ اپنا مال لگا کر بل پیش کرتا جائے گا، ادارہ کا آدمی اس کی تحقیق کر کے ادارہ کو رپورٹ پیش کرے گا، جس پر ادارہ لگائی ہوئی رقم کا دو تہائی حصہ دے گا۔

(۳) قرض لی ہوئی رقم کا طے شدہ سود ادا کرنا ہوگا۔

(۴) مقروضہ رقم کو بالاقساط بھی ادا کر سکتے ہیں، اور ایک ساتھ بھی ادا کر سکتے ہیں؛ جبکہ ادا کی جانے والی رقم وائٹ (جس رقم کا انکم ٹیکس حکومت کو بھر دیا ہو) ہو۔

(۵) کاروبار شروع کرنے سے دو سال تک کوئی قسط ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔

(٦) کاروبار شروع کرنے سے آٹھ سال کے اندر پوری پوری رقم مع سود ادا کرنا ضروری ہے۔

(۷) کاروبار میں بالکلیہ نقصان آنے پر، مثلاً فسادات کے موقع پر دکان جلادی گئی یا لوٹ لی گئی یا اچانک حادثہ میں گر گئی، تو ادارہ بھی اپنے دو تہائی نقصان کا ذمہ دار ہوگا؛ مگر اس وقت جبکہ ادارہ کی رقم ادا کرنے سے پہلے نقصان آیا ہو۔

اس ادارہ سے سودی لون لینے کی وجہ مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) کاروبار کو بڑھانا۔

(۲) لون لے کر اس سے دوکان یا کارخانہ وغیرہ قائم کیا جائے تو اس میں کارندوں کی ضرورت محسوس ہوگی، تو ان کارندوں میں مسلمانوں کو لیا جائے؛ تا کہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچے کہ ان کو ملازمت ملے گی، اور مسلمانوں کو دوسری جگہوں پر ملازمت کے لیے کفار اور حکومت بہت کم مسلمانوں کو لیتی ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو روزینہ میں بہت تکلیف پہنچتی ہے۔

اس ادارہ سے رقم نہ لے کر اپنی ذاتی رقم جو وائٹ نہ ہو اس سے تجارت کرنے پر مندرجۂ ذیل نقصانات ہیں، اور ادارہ سے رقم لینے پر مندرجۂ ذیل فوائد ہیں:

(۱) ذاتی غیر وائٹ رقم کو وائٹ کی جائے گی، یا وائٹ نہیں کی جائے گی۔

اگر وائٹ کی جائے گی تو اس میں کافی خرچ برداشت کرنا پڑے گا کہ ۶۰ فیصد رقم سرکار کو دینی پڑے گی، جس کی وجہ سے رقم میں بہت کمی ہو جائے گی۔

اور اگر وائٹ نہیں کی گئی تو دوکان یا کارخانہ بننے پر سرکار تفتیش کرتی ہے کہ یہ رقم کہاں سے لا کر بنایا، تفتیش کرنے پر جب دو نمبر کی رقم معلوم ہوتی ہے تو سرکار اس پر ٹیکس لگاتی ہے، مزید جرمانہ بھی لگاتی ہے اور کم از کم تین سال تک قید خانہ میں جانا پڑتا ہے۔

(۲) انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس سے رہائی حاصل ہوتی ہے کہ تین سال تک سیل ٹیکس بھرنا نہیں پڑتا اور انکم ٹیکس بھی کچھ سال تک بھرنا نہیں پڑتا؛ لیکن اس کے بجائے سود بھرنا پڑتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجۂ ذیل سوالات قائم ہوتے ہیں:

(۱) اس ادارہ سے اس شخص کو جس کے پاس کاروبار کرنے کے لیے رقم کا مکمل انتظام نہ ہو، اس کو سودی لون لینا کیسا ہے؟

(۲) اس ادارہ سے اس شخص کو کاروبار کرنے کے لیے جس کے پاس رقم کا مکمل انتظام ہے؛ مگر وہ رقم غیر وائٹ ہے تو ایسے شخص کو سودی لون لینا کیسا ہے؟

(۳) مذکورہ صورت میں کچھ سال تک سودی لون لینے کی وجہ سے انکم ٹیکس نہیں بھرنا پڑے گا، جس کی وجہ سے انکم ٹیکس کی رقم بچے گی، اس بچی ہوئی رقم کو قرض لی ہوئی رقم کے سود میں بھرنا کیسا ہے؟

تین نمبر سوال کی مزید تفصیل یہ ہے کہ مثلاً ہم نے اپنی وائٹ رقم سے دوکان بنائی، اب ایک سال میں جو بھی نفع ہوا تو اس میں ۶۰ فیصد کے اعتبار سے انکم ٹیکس بھرنا ہوگا، اور اگر ہم نے ادارہ سے رقم لے کر دوکان بنائی ہے، تو اس میں انکم ٹیکس معاف ہوگا؛ کیونکہ ادارہ سے لی ہوئی رقم کا سود بھرنا پڑتا ہے۔

(۴) ایک آدمی نے فائنس انسٹیٹیوٹ سے تیس لاکھ روپئے قرض لیے، پھر اس نے دوکان بنائی اور اس کو چلایا اور کافی نفع ہوا، اب ایک سال کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس کا انکم ٹیکس سرکار میں بھرنا پڑے گا، مثلاً: دس لاکھ نفع ہوا تو پانچ لاکھ انکم ٹیکس بھرنا پڑے گا، اب وہ آدمی جس کو انکم ٹیکس بھرنے کا ہے، وہ پانچ لاکھ روپئے لے کر بھرنے کے لیے چلا، اب اس رقم میں سے چار لاکھ تو جو رقم ادارہ سے لی تھی اس کے سود میں بھر دی، اور ایک لاکھ انکم ٹیکس میں بھر دی اور سود میں بھرنے کی وجہ سے انکم ٹیکس اب پھر سے بھرنا نہیں پڑے گا، تو اس طرح جو رقم انکم ٹیکس میں جارہی تھی، وہ رقم سود میں بھر دی تو اس طرح کرنا کیسا ہے؟ جبکہ انکم ٹیکس اور سود دونوں سرکار کے پاس ہی پہونچتے ہیں۔

فائنس انسٹیٹیوٹ اور اسی طرح کے دوسرے ادارے حکومت عوام کو فائدہ پہنچانے کے لیے بناتی ہیں کہ جس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر فائدہ اٹھا سکتے ہیں؛ مگر سود کی وجہ سے مسلمان فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں، تو مسلمان ان اداروں سے کس طرح فائدہ اٹھائے؛ تاکہ ترقی یافتہ ہو، اس کے لیے صحیح صورت سے آگاہ فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کی طرف سے کاروبار کے لیے جو قرض دیا جاتا ہے، اور اس کے عوض میں

قرض لینے والے سے جو رقم زائد وصول کی جاتی ہے وہ سود ہی ہے، دور حاضر کی اصطلاح میں یہ تجارتی سود کہلاتا ہے، سود چاہے تجارتی ہو یا مہاجنی؛ بہر صورت حرام ہے، قرآن وحدیث کی نصوص اور اجماعِ امت سود کی ہر قسم اور ہر شعبہ کو سخت ترین حرام قرار دیتے ہیں۔

اب رہا انکم ٹیکس کی ادائیگی کا معاملہ تو اس کے خاطر سود کی ادائیگی کو ایک مسلمان کیوں اختیار کرے گا؟ جبکہ اس میں اپنی مرضی واختیار سے حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے، اور انکم ٹیکس میں ہم پر جبر وظلم ہوتا ہے، اس لیے انکم ٹیکس کا خطرہ بتلا کر سود کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ حکومتی ترقیاتی اداروں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان متحد ہوکر اپنی آواز حکومت کے ان اداروں کو پہنچائیں، اور سود کے بجائے کاروبار میں حکومت کی شرکت والی صورت کو بطور بدل پیش فرما کر ان کے سامنے واضح کریں کہ سودی معاملہ کے بجائے شرکت والا معاملہ خود حکومت کے لیے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اگر مسلمان اس طرح کے نمونے امانت ودیانت کے ساتھ پیش کردیں تو کوئی وجہ نہیں کہ حکومت اپنے موقف پر جمی رہے؛ اس لیے بہتر اور مناسب صورت یہی ہے کہ شریعت کے احکام منصوصہ میں تاویل وتغییر کے بجائے حکومت کے سامنے سنجیدگی سے ہمارا موقف رکھا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتاب الوکالۃ

وکیل بالشراء کا مؤکل مدیون پر ظلم در ظلم کرنا

سوال: محمد مرشد نے اپنے ماموں زاد نانا سے یہ کہا کہ مجھے آپ ایک پاور لوم مشین دلا دیں، تو ہم بھی اچھی طرح سے روزی روٹی حاصل کرسکیں، اس وقت مرشد کے نانا نے یہ کہا کہ تم اگر اپنا گھر اپنے والد سے میرے بندھک کرادو، اس کے عوض مشین میں جو بھی رقم لگے گی، میں دے دوں گا، تم سب بھائی بہن مل جل کر کام کروگے اور دھیرے دھیرے مشین کی رقم وصول دیتے رہو گے، مرشد نے یہ الفاظ اپنے باپ محمد علی جان کو بتائے، وہ تیار ہو گئے؛ لہذا علی جان اور مرشد نانا حبیب الرحمٰن سے گفت وشنید کے بعد یہ طے ہوا کہ مشین تم اپنے سے دیکھ بھال کرلوگے، میں صرف مشین میں جتنی رقم لگے گی، دے دوں گا، بدلے میں تم اپنا گھر میرے نام بندھک کے طور پر لکھ دو؛ تا کہ کل آئندہ دن تمھارا لڑکا کسی طرح کی عیاری نہ کرسکے اور ان کے دل میں چور ہو کہ وہ پیسہ جلد وصول دینے کی کوشش کرے، محمد علی جان نے حاجی حبیب الرحمٰن کی ساری باتوں اور شرائطوں کو منظور کرلیا اور گھر لکھنے پر تیار ہو گئے اور کچہری جا کر حاجی صاحب کو اپنے گھر کا قبالہ دے دیا اور ان کے یقین پر ان کے بنائے ہوئے کاغذات پر دستخط کر دیئے، اس وقت محمد علی جان کو اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ کاغذات پر کیا الفاظ تحریر کیے گئے ہیں؛ چونکہ انہیں حاجی صاحب پر یقین واعتماد تھا اور قریبی رشتہ داری بھی تھی، لیکن دستخط کرنے کے بعد حاجی صاحب نے کچہری میں بتایا کہ مبلغ دو ہزار روپئے کا قبالہ شرطیہ کرآیا ہوں، جس کی مدت سات سال ہے اور ساتھ ہی مشین تلاش کرنے کی ہدایت دی، دس بارہ دنوں بعد ایک مشین مرشد نے دیکھا اور حاجی صاحب سے کہا کہ فلاں جگہ مشین ہے، جس کی قیمت پانچ

ہزار روپئے ہے اور انہیں پسند بھی ہے اور یہی مشین کو خریدنا ہے؛ لہٰذا حاجی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، کل سویرے مشین خرید لیا جائے گا، لہٰذا دوسری صبح مرشد اپنے بھائیوں مع حاجی صاحب کے مشین والے کے گھر پہونچ گئے، بیل گاڑی بھی ساتھ لے گئے تھے، واضح رہے کہ مشین والے کو حاجی صاحب نے کتنی رقم دی یا اس مشین کی بابت خرید و فروخت کی کوئی دستاویز محمد مرشد یا محمد علی جان کو نہ ملا، دو ماہ کی مدت تک میں مشین چالو ہوگئی، اس درمیان محمد مرشد نے حاجی صاحب سے حسب ضرورت خورہ کر کے تقریباً دو ہزار روپئے لیے، تب حاجی حبیب الرحمٰن نے محمد مرشد سے کہا کہ تمھارے سر کل ملا کر میرے سات ہزار روپئے قرض ہوگئے ہیں، حاجی صاحب نے دانستہ طور پر کہا کہ فی ہزار پچیس روپئے کے حساب سے ایک سو پچھتر روپئے ماہانہ بنتا ہے، سو ہم لیں گے، مرشد نے عاجزی کی، تو ایک سو پچاس روپئے ماہانہ پر بات طے ہوئی اور اسی وقت حاجی صاحب نے ایک کاغذ مشین کے کرایہ کا لکھ کر مرشد کو دیا اور کہا کہ اپنے باپ سے دستخط کرا دو، لہٰذا مرشد نے دستخط کروائے اور کہا کہ یہ رقم مشین کا کرایہ رہے گی، ہوسکتا ہے ایسا نہ کرنے سے یہ رقم سود میں شمار ہو جاوے، اس دور میں حاجی صاحب بھی مشین پر مشین لے کر کپڑا تیار کرواتے تھے، یہی کاروبار اس کا ابھی بھی ہے؛ لہٰذا مرشد نے بھی اسی شکل کو اختیار کیا اور حاجی صاحب سے سوت وغیرہ لے کر کام کرنے لگا؛ مگر مرشد نے فائدہ نہ دیکھ کر بار بار کوشش کی کہ یہی کام مہاجن سے سوت لے کر کیا جائے، لیکن حاجی صاحب نے کاروباری چکڈن میں مرشد کو ایک ہزار روپئے مزید قرض دار بنا دیا، ایک دن مرشد دوسرے کے مہاض سے سوت لے آیا، اس نے کاروبار کو دوسرے سرے سے چلانا چاہا،

حاجی صاحب کو خبر ہوئی اور آ دھمکے، غصے سے لال سے ہوتے ہوئے صاف لفظوں میں یہ بات کہی کہ تم دوسرے کا کام نہیں کر سکتے، چونکہ یہ لوم میرا ہے، یہ لوم میں نے اپنے نام خریدا ہے اور تمہیں صرف کرایہ پر دیا ہے، تمھیں کام بھی صرف میرا ہی کرنا ہوگا، مرشد اور ان کے گھر والے غم کھا گئے اور پھر حاجی صاحب کے یہی کام کو جاری رکھا، حاجی صاحب ہر ماہ پابندی کے ساتھ مرشد کے حساب میں سے کرائے کی رقم نقد ایک سو پچاس روپئے کاٹ لیا کرتے تھے، مرشد پھر بھی اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح اس چکڈن سے آزاد ہو جاویں، جس کا تذکرہ مرشد حاجی صاحب سے برابر کرتا رہا، تب حاجی صاحب نے مشورہ دیا کہ تمھارے گھر کے بغل میں جو تھوڑی سی زمین خالی پڑی ہے، وہ میرے نام کر دو تو اس کے بدلے میں میں کچھ رقم دے دوں گا، تم بازار سے یہی سوت وغیرہ لے کر نقدی کے طور پر میرے اپنے کاروبار کو چلاؤ، پھر مرشد نے یہ بات اپنے والد محمد علی جان کو بتائی، علی جان کی ایک بار پھر حاجی صاحب سے گفت وشنید ہوئی، حاجی صاحب نے برجستہ یہ جملہ کہا تھا کہ تمھارا ایک انچ زمین ہم نہیں لیں گے، گھر تو میرے نام کر ہی چکے ہو، اس کی مدت سات سال کی ہے اور ساڑھے تین سال کا وقت گزر چکا ہے، اس زمین کو بھی میرے نام لکھ دو، کچھ رقم دے دوں گا نقدی کے طور پر، ہر کام کرو اور اسی مدت میں پیسے وصول کرنے کی کوشش کرو؛ لہذا محمد علی جان نے کچہری جا کر اس کاغذات پر بھی دستخط کر دیے، پھر بھی دلاسہ دیتے ہوئے حاجی صاحب نے کہا کہ تمھاری زمین سے مجھے کسی طرح کی کوئی لالچ نہیں اور اس وقت سوت اور تھوڑی رقم ملا کر کل تقریبا ایک ہزار چھ سو روپئے حاجی صاحب نے مرشد کو دیئے، دو ماہ کے بعد حاجی صاحب آئے اور مشین کا

کرایہ طلب کیا، مرشد نے مہلت مانگی کہ ایک ہفتہ کے بعد کرایہ دے دوں گا، اس پر حاجی صاحب فحش کلامی پر اتر آئے، اور غصے میں آکر یہ کہہ دیا کہ میرا الوم (مشین) بند کردو، مرشد کو بھی غصہ لگا، اس نے مشین کو جھنجھوڑ کر چھوڑ دیا، اس وقت سے تقریباً ٦/سال مشین یونہی بند پڑی رہی اور حاجی صاحب بھی پھر کبھی کرایہ لینے دوبارہ نہیں آئے، لیکن محلے کے لوگوں کے پوچھنے پر حاجی صاحب نے یہ الفاظ کہہ دیے کہ مرشد کے یہاں میرا روپیہ دودھ نہیں گھی پی رہا ہے، پھر تقریباً ٦/ برس بعد پھر حاجی صاحب اس مشین کو دیکھنے پہنچے، اور خاص اسی وقت محلے کے ایک شخص نے حاجی صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا یہ مشین بیچنے کا؟ حاجی صاحب نے فوراً کہا، ہاں! پوچھنے پر قیمت دس ہزار روپئے کہہ دیئے، اس شخص نے منظور کرلیا، اور حاجی صاحب نے مرشد کو کہا کہ مشین اس شخص کو اکھاڑ کر دے دو، مرشد نے مشین اکھاڑ کر اس شخص کے حوالے کر دیا، دوسال بعد پھر مرشد نے پانچ ہزار روپئے اپنے ساتھ لے کر حاجی حبیب الرحمٰن کے گھر جاکر مؤدبانہ انداز میں کہا کہ میں پانچ ہزار روپئے لایا ہوں، آپ میرا حساب دیکھ کر مجھے بتائیں کہ کیا ہے؟ تاکہ آپس میں لین دین رفع دفع ہو جائے؛ مگر اس نے حساب نہ دکھایا اور نہ ہی رقم طلب کی، صرف یہ کہہ کر ٹال گئے کہ تم حساب کیا دیکھو گے، تمھارے اوپر بہت پیسہ ہوگیا، بارہ سال کا تو مجھے صرف کرایہ کی رقم چاہیے، مرشد لوٹ آئے، پھر تقریباً ایک سال بعد مرشد اس کی ماں اور بھائیوں کے ساتھ نقد دس ہزار روپئے لے کر پھر حاجی صاحب کے پاس گئے اور مرشد کی ماں نے حاجی صاحب کے پیر پکڑ کر التجاء کی اور کہا کہ ماموں! یہ میرے بچے اتنی سی رقم لائے ہیں، انہیں لے لیجئے اور میرے مکان، کاغذات وغیرہ اسے رفع دفع کردیں، یہ سب بھی تو

آپ ہی کے بچے ہیں، یہ لوگ کہاں بھٹکیں گے، مگر حالات برعکس ہوئے، ترس کھانے کے بجائے حاجی صاحب نے مرشد کی ماں کو بڑی بری طرح پھٹکارا اور کھلے الفاظ میں مندرجۂ ذیل الفاظ برجستہ طور پر کہے ''وہ زمین میری ہے اور وہ گھر بھی میرا ہے، اب اگر تم اس گھر اور زمین کو لوٹانا چاہتے ہو، تو اس گھر اور زمین کی کل قیمت ستر ہزار روپئے دینا ہوگا'' یہ الفاظ سن کر مرشد اور ان کی والدہ اپنے گھر واپس آ گئے، ساری باتیں درج کر دی گئی ہیں اور مفتیان شرع متین سے پرزور گزارش ہے کہ ان باتوں کو اچھی طرح مطالعہ کرتے ہوئے جواب از بحوالۂ کتب دیں گے، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں مالکِ مشین سے خریداری کا جو معاملہ ہوا، اس میں حاجی حبیب الرحمٰن کی حیثیت وکیل بالشراء کی ہے، انھوں نے اس مشین کی جو قیمت ادا کی، وہ رقم ان کا محمد مرشد اور اس کے والد پر دین ہے، جس کی وصولیابی کا ان (حاجی) کو حق ہے۔

وفي الدرر من الوكالة للوكيل بالشراء الرجوع بالثمن على آمره، إذا فعل ما أمر به، سواء دفعه أي الثمن إلى بائعه أو لا. اهـ. (تنقيح الفتاویٰ الحامدية ۱/۳٦٧)

لیکن اس معاملہ کے بعد مشین پر ملکیت حاجی حبیب الرحمٰن کی نہیں؛ بلکہ محمد مرشد اور اس کے والد کی ثابت ہوئی۔ والملك يثبت للمؤكل ابتداء في الأصح. (درمختار مع الشامي ٤/٤٤٧) حاجی حبیب الرحمٰن کا محمد مرشد سے یہ کہنا کہ کل ملا کر میرے سات ہزار روپیہ قرض ہو گئے ہیں، یہ خود ان کی طرف سے صحیح اقرار ہے کہ مشین کی قیمت جو حاجی نے ادا کی ہے، وہ محمد مرشد کی طرف سے ادا کی ہے؛ نیز اس سے پہلے جو باتیں اور معاملات

ہوئے، وہ بھی اس کے واضح قرائن ہیں، حاجی کا محمد مرشد کے مکان کو بند ھک رکھنا، یہ بھی اسی کا ایک قرینہ ہے، اس لیے اس کے بعد حاجی حبیب الرحمٰن کا محمد مرشد کے پاس سے مشین کے کرایہ کے نام سے ماہانہ ڈیڑھ سو روپیہ وصول کرنا صریح سود ہے، جو حرام ہے، کرایہ کا نام دینے سے حکم بدلتا نہیں ہے، حاجی کے لیے ضروری ہے کہ کرایہ کے نام سے جتنی رقم اب تک وصول کی ہے، وہ محمد مرشد کو واپس کرے۔

(قوله فيجب رد عين الربا لو قائما، لا رد ضمانه الخ) يعني أنما يجب رد ضمانه لو استهلكه. (شامی ۴/۱۹۷)

ایک مدت کے بعد حاجی حبیب الرحمٰن کا اسی مشین کے متعلق یہ دعویٰ کہ یہ مشین میری ہے، تمہیں صرف کرایہ پر دیا ہے، درست نہیں اور نہ تو حاجی حبیب الرحمٰن کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مشین کسی کے ہاتھ فروخت کرے؛ لیکن اس کے باوجود حاجی نے محلّہ کے ایک آدمی کو دس ہزار میں مشین فروخت کی، ان کا یہ تصرف فضولی کے تصرف کے حکم میں ہے، اگر محمد مرشد نے اس بیع کو بغیر جبر و اکراہ کے منظور کرلیا ہے، تو بیع درست ہوگئی۔

وقف بيع مال الغير لو الغير بالغا عاقلا فلو صغيرا أو مجنونا لم ينعقد أصلا الخ. (شامي مع درمختار ۴/۱۵۲)

اور دس ہزار کی رقم کا مالک محمد مرشد ہے، حاجی حبیب الرحمٰن کے لیے ان دس ہزار کو وصول کر کے اپنے پاس رکھ لینا جائز نہیں تھا؛ بلکہ حرام ہے، اب جبکہ وہ رقم حاجی حبیب الرحمٰن نے خود رکھ لی، تو وہ محمد مرشد کا حاجی کے اوپر دین ہے، جس کی ادائیگی حاجی پر ضروری ہے، اب صورت حال یہ ہوگئی کہ حاجی کا کچھ دین محمد مرشد کے اوپر تھا، یعنی پانچ

ہزار مشین کی رقم، دو ہزار اس کے علاوہ، ایک ہزار اس کے بعد اور ایک ہزار چھ سو بالکل آخری (جو زمین بندھک دے کر لیے تھے) کل ملا کر یہ رقم نو ہزار چھ سو روپئے ہوئی، اس کے بالمقابل محمد مرشد کا کچھ دین حاجی حبیب الرحمٰن کے ذمہ ہے، یعنی دس ہزار جو حاجی نے مشین خریدنے والے محلّہ کے آدمی سے وصول کر کے خود رکھ لیے، جو محمد مرشد کا حق تھا اور مشین کے کرایہ کے نام سے اب تک جتنی رقم حاجی عبدالرحمٰن نے محمد مرشد سے وصول کی ہے، وہ بھی حاجی کے ذمہ محمد مرشد کا دین ہے، دونوں کا حساب کرنے سے نتیجہ میں محمد مرشد کا حق حاجی حبیب الرحمٰن پر نکلتا ہے، اس لیے کہ حاجی حبیب الرحمٰن کی کل رقم جو محمد مرشد پر ہے، جس کی مقدار نو ہزار چھ سو ہوتی ہے، وہ تو مشین کی دوسری مرتبہ فروخت میں حاصل شدہ دین میں سے ہی وصول ہو جاتی ہے اور چار سو روپئے پھر بھی محمد مرشد کا حق باقی رہتا ہے، اور کرایہ کے نام سے اب تک جتنی رقم محمد مرشد سے حاجی حبیب الرحمٰن نے وصول کی ہے، ان سب کا لوٹانا حاجی حبیب الرحمٰن پر لازم ہے؛ نیز اب حاجی حبیب الرحمٰن کے لیے محمد مرشد کی زمین اور مکان کو بندھک کے نام سے اپنے پاس روکے رکھنا ہرگز ہرگز جائز نہیں؛ بلکہ صریح ظلم ہے، حاجی حبیب الرحمٰن پر لازم ہے کہ پہلی فرصت میں مکان اور زمین محمد مرشد اور اس کے والد کے حوالہ کرے، (اور والد نہ ہوں تو دیگر ورثاء ان کے قائم مقام ہیں) اگر تاخیر یا ٹال مٹول کریں گے، تو سخت گنہ گار ہوں گے اور ظالم وغاصب شمار ہوں گے۔ باقی رہا حبیب الرحمٰن کا ستر ہزار کا مطالبہ تو یہ ظلم در ظلم ہے: ﴿وسیعلم الذین ظلموا أي منقلب ینقلبون﴾ حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”من أخذ شبرا من الأرض ظلما فإنه یطوقه یوم القیٰمة من سبع

أرضین."(مشکوۃ ٢٥٤) یعنی جو آدمی کسی کی ایک بالشت زمین بھی رکھ لے گا، تو اس کو قیامت کے روز سات زمین کا طوق پہنایا جائے گا۔(اعاذنا اللّٰہ منہا) جماعتِ مسلمین کو بھی چاہیے کہ ظالم سے مظلوم کا حق دلانے میں مظلوم کی بھرپور مدد کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

وکیل مؤکل کے خلاف تصرف کا خود ذمہ دار ہے

سوال: ہمارے والد صاحب نے جو کاروبار ہمیں سونپا ہے، وہ ایسا ہے کہ سب کام ورکروں یعنی نوکروں سے لیا جاتا ہے اور ان سے پالیسی رکھنا پڑتا ہے، ایسا نہیں کرتے تو کام رک جاتا ہے، اور کاروبار میں خلل ہوتا ہے، اور دیتے ہیں تو والد صاحب وہ رقم واپس ہم کو دینے سے انکار کرتے ہیں، تو میں کیا کروں؟ ایسے ورکروں کو دی ہوئی رقم کاروبار سے وصول کرسکتا ہوں؟ آپ اس کے متعلق شرعی رو سے وضاحت کریں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

والد صاحب کی طرف سے آپ جو کاروبار کر رہے ہیں، اس میں آپ ان کے وکیل ہیں، اور وکیل کو اسی تصرف کا اختیار ہوتا ہے جس کی مؤکل اس کو اجازت دے، اس لیے جب والد صاحب کی طرف سے ورکروں کو دینے کی اجازت نہیں ہے، اور آپ نے دی تو اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی، آپ کاروبار میں سے وہ رقم وصول نہیں کرسکتے۔

(ہدایہ ثانی ۲۳۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

كتاب الإجارة

مریض کو حکیم تک پہنچانے کی دلالی لینا

سوال: حکیم اور مریض دونوں غیر مسلم ہیں؛ لیکن درمیان میں ایک مسلم شخص جو مریض کو حکیم تک پہنچانے یا دونوں کے تعلقات کرانے کے؛ نیز اس ذمہ داری سے کہ مرض ٹھیک ہو ہی جائے گا، مریض سے بطورِ دلالی کے کچھ رقم: ہزار، دس ہزار اس نیت سے کہ اس رقم سے کوئی مسجد تعمیر کرے یا کسی مدرسہ کی نصرت کرے، کیا اس رقم پر دلال کی ملکیت ثابت ہوں گی یا نہیں؟ کیا اس کو مسجد تعمیر میں لگانا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ ایک طرح کی سفارش ہے؛ نیز مرض سے خلاصی ہونا اور صحت حاصل ہونا منفعتِ مقدور التسلیم نہیں ہے، اس لیے یہ رقم لینا جائز نہیں ہے۔(ماخوذ از امداد الفتاویٰ ۳/۳۴۲)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سودی کاروبار پر مشتمل تنظیم میں ملازمت کرنا

سوال: زید احمد آباد شہر کی اردو اسکول میں مدرس کی حیثیت سے کام کر رہا ہے، مقامی اسکولوں کے اساتذہ کی co-operative تنظیم چلتی ہے، یہ تنظیم مدرسین کو (loan) فراہم کرتی ہے، یہ قرض مدرس کو مع سود کے قسط وار ادا کرنا پڑتا ہے، اس کا او پریٹیو تنظیم کا نظام چلانے کے لیے آٹھ افراد پر مشتمل ایک عملہ ہے، زید اس تنظیم میں بھی کام کرتا ہے، اسے اس کی محنت کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے، تنظیم کا منافع یا آمدنی خاص سود پر ہے، سوال یہ ہے کہ زید اپنی خدمت دے کر جو وہاں سے معاوضہ لیتا ہے، وہ از روئے شریعت حلال ہے کہ نہیں؟ مطلع کیجیے، نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اگراس تنظیم کا کام سود پر قرض دینا ہی ہے، تو اس میں ملازمت کرنا اور اس سے حاصل شدہ اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللّٰه ﷺ آكل الربوا، وموكله، وكاتبه، وشاهديه. وقال: هم سواء. رواه مسلم (مشکوٰۃ ۲٤٤)

لايجوز أخذالأجرة على المعاصي كالغناء، والنوح، والملاهي؛ لأن المعصية لا يتصور استحقاقها بالعقد، فلا يجب عليه الأجر، وإن اعطاه الأجر وقبضه لا يحل له ويجب عليه رده على صاحبه. (مجمع الانهر ۳۸٤/۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/شوال ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

شراب بیچنے والے کو ہوٹل کرایہ پر دینا

سوال: اگر میرے پاس کوئی ہوٹل ہے، اور میرے پاس صرف کھانے کی دوکان ہے، یعنی جس کے اندر صرف چائے اور کھانا فروخت کرتا ہوں، اور دوسرا آدمی جس کو میں نے کرایہ پر دیا ہے، وہ میری اجازت سے شراب فروخت کرتا ہے، یا پھر میں نے اجازت نہیں دی اور وہ میری اجازت کے بغیر شراب فروخت کرتا ہے، تو یہ کیا اس کے لیے جائز ہے یا حرام ہے؟ اس لیے میں نے لکھا کہ ایک مولانا ہمارے یہاں اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اس میں اعانت علی المعصیت ہے، فرمانِ خداوندی ہے: ﴿ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾ (یعنی معصیت اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت

مت کرو) اگر اجارہ پر دینے والے کا مقصد اس معصیت ہی کا ہو، (جیسا کہ اجازت دینا اس پر دلالت کرتا ہے) تب تو یہ خود ارتکابِ معصیت اور اعانتِ معصیت میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہے اور اگر اس کا قصد و نیت شامل نہ ہو؛ لیکن اس کو علم ہے کہ یہ شخص اس دوکان میں شراب فروخت کریگا، تو اس صورت میں یہ بیع و اجارہ مکروہ ہے۔ (از جواہر الفقہ ۲/ ۴۵۵ ملخصاً) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عقدِ اجارہ کے بغیر پیشگی اجرت کے جواز کا حیلہ

سوال: یہاں مدرسہ اسلامیہ کی ملکیت کی پانچ دوکانیں موجود ہیں، اس کی کرایہ کی آمدنی سے مدرسہ اسلامیہ کے اخراجات پورے کیئے جاتے ہیں، فی الحال مدرسہ میں سات سو کے قریب طلبہ اور طالبات علم حاصل کررہے ہیں اور سولہ استاذ ہیں، دوکانیں پرانی ہوچکی تھیں، اور یہاں کے سرکاری قانون کے موافق نئی تعمیر کرنے کی ضرورت تھی، اس لیے ٹرسٹی صاحبان نے پرانی دوکانیں توڑ دی ہیں، اب دوبارہ جو دوکانیں بنائی جائیں گی وہ بجائے پانچ کے سات دوکانیں بنے گی، پانچ دوکانیں پرانے کرایہ داروں کو دی جائیں گی، بقیہ جو دو دوکانوں میں ان کی تعمیر کے لیے پیسوں کی اشد ضرورت ہے، تو ٹرسٹی صاحبان نے مسجد کے بورڈ پر ایک ماہ کے لیے نوٹس لگائی تھی کہ جو مسلمان دوکان لینا چاہتے ہوں، وہ مدرسہ کو پیشگی امداد کے طور پر پچاس ہزار رینڈ بطور قرضہ دیں، ان کو دوکانیں دی جائے گی، اور ان کی دی ہوئی رقم دوکان کے کرایہ میں وضع کی جائے گی۔

تو اس نوٹس کے بعد دو مسلمان مدرسہ کو پیشگی امداد بطورِ قرضہ دے کر دوکان لینا چاہتے ہیں، تو اس طرح مدرسہ کے لیے پیشگی مدد لینا اور مدد کرنے والوں کو دوکانیں دے کر اس کی دی ہوئی رقم کو دوکان کے کرایہ میں وصول کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ مفصلاً جواب دے کر ممنون فرماویں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عقدِ اجارہ میں اگر مستاجر (کرایہ پر لینے والا) پیشگی کرایہ ادا کردے، یا باہمی رضامندی سے پیشگی کرایہ ادا کرنے کی شرط کرلی جائے تو یہ درست ہے۔

اعلم ان الاجر لا يلزم بالعقد فلا يجب تسليمه به؛ بل بتعجيله او شرطه فى الاجارة المنجزة، اما المضافة فلا تملك فيها الاجرة بشرط التعجيل اجماعاً. (درمختار) (قوله لايلزم بالعقد) اى لا يملك به كما عبر فى الكنز؛ لأن العقد وقع على المنفعة، وهى تحدث شيئا فشيئا، وشأن البدل ان يكون مقابلاً للمبدل وحيث لا يمكن استيفاؤها حالا لايلزم بدلها حالا الا اذا شرطه؛ ولو حكما بان عجله لانه صار ملتزماله بنفسه حينئذ وابطل المساواة التى اقتضاها العقد فصح. (قوله بل بتعجيله) فى العتابية اذا عجل الاجرة لا يملك الاسترداد، ولو كانت عينا فاعارها أو أودعها رب الدار فهو كالتعجيل، وفى المحيط لو باعه .... (قوله او شرطه) فله المطالبة بها، وحبس المستأجر عليها، وحبس العين المؤجرة عنه، وله حق الفسخ ان لم يعجل له المستأجر، كذا فى المحيط .... (قوله اما المضافة الخ)

أي فيكون الشرط باطلا، ولا يلزمه للحال شيء الخ (شامی ۵/۷)

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: کرایہ پیشگی باہمی رضامندی سے وصول کرلیا جائے درست ہے۔ (کفایت المفتی ۷/۳۶۷)

اس لیے کسی موقعہ پر کرایہ دار سے پیشگی کرایہ لینے میں کوئی حرج نہیں؛ بشرطیکہ عقد اجارہ درست اور مکمل ہو جانے کے ساتھ ساتھ اجارہ منجز ہ ہو، یعنی یہ اجارہ کا معاملہ فوری طور پر عمل میں آرہا ہو، آنے والے وقت پر موقوف نہ ہو؛ لیکن صورتِ مسئولہ میں جو رقم ٹرسٹیان مسجد وصول کررہے ہیں وہ پیشگی کرایہ نہیں ہے، اولاً تو اس لیے کہ خود فریقین (رقم لینے والا فریق ٹرسٹیان اور رقم دینے والا فریق دونوں مسلمان) اس کو کرایہ نہیں سمجھ رہے ہیں؛ بلکہ قرض سمجھ رہے ہیں اور کہہ بھی رہے ہیں۔ ثانیاً اس لیے کہ پیشگی کرایہ والی جو صورت شریعت میں جائز و درست ہے، اس میں اولاً تو عقدِ اجارہ ہونا چاہئے، اور ثانیاً اجارۂ منجز ہ ہونا بھی ضروری ہے، اور صورتِ مسئولہ میں سرے سے عقد اجارہ ہی نہیں ہوا ہے، اور اگر ایجاب وقبول کے ذریعہ عقد اجارہ کر بھی لیں تو وہ اجارہ شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے کہ عین مؤجرہ (وہ چیز جو اجارہ پر دی جارہی ہے) یعنی دوکان موجود نہیں ہے؛ حالانکہ اس کا موجود و متعین ہونا اجارہ میں ضروری ہے، اور جب موجود ہی نہیں تو متعین کیسے ہوگی؟۔

منها: بيان محل المنفعة حتى لو قال آجرتك احدى هاتين الدارين او احد هذين العبدين، أو استأجرت احد هذين الصانعين لم يصح العقد. (فتاوی عالمگیری ۴/۴۱۱)

الحاصل جب عقدِ اجارہ نہیں ہے تو پیشگی دی جانے والی رقم کو اجرت کا نام نہیں دے سکتے، اس لیے لامحالہ یہ قرض ہے، اب جبکہ وہ قرض ہوئی تو یہ قرض بلا شرط ہوتا تو

کوئی حرج نہیں تھا کہ یہ مسجد کی امداد کی ایک صورت ہے؛ لیکن صورتِ مسئولہ میں رقم دینے والے یہ دونوں مسلمان اس قرض کے ذریعہ یہ فائدہ حاصل کررہے ہیں کہ بننے والی دوکانوں کو خود کرایہ پر لینے کا معاملہ اس قرض کی وجہ سے اپنے حق میں کروا رہے ہیں، جو ایک قسم کا نفع ہے جو وہ حاصل کررہے ہیں، اس لیے ”کل قرض جر نفعا فهو حرام“ کے تحت داخل ہوکر یہ ممنوع ٹھہرتا ہے؛ البتہ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مسجد کو بھی رقم کی ضرورت ہے، اور کوئی آدمی بلا شرط قرض دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو ایسا کرلیا جائے کہ ان دونوں مسلمان کو جو دوکانیں بننے کے بعد کرایہ پر دی جانے والی ہیں، وہ جس جگہ تعمیر ہوں گی وہ جگہ متعین کرکے فی الحال ان دونوں سے جگہ کے اجارہ کا معاملہ کرلیا جائے، یعنی یوں کہہ دیا جائے کہ یہ جگہ ہم نے آپ کو ماہانہ اتنے کرایہ کے حساب سے اتنی مدت کے لیے کرایہ پر دی، اور اس جگہ کا قبضہ بھی انہیں سپرد کردیا جائے، اب یہ عقد اجارہ مکمل ومنجز ہوگیا، اور ان سے پیشگی کرایہ لینا درست ہوگیا، اس کے بعد جب اس پر دوکان تعمیر ہوجائے تو دکان کے حساب سے جتنا کرایہ بڑھانے کی ضرورت ہو بڑھا دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ ذو القعدہ ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عملیات کی فیس لینا

سوال: عامل کا فیس متعین کرکے علاج کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اس طریقہ سے جو آمدنی ہوں گی حلال یا حرام؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عامل اگر عملیات میں خلافِ شرع امور کا ارتکاب نہیں کرتا، تو وہ اپنے اس علاج کی فیس وصول کرسکتا ہے؛ بشرطیکہ پہلے سے متعین کی گئی ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

پڑوسی کو تکلیف پہنچانے والے شخص کو مکان کرایہ پر دے تو مالک مکان گنہگار ہوگا

سوال: احقر بیتا کا رہنے والا ہے، ہمارے پڑوس میں ایک مولانا صاحب کا مکان ہے، جنہوں نے اپنا مکان شیعی کو کرایہ پر دے کر خود بمبئی میں قیام پذیر ہیں، اور سال بھر میں صرف ۱۵ یا ۲۰ دن کے لیے اپنے مقام پر آتے ہیں، وہ مستاجر شیعی سنیوں سے بیحد تعصب رکھنے والا ہے، اس کی نظریں بھی نہایت ہی خراب ہیں؛ نیز بسا اوقات نشہ آور اشیاء بھی استعمال کرلیتا ہے، اور نہ جانے کیا کیا بری عادتوں کا خوگر ہے، جس کی وجہ سے پڑوس کے مسلمان حضرات کو بیحد تکلیفیں ہوتی ہیں؛ نیز اس کی بری عادتوں کی وجہ سے پڑوس کے مسلمان حضرات کے لیے اپنی اپنی مستورات کی بے عزتی کا بھی خطرہ ہے، احقر نے اصل صاحبِ مکان سے مستاجر شیعی کی تمام بری عادتوں اور اس کی وجہ سے پڑوسیوں کی تکلیفوں کا تذکرہ بھی کیا؛ لیکن صاحب مکان کا کہنا ہے کہ مستاجر شیعی کا رویہ ہمارے ساتھ بہت اچھا ہے، اس لیے ہم ان کو خالی نہیں کروائیں گے۔

اب احقر کا سوال یہ ہے کہ ایسے صاحب مکان کے لیے شریعت کی کیا ہدایت ہے؟ کیا اس کے لیے ایسے مستاجر کو اپنا مکان کرایہ پر دینے کا پورا پورا اختیار ہے کہ جس مستاجر کی وجہ سے تمام پڑوسیوں کو تکلیف ہو؟ یا کوئی اور ہدایت ہے؟ مدلل و مفصل جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿والذین یؤذون المؤمنین والمؤمنٰت بغیر مااکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثماًمبینا﴾ (سورۂ احزاب ۵۸)

یعنی جولوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ (ایسا کام) کیا ہو، (جس سے وہ مستحق سزا ہو جائیں) ایذاء پہنچاتے ہیں، تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا (اپنے اوپر) بار لیتے ہیں، (یعنی اگر وہ ایذاء قولی ہے تو بہتان ہے، اور اگر فعلی ہے تو مطلق گناہ ہی ہے)۔ (معارف القرآن ۷/ ۲۲۶)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: مذکورہ آیت سے کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی کے کسی قسم کی ایذاء اور دکھ پہنچانے کی حرمت ثابت ہوئی۔ (معارف القرآن ۷/ ۲۲۹)

یہ تو عام اہل ایمان کو حکم ہے، جب کہ پڑوسی کے سلسلہ میں مزید تاکید قرآن وحدیث میں وارد ہے۔ مشکوۃ میں حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کے معاملہ میں مجھے برابر تاکید کرتے رہے؛ یہاں تک کے مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دیں گے۔ (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم وہ آدمی مؤمن نہیں، پوچھا گیا کون اے اللہ کے رسول! فرمایا: وہ آدمی جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں اور ایذاء رسانیوں سے مامون نہ ہو۔ (بخاری ومسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانیوں سے مامون نہ ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ (مسلم شریف، مشکوۃ شریف ص:۴۲۲)

صورت مسئولہ میں آپ کے پڑوسی صاحب مکان (جو خود بمبئی میں قیام پذیر ہیں) نے ایک شیعی کو جو سنیوں سے بے حد تعصب رکھنے والا ہے؛ نیز منشیات اور دیگر برائیوں کا خوگر ہے، اپنا مکان کرایہ پر دے کر پڑوسیوں پر اس کو مسلط کر دیا، ان کو چاہئے کہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اس طرح کرایہ پر دینے سے کچھ رقم کا فائدہ ضرور ہوگا، اور بحیثیت مستاجر کے اس کا رویہ صاحب مکان کے ساتھ چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، (اور ہونا ہی چاہئے، ورنہ صاحب مکان خود ہی بغیر کسی کے کہے خالی کرواتا ہے) لیکن اس کی سوال میں مذکورہ بری عادتوں کی وجہ سے پڑوسیوں کو جو ایذاء پہنچ رہی ہے اس میں یہ صاحب مکان بھی سبب بننے کی وجہ سے شرعاً شریک سمجھے جائیں گے، اور ان سے بھی اس سلسلہ میں روز قیامت پرسش ہوگی، کہیں ایسا نہ ہو کہ بفحوائے حدیث نبوی ﷺ یہ چیز جنت میں دخول اولین سے رکاوٹ بن جائے، اس لیے ان کو چاہئے کہ پڑوسیوں کو پہنچنے والی تکالیف کو مدنظر رکھتے ہوئے اس عقد اجارہ پر نظر ثانی کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ — الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

ہاؤسنگ سوسائٹی میں مالک مکان سے نون اوکیوپیشن چارج (Non occupetian) لینا جائز ہے

سوال: بمبئی میں ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی ایک بلڈنگ ہے، جس میں تین سو

سے زیادہ مکان مالکان اپنی ملکیت کے مکان رکھتے ہیں، اِن میں سے کچھ لوگ اپنے مکان میں خود رہنے کے بہ جائے کرایہ دار کو کرایے سے مکان دیتے ہیں۔ ہر مکان مالک سے بلڈنگ کی اجتماعی سہولیات کے اخراجات کے لیے مینٹینس (Maintenence) لیا جاتا ہے؛ البتہ جو لوگ اپنا مکان کرایے سے دیتے ہیں اُن مکان مالکان سے کچھ زائد رقم مینٹننس میں لی جاتی ہے، جس کو ''نون اوکیوپیشن چارج'' (Non occupetian) کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری قانون کے مطابق اگر ہاؤسنگ سوسائٹی میں مکان مالک خود رہنے کے بہ جائے کرایے سے مکان دیوے، تو اُس مکان کے مینٹننس چارج کا دس فیصد اُس مکان والے سے زیادہ لیا جائے، یہ رقم اُس سوسائٹی کے اجتماعی کاموں کے اخراجات میں صرف ہوتی ہے۔

اور اگر یہ ۱۰ فیصد ''نون اوکیوپیشن چارج'' نہ لیا گیا اور متعلقہ افسران کو اِس بات کا کسی طرح پتہ چل گیا کہ یہاں کوئی کرایہ دار رہتا ہے، تو وہ سوسائٹی کی انتظامیہ کے واسطے سے اُس مکان مالک سے مینٹننس کا چالیس فی صد زیادہ وصول کریں گے، اور یہ چالیس فی صد رقم متعلقہ سرکاری شعبے میں داخل ہوگی، سوسائٹی میں استعمال نہیں کی جاسکتی، اِس سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ سوسائٹی کی کمیٹی متعلقہ افسران کے سامنے غلط بیانی کرتی رہے کہ: یہاں کوئی کرایہ دار نہیں ہے، اور پتہ چلنے پر اُن افسران کو رشوت دے کر معاملہ ختم کردے، اگر اِن میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کی گئی تو ہاؤسنگ کے شعبے کے افسران کے سامنے سوسائٹی کی کمیٹی جواب دہ ہوگی۔ اِس تفصیل کے پیشِ نظر چند سوالات عرض خدمت ہے:

(الف) کیا مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں کرایہ پر دینے والے مالک مکان سے نون اوکیوپیشن چارج - جو مینٹینس سے زیادہ ہو- لینا جائز ہے؟

(ب) اگر یہ زائد چارج لینا جائز ہے تو سرکاری قانون کے مطابق مینٹینس کا دس فی صد یا اِس سے زیادہ بھی لے سکتے ہیں؟ اور اُس کو سوسائٹی کے اجتماعی کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں؟

(ج) اگر یہ دس فی صد چارج نہ لیا جائے اور متعلقہ افسران کو پتہ چلنے پر چالیس فی صد وصول کرنا پڑے، تو کیا کمیٹی مکان کے مالک سے وصول کر سکتی ہے جب کہ یہ چارج اُسی کے کرایے پر دینے سے اُس مکان مالک پر قانوناً عائد ہوا ہے؟

(د) اِن تمام قانونی گرفتوں سے بچنے کے لیے سرکاری افسران کو رشوت میں دی ہوئی رقم کا ذمہ دار کون ہوگا؟ چاہے وہ رقم چالیس فی صد سے بھی زیادہ ہو؟

امید ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اِن تمام باتوں کے جوابات ارشاد فرمائیں گے۔ از: اراکین کمیٹی مرغا گرین بمبئی

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ کے سوالات کے جواب سے پہلے بہ طور تمہید چند باتیں عرض ہیں:

(۱) حکومت اپنے شہریوں کی سہولت اور راحت رسانی اور اُن کی ضروریات کی فراہمی کی غرض سے مختلف اسکیمیں جاری کرتی ہے، اُن ہی میں سے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی اسکیم ہے، جس کا مقصد ملک کے شہریوں کو اپنی ملک کے رہائشی مکانات کی فراہمی ہے؛ چناں چہ اِسی مقصد کے لیے وہ قرض بھی دیتی ہے۔

(۲) شہریوں کی ضرورت کی فراہمی کے لیے اور اُن کی راحت رسانی کے لیے حکومت جن چیزوں کا انتظام کرتی ہے اُن میں بجلی، پانی، ڈرینج سسٹم، سڑکیں وغیرہ شامل ہیں؛ یہ وہ چیزیں ہیں کہ انفرادی طور پر اِن کا انتظام کسی فرد یا ادارے کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ پھر حکومت کا طریقِ کار اِن سہولتوں کی فراہمی میں افراد وشخصیات اور ادارے کے لیے مختلف ہوتا ہے، مثلاً بجلی، کہ عموماً یہ حکومت کی طرف سے معاوضہ لے کر فراہم کی جاتی ہے؛ لیکن استعمال کرنے والے کے اعتبار سے اُس کی قیمت میں فرق رکھا جاتا ہے: گھریلو استعمال کے لیے اُس کی جو قیمت مقرر کی جاتی ہے وہ کاروباری اور تجارتی استعمال کے لیے مقرر کی جانے والی قیمت کے مقابلے میں کم ہوتی ہے، اِسی طرح کارخانوں اور فیکٹریوں کے استعمال میں آنے والی بجلی کی قیمت، کھیتی باڑی میں استعمال آنے والی بجلی کی قیمت کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے، عبادت گاہوں اور رفاہِ عام کے کاموں میں استعمال ہونے والی بجلی کی قیمت میں، ذاتی استعمال میں آنے والی بجلی کی قیمت کے مقابلے میں بہت زیادہ رعایت دی جاتی ہے؛ یہی حال بعض دوسری سہولتوں کا ہے جو حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی ہیں۔

(۳) ہاؤسنگ سوسائٹی والی اسکیم جاری کرنے سے حکومت کا مقصد یہ ہے کہ اپنے زیادہ سے زیادہ شہریوں کو اپنی ملک کے رہائشی مکانات میسر ہوں؛ اِس لیے جب حکومت کے سامنے چند افراد مل کر اِس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ: ہم پچاس یا سو افراد مل کر مشترکہ طور پر ایک جگہ خرید کر وہاں پر رہائشی مکانات تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور اُس کا پورا نقشہ وغیرہ حکومت کے شرائط کے مطابق متعلقہ شعبے میں پیش کرتے ہیں، تو حکومت کی

طرف سے اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اور اِس کام میں اُن کا مختلف حیثیتوں سے تعاون کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر اِسی طرح کی تعمیراتی اسکیم تجارتی غرض سے پیش کی جاتی اور اُس کو منظور کرنے کے لیے اُن سے جو فیس وصول کی جاتی ہے، اُس کے مقابلے میں ہاؤسنگ سوسائٹی کی اسکیم کی منظوری کے لیے اِتنی فیس نہیں وصول کی جاتی، یہی حال بجلی، پانی وغیرہ دیگر ضروریات کی فراہمی کا ہے۔

(۴) اِس طرح کی اسکیموں میں پہلے سے باقاعدہ سارے اُمور معاہدے کی شکل میں حکومت اور سوسائٹی کے درمیان طے کیے جاتے ہیں، گویا اِس سوسائٹی کا ہر ممبر حکومت کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ: اِس اسکیم میں جن شرائط کے ساتھ حکومت کی طرف سے منظوری دی گئی ہے ہمیں وہ شرائط منظور ہیں، اور ہم اُن شرائط پر عمل کا عہد و پیمان کرتے ہیں۔

(۵) آپس کے معاہدے سے جو شرائط منظور کیے جاتے ہیں اسلامی تعلیمات کا تقاضہ ہے کہ اُن شرائط کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے، اُن کی خلاف ورزی نہ ہو۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ﴿وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا﴾ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''دسواں حکم، عہد کو پورا کرنے کی تاکید ہے۔ عہد دو طرح کے ہیں: ایک وہ جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، (آگے تحریر فرماتے ہیں:) دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے، جس میں تمام معاہدات: سیاسی، تجارتی، معاملاتی شامل ہیں، جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں''۔ (معارف القرآن ۵/۴۶۸)

آیت کریمہ ﴿وأوفوا بعهد الله إذا عاهدتم﴾ (سورۂ نحل) کی تفسیر میں تحریر

فرماتے ہیں: ''لفظ عہد اُن تمام معاملات ومعاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے، یعنی اُس کی ذمہ داری لی جائے، خواہ اُس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔ (آگے تحریر فرماتے ہیں:) کسی سے عہد ومعاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے''۔ (معارف القرآن ۵/۳۸۳)

عن عبدالله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: أربع من كن فيه كان منافقا خالصا، ومن كان فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتیٰ يدعها: إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر. متفق عليه (مشكوة ص:١٧)

(٦) ہاؤسنگ سوسائٹی کی اجتماعی ضرورتوں کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جو رقم ممبران سے وصول کی جاتی ہے جس کو مینٹننس کا نام دیا گیا ہے، چوں کہ اُن کی ضرورتوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کے لیے حکومت کی طرف سے تعاون بھی کیا جاتا ہے، مثلاً: وہاں آنے جانے کے راستے، یا پانی کا اجتماعی نظام، وغیرہ اور جیسا کہ اوپر کے نمبرات میں بتلایا گیا، ایسے امور میں حکومت کی طرف سے رعایت بھی دی جاتی ہے، چوں کہ بہ وقتِ معاہدہ حکومت کو یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ مکانات جو تعمیر کیے جارہے ہیں اُن کو ممبران حضرات اپنی رہائشی ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال کریں گے، اُن کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا یا کمانا مقصود نہیں، اُن کی اِسی درخواست کو مدنظر رکھ کر اُن سے لیے جانے والے معاوضوں میں حکومت کی طرف سے رعایت دی جاتی ہے؛ لیکن ساتھ ہی یہ وعدہ بھی لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی ممبر اِس مکان کو اپنی رہائشی ضرورت میں استعمال

کرنے کے بہ جائے کرایے پر دے گا یعنی اِس کو آمدنی کا ذریعہ بنائے گا، تو اُس سے عام طور پر لی جانے والی مینٹیننس کی مقدار سے زیادہ مقدار وصول کی جائے گی، اور اُس کو بھی حکومت خود لینے کے بہ جائے ہاؤسنگ سوسائٹی کے پاس رہنے دیتی ہے، کہ وہ اِس کے ذریعے سوسائٹی کی عام ضرورتوں کو پورا کرے (کہ یہ بھی حکومت کے مقاصد میں سے ہے)، گویا زیادتی کی یہ شرط لگا کر حکومت کی طرف سے جو رعایت دی گئی تھی اُس میں کمی کر دی گئی؛ اِس لیے اِس طرح کی شرط بھی قرین قیاس ہے، اور جو آدمی اِس زیادتی کو ادا نہ کرے اُس سے بہ طور سزا چالیس فی صد وصول کیا جاتا ہے، جس کو حکومت ہی متعلقہ شعبے میں جمع کر لیتی ہے، اور یہ بھی اِس سلسلے میں کیے گئے معاہدے کا ایک حصہ ہی ہے جس کا ہر ممبر کو علم ہے۔

(۷) حکومت کی طرف سے جو مال بہ طور جرمانہ وصول کیا جاتا ہے شرعی اعتبار سے تو اُن میں سے کوئی چیز وصولنی نہیں چاہیے، اور جو حاکم اصولِ شرع کے مطابق نظامِ حکومت چلاتا ہو اُس کو چاہیے کہ اِس طرح کے جرمانوں کو ختم کرے؛ لیکن چوں کہ ہماری حکومت اسلامی حکومت نہیں، اور اِن جرمانوں کو ختم کرنا اور اِن کی ادائیگی سے انکار کرنا ہمارے اختیار اور طاقت سے باہر ہے؛ اِس لیے اگر حکومت کے قانون کے پیش نظر اِس کا مطالبہ کیا جائے تو اپنی عزت وآبرو اور جان کے نقصان سے حفاظت کے لیے اِس کی ادائیگی کی جاسکتی ہے۔ تنقیح الفتاوی الحامدیۃ سے ایک سوال جواب نقل کیا جاتا ہے:

(سئل) فيما إذا كان رجل ساكن بدمشق وله أملاك في قرية من قراها، وترد على القرية المزبورة غرامات متعلقة بالأبدان والأنفس، فهل

لاينوب الرجل المذكور شيء من الغرامات المتعلقة بالأنفس؟

(الجواب)الأصل في ذلك: أنه لايلزم أحد بشيء من ذلك شرعا، ولحاكم الشرع رفع ذلك ومنعه، فإذا لم يمكن رفع ذلك ولامنعه فما كان لحفظ الأملاك فالقسمة علىٰ قدر الملك؛ لأنها مؤنة الملك، وإن كانت لتحصين الأبدان فعلىٰ عدد الرءوس؛ لأنها مؤنة الرأس، ولايدخل في ذلك النساء والصبيان؛ لأنه لايتعرض لهم، ولأنه لايمكن دفعها، فوجب توزيعها علىٰ حسب ذلك؛ كما ذكر هذا التعليل الخير الرملي في فتاويه. ومن لم يكن ساكنا في القرية المزبورة لايمنعه من الغرامات المتعلقة بتحصين الأبدان شيء؛ لأن بدنه ليس في القرية المزبورة. قال الإمام الجليل فخر الدين قاضي خان في فتاواه المشهورة في كتاب القسمة: ”أهل قرية غرمهم السلطان فقال بعضهم: يقسم علىٰ قدر الأملاك. وقال بعضهم: يقسم علىٰ عدد الرءوس. وقال الفقيه أبوجعفر: إن كانت الغرامة لتحصين الأملاك يقسم علىٰ قدر الأملاك؛ لأنها مؤنة الملك، وإن كان لتحصين الأبدان تقسم علىٰ عدد الرءوس الذين يتعرض لهم؛ لأنها مؤنة الرأس، ولاشيء من ذلك على النساء والصبيان؛ لأنه لايتعرض لهم“ اه بحروفه. ومثله في قسمة الذخيرة والتتارخانية، وكذا في التجنيس وفتاوى الإنقروي والولوالجية والأشباه وغيرها من الكتب المعتبرة النعمانية. (تنقيح الفتاوى الحامدية:۲/۱۹۸،۱۹۹)

اب آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب پیش خدمت ہیں:

(الف) مندرجۂ بالا تمہید کی روشنی میں نون او کیوپیشن چارج لینا درست ہے۔

(ب) جتنی زیادتی کا قانون ہے اُتنا ہی لیا جاسکتا ہے، اور حسبِ قانون اُس کو اجتماعی کاموں میں خرچ بھی کرسکتے ہیں۔

(ج) جی ہاں۔

(د) اِس کے لیے سرکاری افسران کو رشوت نہ دی جائے؛ اِس لیے کہ رشوت دے کر جو کچھ بھی اِن افسران کے ذریعے کروایا جارہا ہے وہ سب قانون حکومت کی خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے جان وعزت دونوں کے لیے خطرہ ہے؛ نیز حکومت کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی بھی ہے؛ نیز جرمانے کی ادائیگی تو ہم اپنی خوشی اور مرضی سے نہیں؛ بلکہ قانونی مجبوری کی وجہ سے کررہے ہیں، جب کہ رشوت دینا ہمارے اختیار سے ہورہا ہے؛ نیز رشوت کی وجہ سے یہ سب کالعدم بھی نہیں ہوتا؛ بلکہ وقتی طور پر افسران چشم پوشی کرلیتے ہیں، پھر جب دوسرا آدمی آئے گا دوبارہ یہی مسئلہ سر اٹھائے گا، اِس لیے رشوت ہرگز نہ دی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

کتاب الشرکة والمضاربة

چچا اور بھتیجہ میں مشترکہ کاروبار کی تقسیم

سوال: زید کا انتقال ہوا، انھوں نے اپنے پیچھے بیوی، ایک چھوٹا لڑکا، اور ایک چھوٹی لڑکی چھوڑی، زید کی بیوہ نے کچھ عدت گزار کر زید کے بھائی عمر سے شادی کر لی، دونوں بچے بھی ماں کے ساتھ رہنے لگے، لڑکا جب کام کے لائق ہوا تو اپنے چچا کا ہاتھ بٹاتا رہا اور دھیرے دھیرے پوری طرح کام میں مصروف ہو گیا، عمر نے کام کی ذمہ داری زید کے لڑکے کے حوالہ کر دی اور خود اس کی نگرانی بھی کرتے رہے، سب لوگ مل کر کام کرتے تھے اور گھر کا نظام اچھی طرح چلتا رہا، اس کمائی سے زید کی لڑکی اور لڑکے دونوں کی شادی ہوئی، لڑکا پھر صاحبِ اولاد ہوا، عمر کے بھی کئی بچے، بچیاں پیدا ہوئیں اور مشترکہ آمدنی سے سبھوں کی پرورش ہوئی اور تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کی شادی بھی ہو گئی، اب عمر اور زید کے لڑکے کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہوا اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی چاہتے ہیں، زید مرحوم کے لڑکے کا مطالبہ ہے کہ میں کاروبار میں برابر کا شریک رہا ہوں، اس لیے کل کاروبار اور اس کی آمدنی میں برابر کا حصہ دار ہوں، اس لیے مجھے ہر چیز میں آدھا حصہ ملنا چاہئے اور عمر کا کہنا ہے کہ میں نے تمھاری اور تمھاری بہن کی پرورش کی ہے، اس لیے کاروبار اور اس کی آمدنی میں تم برابر کے حصہ دار نہیں ہو، کل آمدنی میری ہے، میں اپنی خوشی سے جو کچھ دے دوں اس میں تم کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے، دربار پنچایت ہو چکی ہے؛ مگر عمر کا کہنا ہے کہ میں شرعی فیصلہ کو مانوں گا۔ دریافت کرنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورت کے پیشِ نظر زید کا لڑکا از روئے شرع برابر کا حصہ دار ہوگا؟ تشفی بخش جواب تحریر فرمائیں؛ تاکہ اس کی روشنی میں فیصلہ کر کے جھگڑا مٹایا جا سکے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سوال میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ زید کے لڑکے نے چچا کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور دھیرے دھیرے پوری طرح کام میں مصروف ہوا، تو یہ کاروبار مشترکہ سرمایہ سے شروع کیا گیا تھا، یا صرف عمر کا سرمایہ تھا، یا کوئی سرمایہ ہی نہیں تھا؛ بلکہ دونوں نے مل کر جدوجہد سے سرمایہ حاصل کیا اور اسی کو ترقی دی۔

پہلی صورت تو یہ ہے کہ زید وعمر دونوں بھائیوں کی مشترکہ املاک تھیں اور دونوں کا مشترکہ کاروبار چل رہا تھا اور زید کے انتقال کے بعد عمر نے زید کے لڑکے، لڑکی کی پرورش کی اور کاروبار میں زید کی جگہ اس کے بیٹے کو شریک کرلیا اور دونوں کام کرتے رہے، تو زید کا لڑکا آمدنی میں برابر کا شریک ہے۔

يقع كثيرا في الفلاحين ونحوهم أن أحدهم يموت، فتقوم أولاده على تركته بلا قسمة، ويعملون فيها من حرث، وزراعة، وبيع، وشراء، واستدانة، ونحو ذلك؛ وتارة يكون كبيرهم هو الذي يتولى مهماتهم، ويعملون عنده بأمره، وكل ذلك على وجه الاطلاق والتفويض؛ لكن بلا تصريح بلفظ المفاوضة، ولا بيان جميع مقتضياتها .... فإذا كان سعيهم واحداً ولم يتميز ماحصله كل واحد منهم بعمله، يكون ماجمعوه مشتركا بينهم بالسوية، وإن اختلفوا في العمل والرأي كثرة وصواباً الخ (شامي ۳/۳۷۰)

دوسری صورت یہ ہے کہ عمر کا سرمایہ تھا اور اپنے کاروبار میں زید کے لڑکے سے وہ کام لیتا رہا، زید نے اپنے بچوں کے معاملہ میں اپنے بھائی عمر کو وصی بھی نہیں مقرر کیا تھا،

لیکن محض اس لیے کہ وہ لڑکا عمر کے ساتھ رہتا تھا اور عمران کا نفقہ برداشت کررہا تھا، عمر اس سے کام لیتا رہا، تو اگر وہ نفقہ جو عمر نے اس لڑکے کو زمانۂ عدمِ بلوغ میں دیا، وہ اس لڑکے سے لیے جانے والے کام کی اجرتِ مثل سے کم تھا، تو اب عمر پر اجرت مثل کی اس کمی کی تلافی ضروری ہے۔

(سئل) في يتيم استعمله زوج أمه في اعمال شتّٰى من جملتها الحرث على فدانه، والزرع في أرضه مدة سنين بلا اجارة وبلا أذن القاضي، هل له مطالبته بعد البلوغ باجرة المثل إن كان حياً، وإن كان ميتا يتبع تركته أم لا؟

(أجاب): له ذلك كالدّين كما يعلم مما ذكروه في الإجارة. (فتاویٰ جزيه ۲/۱۱٤)

سئل في يتيم استخدمه رجل مدة سنين، وكان ما يطعمه ويكسوه لا يساوي أجر مثله الخ وقد تقرر أنه ليس لغير الأب والجد والوصي استعمال الصغير بلا عوض. (أيضاً۲/۱۱٤)سئل في يتيمين استعملهما قريبهما في اعمال شتى بلا إذن الحاكم ولا اجارة وكان يطعمها ويسقيهما ويعطيهما بعض الأحيان دراهم وذلك قدر أجرة مثلهما ثم بلغ وطلبا منه أجر مثلهما .... استعمله أقرباء مدة في اعمال شتىٰ بلا إذن الحاكم وبلا اجارة، له طلب أجر المثل بعد البلوغ إن كان مايعطونه من الكسوة والكفاية لايساوى أجر المثل بزازية. (العقود الدرية في تنقيح الفتاویٰ الحامدية۲/۱۰۹)

آگے بلوغ کے بعد اگر عمر نے زید کے لڑکے کے ساتھ کوئی عقد کیا تھا، چاہے شرکت

یا مضاربت کا یا اجارہ کا، تو اس کی تفصیل معلوم ہونے پر حکم بتایا جا سکتا ہے اور اگر کوئی ایسا عقد نہیں ہوا تھا تو سب مال عمر کا ہے، اس لیے کہ اس کے سرمایہ سے حاصل ہوا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی کے پاس سرمایہ نہیں تھا؛ بلکہ دونوں نے مل جل کر محنت سے سرمایہ پیدا کیا، تو اگر زید کے لڑکے نے محض مددگار کی حیثیت سے مکمل طور پر عمر کی ماتحتی میں کام کیا ہے، تو سب کچھ عمر کا ہے اور اگر زید کے لڑکے نے اپنی مستقل حیثیت برقرار رکھتے ہوئے عمر کے ساتھ مل کر کام کیا تھا، تو اس صورت میں وہ نصف کا شریک ہے۔

(سئل): في رجل مات عن ابن كبير، وابنين صغيرين، لا عن تركة، فربّاهما الكبير ونشآ في خدمته، ومن جملة عائلته مع ابنه المقارب لهما في السن، وحصلوا جميعاً بالكسب والعمل مالا ولم يكن لهم مال، واختلفوا فيه، فالكبير يدعيه كله لنفسه، وأنهم كانوا معينين فيما له بالعمل، وابنه يدعى ربعه بعمله، واخواه يدعيان ثلثيه بعملهما، وان ابنه لا حصة له معهما لكونه معينا والده، فماالحكم فى ذلك؟

(أجاب): إن ثبت كون ابنه واخويه عائلة عليه وأمرهم في كل ما يفعلونه إليه وهم معينون له، فالمال كله له، والقول قوله فيما لديه بيمينه، وليتق الله فالجزاء امامه وبين يديه، وان لم يكونوا بهذا الوصف؛ بل كان كل مستقلا بنفسه، واشتركوا فى الاعمال فهو بين الأربعة سوية بلا اشكال، وان كان ابنه فقط هو المعين، والإخوة الثلاثة بانفسهم مستقلون فهو بينهم

اثلاثا بيقين، والحكم دائر مع علته بإجماع أهل الدين الحاملين لحكمته.

(فتاویٰ خیریہ ۲/۵۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵/ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مشترکہ زمین بیچ دی شریک کیا کرے؟

سوال: عرصہ بیس سال ہوا، زید اور بکر نے مشترکہ طور پر دس بیگہ زمین کا سودا کیا، زید نے آدھا روپیہ ڈال کر زمین کا بیعانہ بکر کے نام کر دیا، تو اس کے بعد بکر نے زید کے گھر اس کے بیٹے بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر قرآن اٹھایا کہ میں زید کے ساتھ دھوکہ نہیں کروں گا؛ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب زمین دس لاکھ میں فروخت ہوگئی، تو بکر نے حصہ دینے سے صاف انکار کر دیا، پھر عرصہ پانچ سال کے بعد بکر نے اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ کیا، تو زید کے داماد نے بکر کے ساتھ مکان کا سودا کیا، سودے کے موقع پر بکر نے زید کے داماد کو کہا کہ تم قرآن اٹھاؤ کہ تم یہ مکان زید کے بیٹے کو نہیں دو گے؛ جبکہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مکان صرف زید کے بیٹے کے لیے ہی خریدا گیا تھا اور سارا روپیہ بھی زید کے بیٹے نے ہی ادا کیا تھا، قرآن اٹھانے کی قسم کھانے کی وجہ سے مکان کی رجسٹری زید کے داماد نے اپنی بیوی کے نام کرادی، جو عرصہ تقریباً دس سال اس کی بیوی کے نام رہی، اسی دوران زید کے داماد کے بیٹے نے گھر میں ہنگامہ شروع کر دیا کہ یہ مکان اور روپیہ تو ہمارا ہے کہ زید کے بیٹے کو مکان مت دو، ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے زید کے داماد اور اس کی بیوی نے عرصہ تین سال ہوا، زید کے بیٹے کے نام مکان کی رجسٹری کروادی، تو

آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں مندرجۂ بالا مضمون کو پڑھ کر بتائیں کہ زید کے داماد نے جو قرآن کی قسم کھائی تھی، اس کو کیا کفارہ ادا کرنا پڑے گا؟ اور اس پر شرع کی کونسی حد لاگو ہوتی ہے؛ جبکہ بکر نے زید کے ساتھ زمین میں قرآن کی قسم کھا کر دھوکہ کیا اور زید کو اس کا حصہ نہیں دیا، اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زمین جب زید اور بکر نے مشترکہ طور پر خریدی، تو اس پر ملکیت دونوں کی مشترکہ طور پر بقدر حصہ ثابت ہوئی، اب اگر بکر نے وہ زمین زید کی اجازت سے فروخت کی ہے، تو یہ بیع درست ہے اور بکر کے لیے شرعاً ضروری ہے کہ جتنا حصہ زید کا اس زمین میں تھا، یعنی آدھا، اس حصہ کی قیمت یعنی پانچ لاکھ زید کو ادا کرے، ورنہ خیانت اور غصب کا گناہ لازم آوے گا اور اگر اس بیع کو زید نے منظور نہیں رکھا تھا، تو اس صورت میں زید کے حصہ کی زمین میں بیع درست نہیں ہوئی اور زید اپنے حصہ کے بقدر یعنی آدھی زمین کا بدستور مالک ہے، رہا بکر کا قرآن اٹھانا تو اگر اس نے قرآن اٹھاتے وقت کوئی لفظ قسم کا بولا تھا، تو اب اس پر قسم کا کفارہ واجب ہوگیا اور کفارہ قسم کا یہ ہے کہ دس مسکینوں کو صبح وشام دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاوے یا دس مسکینوں کو متوسط درجہ کے کپڑے پہناوے اور اگر لفظ قسم کا نہ بولا تو کوئی کفارہ اس کے ذمہ نہیں۔ (فتاوی دار العلوم۲/۲۶، امداد المفتیین) زید کے داماد نے قرآن اٹھا کر جو بات کہی تھی، اس کا بھی یہی حکم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

معاملۂ مضاربت اور اجارہ میں خلط ملط

سوال: ایک صاحب کی ایک دکان ہے، اس نے ایک صاحب کو منافع میں حصہ دیا کہ سب کچھ رقم وخرچ میرا، تم محنت کرو اور تجارت کرو، منافع میں پچاس فیصد تمھارا حصہ ہے، اور ماہانہ اتنی تنخواہ ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟ اور اگر حصہ دے رقم میں، یعنی محنت کرنے والے کو کہے کہ میں تمھیں حصہ دکان میں دوں گا تو کیا جواز ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جب اس کو منافع میں حصہ دیا تو اب تنخواہ مقرر کرنا درست نہیں ہے، اگر تنخواہ مقرر کرنا ہے تو صرف تنخواہ ہی رکھے، اس لیے کہ منافع میں حصہ مقرر کرنے کی صورت میں معاملہ مضاربت کا ہے، اور تنخواہ مقرر کرنے کی صورت میں معاملہ اجارہ کا ہے، دونوں کو خلط کرنا درست نہیں ہے، کوئی ایک صورت تجویز ہونی چاہئے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سونے میں عقدِ مضاربت

سوال: میں ایک شخص باہر ملک سے ہندوستان کے شخص کو سونا بغرض تجارت بھیج رہا ہوں، اس شرط پر کہ دونوں نفع میں برابر کے شریک رہیں گے، بالفرض اگر راستہ میں کچھ نقصان ہوجائے، تو بھیجنے والا اس کا ذمہ دار ہے، کیا یہ تجارت صحیح ہے؟ اور ایسا پیسہ کیا مسجد میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ بھیجنے والے کا مال اور جس کو بھیجا ہے اس کی صرف محنت ہے، مدلل ومفصل جواب تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایسا معاملہ جس میں ایک جانب سے مال ہو اور دوسری جانب سے محنت ہو، اس کو فقہی اصطلاح میں ''مضاربت'' کہتے ہیں۔

المضاربة: عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين، ومراده الشركة في الربح، وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين، والعمل من الجانب الآخر الخ. (هدايه ٢٤١/٣)

مضاربت کے صحیح ہونے کے چند شرائط ہیں: جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ راس المال اثمان کے قبیل سے ہو۔

وشرطها أمور سبعة: كون راس المال من الاثمان كما مر في الشركة. (درمختار) قوله من الاثمان أي الدراهم والدنانير. (شامی ٥٣٩/٤)

ہدایہ میں ہے: ولا تصح إلا بالمال الذي تصح به الشركة الخ. (٢٤٢/٣)

سونے اور چاندی کے ٹکڑے (بسکٹ) اگر دراہم ودنانیر کی طرح رائج ہوں، تو وہ عقد مضاربت میں راس المال بن سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔

ولا يجوز الشركة بما سوىٰ ذلك إلا أن يتعامل الناس بالتبر والنقرة الخ. (هدايه ٦٢٨/٢)

چونکہ دورِ حاضر میں سونے چاندی کے ٹکڑوں کا بطورِ دراہم ودنانیر رواج نہیں ہے، اس لیے ان میں راس المال مضاربت کی شرط نہیں پائی جاتی، اس لیے ان میں مضاربت درست نہیں ہوگی۔

ھدایہ میں ہے: إلا أن الأول أصح؛ لأنها وإن خلقت للتجارة في الأصل لكن الثمنية تختص بالضرب المخصوص الخ. (۲/۶۲۸)

بنا بریں یہ معاملہ درست نہیں ہے؛ البتہ اگر سونے کا مالک دوسرے آدمی کو اپنا ملازم رکھ لے، اس کے بعد اس سے یہ کام لے، تو درست ہے، اس صورت میں اس کی تنخواہ مقرر کرنا ہوگا، کام کرنے والا اس مقرر تنخواہ کا حق دار ہوگا؛ لیکن اگر یہ کام سرکاری قانون کے خلاف ہے اور اس کے ارتکاب میں اپنی عزت کو داؤ پر لگانا ہے اور ایسا کام جس میں آبرو داؤ پر لگتی ہو، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس لیے کہ عزت وآبرو کی حفاظت بھی مسلمان کا فریضہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عقدِ مضاربت میں رب المال کے لیے سیل پر نفع کا دارومدار

سوال: عابد کا ایک پرنٹنگ پریس ہے، اسی سے اس کا کاروبار چل رہا ہے؛ چونکہ عابد کو اپنا پریسی کاروبار جاری رکھنے کے لیے مزید روپیوں کی ضرورت درپیش ہے، جس سے وہ بذاتِ خود مجبور ہے؛ چنانچہ اس نے اپنے ایک دوست محمود سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ تم صاحبِ حیثیت ہو؛ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم مجھے ۵/ لاکھ روپئے دیدو؛ تاکہ میں انہیں اپنے کاروبار میں لگادوں، اس سے تمہارا بھی بھلا ہوگا؛ بایں طور کہ ہر ماہ جتنا مال کا سیل ہوگا اس سیل میں سے چار فیصد میں (عابد) تمہیں (محمود) دوں گا۔

معلوم ہو کہ سیل کی مقدار مقرر نہیں ہے، کبھی بڑھتی ہے اور گھٹ جاتی ہے، اسی

حساب سے محمود کے حصے میں کمی بیشی ہوتی رہے گی؛ لیکن سیل چار فیصد رہے گا، اور یہ بھی معلوم رہے کہ شرحِ منافع بہ نسبت سیل کے یکساں نہیں ہے، یعنی یہ کہ منافع کبھی دس فیصد سیل کا اور کبھی پندرہ فیصد سیل کا ہوگا اور کبھی دو فیصد بھی ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا صورت میں محمود کو اپنے پانچ لاکھ روپیوں پر سیل کے اعتبار سے، یعنی بیع پر چار فیصد پرینٹنگ پریس کے مالک عابد سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

معلوم رہے کہ نقصان کا احتمال اس کاروبار میں بہت کم ہے؛ نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ طرفین یعنی عابد اور محمود سودی کاروبار کے قطعاً قائل نہیں ہیں، اس خوف سے کہ مذکورہ بالا باہمی معاملہ خدانخواستہ کہیں سودی انداز کا نہ ہو، اس لیے مؤدبانہ درخواست ہے کہ جلد جواب سے نوازیں، بڑی عنایت ونوازش ہوگی، اور کاروباری حضرات کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا؛ کیونکہ یہی خواہش ہے کہ حلال روزی نصیب ہو اور حرام سے ممکن طور پر اجتناب واحتراز۔ والسلام.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں عابد ومحمود کے درمیان جو معاملہ ہوا اس کو مضاربت پر محمول کیا جاسکتا ہے؛ لیکن محمود کے لیے جو مقدار متعین کی گئی اس کی بنیاد نفع پر نہیں؛ بلکہ سیل پر ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سیل ہونے کے باوجود نفع حاصل نہ ہو، (یا محمود کے لیے مقرر کی گئی مقدار سے کم ہوا) پھر بھی محمود کو چار فیصد ملے گا، اور یہ درست نہیں ہے؛ نیز اگر نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری مضارب (عابد) پر عائد ہورہی ہے؛ حالانکہ مضاربت میں اگر نقصان ہو تو وہ اولاً نفع (پہلے سے موجود ہو تو اس) میں سے وضع ہوتا ہے، اور پھر

رأس المال میں سے، مضارب پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؛ جبکہ صورتِ مسئولہ میں رقم دینے والے (محمود) پر کسی حال میں نقصان کی ذمہ داری نہیں آرہی ہے، یہ وہی سرمایہ دارانہ ذہن ہے جو دورِ حاضر میں عام ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، بنظرِ انصاف غور فرمائیں کہ رقم دینے والا جو رقم دے رہا ہے دو حال سے خالی نہیں:

(الف): کیا اس رقم سے مستقرض کی اعانت مقصود ہے؟

(ب): یا اس کے منافع میں شرکت مقصود ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو اس کو چاہئے کہ مستقرض سے صرف اپنا مال (قرض دی ہوئی رقم) وصول کرے، اس سے زیادہ نہ لے، اور اگر دوسری صورت مقصود ہے تو انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ تجارت کے خطرات میں بھی اس کے ساتھ شریک رہے، اور جب نفع ہو تب ہی لے، یہاں تو رقم دینے والا اسیل میں سے ایک مقررہ مقدار وصول کرتا ہے، اور خود ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ ہے، یہی تو سود ہے، رہی یہ بات کہ اس کاروبار میں نقصان کا احتمال کم ہے، اس سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ کم سہی؛ لیکن احتمال تو موجود ہے، بصورتِ نقصان رب المال تو محفوظ ہی رہا، اس لیے یہ صورت جائز نہیں؛ ہاں اس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ محمود عابد کو یہ کہہ کر رقم دے کہ اس رقم سے کاروبار کرو، جو نفع ہو اس میں ہم نصفا نصف ہوں گے، یا میرا ایک تہائی تمھارا دو تہائی رہے گا، الحاصل اس رقم سے ہونے والے منافعہ میں کچھ فیصد محمود کا اور کچھ فیصد عابد کے لیے طے کیا گیا تب یہ عقد درست ہے۔(بدائع الصنائع، تکملہ فتح الملہم)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

تجارت کے لیے رقم دے کر متعین نفع لینا

سوال: بمبئی میں یہ بات عام ہوتی جارہی ہے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تم ایک ہزار روپیہ دو، میں تم کو روزانہ ۲۰ یا ۲۵ روپئے کے اندر اندر منافع دوں گا، کبھی ۲۱، تو کبھی ۲۲، تو کبھی ۲۳، تو کبھی ۲۴، تو کبھی ۲۵، تو کیا یہ کاروبار جائز ہے یا سود ہے؟ کئی لوگوں نے ہم سے پوچھا؛ لیکن ہم نے کہا کہ بھائی کسی مفتی صاحب سے معلوم کرلو تو بہتر ہے، تفصیل مع الدلائل جواب دیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کسی آدمی کو کاروبار کے لیے اس طرح رقم دینا کہ تم اس سے تجارت کرو، جو نفع ہوگا اس میں ہم دونوں شریک رہیں گے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں مضاربت کہتے ہیں؛ لیکن مضاربت کے درست ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں: انہی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منافع میں دونوں کے حصے متعین ہوں، اور وہ بھی اس طرح کہ یہ حصہ سارے نفع میں پھیلا ہوا ہو، مثلاً نصف یا ثلث وغیرہ، اگر دونوں میں سے ایک کے لیے نفع میں سے متعین رقم کی شرط کردی گئی تو مضاربت فاسد ہوگی، صورتِ مسئولہ میں بھی ایک طرح کی تعیین ہی ہے، اس لیے یہ عقد فاسد ہے؛ بلکہ اگر نفع نہ ہو، پھر بھی اس سے رقم لی گئی، تو یہ سود گا؛ بہرحال معاملہ کی یہ صورت جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتاب الوقف

موقوفہ زمین میں تصرف

سوال: مسجد کے لیے وقف کردہ زمین گاؤں والے اپنے مسجد کے امام کے لیے وقف کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کردیا تو یہ وقف صحیح بھی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو زمین مسجد کے لیے وقف ہوچکی ہے، اب ضروری ہے کہ واقف نے جس مقصد کے لیے وقف کیا ہے اسی میں اس کا استعمال ہو، گاؤں والے اس میں ترمیم وتغییر نہیں کرسکتے۔ "شرط الواقف کنص الشارع" فقہاء کے یہاں مسلَّم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

موقوفہ زمین کی بیع کرنا

سوال: لوگ مسجد یا مدرسہ میں اپنی زمین (کھیت) وقف کرتے ہیں؛ تاکہ اس کی آمدنی ادارہ کے کام آسکے، اب آج کل کے حالات میں زمین اگر کسی کو بٹوارہ پر دیتے ہیں، تو اس سے برائے نام آمدنی ہوتی ہے، کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی، ادھر زمینوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، جس کی وجہ سے معمولی زمین کے بھی بہت اچھے نرخ مل رہے ہیں، کیا ایسی کوئی گنجائش ہے کہ وقف شدہ زمین کو فروخت کرکے اس رقم سے آمدنی کا کوئی اور مستقل ذریعہ بنایا جائے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر واقف نے بوقتِ وقف اس زمین میں تبدیلی کرنے کا اختیار اپنے لیے یا (بعد میں آنے والے) کسی اور کے لیے رکھا ہے، تب تو اس کی تجویز کردہ شرط کے مطابق تبدیلی درست ہے، اور اگر اس نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی اور موقوفہ زمین بالکلیہ ناقابل

انتفاع نہیں بنی؛ بلکہ اس میں سے آمدنی ہوتی ہے، اگر چہ اس کے بدل سے زیادہ آمدنی متوقع ہے، تو اس صورت میں مختار قول کے بموجب اس زمین کو فروخت کرکے آمدنی کا کوئی دوسرا مستقل ذریعہ بنانا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر اسی زمین سے ہونے والی آمدنی اتنی قلیل ہے کہ اس زمین پر ہونے والے مصارف کے لیے بھی کافی نہیں ہے، تو چند شرائط کے ساتھ اس میں تبدیلی درست ہے۔

اعلم ان الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول: أن يشرطه الواقف لنفسه او لغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح، وقيل: اتفاقا. والثاني: أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت؛ لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية، بأن لا يحصل منه شيء أصلا، أو لا يفى بمؤنته فهو ايضاً جائز على الأصح، إذا كان بإذن القاضي، ورأيه المصلحة فيه. والثالث: أن لا يشرطه أيضاً؛ ولكن فيه نفع في الجملة، وبدله خير منه ريعاً ونفعاً، وهذا لا يجوز استبداله على الاصح المختار، كذا حرره العلامة القنالي زاده في رسالته "الموضوعة الاستبدال اطنب فيها عليه الاستدلال" وهو مأخوذ من الفتح أيضاً. (شامي ۳/٤٢٤ مطبوعه كوئٹه) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

وقف کی بنجر زمین بیچنا

سوال: ایک دیہات میں مسجد و مدرسہ ہے، اور اس کو ایک زمین (کھیت)

وقف کیا ہے، اس مسجد کی جو زمین ہے، ایک مدت تک تو اس میں کھیتی کرتے رہے، اور اس سے آمدنی آتی رہی؛ مگر ابھی چند سال سے کوئی اس کی صحیح دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، اس لیے بالکل بنجر پڑی ہے، اب متولیانِ مسجد یہ چاہتے ہیں کہ اس زمین کو فروخت کر دیں، اور اس کا جو عوض آوے اس کا مکان کسی قصبہ یا شہر میں خرید لیں، اور وہ کرایہ پر دیں، تو امید ہے کہ اس صورت میں مسجد کو نفع ہوگا کہ اس کی آمدنی حاصل ہوگی، جو واقف کا اصل مقصد بھی تھا اور مسجد کا اور زمین کا نقصان بھی نہیں ہے، تو اس زمین کا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کہ عقار کے بدلہ میں عقار بھی ہو جائے گی، اور فروخت کرنا جائز نہ ہو تو پھر اس صورت میں مسجد کو خسارہ (آمدنی نہ میسر ہوگی اس لیے) بھی ہوگا، اور واقف کو جو ثواب کی امید - جو دوسری صورت میں ہے - اس سے محروم ہوگا، براہِ کرم جواب بالدلائل تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر واقف نے بوقتِ وقف اس زمین میں تبدیلی کرنے کا اختیار اپنے لیے یا (بعد میں آنے والے) کسی اور کے لیے رکھا ہے، تب تو اس کی تجویز کردہ شرط کے مطابق تبدیلی درست ہے، اور اگر اس نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تو موقوفہ زمین بالکلیہ ناقابل انتفاع نہیں بنی؛ بلکہ اس میں سے آمدنی ہوسکتی ہے، اگرچہ اس کے بدل سے زیادہ آمدنی متوقع ہے، تو اس صورت میں مختار قول کے بموجب اس زمین کو فروخت کر کے آمدنی کا کوئی دوسرا مستقل ذریعہ بنانا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر اس زمین سے ہونے والی آمدنی اتنی قلیل ہو کہ اس پر ہونے والے مصارف کے لیے بھی ناکافی ہے تو چند شرائط کے ساتھ

اس میں تبدیلی درست ہے، آپ کے سوال سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ صورت میں اس زمین کی کما حقہ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بنجر پڑی ہے، یہ زمین کا قصور نہیں ہے؛ بلکہ متولیان کی کوتاہی ہے، اس لیے یہ تبدیلی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتا۔

اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه الخ (شامی ۳/ ۴۲۴ مطبوعہ کوئٹہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

درگاہ کے ڈبہ کی رقوم کا مصرف

سوال: ایک بزرگ کی درگاہ میں مزار کے پاس نذرانۂ درگاہِ خواجہؒ کے ڈبے ہیں، عقیدت مندان ڈبوں میں نذرانے ڈالتے ہیں، کیا:

(۱) یہ نذرانہ تحفہ ہے یا صدقہ؟

(۲) کیا سجادہ نشین درگاہ جو ایک سید ہیں، ان نذرانوں کے ڈبوں کی رقم ذاتی خرچ میں استعمال کر سکتے ہیں؟

(۳) کیا صدقہ سید کے لیے جائز ہے؟

(۴) کیا نذرانہ کے ڈبوں کی رقم اس درگاہ کے غریب خادموں کو- جو سید نہیں ہیں- تقسیم کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر یہ رقم بطورِ نذر مزار پر چڑھائی گئی ہے، تو کسی جگہ بھی اس کا استعمال جائز نہیں

ہے؛ کیونکہ غیر اللہ کے نام کی نذر حرام ہے، اور اس چیز کا استعمال بھی حرام ہے جس کی نذر کی گئی ہو۔

واعلم أن النذر الذي يقع للاموات من اكثر العوام، وما يؤخذ من الدراهم، والشمع، والزيت، ونحوها إلى ضرائح الاولياء الكرام، تقربا إليهم فهو بالاجماع باطل وحرام الخ. (درمختار علی هامش الشامی ۲/۱۳۹)

اور اگر نذر تو اللہ تعالیٰ کے نام کی ہے اور اس کو کسی بزرگ کے مزار کے پاس مقیم فقراء اور مساکین پر صرف کرتا ہے، تو اس صورت میں اس رقم کا استعمال صرف فقراء ومساکین کے لیے (بشرطیکہ وہ بنو ہاشم میں سے نہ ہوں) درست ہوگا۔

اللّٰهم إلا ان قال يا الله إني نذرت لك إن شفيت مريضي، أو رددت غائبي، أو قضيت حاجتي أن اطعم الفقراء الذين بباب السيدة نفيسة او الامام الشافعي الخ (شامی۲/۱۳۹) جس کی صورت یہ ہے کہ وہ آدمی یوں کہے کہ: اے اللہ اگر تو نے میرے فلانے (بیٹا یا اور کوئی عزیز) بیمار کو تندرست فرما دیا، یا میرا فلاں کام کر دیا، تو میں فلاں بزرگ کے مزار کے پاس- جو فقراء ومساکین مقیم ہیں- ان کو کھانا کھلاؤں گا، یا ان کو اتنی رقم دوں گا؛ لیکن دورِ حاضر میں عموماً عوام اپنی جہالت اور دین سے ناواقفیت کی وجہ سے رقوم اور دیگر اشیاء کو مزار پر ہی چڑھاتے ہیں، جیسا کہ صاحبِ درمختار نے صراحت فرمائی ہے۔ وقد ابتلى الناس بذلك ولا سيما في هذه الاعصار. (درمختار علی هامش الشامی ۲/۱۳۹) اس لیے ان کا استعمال کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔

اگر ڈبے پر لکھ دیا جائے کہ یہ رقم سجادہ نشین کے ہدیہ کے لیے ہے، یا درگاہ میں مقیم فقراء

کے صدقہ یا ہدیہ کے لیے، تو اس صورت میں اس پر جو مد تحریر ہے، اس میں اس کا استعمال ہوسکتا ہے۔

(۲) جواب نمبر ایک میں اس کی وضاحت ہوچکی ہے۔

(۳) صدقاتِ واجبہ (مثلاً زکوٰۃ، صدقۂ فطر، کفاراتِ نذر وغیرہ) سید کے لیے جائز نہیں؛ البتہ صدقاتِ نافلہ سید کے لیے بھی جائز ہے۔

وجازت التطوعات من الصدقات وغلة الأوقاف لهم أي لبني هاشم الخ. (درمختار) أقول: نقل في البحر عن عدة كتب: أن النفل جائز لهم إجماعا، وذكر أنه المذهب الخ. (شامی ۲/۷۳)

(۴) اس کی وضاحت بھی جواب نمبر ایک میں آچکی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

جنازہ کے چندے کی باقی رقم کو کیا کرے؟

سوال: ہم نے جنازہ لانے کے لیے چندہ جمع کیا تو پانچ ہزار روپیہ جمع ہوا، تو دو ہزار روپیہ کا جنازہ ملا، باقی تین ہزار روپیہ بچ گیا، تو اب وہ تین ہزار روپیہ کا سامان مسجد میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ یا وہ روپیہ کسی کام میں خرچ کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ایک خاص مقصد، یعنی جنازہ لانے کے لیے رقم جمع کی گئی ہے، اس لیے جو رقم بچے، وہ بقدر حصص معطین پر لوٹا دی جائے، یا ان کی اجازت سے دوسرے کام میں صرف

کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چندہ میں دینے کے لیے دی گئی رقم کا اپنی ذات پر استعمال

سوال: اگر کسی صاحب نے یا گاؤں کے چند ذمہ داروں نے کچھ رقم للہ دی کسی امام صاحب کو، اور وکیل بنایا کہ جہاں ضرورت ہو آپ اس رقم کو چندہ میں دیتے رہیں، اب امام صاحب خود مقروض ہیں، اور کوئی آمدنی ذرائع نہیں ہے، تو کیا وہ للہ رقم کو اپنی ضروریات میں لا سکتے ہیں؟ اور اگر امام صاحب گاؤں والوں کے سامنے اظہار بھی کرے تو یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا، تو کیا جواز کی کوئی شکل ہے کہ نہیں؟ اور اگر حوالہ بھی دیدیں تو زیادہ مناسب ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر امام صاحب کو صرف اتنا کہا گیا ہے کہ آپ یہ رقم مواقع ضرورت میں صرف فرمائیں، یا ان کو اختیار دیا ہے تو اس صورت میں اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے؛ لیکن اگر چندہ میں دینے کا لفظ کہا گیا ہے تو اس صورت میں اپنے اوپر خرچ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ ہمارے عرف میں چندہ میں دینے کا مطلب اپنے اوپر خرچ کرنا نہیں ہے۔

وللوكيل بدفع الزكوٰة أن يدفعها إلى ولد نفسه كبيراً كان أو صغيراً وإلى إمرأته إذا كانوا محاويج، ولا يجوز أن يمسك لنفسه شيئا، اه. إلا إذا قال: ضعها حيث شئت، فله أن يمسكها لنفسه، كذا في الولوالجية. (البحر الرائق ٢/٢٢٧) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسائل مدارس

زبردستی سے چندہ لینا

سوال: لوگوں سے زبردستی روپیہ جمع کر کے دینی جلسہ کرنا کیسا ہے؟ کیا شریعت اسلام اس کی اجازت دیتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ جائز نہیں ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"لا یحل مال إمرئ مسلم إلا بطیب نفسه" (مسند امام احمد) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مدرسہ کے لیے خریدی ہوئی زمین میں زمین کے بدل زمین لینے کی نیت کا اعتبار نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین وشرعِ متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے (ایک مدرسہ عربیہ کے ناظم مہتمم) ایک قطعہ اراضی ۱۳/سوگز کی واقع لب سڑک مدرسہ عربیہ کے نام ۱۹۶۸ء میں بیع کی، اوراس کی قیمت وصول کر لی، اسی دوران زید نے موہن وغیرہ سے ایک قطعہ اراضی مدرسہ عربیہ کے نام خریدا، (بدل میں اپنی صحرائی جائیداد موہن وغیرہ کو بیع کی) جس سے مدرسہ و مسجد تعمیر ہو چکے ہیں، پھر ایک قطعہ اراضی مدرسہ عربیہ کے نام سے ۱۹۷۲ء میں خریدا، اوراس میں مدرسہ نے اپنی تعمیر بھی کی، ناظم کی ہی فراہم کردہ ہیں، انہیں کا اقرار ہے کہ ۱۹۷۲ء والی جائیداد کی آمدنی ۱۹۸۱ء تک میں

مدرسہ کو دیتا رہا، بعد میں میں خود رکھتا رہا، اس پلاٹ کو لکڑی کی تال والے کو کرایہ پر دے رکھا تھا، جو آمدنی اس اراضی سے ہوئی وہ ۱۹۸۱ء تک مدرسہ عربیہ کو ملتی رہی اس قطعہ اراضی میں سے ۱۹۸۱ء میں زید نے ۵۵۰/ گز اراضی واقع لبِ سڑک اپنے لڑکوں کے نام بیع کر دی، اور اس میں ۱۱/ دکانیں تعمیر کر لیں، باقی اراضی مدرسہ عربیہ کے نام ہی رہی۔

بعد ازاں اعتراض ہوا کہ مدرسہ عربیہ کی جائیداد کو زید نے اپنے لڑکوں کے نام کیوں بیع کیا؟ اور چند افراد نے غبن کا مقدمہ دائر کر دیا، اس سے متأثر ہو کر زید نے ایک خصوصی میٹنگ قصبہ ودیہات کی اگست ۱۹۸۷ء میں منعقد کی، جس میں زید نے اعلان کیا: جس وقت میں نے اپنی ۱۳/ سو گز اراضی مدرسہ عربیہ کے نام بیع کی تھی، میری نیت اراضی کے بدلہ اراضی لینے کی تھی، اور اب تو میں نے ۵۵۰/ گز اراضی ہی لی ہے، میں نے تو اپنی صحرائی جائیداد بھی مدرسہ کی تعمیر اور ترقی کے لیے فروخت کر دی ہے، میری مذکورہ بالا جائیداد میں تقریباً ۳۰/ دکانیں تعمیر ہوئیں۔

زید نے جس وقت پہلی اراضی مدرسہ عربیہ کے نام بیع کی، اس وقت نہ تو کوئی تحریر مدرسہ ہذا کو دی کہ میں بعد میں اراضی کے بدلہ اراضی لوں گا، اور نہ ہی کوئی اعلان کیا، اور نہ ہی کوئی گواہ، نہ ہی زید نے ۱۹۸۱ء میں اراضی کو اپنے لڑکوں کے نام بیع کرنے سے قبل کوئی عمومی اعلان کیا کہ میں اراضی کے بدلہ اراضی لے رہا ہوں۔

میٹنگ مذکورہ میں موجودہ افراد نے زید کی نیت کا اعتبار اور خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے، زید نے جو اراضی مدرسہ عربیہ کی اپنے لڑکوں کے نام بیع کی تھی، اس کو زید کے لڑکوں کے نام پر ہی رہنے کی رضامندی ظاہر کی، اور مدعیان پر دباؤ دے کر مقدمہ

واپس کرانے کی ذمہ داری قبول کی۔

(۱) کیا شرعی حیثیت سے مدرسہ عربیہ کی ملکیت مذکورہ بالا اراضی میں ہوگئی؟

(۲) خرید وفروخت کے بعد نیت کا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

(۳) ناظم یا عوام کو مدرسہ کی اس مملوکہ موقوفہ جائیداد فروخت کرنے کا شرعی جواز ہے؟

(۴) کیا خصوصی میٹنگ میں موجودہ اقرار رضامندی کی کوئی شرعی حیثیت ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) جو اراضی مدرسہ کے لیے خریدی گئی اس میں مدرسہ کی ملکیت ثابت ہوگئی۔

والملك يثبت للمؤكل ابتداءً في الاصح.(درمختار على هامش الشامى ٤/٤٤٧)

(۲) بوقتِ بیع جو ثمن مقرر کیا گیا وہی ثمن ٹھہرے گا، اور اس میں بائع کی ملکیت ثابت ہوچکی۔(قوله وحكمه ثبوت الملك) أي في البدلين لكل منهما في بدل. (شامى ٤/٦) بعد میں بائع کا یہ دعویٰ کہ ''میری نیت اراضی کے بدلہ اراضی لینے کی تھی'' اس کا اعتبار نہیں ہے۔

اولاً تو اس لیے کہ جو چیز بطورِ ثمن طے کی جائے وہی ثمن ٹھہرتی ہے، اور صورتِ مسئولہ میں ۱۹۶۸ء میں بائع نے جو اراضی مدرسہ کے نام بیع کی تھی اس کے ثمن میں اراضی کو مقرر نہیں کیا گیا تھا؛ بلکہ نقد ثمن تھا جس کو بائع وصول کر چکا ہے۔

ثانیاً اس لیے کہ بائع (مدرسہ کی) جس اراضی کو اپنی اراضی کا ثمن قرار دینے کا مدعی ہے، وہ اراضی بوقتِ بیع مدرسہ کی ملکیت میں نہیں تھی، اس لیے کہ بائع نے اپنی

اراضی مدرسہ کو ۱۹۶۸ء میں فروخت کی ہے، اور مدرسہ کی جس اراضی کے ثمن ہونے کا مدعی ہے وہ اراضی مدرسہ کی ملک میں ۱۹۷۲ء میں آئی۔

"وبيع ماليس في ملكه لبطلان بيع المعدوم وماله خطر العدم. (درمختار) (قوله وبيع ماليس في ملكه) فيه انه يشمل بيع ملك الغير بوكالة أو بدونها؛ مع أن الأول صحيح نافذ، والثاني صحيح موقوف، وقد يجاب بأن المراد بيع ماسيملكه قبل ملكه له، ثم رأيته كذلك في الفتح في أول فصل بيع الفضولي، وذكر أن سبب النهي في الحديث ذلك. (شامی ٤/١١٨)

نیز ایسی نیت کا اعتبار کر لینے کا حاصل یہ ہوا کہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا؛ اس لیے کہ مثلاً ایک آدمی نے مدرسہ کو اینٹیں فروخت کیں، اور اس کی قیمت وصول کر لی، اس کے بعد ایک مدت گزرنے پر وہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ میری نیت تو ان اینٹوں کے عوض مدرسہ کا فلاں قطعۂ اراضی لینے کی تھی تو کیا اس کی اس نیت کا اعتبار کر لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔

(۳) جو اراضی یا جائیداد اس کے مالک نے ابتداءً وقف کی ہو، اس کا بیچنا جائز اور درست نہیں۔ "فإذا تم، ولزم، لايملك ولايملك. (درمختار) (قوله لايملك) اى لا يكون مملوكا لصاحبه، ولا يملك اى لا يقبل التمليك لغير بالبيع ونحوه". (شامی ٣/٤٠٢)

البتہ جو وقف کی ضرورت کے لیے خریدی گئی تھی، اس کو بوقتِ ضرورت ومصلحت متولیٔ وقف بیچنا چاہے تو اس کی بیع کے درست ہونے کا بھی قول موجود ہے۔

"اشترى المتولي بمال الوقف دارا للوقف، لا تلحق بالمنازل الموقوفة، ويجوز بيعها في الأصح؛ لأن للزومه كلاما كثيراً، ولم يوجد ههنا. (درمختار)

(قوله يجوز بيعها في الأصح) في البزازية بعد ذكر ما تقدم: وذكر أبوالليث في الاستحسان: يصير وقفا، وهذا صريح في أنه المختار. اهـ رملي. قلت: وفي التاتارخانية: والمختار أنه يجوز بيعها إن احتاجوا إليه". (شامی ۳/۴۴۵)

(۴) جب یہ معلوم ہو چکا کہ ایسی نیت کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں تو پھر میٹنگ میں موجود حضرات کی رضامندی سے کیسے کام چلے گا؟ اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ جن حضرات نے اس میٹنگ میں شریک ہو کر رضامندی کا اظہار فرما کر اتفاق ظاہر کیا تھا، وہ اپنی ناراضگی کا اعلان کر دیں، اور اپنے اس فعل سے تائب ہوں، اسی طرح جن حضرات نے مقدمہ واپس کھینچوانے کی ذمہ داری قبول فرمائی تھی، وہ اپنی اس ذمہ داری سے دست کش ہو جائیں اور تائب ہوں؛ اس لیے کہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

دستور کے خلاف ممبرِ مدرسہ کا انتخاب کرنا

سوال: دارالعلوم حسینیہ آکولہ کے ٹرسٹ کے دستور کے دفعہ تین حصہ (H) میں یہ لکھا ہے کہ: مجلسِ شوریٰ نئے ممبر کا انتخاب عوام میں سے کرے گی، اور سرپرستوں کی اجازت کے بعد ہی اسے ممبر بنایا جائے گا، مذکورہ دستور کے خلاف دارالعلوم حسینیہ کے سات اراکینِ شوریٰ نے سرپرستوں اور بانی و مہتمم صاحب کی اجازت کے بغیر نئے ممبر کا

انتخاب کیا، تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ مفصل مدلل تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب ٹرسٹ کے دستور میں نئے ممبر کے انتخاب کے لیے سرپرستان کی اجازت کو شرط قرار دیا گیا ہے، تو اب ان کی اجازت کے بغیر جس نئے ممبر کا انتخاب عمل میں آیا ہے، وہ معتبر نہیں ہے۔ فإن شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع. (شامی ۳/۳۹۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

بانیٔ مدرسہ کا ممبران کو رکنیت سے معزول کرنا

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیانِ شرعِ متین حسبِ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

سوال: مہتمم دارالعلوم حسینیہ آکولہ مولانا ابوالحسن زید مجدہ و مدظلہ نے شہر آکولہ میں دارالعلوم حسینیہ کی بنیاد ڈالی، مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کے لیے بذاتِ خود ممبران کو منتخب فرمایا، ناچاقی کی بنا پر تین ممبران نے ممبری کی ذمہ داری سے سبک دوشی کا بذریعہ اشتہار اعلان کرتے ہوئے استعفیٰ دیا، تھوڑے عرصے کے بعد رجوع بھی کرلیا؛ لیکن مدیر و مہتمم صاحب نے کچھ عرصے کے بعد ہی پانچ ممبران کے علیحدگی کا فیصلہ کردیا، اس میں یہ تین ممبران جن کے سابق استعفیٰ نامے موجود تھے، اوران کے علاوہ دو ممبران کو اس ذمہ داری سے اخراج کے فیصلہ کی خبر کورٹ چیریٹی کمشنر کو دی، اس طریقے سے کہ ان تین ممبران کے سابق استعفیٰ نامے اور بقیہ دو کے نام اس استعفیٰ نامے میں لکھ دیئے گئے، مقابلین کو جب کورٹ میں اس عرضی کے داخلہ کی خبر ہوئی، تو ان حضرات نے کورٹ چیریٹی کمشنر سے کہا کہ

ہم نے استعفیٰ نہیں دیا، یہ مصنوعی استعفیٰ نامے ہیں، کورٹ نے فیصلہ روک دیا۔

سوال یہ ہے کہ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جبکہ ان ممبران کے اخراج میں مدرسہ کے کئی مصالح مرعی ہیں، اور ممبران کو مولانا ہی نے منتخب کیا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ مدرسہ کے بانی وروح رواں ہیں، مدرسہ کو اس کے زمانۂ طفولیت کی کمزوریوں اور مصیبتوں سے شبابیت تک پہونچانے میں مولانا نے اپنی جان کی بازی لگادی، اور اس صحراء ویراں نما کو چمنستان وگلستان علم وگل سے لہلہاتا ہوا بنانے والے مولانا موصوف ہی کی ذات ہے۔ وہ شعر کا پورا مصداق بنا کر دکھایا۔

صحراء میں جہاں رکھتے ہیں قدم　　　　کھلتا ہے وہیں پر ایک چمن

جواب مدلل ومفصل عنایت فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بانیٔ مدرسہ نے جس طرح اپنے اختیار سے اراکین کا تقرر کیا تھا، اوران کا وہ تقرر درست تھا، اسی طرح جب وہ اپنے اختیار سے ان کو (قصور بلاقصور) اس رکنیت سے معزول کریں تو ان کا یہ اقدامِ عزل بھی درست ہے، بانی کو بحیثیتِ بانی یہ اختیار حاصل ہے، اس معاملہ میں ممبران کو بانی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل نہیں ہے۔ ولاية نصب القيم إلى الواقف ثم لوصيه لقيامه مقامه. (درمختار) (قوله ولاية نصب القيم الى الواقف) قال فى البحر: قدمنا ان الولاية للواقف ثابتة مدة حياته وان لم يشترطها، وان له عزل المتولى الخ (شامی ۳/۴۴۸) للواقف عزل الناظر مطلقاً به يفتىٰ. (درمختار) (قوله للواقف عزل الناظر مطلقا) اى سواء كان بجنحة او لا

وسـواء كـان شرط له العزل او لا. (شامی ۴۵۲/۳) بخـلاف الواقف، فان له عزل القيم وان لم يشرطه والقيم لا يملكه. (شامی ۴۵۱/۳)فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/صفرالمظفر ۱۴۰۸ھ

ایک مدرسہ کے صدر صاحب کی طالبات کے ساتھ ناجائز حرکتیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلۂ ذیل میں:

کہ مسلم لڑکیوں کے لیے ایک خالص اور اعلیٰ دینی تعلیم کی درس گاہ ہے، ادارۂ مذکور کے صدر اور ایک طالبہ کے مابین ایک واقعہ ظہور میں آیا:

اور اس واقعہ کی اطلاع صدر موصوف کے بھتیجے نے مدرسہ کے ارکان کو بہم پہونچائی اور تحقیقات کا مطالبہ کیا؛ چونکہ صدر صاحب کے بھتیجے بھی ادارۂ ہذا کے ذمہ دار رکن ہیں، اس لیے ان کی اطلاع اور مطالبہ کے مطابق اراکین نے واقعہ کی تحقیق وتفتیش کی، اس سلسلے میں چند باتوں کا استفسار مقصود ہے:

مذکورہ طالبہ نے شہر کے ائمۂ مساجد اور علماء؛ نیز ادارہ کے بعض ارکان کے روبرو حلفیہ بیان دیا کہ ۱۶/اکتوبر ۱۹۸۷ء مطابق ۱۲/صفر دوپہر میں کھانا کھانے کے بعد پرہیزی کھانے کی چٹ لکھوانے کے لیے میں اور ایک طالبہ دونوں ساتھ میں آفس گئیں، میں نے صدر صاحب سے کہا کہ پرہیزی کھانے کی چٹ لکھ دیجیے، تو انھوں نے کہا کہ ''بیٹھ ابھی لکھ کر دیتا ہوں''، ہم دونوں کھڑی رہ گئیں، تو صدر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو بٹھا دیا، اور ساتھ والی سے کہا تم جاؤ، وہ چلی گئی، تو صدر صاحب نے اٹھ کر آفس کے دونوں دروازے خود بند کیے، اور لائٹ بھی بند کردی، پھر میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے سے

چمٹا لیا، اور میرے چیخنے پر میرا منہ ہاتھ سے دبا دیا، اور مجھے زبردستی لٹا دیا، اور کہا کہ اگر چلائے گی تو مدرسہ سے خارج کر دوں گا، پھر اس کے بعد میری شلوار اور اپنا پائجامہ اتارا، اور میرے سینے کو ہاتھ لگایا اور زور سے دبایا، اور اپنے قابو میں کر کے خود کا ڈال دیا، میں چیخنے لگی، تو اپنی ٹوپی میرے منہ میں ٹھونس دی، اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم کو مزہ آرہا ہے؟ اور خبردار کرتے ہوئے کہ کسی کو ہرگز نہ بتانا، اگر کسی سے بھی بتایا تو مدرسہ سے خارج کر دوں گا، پھر یہ کہتے ہوئے کہ میں تم کو پیار کرتا ہوں بوسہ لیا اور میرے سینے پر کاٹا بھی، کچھ دیر کے بعد اچانک دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ آنے والی لڑکی عائشہ دروازہ پر کھڑی ہے، اس وقت میں اپنی شلوار باندھ رہی تھی اور صدر ننگے تھے، اسی دن منگل کو مجھے اپنے ساتھ کھانے کے لیے صدر صاحب نے کہا؛ لیکن میں روتی ہوئی سیدھی حفظ کلاس میں چلی گئی، بدھ کے روز مجھ کو پھر بلایا؛ لیکن میں نے جانے سے انکار کر دیا، مجھے اپنے سینے اور شرمگاہ پر درد بڑھا تو مجھ کو کلاس کی دو طالبات نے کمرے تک پہونچایا، مجھے روتا دیکھ کر کچھ لڑکیوں نے میرے چچا کو اطلاع دی، تو انھوں نے مجھ سے رونے کی وجہ پوچھی، تو میں نے ساری بات ان کو بتا دی۔

دیکھنے والی لڑکی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ میں فاطمہ کے ساتھ آفس گئی تھی، صدر صاحب نے اس کو روک لیا، اور مجھے واپس بھیج دیا، میں اپنی کلاس میں چلی گئی؛ لیکن تھوڑی دیر کے بعد پانی پینے کے لیے آفس گئی تو دروازہ بند تھا، میں نے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا، میں نے دیکھا کہ صدر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، اور ان کا پائجامہ کھلا ہوا ہے، اور فاطمہ اپنی شلوار باندھ رہی ہے، یہ منظر دیکھ کر پانی پینے کے بجائے فوراً سامنے والی

کلاس میں چلی گئی، صدر صاحب نے فاطمہ کو دوسرے دروازے سے بھیج دیا، اور صالحہ کے ذریعے مجھ کو بلوایا، اور مجھے ڈانٹتے ہوئے بازو والی کرسی پر بٹھایا، اس وقت میرے ساتھ شمع بھی تھی، اس کو یہ کہا کہ مجھے اس سے ایک بات کہنا ہے، تم جاؤ، حکم پا کر نہ چاہنے کے باوجود اس کو جانا پڑا، پھر مجھ سے پوچھا کہ تو نے کیا کیا دیکھا ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا تھا بتا دیا، سننے کے بعد مجھے سخت تاکید کی کہ کسی سے ہرگز ہرگز کچھ نہ کہنا، پھر دوسرے دن بدھ کو مجھے بلا کر پوچھا کہ کسی کو کچھ بتایا تو نہیں، میں نے انکار میں جواب دیا اور بہانہ کر کے وہاں سے چلی آئی۔ واضح رہے کہ آفس سے متعلق سارے کام صرف صبح کے وقت ہوتے ہیں، دوپہر میں آفس بند رہتا ہے؛ لیکن صدر موصوف کا یہ معمول تھا کہ اپنی دوپہر روزانہ آفس میں گزارتے تھے، اور کسی کو اس وقت آفس میں رہنے یا آنے جانے کی قطعاً اجازت نہ تھی، صدر صاحب کسی بھی لڑکی کو کھانے کے بہانے آفس میں بلا لیا کرتے تھے، اور دروازہ بند کر کے مطلوبہ لڑکی کے ساتھ دوپہر گزارتے تھے، اور آفس کے اردگرد کرفیو لگا رہتا تھا؛ نیز مدرسہ کا ٹائم صبح نو بجے شروع ہوتا ہے؛ لیکن صدر صاحب صبح سات بجے ہی مدرسہ پہونچ جاتے تھے اور ایک مقررہ لڑکی روزانہ بند آفس میں ان کے ساتھ اتنا وقت گزارا کرتی تھی، اور دوپہر میں مدرسہ کا ٹائم تین بجے شروع ہوتا ہے، تو روزانہ کا معمول تھا کہ تین بجے کے بعد جب ساری طالبات دارالاقامہ سے اپنی اپنی کلاسوں میں منتقل ہوجاتی تھیں، تو دارالاقامہ میں رہنے والی ایک معلّمہ کے ساتھ چھٹی تک کا وقت گزارا کرتے تھے، اس وقت دارالاقامہ میں کرفیو رہتا تھا، کسی فرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی، اور صدر موصوف اور معلّمہ موصوفہ کے علاوہ وہاں کوئی تیسرا نہیں ہوتا تھا؛ نیز صدر موصوف

عملی طور پر ادارۂ ہذا کے مختار کل اور حاکم مطلق تھے، جب اور جس لڑکی کو جہاں چاہتے تھے بلا لیتے تھے، اور جب تک چاہتے اپنے پاس روکے رکھتے، اور جب اور جس کو چاہتے خارج کر دیتے، اور جسے چاہتے داخل کر لیتے، اپنے طور پر جو حکم چاہتے نافذ کر دیتے، کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی، حکم عدولی یا اعتراض پر اخراج کی سزا جاری کر دیتے، واقعہ مذکورہ کے ظہور کے بعد ہمت کر کے بہت سی طالبات نے ظاہر کیا کہ صدر صاحب دو پہر میں جب کبھی ہم کو بلاتے تو اپنے پاس بٹھا کر ہمارے سینے پر عطر ملتے، اور اس بہانے دست درازی کیا کرتے تھے؛ نیز اس واقعہ کے فوراً بعد کاریگر کو بلوا کر دروازہ درست کرایا؛ تاکہ دھکا دینے سے کھل نہ سکے، یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ صدر موصوف کی بیوی نہیں ہیں، انتقال کر چکی ہیں، اس حادثہ کے پانچویں یا چھٹے دن صدر موصوف اور ان کے متعلقین نے ان کے قول کے مطابق دو غیر سرکاری لیڈی ڈاکٹروں سے پہلی بار معائنہ کرایا پھر بارہویں روز دوبارہ معائنہ کروایا، ان ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ لڑکی کا پردۂ بکارت باقی ہے، اور جو جھلی جماع کی وجہ سے اپنی اصل وضع سے ہٹ جاتی ہے وہ علی حالہ باقی ہے۔

مذکورہ حالات وحقائق کے پیشِ نظر دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) لڑکی کے بیان اور دیکھنے والی طالبہ کی گواہی سے صدر موصوف پر زنا کا حکم لگ سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اجنبیات کے ساتھ صدر موصوف کا خلوت کرنا اور انہیں ہاتھ لگانا، سینے پر عطر ملنا شرعاً جرم ہے یا نہیں؟

(۳) زنا کے سلسلے میں شریعت نے چار مردوں کی عینی شہادت آیا حدِ زنا نفاذ

کے لیے ضروری رکھی ہے یا مطلق ثبوتِ زنا کے لیے؟

(۴) صرف عورتوں کی شہادت سے کسی پر زنا کا جرم لگ سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہاں کسی مرد کے آنے جانے کی گنجائش نہیں؟

(۵) کیا زنا کے ثبوت کے لیے شرعاً پردۂ بکارت کا زائل ہونا ضروری ہے؟

(۶) کیا اس سلسلے میں ڈاکٹری رپورٹ - جو کئی دنوں بعد حاصل کی گئی- معتبر ہوگی؟ اور کیا اس رپورٹ کو کسی شرعی فیصلہ کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟

(۷) کیا صدر موصوف کو لڑکیوں کے مدرسہ کا صدر باقی رکھنا چاہئے؟ اور ایسے شخص کا مدرسۂ مذکورہ میں آنا جانا، اور طالبات و معلمات سے بے پردہ بے تکلف خلط ملط رکھنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱،۳،۴) لڑکی کے بیان اور دیکھنے والی طالبہ کی شہادت کی بنیاد پر زنا کا حکم نہیں لگ سکتا، ثبوتِ زنا کا ایک معنی تو یہ ہے کہ فعلِ زنا کا خارج میں وجود و تحقق ہو، تو اس کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی اس کا مرتکب ہو، اس لیے کہ یہ فعل حسی ہے اور فعلِ حسی کا وجود و تحقق نفسِ ایقاع و ایجادِ فعل سے ہو جاتا ہے، اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کسی نے دیکھا ہو، اور دیکھنے والا اس کی شہادت بھی دے بلکہ اگر کسی آدمی نے اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا، اور کسی نے نہیں دیکھا یا دیکھنے والوں نے دیکھا؛ لیکن انھوں نے اس کی پردہ پوشی کرتے ہوئے یا اور کسی اور وجہ سے شہادت نہیں دی، پھر بھی وہ شخص زانی اور گنہ گار ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اس گناہ سے سچی پکی توبہ کرے۔

ثبوتِ زنا کا دوسرا معنی یہ ہے کہ حاکم یا لوگوں کے نزدیک وہ زانی قرار دیا جائے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس پر زنا کا حکم لگایا جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مرد ہی گواہ ہوں، اس باب میں عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا؛ نیز چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا، چار سے کم کی گواہی کا اعتبار نہیں، اس کے علاوہ دیگر شرائط بھی ہیں جو کتبِ فقہ میں مفصل مذکور ہیں، مندرجۂ ذیل عباراتِ فقہیہ سے یہ باتیں بخوبی ثابت ہوجاتی ہیں۔

درمختار میں ہے: ويثبت بشهادة أربعة رجال في مجلس واحد، فلو جاؤا متفرقين حُدُّوْا، بلفظ الزنا لا مجرد لفظ الوطأ والجماع وظاهر الدرر أن ما يفيد معنى الزنا يقوم مقامه. (درمختار على هامش الشامی ۱۵٦/۳)

اس کے بعض الفاظ کی تشریح فرماتے ہوئے علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں: (قوله ويثبت) اى الزنا عند القاضي، إما ثبوته في نفسه فبايجاد الانسان له؛ لأنه فعل حسى، نهر. (قوله رجال) لأنه لامدخل لشهادة النساء فى الحدود، وقيد بذلك من ادخال التاء فى العدد كما هو الواقع فى النصوص، (قوله فلو جاؤا متفرقين حدوا) اى حد القذف، ولو جاؤا فرادىٰ وقعدوا مقعد الشهود، وقام إلى القاضي واحد بعد واحد، قبلت شهادتهم، وان كانوا خارج المسجد حدوا جميعاً، بحر عن الظهيرية الخ (شامی ۱۵٦/۳)

ہدایہ میں ہے: وان نقص عدد الشهود عن اربعة حُدُّوْا؛ لأنهم قذفة اذ لا حسبة عند نقصان العدد وخروج الشهادة عن القذف باعتبارها. (ہدایہ)

علامہ ابن ہمامؒ اس کی تشریح فرماتے ہیں: (قوله وإن نقص عدد الشهود

عن اربعة) بان كانوا ثلاثة فأقل حدوا حد القذف، يعنى اذا طلب المشهود عليه بالزنا ذلك؛ لأنه حقه فتوقف على طلبه وهذه اجماعية لقوله تعالىٰ ﴿والذين يرمون﴾ الخ. (فتح القدير ٢٨٩/٥)

درِمختار کے باب التعزیر میں ہے:ادعى سرقة على شخص وعجز عن اثباتها لايعزر .... بخلاف دعوى الزنا؛ فانه اذا لم يثبت يحد لما مر. علامہ شامیؒ اس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: (قوله لمامر) اى قبيل هذا الباب من انه مندوب للدر أى مامور بالستر، فاذا لم يقدر على اثباته كان مخالفا للأمر، وذكرنا الفرق فيما تقدم بورود النص على جلده اذا لم يأت بأربعة شهداء. (شامى ٢٠٤/٣)

اس موقعہ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا کلام (جوانھوں نے معارف القرآن میں فرمایا ہے) فائدہ سے خالی نہیں، فرماتے ہیں: ''زنا چونکہ سارے جرائم سے زیادہ معاشرہ میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ ہے، اس لیے اس کی سزا شریعتِ اسلام نے دوسرے سب جرائم سے زیادہ سخت رکھی ہے، اس لیے عدل وانصاف کا تقاضہ تھا کہ اس معاملہ کے ثبوت کو بڑی اہمیت دی جائے، بغیر شرعی ثبوت کے کوئی کسی مرد یا عورت پر زنا کا الزام یا تہمت لگانے کی جرأت نہ کرے، اس لیے شریعتِ اسلام نے بغیر ثبوت شرعی کے جس کا نصاب چار مرد گواہ عادل ہونا ہے، اگر کوئی کسی پر تہمت صریح زنا کی لگائے تو اس تہمت لگانے کو بھی شدید جرم قرار دیا، اور اس جرم پر بھی حد شرعی اسّی کوڑے مقرر کی، جس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ کسی شخص پر زنا کا الزام کوئی شخص اسی وقت لگانے کی جرأت کرے گا

جبکہ اس کے اس فعلِ خبیث کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا بھی اور صرف اتنا ہی نہیں؛ بلکہ اس کو یہ یقین ہو کہ میرے ساتھ اور تین مردوں نے دیکھا ہے، اور وہ گواہی دیں گے؛ کیونکہ اگر دوسرے گواہ ہی نہیں یا چار سے کم ہیں، یا ان کے گواہی میں شبہ ہے، تو اکیلا یہ شخص گواہی دے کر تہمتِ زنا کی سزا کا مستحق بننا کسی حال میں گوارا نہ کرے گا، رہا یہ معاملہ کہ جب زنا کی شہادت کے لیے ایسی کڑی شرطیں لگادی گئیں تو مجرموں کو کھلی چھٹی مل گئی، نہ کسی کو شہادت کی جرأت ہوگی، نہ کبھی ثبوتِ شرعی بہم پہنچے گا، نہ ایسے مجرم کبھی سزا یاب ہوسکیں گے؛ مگر یہ خیال اس لیے غلط ہے کہ زنا کی حد شرعی، یعنی سو کوڑے یا رجم وسنگساری کی سزا دینے کے لیے تو یہ شرطیں ہیں؛ لیکن دو غیر محرم مرد وعورت کو یکجا قابلِ اعتراض حالت میں یا بے حیائی کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی شہادت دینے پر کوئی پابندی نہیں، اور ایسے تمام امور جو زنا کے مقدمات ہوتے ہیں یہ بھی شرعاً قابلِ سزا جرم ہیں؛ لیکن حدِ شرعی کی سزا نہیں؛ بلکہ تعزیری سزا قاضی یا حاکم کی صوابدید کے مطابق کوڑے لگانے کی دی جاتی ہے، اس لیے جس شخص نے دو مرد وعورت کو زنا میں مبتلا دیکھا؛ مگر دوسرے گواہ نہیں ہیں، تو صریح زنا کے الفاظ سے تو شہادت نہ دے مگر بے حجابانہ اختلاط کی گواہی دے سکتا ہے، اور حاکم، قاضی اس پر تعزیری سزا بعد ثبوت جرم جاری کرسکتا ہے''

(معارف القرآن ۶/۳۵۳، ۳۵۴)

بہرحال نصوصِ فقہیہ سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ شریعت نے ثبوتِ زنا کے لیے شہادت یا اقرار کو ضروری قرار دیا ہے، اور شہادت وہی کہلاتی ہے جو مجلسِ قضاء میں ہو، اور اس میں تمام شرائطِ ضروریہ موجود ہوں۔

(۵) اگر کسی مرد عورت کے متعلق چار شرعی گواہوں نے زنا کی شہادت دی، اور عورت باکرہ ہے، یعنی اس کا پردۂ بکارت زائل نہیں ہوا ہے، تو اس صورت میں ان دونوں مرد عورت پر حدِ زنا جاری نہیں ہوگی، اور گواہوں پر حدِ قذف بھی جاری نہ ہوگی۔

اس مسئلہ کی تعلیل کرتے ہوئے صاحبِ ہدایہ رقمطراز ہیں: لأن الزنا لا يتحقق مع بقاء البكارة، یعنی پردۂ بکارت کے ہوتے ہوئے زنا کا تحقق نہیں ہوسکتا ہے، اس تعلیل سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ شرعاً ثبوتِ زنا کے لیے پردۂ بکارت کا زائل ہونا شرط ہے؛ البتہ شارحِ ہدایہ علامہ ابن ہمامؒ نے اس موقعہ پر جو تفصیل فرمائی ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ازالۂ بکارت میں مبالغہ نہ ہو تو بکارت عود کر آئی ہو؛ بہر حال اس پر سب متفق ہیں کہ ثبوتِ زنا نہیں ہوگا۔ (فتح القدیر ۵/ ۲۸۸)

(۶) اگر ایک آزاد مسلمان عادل عورت یہ کہے کہ فلاں عورت باکرہ ہے، تو اس کو تسلیم کرلیا جائے گا؛ البتہ اگر دو عورتیں ہوں تو یہ زیادہ احتیاط کی بات ہے۔

درمختار میں ہے: والبكارة، وعيوب النساء فيما لا يطلع عليه الرجال امرأة حرة مسلمة والثنتان احوط. (درمختار علی هامش الشامی ٤ /٨ ٤١٣)

ایک دوسرے مقام پر ہے: فان قالت امرأة ثقة والثنتان احوط هي بكر. (درمختار) اس کی شرح فرماتے ہوئے علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: (قوله ثقة) يشير الى مافى كافى الحاكم من اشتراط عدالتها تأمل. (قوله والثنتان احوط) وفى البدائع اوثق، وفى الاسبيجابى افضل. بحر. (شامی ٢/ ٦٤٧)

اس میں مدت کی کوئی تحدید وتعیین نہیں ہے۔

(۲) جس طرح اصول، عقائد، توحید، رسالت، آخرت تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آرہے ہیں، اسی طرح عام معاصی اور فواحش ومنکرات ہر شریعت و مذہب میں حرام قرار دئے گئے ہیں؛ لیکن شرائعِ سابقہ میں ان کے اسباب وذرائع کو مطلقاً حرام نہیں کیا گیا تھا، جب تک کہ ان کے ذریعہ کوئی جرم واقع نہ ہوجائے، شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبها الصلوٰۃ والسلام) چونکہ قیامت تک رہنے والی شریعت تھی، اس لیے اس کی حفاظت کا منجانب اللہ خاص اہتمام یہ کیا گیا کہ جرائم ومعاصی تو حرام تھے ہی، ان اسباب وذرائع کو بھی حرام قرار دے دیا گیا جو عادتِ غالبہ کے طور پر ان جرائم تک پہونچانے والے ہیں، مثلاً شراب نوشی کو حرام کیا گیا، تو شراب کے بنانے، بیچنے، خریدنے، اور کسی کو دینے کو بھی حرام قرار دے دیا گیا۔ سود کو حرام کرنا تھا تو سود سے ملتے جلتے معاملات کو بھی ناجائز کردیا گیا، اسی لیے حضراتِ فقہاء نے تمام معاملاتِ فاسدہ سے حاصل ہونے والے نفع کو سود کی طرح مالِ خبیث قرار دیا۔ شرک و بت پرستی کو قرآن نے ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم قرار دیا تو اس کے اسباب ذرائع پر بھی کڑی پابندی لگادی، آفتاب کے طلوع وغروب اور وسط میں ہونے کے اوقات میں چونکہ مشرکین آفتاب کی پرستش کرتے تھے، ان اوقات میں نماز پڑھی جاتی تو آفتاب پرستوں کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہوجاتی، پھر یہ مشابہت کے وقت خود شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتی تھی، اس لیے شریعت نے ان اوقات میں نماز اور سجدہ کو بھی حرام وناجائز کردیا، بتوں کے مجسمات اور تصویریں چونکہ بت پرستی کا قریبی ذریعہ تھیں، اس لیے بت تراشی اور تصویر سازی کو حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کردیا گیا، اسی طرح جبکہ شریعت نے زنا کو حرام

قرار دیا تو اس کے تمام اسبابِ قریبہ اور ذرائع کو بھی محرمات میں داخل کر دیا، کسی اجنبی عورت یا امرد پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا قرار دیا، اس کا کلام سننے کو کانوں کا، اس کے چھونے کو ہاتھوں کا، اس کے لیے جد وجہد میں چلنے کو پاؤں کا زنا فرمایا جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔ (معارف القرآن ۷/ ۲۰۵،۲۰۶)

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ شریعتِ اسلام نے جن کاموں کو گناہ کا سبب قریب درجۂ اول قرار دے کر حرام کر دیا، اس حکمِ حرمت کے بعد وہ سب کے لیے مطلقاً حرام ہے، خواہ ابتدائے گناہ کا سبب بنے یا نہ بنے، اب وہ خود ایک حکمِ شرعی ہے جس کی مخالفت حرام ہے۔ (معارف القرآن ۷/ ۲۰۷)

اجنبی عورت کے ساتھ خلوت حرام ہے، چاہے عورت تنہا ہو یا متعدد، حدیث پاک میں اس کی صراحۃً ممانعت آئی ہے، طبرانی میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”ایاك والخلوة بالنساء، فوالذي نفسي بيده ماخلا رجل بإمرأة الا دخل الشيطان بينهما، وليزحم رجل خنزيراً متلطخا او حمأة خير له من أن يزحم منكبه منكب امرأة لاتحل له“. (کنز العمال ۵/ ۳۲۲ مطبوعہ بیروت) یعنی عورتوں کے ساتھ خلوت سے بچو! پس قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کوئی مرد جب کسی (اجنبی) عورت سے خلوت کرتا ہے، تو شیطان ان کے درمیان داخل ہو جاتا ہے، اور کوئی مرد کسی مٹی میں آئے ہوئے یا کیچڑ میں لت پت سور سے ٹکرائے یہ بہتر ہے اس کے لیے اس سے کہ اس کا کندھا کسی ایسی عورت کے کندھے سے رگڑے جو اس کے لیے حلال نہیں۔

ایک دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا يخلونَّ رجل بإمرة،

فان الشیطان ثالثھما" یعنی کوئی مرد کسی (اجنبی) عورت سے خلوت ہرگز نہ کرے کہ ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ (کنز العمال ۵/۳۲۳ بحوالۂ طبرانی)

ابوعبداللہ حاکمؒ نے بھی اس روایت کو اپنی کتاب مستدرک ۱/۱۱۴ میں لیا ہے، اور آخر میں فرماتے ہیں: "صحیح علی شرط الشیخین"، علامہ ذہبیؒ نے اس کی تائید فرمائی ہے۔ (من ھامش الکنز)

ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لاتلجوا علی المغیبات، فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم، قلنا: ومنك؟ قال: ومني ولكن الله اعانني عليه فاسلم". (ترمذی کتاب الرضاع باب ۱۷، ۱/۱۴۰) یعنی جن عورتوں کے مرد موجود نہیں ان کے پاس داخل نہ ہو؛ اس لیے کہ شیطان تمھاری (رگ و پے میں) خون کی طرح جاری وساری ہے، صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اور آپ ﷺ کے بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی ہے اس کے مقابلہ میں، اس لیے میں محفوظ رہتا ہوں۔

اس روایت کے بعد بھی کیا کوئی اپنے بارے میں گارنٹی دے سکتا ہے؟

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "الا لا يبيتن رجل عند امرأة في بيت إلا أن يكون ناكحا او ذامحرم". (مسلم شریف کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیھا ۲/۲۱۵) سنو! کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ ایک مکان میں رات نہ گزارے؛ مگر یہ کہ اس کا شوہر ہو یا محرم ہو۔

مسلم شریف ہی میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ناقل ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

ایک روز منبر پر خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا: ”لا یدخلن رجل بعد یومی هذا علی مغیبة الا ومعه رجل او اثنان“ (آج کے بعد کوئی مرد ایسی عورت جس کا مرد نہ ہو اس کے پاس داخل نہ ہو؛ مگر یہ کہ اس کے ساتھ ایک یا دو مرد اور ہوں) (مسلم شریف باب سابق ۲/۲۱۶، یہ روایت مسندِ احمد ۲/۱۸۶،۲/۱۷۱ پر بھی موجود ہے)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقامِ جابیہ میں اپنا مشہور خطبہ جو دیا اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ: ”لا یخلون احدکم بإمرأة فان الشیطان ثالثهما“. (تم میں سے کوئی کسی (اجنبی) عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے؛ اس لیے کہ ان میں تیسرا شیطان ہے) (مسندِ احمد ۱/ ۱۸، ۲۶)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من قعد علی فراش مغیبة، قیض اللّٰہ له یوم القیامة ثعباناً“ یعنی جو آدمی کسی ایسی عورت کے بستر پر بیٹھا جس کا مرد موجود نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ اس پر قیامت کے روز ایک اژدھا مسلط فرمائیں گے۔ (مسندِ احمد ۵/۳۰۰)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ناقل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مثل الذی یجلس علی فراش المغیبة مثل الذی ینهشه اسود من اساود یوم القیامة“ یعنی اس آدمی کی مثال جو کسی ایسی عورت جس کا مرد نہ ہو کے بستر پر بیٹھتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کو قیامت کے اژدہوں میں سے کوئی اژدہا ڈس رہا ہو۔ (کنز العمال ۵/۳۲۲، مجمع الزوائد للهیثمی ٦/٢٥٨)

یہ چند احادیث بطورِ نمونہ پیش کی ہیں، ورنہ اس کے علاوہ بھی ایک بڑا ذخیرہ اس

موضوع پر موجود ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اجنبیات سے خلوت حرام و ناجائز ہے۔

حضراتِ فقہاء نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے، فقہ حنفی کی مشہور ومتداول کتاب ہدایہ میں ہے: ولھذا تحرم الخلوۃ بالاجنبیۃ وان کان معھا غیرھا. (اجنبی عورت کے ساتھ خلوت حرام ہے چاہے وہاں دوسری عورت بھی موجود ہو) (ہدایہ ۲/۲۱۳)

درمختار میں ہے: وفی الاشباہ: الخلوۃ بالاجنبیۃ حرام. (درمختار علی ھامش الشامی ۵/۲٦۰) (یعنی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت حرام ہے)۔

شامی میں "منیۃ المفتی" کے حوالے سے نقل کیا ہے: الخلوۃ بالاجنبیۃ مکروھۃ وان کانت معھا اخریٰ کراھۃ تحریم. یعنی اجنبیہ عورت کے ساتھ خلوت مکروہ تحریمی ہے چاہے وہاں دوسری عورت موجود ہو۔ (شامی ۵/۲۶۰)

علامہ ابن حجر ہیثمیؒ نے اپنی کتاب "الزواجر عن اقتراف الکبائر" میں خلوت بالاجنبیہ کو کبائر میں شمار کیا ہے۔ (الزواجر ۲/۲،۳)

اجنبیات کو چھونا اور ہاتھ لگانا بھی ناجائز وحرام ہے، حدیث پاک میں اس کو ہاتھ کا زنا قرار دیا گیا ہے "والید زناھا البطش"۔

ایک روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے: "لان یطعن فی رأس احدکم بمخیط من حدید خیرلہ من ان یمس امرأۃ لاتحل لہ". (کنز العمال ۵/۳۲۸) (کسی کے سر پر لوہے کی سوئی چبھوئی جائے، یہ اس کے لیے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی ایسی عورت کو چھوئے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے) علامہ ابن حجر مکیؒ نے بھی طبرانی کے حوالہ سے اس روایت کو نقل فرما کر اس کی تصحیح فرمائی ہے۔ (الزواجر ۲/۲)

ہدایہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد منقول ہے:"من مس کف امرأة لیس منها بسبیل، وضع علی کفه جمر یوم القیامة" **(جس نے کسی ایسی عورت کا ہاتھ چھویا جو اس کے لیے حلال نہیں ہے، اس کے ہاتھ پر روزِ قیامت آگ کے انگارے رکھے جائیں گے)**(ہدایہ ۴/۴۴۲،۴۴۳)

فقہاء نے اجنبیہ کے ہاتھ اور چہرے (جس کو بعض صورتوں میں دیکھنے کی اجازت ہے) کے چھونے کو صراحۃً ناجائز وحرام لکھا ہے۔

ہدایہ میں ہے:لایحل له ان یمس وجهها ولا کفها وان کان یأمن الشهوة. **(مرد کے لیے اجنبی عورت کے چہرہ اور ہاتھ کا چھونا جائز نہیں ہے چاہے شہوت کا اندیشہ نہ ہو)**(ہدایہ ۴/۴۴۲)

درمختار میں ہے: فلا یحل مس وجهها وکفها وإن امن الشهوة.

(درمختار علی هامش الشامی ۵/۲٦۰)

بلکہ اجنبی عورت کے ہاتھ اور چہرے کے دیکھنے میں شہوت کا اندیشہ ہو تو وہ بھی حرام ہے۔

درمختار میں ہے: فحل النظر مقید بعدم الشهوة والا فحرام. (درمختار علی هامش الشامی ۵/۲٦۱) **اور آگے تو یہاں تک فرمایا ہے:**وهذا فی زمانهم، واما فی زماننا فمنع من الشابة، قهستانی وغیره. (درمختار) **یعنی ہمارے زمانہ میں تو نوجوان عورت کے چہرہ اور ہاتھ (ہتھیلی) کو دیکھنا مطلقاً ممنوع ہے، (چاہے شہوت کا اندیشہ ہو یا نہ ہو)۔**

صاحبِ درمختار نے یہ بات علامہ قہستانیؒ سے نقل فرمائی ہے، جن کی وفات

۹۵۰ھ یا ۹۶۲ھ میں ہوئی ہے، گویا ساڑھے چار سو سال پہلے فرمایا جا رہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں الخ، اب ہمارے اس دور میں کیا کہا جائے گا؟

جب ہتھیلی وغیرہ کو صرف چھونے کا یہ حکم ہے تو سینے پر عطر ملنے کی حرمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ خوشبو ان چیزوں میں سے ہے جو خواہشاتِ نفسانی میں ہیجان پیدا کرنے والی ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے زمانۂ مبارکہ میں جو عورتیں مسجد نبوی میں حاضری دیتی تھیں، ان کو آپ ﷺ نے تاکید فرمائی تھی کہ خوشبو لگا کر نہ آئیں: عن زینب امرأة عبدالله قالت: قال لنا رسول الله ﷺ: اذا شهدت احدٰيكن المسجد فلا تمس طيباً.

(مسلم شریف ۱/ ۱۸۳)

حدیث پاک میں ایسی عورت کو جو خوشبو لگا کر (مردوں کی) مجلس پر گزرتی ہے زانیہ قرار دیا گیا ہے: "كل عين زانية والمرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني زانية" (اسلام کا نظامِ عصمت وعفت ۲۳۲ بحوالہ تفسیر ابن کثیر ۳/ ۲۸۶)

(۷) صدارت ایک منصب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو اس منصب پر فائز کیا جا رہا ہے، وہ علمی اور عملی اعتبار سے اس ذمہ داری کا اہل ہے، اور عہدے ومنصب جتنے بھی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حضرات ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ارشاد ربانی: ﴿ان الله يأمركم ان تؤدوا الامٰنٰت الى اهلها﴾ (یعنی اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچایا کرو) کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ:

’’اس حکم کا مخاطب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عام مسلمان ہوں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ خاص امراء وحکام مخاطب ہوں، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو کسی امانت کا امین ہے، اس میں عوام بھی داخل ہیں اور حکام بھی، حاصل اس ارشاد کا یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں کوئی امانت ہے اس پر لازم ہے کہ یہ امانت اس کے اہل و مستحق کو پہونچادے۔‘‘ (معارف القرآن ۲/ ۴۴۶)

آگے فرماتے ہیں: ’’اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآنِ حکیم نے لفظ امانت بصیغۂ جمع استعمال فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو، جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے؛ بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں، جو واقعہ اس آیت کے نزول کا ابھی ذکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا؛ بلکہ یہ کنجی خدمتِ بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے۔‘‘ (معارف القرآن ۲/ ۴۴۶)

اس کی تائید نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: ”اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة“ (بخاری شریف کتاب العلم) یعنی جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کردی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں، تو (اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو۔

اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''جب معاملات نااہلوں کے سپرد کئے جائیں، تو قیامت کا انتظار کرنا چاہئے، ضیاعِ امانت اس طرح ہوگا کہ لوگ جسے اہل سمجھ کر کوئی امانت سپرد کریں گے وہ واقع میں اہل نہ ہوگا، لامحالہ وہ امانت کا حق ادا نہیں کرے گا، ایسے لوگ خدماتِ مفوضہ میں خیانت شروع کریں گے کیونکہ وہ تو اس خدمت کے لائق ہی نہیں تھے، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے، اہلیت نہیں دیکھی جاتی؛ بلکہ اغراض وسفارشات پر دارومدار ہوگیا ہے، اور اہلیت ہر شعبہ کی اس کے مناسب ہوتی ہے، مثلاً محدث وہ نہیں جس کی صرف تقریر عمدہ ہو؛ بلکہ حدیث کا اہل وہ ہوسکتا ہے جس میں دیانت اور علم دونوں ہوں۔'' (فضل الباری ۱/ ۵۶۶)

مندرجۂ بالا حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ذمہ دار حضرات کو چاہئے کہ صدر موصوف کے سلسلہ میں فیصلہ کرلیں۔ البتہ اس موقعہ پر ذمہ دار حضرات کو اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ صدر موصوف کی جگہ کسی اور شخص کو اس منصب پر مقرر کیا گیا، تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس کو بھی اس نوع کے ابتلاءات پیش نہیں آئیں گے؟

اس لیے لڑکیوں کے مدرسہ کی موجودہ جو صورت قائم کی گئی ہے، احقر کے خیال میں تو وہی شریعت کے مقرر فرمودہ اصول وہدایات کے خلاف ہے، حضرات فقہاء نے عورتوں کو نماز کی جماعتوں اور عیدین اور مجالسِ وعظ میں جانے سے منع کیا ہے، اور کتبِ فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ عورت کے لیے مجالسِ وعظ اور جماعتِ نماز اور عیدین میں جانا مکروہ تحریمی ہے، جو حرام کے قریب ہے، اس حکمِ فقہی کی دلیل یہ حدیث ہے جو بخاریؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے: عن عائشة رضی الله

تعالیٰ عنہا قالت: لو ادرك رسول الله ﷺ مااحدث النساء، لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني اسرائيل، فقلت لعمرة: او منعهن، قالت: نعم. (بخاری شریف)

اس حدیث سے نہایت صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہی عورتوں کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ ان کا گھروں سے نکلنا اور جماعتوں میں جانا سببِ فتنہ تھا، اور اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی الله تعالیٰ عنہا اور دیگر اکابر صحابیات عورتوں کو جماعت میں آنے سے منع کرتے تھے۔

علامہ عینیؒ عمدہ القاری شرحِ بخاری میں فرماتے ہیں: قلت: هذا الكلام من عائشة بعد زمن يسير جدا بعد النبى ﷺ، واما اليوم فنعوذ بالله من ذلك، فلا يرخص فى خروجهن مطلقاً للعيد وغيره. (یعنی حضرت عائشہ رضی الله تعالیٰ عنہا کا یہ فرمانا رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ مبارکہ کے بہت تھوڑے دنوں بعد کا ہے، اور آج کل تو خدا کی پناہ! پس مطلقاً عورتوں کو عید اور غیر عید میں جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی)۔ جبکہ علامہ عینیؒ اپنے زمانہ میں یہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی عورتوں کے حالات سے خدا کی پناہ! تو پھر ہمارے اس زمانہ پندرہویں صدی کی عورتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے؟۔

بحرالرائق، عینی شرحِ کنز، درمختار وغیرہ کتبِ فقہ میں صراحۃً یہ ہے کہ عورتوں کو مجالسِ وعظ میں جانا مکروہ اور ناجائز ہے؛ نیز یہ کہ عورتوں کا گھر میں سے نکلنا اور جماعتوں میں شریک ہونا موجبِ فتنہ ہے، اور ممانعت کا حکم اس فتنہ سے بچنے کے لیے ہے۔'' (کفایت المفتی ۵/۳۹۱ تا ۳۹۷ بحذف وتغیر)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث فرما کر تحریر فرمایا

ہے کہ: ''اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے نفسِ خروج کو موجبِ فساد سمجھ کر گھر سے نکلنے کو ہی منع فرمایا۔'' (کفایت المفتی ۵/ ۳۹۹)

آگے اسی بحث کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب عورتوں کو مجالس وعظ میں جانا ناجائز ہے، تو ان کے لیے وعظ و پند کا دروازہ ہی بند ہو گیا، تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ نہیں، وعظ و پند کا دروازہ اب بھی مفتوح ہے، بند نہیں ہوا؛ لیکن شرط یہ ہے کہ شرعی طریقہ سے وہ اس پر کار بند ہوں، اور وہ طریقہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں واعظ عالم متقی کو بلا کر وعظ سن لیا کریں؛ مگر اس میں یہ شرط لازمی ہے کہ عورتیں صرف اسی گھر کی ہوں یا اس کے آس پاس اتنے قریب مکانوں کی ہوں کہ ان کا مکانِ وعظ میں آنا گویا خروج عن المکان ہی نہ ہو۔ الخ (کفایت المفتی ۵/ ۴۰۶) (مزید تفصیل مطلوب ہو تو کفایت المفتی ۵/ ۳۹۱ تا ۴۳۱ کا مطالعہ فرمالیں)

جب عورتوں کے لیے جماعتِ نماز، عیدین، مجلسِ وعظ وغیرہ کے لیے خروج عن المکان کی اجازت نہیں دی گئی؛ حالانکہ یہ سب کام چند ساعتوں کے لیے ہیں، تو پھر ان کو ایک طویل مدت کے لیے ایسی جگہ چھوڑ دینا، جہاں نہ محرم موجود، نہ شوہر، اس کی گنجائش شرعاً کیسے ہوسکتی ہے؟ بہرحال ادارۂ ہذا کے ذمہ دار حضرات کو چاہیئے کہ اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم وعلمہ أتم واحکم

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ جمادی الاول ۱۴۰۸ھ

طلباء کی تعزیز کی حد

سوال: (۴) شرعی تعزیر کی کیا حد ہے؟ (وہ تعزیر جو طلباء کی کی جاتی ہے)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

وان وجب ضرب ابن عشر عليها بيد لا بخشبة، لحديث "مروا اولادكم بالصلوٰة؛ وهم ابناء سبع، واضربوهم عليها وهم ابناء عشر" (درمختار)

(قوله بيد) اى ولا يجاوز الثلاث، وكذلك المعلم ليس له ان يجاوزها، قال عليه الصلوٰة والسلام لمرداس المعلم "اياك ان تضرب فوق الثلاث، فانك اذا ضربت فوق الثلاث اقتص اللّٰه منك" اه اسمعيل عن أحكام الصغار للاستروشنى. وظاهره انه لا يضرب بالعصا فى غير الصلوٰة ايضاً (قوله لابخشبة) اى عصا ومقتضى قوله بيد ان يراد بالخشبة ماهو الاعم منها ومن السوط افاده.ط. (شامى ۱/۲۵۸)

عبارتِ منقولہ سے امرِ مسئول عنہ کا حکم بالتفصیل معلوم ہوگیا۔(فتاویٰ محمودیہ ۱/۵۲۵)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

جرمانہ کی رقم کا مدرسہ میں استعمال

سوال: اگر کسی ادارہ میں طلباء کے کسی جرم کی وجہ سے ان پر جرمانہ عائد کیا جائے، تو کیا یہ جرمانہ لے کر اس کو مدرسہ کے کسی مصرف میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر طالب علم نے مالی نقصان پہنچایا ہے، تو اس کا تاوان وصول کیا جا سکتا ہے، اور اگر اس کے علاوہ کوئی جرم ہے تو اگر مال لے کر کچھ مدت تک روکے رکھا، اور پھر واپس کیا تو اس کی گنجائش ایک روایت کے مطابق ہے؛ لیکن اس کو استعمال کرنا جائز نہیں۔

لا بأخذ مال فی المذهب "بحر" وفیه عن البزازية وقيل يجوز، ومعناه ان يمسكه مدة لينزجر ثم يعيده له، فان ايس من توبته صرفه الى مايرىٰ (درمختار) (قوله فيه الخ) اى فى البحر حيث قال: وافاد فى البزازية ان معنى التعزير بأخذ المال على القول به امساك شيء من ماله عند مدة؛ لينزجر ثم يعيده الحاكم اليه، لا ان ياخذه الحاكم لنفسه او لبيت المال الخ (شامی ۱۹۵/۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

تارکِ صلوٰۃ متولی ومہتمم کو برطرف کرنا

سوال: صدر مسجد و مدرسہ اگر تارکِ صلوٰۃ ہے تو اس کو برطرف کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کوئی دوسرا مانع موجود نہ ہو تو برطرف کیا جا سکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ "متولی اور مہتمم عالم باعمل ہونا چاہئے، اگر ایسا میسر نہ ہو سکے تو صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو، امانت دار، مسائلِ وقف کا جاننے والا، خوش اخلاق، اور رحمدل، منصف مزاج، علم دوست، اہل علم کی تعظیم وتکریم کرنے والا ہو، جس میں یہ صفات زیادہ ہوں اسی کو متولی ومہتمم بنانا چاہئے" (فتاویٰ رحیمیہ ۱۶۶/۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

متولی کیسا ہو؟

سوال: (۱) آندھرا پردیش ضلع چتور میں ایک قصبہ پیلر شریف ہے، قصبہ ھذا میں ایک مدرسہ بنامِ "نور الھدیٰ" ۱۴/سال سے دینی خدمات انجام دے رہا ہے، اور مدرسہ ھذا کے معلمین ومتعلمین کے اخراجات بیرونی چندہ سے پورے ہوتے ہیں، قصبہ

والوں پر کوئی بوجھ نہیں ہے............ باوجود اس کے یہاں کے جامع مسجد کے متولی جناب خواجہ اویس قرنی صاحب قصبہ کے لوگوں کو اس بات پر برانگیختہ کررہے ہیں، کہ اس مدرسہ سے ہمیں کوئی دنیوی فائدہ نہیں ہورہا ہے، یعنی اتنے سال سے یہ مدرسہ چل رہا ہے؛ لیکن مدرسہ میں بچت کچھ بھی نہیں ہے؛ لہٰذا مدرسہ کو ختم کردیا جائے، ایسے شخص کے بارے میں علماءِ دین کیا حکم فرماتے ہیں؟

(۲) گیارہویں شریف میں ایک بیوہ عورت نجم النساء نامی نے کسی دوسرے کے ذریعہ سے گیارہ روپئے برائے میلاد شریف متولی مذکور کو بھیجا، دوسرے روز یہ عورت متولی کے گھر دریافت کرنے گئی کہ میں نے جو رقم بھیجی تھی ملی یا نہیں؟ تو فوراً متولی صاحب نے اس عورت کو چھینال لونڈی وغیرہ برا بھلا کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر دروازے سے باہر ڈھکیل دیا۔

(۳) اس قصبہ میں تقریباً سات سال سے جناب سالار صاحب بطور اذنی (المعلن) مقرر ہیں، یہ متولی مذکور صاحب جب متولی بنے ہیں، چار مرتبہ سالار صاحب کو اذنی کے عہدے سے برطرف کیا، بار بار برطرف کرنے کے بعد اذنی نے متولی کے نام ایک عریضہ لکھ کے دیا کہ اس طریقہ سے میری بے عزتی کیوں کررہے ہو؟ تو متولی نے کہا کہ جو چاہوں کرسکتا ہوں، میں چیف منسٹر کا عہدہ والا ہوں، اس واقعہ کے بعد جماعت والوں نے یہ طے کیا کہ جامع مسجد کمیٹی کی ایک جماعت مقرر کی، اور متولی کو اطلاع دی کہ تمام حسابات کتاب، نکاح اور جماعت کا پیسہ، بیت المال کا پیسہ، مسجد میں جماعت کے حوالے کردو، جماعت والے کے طے شدہ فیصلہ کے بعد متولی صاحب جماعت والوں کو

مختلف قسم سے غصہ کی آگ بجھانے کے لیے برے برے القاب سے بدنام کیا۔

نوٹ: یہ متولی صرف دو ماہ سے بنائے گئے ہیں، اور اسی دو ماہ کے اندر انھوں نے یہ سارے فسادات برپا کئے ہیں، اب علمائے دین غور وفکر فرما کر یہ فرمائیں کہ جامع مسجد کے متولی کیسے ہونے چاہئے؟ ان کے اخلاق وعادات واعمال کیسے ہونے چاہئے؟ نیز اس قصبہ میں مسلم آبادی تقریبا ۵۰۰۰/ پانچ ہزار ہے، ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فرمائیں کہ اس کا ذمہ دار کیسا ہونا چاہئے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

متولی، عالم باعمل ہونا چاہئے، اگر ایسا میسر نہ ہو سکے تو صوم وصلوۃ کا پابند، امانت دار، مسائل وقف کا جاننے والا، خوش اخلاق اور رحمدل، منصف مزاج، علم دوست، اہل علم کی تعظیم وتکریم کرنے والا ہو، جس میں یہ صفات زیادہ ہوں اسی کو متولی بنانا چاہئے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۲/ ۱۶۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

امام ومدرس کی ماہانہ تنخواہ کی مقدار

سوال: امام ومدرس حضرات کی کم ازکم ماہانہ تنخواہ کتنی رکھنی ضروری ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اصل مذہب یہ ہے کہ کسی طاعتِ مقصودہ پر اجرت لینا جائز نہیں؛ مگر جس طاعت میں دوام یا پابندی کی ضرورت ہے، اور وہ شعارِ دین میں سے ہے کہ ان کے بند

ہونے سے اخلال دین لازم آوے گا، اور ویسے کسی کو مہلت نہیں، ایسے امور کو اس کلیہ سے مستثنیٰ کر دیا ہے، امامت اور تدریس قرآن وفقہ بھی انہی امور میں سے ہیں۔ (شامی ۵/ ۳۸)

جب ایک شخص تمام امور سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو امامت اور تدریسِ قرآن وفقہ میں مشغول کئے ہوئے ہیں، تو مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ اس کی ضروریات زندگی کی کفالت کریں، اور کم از کم اس کو اتنی تنخواہ دیں کہ جس سے اس کی ذات اور اس کے اہل وعیال (جن کا نفقہ اس پر واجب ہے) کا گزران ہو سکے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

غریبوں کی امداد کی غرض سے چندہ کر کے کسی ادارہ میں لگانا

سوال: خدمتِ عالی میں گزارش یہ ہے کہ حکومتِ ہند کی جانب سے منظور شدہ ایک عوامی ادارہ ہے، جس کا نام ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' ہے، یہ ادارہ عوام کے فائدہ کے لیے وجود میں آیا ہے، یہ ادارہ عوام سے ان کا سرمایہ لے کر اس کو مختلف قسم کے کاروبار میں لگاتا ہے، پھر اس سرمایہ سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ہر سال مالک کے سرمایہ پر کچھ فیصدی نفع طے کر کے اس کو سالانہ نفع تقسیم کرتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ادارہ کے منتظمین سرمایہ داروں کا سرمایہ جن کاروبار میں لگاتے ہیں، ان میں سے اکثر میں سودی طریقہ پر لگاتے ہیں، اور ان کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع شرعاً سود ہی ہوتا ہے، جیسا کہ کچھ سرمایہ کمپنیوں کے پریفرنس شیئرز، اور ڈبینچر شیئرز میں لگاتے ہیں، اور کچھ سرمایہ سرکاری بینکوں کی فکس ڈپازٹس اور بونڈس میں لگاتے ہیں، اور کچھ سرمایہ سرکاری سودی سرٹیفکٹ اور وِکاس پتروں میں لگاتے ہیں، بیمہ کا کاروبار بھی ہوتا ہے، اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے آمدنی کے ذرائع

کھڑے کرنے کی غرض سے لوگوں سے چندہ کر کے سرمایہ جمع کرے، اور اس چندہ کی رقم کو آمدنی حاصل کرنے کے لیے مذکورہ ادارہ ''یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا'' میں لگائے، اور یونٹ ٹرسٹ سے جو نفع حاصل ہو اس کو محتاجوں میں تقسیم کرے، تو سوال یہ ہے کہ اس غرض سے چندہ کرنا، پھر اس کو مذکورہ یونٹ ٹرسٹ میں لگا کر اس سے نفع حاصل کرنا، پھر نفع کی رقم سے غریبوں کی مدد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سوال میں مذکورہ غرض سے چندہ کرنا درست ہے؛ (البتہ اس چندہ میں ایسی رقم وصول نہ کی جائے جس میں شرعی طور پر تملیک ضروری ہے، مثلاً: زکوٰۃ وغیرہ، اس لیے کہ ایسی رقم سے ذرائع آمدنی قائم نہیں کیے جا سکتے) اور اس چندہ سے حاصل شدہ رقم سے جائز ذرائع آمدنی قائم کیے جا سکتے ہیں، یونٹ ٹرسٹ سے حاصل ہونے والا نفع حسبِ تصریح سوال سود ہے، تو اس میں یہ رقم لگانا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسائل مساجد

جانب غرب میں واقع دکانوں پر توسیع مسجد

سوال: ہمارے بڑودہ شہر کے بالکل وسط میں ایسے علاقے ہیں، جس کے چاروں طرف بازار ہیں، سامنے عدالت (نیائے مندر) کی شاندار پرشکوہ عمارت ہے اور اطراف سے شہر میں آنے والی بسوں کا بس اسٹینڈ بھی اسی کے قریب ہے، بستی اور ٹرافک سے ایسے بھرپور علاقہ میں ''کھجوری مسجد'' نامی ایک تاریخی مسجد واقع ہے، مذکورہ مسجد کے چاروں طرف مسجد کی مملوکہ زمین پر دکانیں ہیں، جو سالہا سال سے کرایہ پر دی ہوئی ہیں، حکومت کے حالیہ قوانین کی رو سے مسجد کی توسیع کے لیے ان دکانوں کا قبضہ مسجد کو حاصل ہونا دشوار؛ بلکہ ناممکن ہے، جائے وقوع کی درج بالا خصوصیات کی وجہ سے نمازیوں کی کثرت تعداد کے پیش نظر موجودہ مسجد بالکل ناکافی ہونے اور آج سے بیس سال قبل کے فرقہ وارانہ فساد میں اس کو کافی نقصان پہنچنے؛ نیز اس کی عمارت نہایت بوسیدہ ہوجانے کی بناء پر، مسجد عرصۂ دراز سے ازسرِ نوتعمیر طلب تھی، قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی تعمیر نو مؤخر ہوتی رہی؛ لیکن اب بحمداللہ بڑودہ کارپوریشن نے اس کی تعمیرِ نو کی اجازت دیدی ہے؛ چنانچہ تعمیری کام شروع ہوچکا ہے، موجودہ مسجد مصلیوں کی تعداد کی بہ نسبت نہایت تنگ ہے اور اس میں ہوا اور روشنی وغیرہ کا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کافی حبس رہتا ہے، اور تاریکی بھی رہتی ہے، دکانوں سمیت مسجد کی مملوکہ زمین کا مجموعی ایریا (علاقہ) پانچ ہزار اسکورفٹ ہے، جس میں سے صرف بارہ سو اسکورفٹ ایریا (علاقہ) پر مسجد واقع ہے اور باقی اڑتیس سو اسکورفٹ ایریا (علاقہ) پر دکانیں ہیں، جس پر کرایہ دار قابض ہیں،

مصلیوں کی تعداد کے اعتبار سے موجودہ مسجد کی چارگنی توسیع اشد ضروری ہے۔

مسجد کی دکانیں مسجد کی ملکیت ہونے کے باوجود ناممکن الحصول ہونے کی وجہ سے تحتانی مسجد کی توسیع بالکل ناممکن ہے، اب توسیع کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ مذکورہ مسجد کے اوپر ایک منزلہ تعمیر کرلیا جائے اور مسجد سے ملحقہ دکانوں کی چھت والا حصہ فوقانی مسجد میں شامل اور داخلِ مسجد کرلیا جائے، بایں طور تحتانی مسجد کے بجائے فوقانی مسجد کی یہ توسیع بقدرِ کفایت وضرورت ممکن ہے، پھر فوقانی مسجد کی یہ توسیع جانبِ شرق میں ممکن نہیں، جبکہ جانبِ غرب (سمت قبلہ) ہی میں ممکن ہے؛ نیز کما حقہ دائیں وبائیں جانب بھی ممکن نہیں، اب مسجد کی انتظامیہ کمیٹی نے جانبِ غرب ہی میں فوقانی مسجد کی تعمیر کا پلان ونقشہ تیار کیا ہے، تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد کے تحتانی اور فوقانی دونوں منزلے پنج گانہ نماز باجماعت میں استعمال ہوں گے، تحتانی مسجد کا استعمال موقوف اور بند نہیں کیا جائے گا، اب پنج گانہ نماز باجماعت میں امام کے تحتانی مسجد میں امامت کے لیے کھڑے رہنے کی صورت میں فوقانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ میں واقع صفوف کا، تقدم علی الامام ہونا لازم آتا ہے، جو جائز نہیں، علاوہ ازیں توسیع کا اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے، لہذا اب درج ذیل امور دریافت طلب ہیں:

(۱) جانبِ غرب دکانوں کی چھت پر واقع فوقانی مسجد کا توسیع شدہ حصہ، صحتِ اعتکاف وغیرہ دیگر احکام مساجد کے اعتبار سے مسجد شرعی ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض حضرات کو درج ذیل عبارت: وحاصله أن شرط كونه مسجداً أن يكون سفله وعلوه مسجدا، ينقطع حق العبد عنه لقوله تعالىٰ ﴿وان المساجد لله﴾ بخلاف ما

إذا كـان السـرداب أو العلو موقوفا لمصالح المسجد، فإنه يجوز إذ لا ملك فيه لأحد؛ بل هو من تتميم مصالح المسجد، فهو كسرداب مسجد بيت المقدس، هـذا هو ظاهر المذهب، وهناك روايات ضعيفة مذكورة في الهداية. (البحر الرائق كتاب الوقف باب احكام المساجد ۲۷۱/۵، رد المحتار احكام المساجد مطبوعه نعمانيه ديوبند ۳۷۰/۳، رد المـحتار كتاب الوقف احكام المساجد۴۰۶/۳ مكتبه رشيديه) کی وجہ سے، مذکور مسجد فوقانی کے دکانوں پر توسیع شدہ حصہ کو عدم انقطاع حق عبد کی بنیاد پر مسجد شرعی قرار دینے میں تأمل ہے۔

(۲) اگر مسجد فوقانی کا مذکور توسیع شدہ حصہ مسجد شرعی نہ ہو، تو اشکال یہ ہے کہ بناءِ ابتداء (اولین تعمیر) کے وقت شروط مذکورہ فی کتب الفقہ کی رعایت کے ساتھ، تحتانی حصۂ مسجد میں کرایہ کی دکانیں وغیرہ بنانا جائز ہے اور فوقانی حصہ ''مسجدِ شرعی'' ہوگا؛ حالانکہ یہاں بھی دکانوں والے تحتانی حصہ کے ساتھ بالکلیہ انقطاع حق عبد نہیں ہے، لہٰذا بناء ابتدائی اور بناء ثانی کی توسیع مسجد فوقانی میں وجہ فرق کیا ہے؟

(۳) اگر مسجدِ فوقانی کا مذکورہ توسیع شدہ حصہ ''مسجدِ شرعی'' ہو، تو مذکورہ بالا حالات میں مفتیٔ اعظم ہند حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل فتوی کی بنیاد پر، امام کو تحتانی مسجد کے بجائے فوقانی مسجد کے جانب غرب توسیع شدہ حصہ کے اندر، فرض نماز با جماعت میں کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں؟

<u>نقل فتوی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ</u>

سوال: مسجد کی چھت پر نماز با جماعت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: (از حضرت مفتی اعظمؒ) مسجد کی چھت پر نماز کی جماعت جائز ہے اور اگر گرمی

وغیرہ کے عذر کی وجہ سے ہو، تو کسی قسم کی کراہت بھی نہیں؛ البتہ بلا عذر ہوتو اس بناء پر کہ جماعت کی اصلی جگہ نیچے کا درجہ اور محراب ہے، اوپر جماعت کرنا خلافِ اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

جواب: (از مولوی حبیب المرسلین نائب مفتی) تشریح اس کی یہ ہے کہ اگر گرمی کی ایسی شدت ہو کہ خشوع وخضوع قائم نہ رہے، تو مسجد کی چھت پر نماز باجماعت، وسنن ونوافل پڑھنے بھی مکروہ نہ ہوں گے اور اگر اس قسم کی شدت کی گرمی نہ ہوگی، تو مسجد کی چھت پر نماز باجماعت وغیرہ مکروہ ہوگی۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: الصعود على كل سطح مسجد مكروه، وهذا إذا اشتدت الحر يكره أن يصلوا بالجماعة فوقه، إلا إذا ضاق المسجد فحينئذ لا يكره الصعود على سطحه للضرورة كذا في الغرائب. (۳۰۶/۵) فقط حبیب المرسلین نائب مفتی مدرسہ امینیہ دہلی (کفایت المفتی ۱۵۵/۳)

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

(۱-۲) صورتِ مسئولہ میں مسجد کی توسیع جانبِ غرب میں درست ہے، اب عدمِ انقطاعِ حقِ عبد کا جو اشکال رہ جاتا ہے، اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ صورت جب ہوتی، جبکہ وہ دکانیں مسجد کی ملک نہ ہوتیں؛ حالانکہ صورتِ مسئولہ میں ان کی ملکیت مسجد کی ہی ہے، ان کا کرایہ بھی مسجد ہی کو مل رہا ہے، ملکی قانون کی وجہ سے باوجود ملک کے ان دکانداروں کو وہاں سے ہٹانا مشکل ہے، عبارت مذکورہ فی السوال میں صراحت ہے: بخلاف ما إذا كان السرداب أو العلو موقوفا لمصالح المسجد فإنه يجوز إذ لا ملك فيه لأحد.

صورتِ مسئولہ میں بھی جو دکان دار قابض ہیں، ان کی ملک نہیں ہے؛ بلکہ ملک تو مسجد کی ہی ہے اور قانونی طور پر بھی ان دکانداروں کی حیثیت کرایہ دار کی ہے اور مواقع ضرورت میں فقہاء نے بھی گنجائش دی ہے۔

"فتح القدير" میں ہے: بخلاف ما إذا كان السرداب أو العلو موقوفاً لصاحب المسجد، فإنه يجوز إذ لا ملك فيه لأحد؛ بل هو من تتميم مصالح المسجد فهو كسرداب مسجد بيت القدس، هذا هو ظاهر المذهب. وروي عن أبي حنيفة أنه إذا جعل السفل مسجداً دون العلو جاز، لأنه يتأبد، بخلاف العلو، وهذا تعليل للحكم لوجود الشرط، فإن التابيد شرط وهو مع المقتضى، وإنما يثبت الحكم معهما مع عدم المانع، وهو تعلق حق واحد، وعن محمدؒ عكسه لأن المسجد معظم، وهو تعليل بحكم الشيء وهو متوقف على وجوده. وعن أبي يوسف أنه جوز ذلك في الأولين لما دخل بغداد ورأى ضيق الأماكن، وكذا عن محمدؒ لما دخل الري وهذا تعليل صحيح لأنه تعليل بالضرورة. (۲۳۴/۶، ۲۳۵)

دیکھئے! فتح القدیر کی اس عبارت میں صرف فوقانی منزل کی مسجدیت کو درست قرار دینے والی روایت کی تائید فرمائی ہے؛ حالانکہ اس میں تحتانی حصہ ملک مسجد نہیں ہے، اس وقت کی یہ بحث ہے جبکہ صورتِ مسئولہ میں تحتانی حصہ پر ملکیت مسجد کی ہی ہے، صرف قبضہ نہیں ہے؛ البتہ اعتکاف کے لیے مناسب یہ ہے کہ قدیم مسجد والے حصہ میں کیا جائے، تاکہ احتیاط پر عمل ہو جائے۔

(۳) ضرورت کے پیشِ نظر جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم

نوٹ: نیچے کے دکانداروں کو تاکید کی جائے کہ حرمتِ مسجد کے خلاف کوئی کام اس میں نہ کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسجد کو رنگین بلب سے سجانا

سوال: ایک صاحب اپنی طرف سے مسجد کو سجانے کے لیے چھوٹی چھوٹی رنگین بلب وغیرہ لگانے کا ارادہ کرتے ہیں، مگر ان کا ارادہ مسجد کے بجلی کا استعمال کرنا نہیں ہے؛ بلکہ اس سجانے میں جو بجلی وغیرہ صرف ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے صاحب کی جانب سے ہے (یعنی مسجد کے رقم میں سے کچھ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے) تو کیا اس طرح مسجد کو سجانا جائز ہے یا ناجائز؟ (صرف تہوار وغیرہ خوشی کے موقع پر)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عید و شبِ برأت وغیرہ موقع پر بجلی کے قمقموں سے مسجد کی سجاوٹ کی ممانعت کئی وجوہ سے ہے: مسجد کی بجلی کا استعمال کرنا، ان وجوہات میں سے ایک وجہ ہے، اب اگر کوئی بلب بھی اپنی طرف سے دیتا ہے اور بجلی کا خرچہ بھی دیتا ہے، تو اس سے صرف ممانعت کی ایک وجہ دور ہوئی، لیکن ممانعت کی دیگر وجوہات تو اپنی جگہ پر قائم ہیں، جن میں سے ایک بڑی اور اہم وجہ ہنود وغیرہ غیر مسلم کے تہواروں کے ساتھ مشابہت ہے کہ وہ دیوالی یا کرسمس کے موقعہ پر اپنی عبادت گاہوں کو اسی طرح سجاتے ہیں، ساتھ ہی اسراف بھی ہے،

اس لیے آپ نے جو تدبیر لکھی ہے، اس کے بعد بھی جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم

مسجد کے تہہ خانہ میں کمرے بنا کر کرایہ پر دینا

سوال: ہم لوگ پرانی مسجد کو شہید کرکے نئے نام سے بنا رہے ہیں اور ہماری مسجد کی کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے، تو ہمارا ارادہ ہے کہ جماعت خانہ کے نیچے دو تین روم (کمرہ) بنا کر کے کرایہ سے دیں، تو کیا ہم جماعت خانہ کے نیچے یہ بنا سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس جگہ نیچے کمرہ بنا رہے ہیں، وہاں پہلے جماعت خانہ موجود تھا، تو اب نئی تعمیر میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اگر بنا لیا، تو اس کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔

أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع، ولو قال عنيت ذلك لم تصدق. تاتارخانية. فإذا كان هذا في الوقف، فكيف يغيره فيجب هدمه ولو على جدار المسجد، ولا يجوز أخذ الأجرة منه، ولا أن يجعل شيئا منه مستغلا، ولا سكنى. بزازية. (درمختار على هامش الشامي ۳/۴۰۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسجد کا حصہ اسکول میں دینا

سوال: ہمارے محلّہ کی مسجد کے شمالی جانب لگ بھگ دس بارہ ہاتھ جگہ خالی ہے، اور یہ جگہ مسجد ہی کی ہے، اس کے بعد روڈ لگ جاتا ہے، اور مسجد کے مشرقی جانب متصلاً نمازیوں کے لیے مسجد اور اسکول، اور پیشاب میں آنے جانے کا راستہ ہے، اور مسجد

کی جنوبی دیوار سے لگے ہوئے جنوب کی طرف مسجد کی دوسری عمارت ہے، جو فی الوقت اردو اسکول ہے، جس کا سرکار کرایہ دیتی ہے، یا دینے والی ہے، اس اسکول میں مسلمان عورت ٹیچر ہے، اور اسکول کے اندر آمد ورفت کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کسی بھی جانب، سوائے یہ ہے کہ مسجد کے سامنے ہی سے آمد ورفت کرے جس راستہ سے نمازی آمد ورفت کرتے ہیں، اور الحمد للہ مسجد میں جماعتیں بھی آتی جاتی ہیں، اور اسکول کے سامنے ہی سے پیشاب پاخانہ کی گذرگاہ ہے، جس سے کبھی کبھار عورتوں پر نظر پڑ جاتی ہے، اور فی الوقت نمازیوں کی زیادتی کی وجہ سے مسجد بھی ناکافی ہے، اور ساتھ ساتھ مسجد کی آمدنی اسکول کے کرایہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، تو اراکینِ مسجد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اسکول کو مسجد کے شمالی جانب جو جگہ خالی ہے اس جگہ لایا جائے، اور اسکول کا کچھ حصہ مسجد کے اندر آئیگا، یعنی مسجد کی شمالی دیوار توڑ کر تھوڑا سا جنوب کی طرف دیوار مسجد قائم کی جائے گی، اور مسجد کی جنوبی دیوار توڑ دی جائے گی؛ تاکہ اسکول کو مسجد بنالیا جائے، اور اسکول روڈ کے کنارے آجائے، اور بے پردگی سے بچ جائے، اور مسجد فی الوقت کافی ہوجائے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مندرجۂ ذیل مجبوریوں کے پیش نظر (نماز کے لیے مسجد ناکافی، مسلمان عورت ٹیچر کی بے پردگی) کیا مسجد کا کچھ حصہ اسکول میں اور اسکول کا کچھ حصہ مسجد میں دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو جگہ ایک مرتبہ شرعی مسجد بن گئی، وہ اب ہمیشہ تاقیامت مسجد ہی رہے گی، اس کو کسی دوسرے کام میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الإمام، والثاني أبدا إلى قيام الساعة، وبه يفتى حاوي القدسي. (درمختار على هامش الشامية ۳/ ٤٠٦)

اس لیے صورتِ مسئولہ میں مسجد کا کوئی بھی حصہ اسکول میں دینے کی ہرگز اجازت نہیں؛ البتہ اگر مسجد میں تنگی پڑتی ہے، تو اسکول کا کوئی حصہ نکال کر مسجد میں داخل کرنے کی اجازت ہے؛ بلکہ اگر وہ اسکول مسجد کی زمین میں ہے تو مسجد کی توسیع کر لی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ذوالحجۃ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسجد کا متولی معاوضہ لے سکتا ہے؟

سوال: ایک شخص مسجد کا متولی ہے وہ پرائیوٹ میں سروس بھی کرتا ہے، اور مسجد کا متولی بھی ہے، اس کو مسجد کی آمدنی میں سے معاوضہ لینا کیسا ہے؟ از روئے شرع جواب عنایت فرمائیں مدلل حوالہ کے ساتھ۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وقف کرنے والے نے وقف کی آمدنی میں سے کچھ مقرر کیا ہے تو متولی اتنی مقدار لے سکتا ہے، اور اگر وقف کرنے والے نے کچھ مقرر نہیں کیا؛ لیکن قاضی شرعی نے اس کے عمل پر اجرت مثل مقرر فرمائی ہے، تو وہ لے سکتا ہے، زائد مقرر فرمائی ہے تو زیادتی لینا درست نہیں، اور اگر اس کو قاضی شرعی نے متولی بنایا ہے، اور عرف میں ایسا کام معاوضہ لے کر کیا جاتا ہے تو اجرت مثل لے سکتا ہے؛ بشرطیکہ کام انجام دیتا ہو، ورنہ اس کے لیے

معاوضہ لینا جائز نہیں۔(تنقیح الفتاوي الحامدية ۱/۲۰۸)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ ذوالحجۃ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسجد میں چوری سے بجلی چلانے اور نماز پڑھنے کا حکم

سوال: مسجد کے اندر بجلی کا جلانا بغیر میٹر کے بغیر حکومت کی اجازت کے، کیسا ہے؟ اور اس مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور اب تک اس میں جو نماز پڑھی ہے، اور اس بجلی سے جو فائدہ اٹھایا اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب درج کریں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت کی اجازت اور میٹر کے بغیر بجلی کا استعمال گناہ ہے، اور سرقہ ہے، خصوصاً مسجد جو اللہ کا گھر ہے اس میں اس فعلِ بد کی قباحت مزید بڑھ جاتی ہے کہ: "إن اللّٰــــه طيب لا يقبل إلا الطيب" (مسلم شريف ۱/۳۲۶) جو حضرات اس حرکت کے مرتکب ہیں، ان کو سختی کے ساتھ اس سے باز رکھا جائے، اب تک جو بجلی اس طرح استعمال کی ہے، اس کا عوض حکومت کے اس محکمہ میں ادا کر دیا جائے، نماز جو پڑھی ہے وہ ادا ہو گئی، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

غیر مسلم کی رقم مسجد میں لینا

سوال: مسجد میں غیر مسلم کی رقم یا اور کوئی چیز استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر ان کے نزدیک یہ رقم وغیرہ مسجد میں دینا ثواب کا کام ہے تو درست ہے، ورنہ نہیں، پہلی صورت میں اگر کوئی خارجی امر مانع ہو، مثلاً: کسی فتنہ کا اندیشہ ہو یا وہ لوگ بعد میں ملکیت کا دعویٰ کریں یا مسلمانوں پر احسان رکھیں یا دباؤ ڈالیں، تو پھر براہِ راست روپیہ وغیرہ ان سے نہ لیا جائے، اگر وہ دینا چاہیں تو کسی مسلمان کی ملک کر دیں اور پھر وہ مسلمان مسجد میں دیدے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱/۴۷۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسجد کی بجلی کا استعمال کب تک کرے؟

سوال: مسجد میں اگر کوئی مسافر رات گزارا کرے تو سوتے وقت پنکھا استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ یا اور کوئی شخص کا تلاوت یا ذکر وغیرہ پڑھنے کے لیے رات کو بہت دیر تک لائٹ وغیرہ استعمال کرنا کیسا ہے؟ لائٹ وغیرہ استعمال کرنے کی کیا مقدار ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نماز کے لیے جب تک روشنی رہنے کا معمول ہے اس وقت تک اس روشنی میں قرآن شریف اور وظیفہ وغیرہ پڑھنا بلا شبہ درست ہے، اور اس کے بعد یعنی جب روشنی گل کردی جاتی ہو اس وقت لائٹ بل دینے والے کی اجازت سے روشنی کرنا، اور اس میں قرآن شریف وغیرہ پڑھنا درست ہے، بلا اجازت نہیں پڑھنا چاہئے۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۵/ ۲۳۸) البتہ اگر وہاں کا دستور اس کی اجازت دیتا ہو تو درست ہے، پنکھے کا بھی یہی حکم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۱۶/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

صحنِ مسجد میں گھومنا

سوال: مسجد کے صحن میں گھومنا ذکر کرتے ہوئے یا ایسے ہی تفریح کے لیے کیسا ہے؟ کیا مسجد میں یا مسجد کے صحن میں اس طرح گھومنا کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تفریح وچہل قدمی کے طور پر مسجد میں گھومنا درست نہیں ہے، احترام مسجد کے خلاف ہے، صحن اگر مسجد میں داخل ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے، ورنہ درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۵/ ۲۰۵، ۲۰۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مسجد کے لیے دی گئی زمین فروخت کرنا

سوال: (۱) ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی یا عطیہ دیا، متولیان مسجد اس زمین کو (ضرورۃً مثلاً تعمیر جدید کے لیے رقم فراہمی کے لیے) فروخت کرنا چاہتے ہیں، یا کسی کو بلا ثمن دینا چاہتے ہوں تو ان کے لیے فروخت کرنا یا بطور عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) نیز مدرسہ کو ایک دارالاساتذہ کی سخت ضرورت درپیش ہے، اور مذکورہ بالا زمین مدرسہ سے بالکل متصل واقع ہے، تو آیا مدرسہ اسے خرید کر وہاں اپنی عمارت تعمیر کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۳) نیز اگر واقف یا معطی بقید حیات ہے وہ ضرورت کے پیش نظر اپنے سابق

قول (یعنی وقف ہو یا عطیہ) سے رجوع کر کے مدرسہ کے لیے مذکورہ زمین کا وقف یا عطیہ یا بیع بالثمن کرے تو آیا وہ اس کا مجاز ہے یا نہیں؟ استفتاء کے تمام سوالات کا جواب وافی اور شافی عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) اگر مالک زمین نے وہ زمین مسجد کے لیے وقف کی ہے، تو متولیان مسجد کے لیے اس کو فروخت کرنا یا کسی کو بطور عطیہ دینا جائز نہیں ہے۔ فإذا تم ولزم لا يملك، ولا يملك، ولا يعار، ولا يرهن. (درمختار) (قوله لا يملك) أي لا يكون مملوكا لصاحبه، ولا يملك: أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه الخ. (شامی ۴۰۲/۳)

البتہ اگر وقف نہیں کی ہے؛ بلکہ بطور عطیہ مسجد کو دی ہے تو متولیان مسجد ضرورتِ مسجد کے لیے اس کو فروخت کرنا چاہیں تو فروخت کر سکتے ہیں، لیکن کسی کو بطورِ عطیہ نہیں دے سکتے۔ لأن تصرف القيم منوط بالمصلحة، وليس من المصلحة اعطاء ہ بلا عوض.

(۲) اگر وہ زمین مسجد کو عطیہ کے طور پر ملی ہے، اور متولیان مسجد ضرورت مسجد کے پیش نظر فروخت کر رہے ہیں تو مدرسہ اس زمین کو خرید سکتا ہے، اور اگر وقف ہے تو نہیں خرید سکتا۔

(۳) اگر وہ آدمی اس زمین کو مسجد کے لیے وقف کر چکا ہے، تو اب اس کو حق نہیں کہ وہ اس سے رجوع کر کے وہ زمین مدرسہ کے لیے وقف کرے؛ البتہ اگر وہ زمین مسجد کو بطور عطیہ دی ہے تو مسجد سے خرید کر مدرسہ کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ غفر لہ

کیا صحن مسجد کا حصہ ہے؟

سوال: جماعت خانہ اور صحنِ مسجد کا حکم یکساں ہے یا کچھ فرق ہے؟ ہمارے محلّہ کی مسجد اور دوسری چند مساجد میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ گرمیوں میں عصر، مغرب، عشاء کی نماز صحن میں ہوتی ہے جیسا کہ اس وقت تراویح مع نماز عشاء صحن میں ہورہی ہے، ایسی صورت میں جماعتِ ثانیہ کی کراہیت اور اعتکاف کی صحت و بطلان کا حکم کیا ہوگا؟ اگر حکم میں فرق ہے، تو پھر جماعت خانہ کی طرح صحن مسجد کے فروخت و ہبہ وغیرہ کا عدم جواز کیوں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صحن مسجد کا اطلاق دو معنوں پر کیا جاتا ہے: اول مسجد کے اس غیر مسقّف حصہ کو صحن کہتے ہیں جو مہیا للصلوٰۃ تو ہوتا ہے، یعنی: نماز و جماعت ادا کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے؛ لیکن بغیر چھت کے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوم اس حصہ کو بھی صحن کہہ دیتے ہیں جو موضع مہیا للصلوٰۃ کے مسقّف اور غیر مسقّف حصہ کے بعد خالی زمین یا فرش کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے؛ مگر وہ نماز و جماعت ادا کرنے کے لیے نہیں بنایا جاتا۔ پہلے معنی کے لحاظ سے صحن تو مسجد کا ہی ایک حصہ ہے، اور اس کے احکام مسجد کے احکام ہیں۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے صحن ایک علیحدہ چیز ہے، یعنی: اگرچہ وہ مسجد کے ساتھ وقف ہونے میں شامل ہے؛ مگر مسجد کے احکام اس کے لیے ثابت نہیں۔ (کفایت المفتی ۳/۱۵۶ بحذف یسیر) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسجد کی حفاظت میں لڑنا مرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک

مسجد ہے، اس پر غیر مسلم قبضہ کرنا چاہتے ہیں، مسلم اگر اس کی حفاظت کرنا چاہیں، تو ان کے کافی تعداد میں شہید ہو جانے کا یقین ہے، ایسی صورت میں مسجد کی حفاظت کی جائے، یا مسجد سے دست بردار ہو جائیں؟ زید کہتا ہے کہ ابن ماجہ میں حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کا خون کعبہ سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح فقہ کی کتابوں میں بھی بوقتِ ضرورت مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس لیے مذکورہ مسجد سے دست بردار ہونا مناسب ہے؟ زید کی بات شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس مسجد کی صیانت سب مسلمانوں پر فرض ہے؛ مگر لڑنا مرنا ہرگز درست نہیں ہے، حسب قاعدہ سرکاری طور سے سرکار کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ۳/۲۰)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

ایک مسجد کی رقم دوسری مسجد میں استعمال کرنا

سوال: کیا ایک مسجد کا پیسہ دوسری مسجد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ایک مسجد کی رقم دوسری مسجد میں استعمال نہیں کی جا سکتی؛ البتہ اگر کسی مسجد کی آمدنی اتنی زیادہ ہے جو اس کی ضروریات سے زائد ہے، اور آئندہ بھی اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے، تو اس صورت میں زائد رقم قریب کی مسجد میں استعمال کرنے کی گنجائش ہے،

صورتِ واقعہ تفصیل سے لکھ کر اس سلسلہ میں حکم دریافت کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسجد کا پانی امام اپنی ضروریات میں استعمال کرسکتا ہے؟

سوال: مسجد کا پانی امام اپنی ضروریات، مثلاً کپڑے وغیرہ دھونے، غسل کرنے کے لیے استعمال کرسکتا ہے؟ یاد رہے کہ یہ پانی گاؤں کی واٹر ورکس سے آتا ہے، اور اس کا پیسہ بھی مسجد کے مال میں سے دیا جاتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر امام کی رہائش احاطۂ مسجد کے اس کمرہ میں ہے جو اس کے لیے بنایا گیا ہے، تو وہ پانی کا استعمال غسل وغیرہ کے لیے کرسکتا ہے۔ (کفایت المفتی ۶/ ۲۴۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

مسجد کے پترے بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں لگانا

سوال: ہمارے گاؤں میں قدیم زمانہ کی مسجد تھی، کچی اینٹ کی بنی ہوئی، زیادہ بارش ہونے کے کارن (وجہ) شہید ہوگئی، بصورت مسجد کی کچی دیوار تھی، اوپر چھاپرا تھا، چھاپرے کے اوپر پترے تھے، ہم نے دوبارہ مسجد بنانا شروع کیا پتھر کی، یعنی پکی، خرچ کے قلت کے کارن ہم نے پترے کچھ بیچ ڈالے، قیمت ان کی مسجد کے کام میں صرف کی، مسجد بڑی تھی، پترے چھوٹے تھے، اوپر آ نہیں سکے، اس کارن سے ہم نے بیچے، جس جائے پہلے مسجد تھی، اسی جائے بنانا شروع کی، اس پترے کی قیمت مسجد میں لگانا جائز یا ناجائز؟ جناب محترم یہ مسئلہ صحیح کر کے لکھ کے بھیجنا کوئی علماءِ کرام بولتے ہیں کہ مسجد کی کوئی چیز بیچنا منع ہے، ہم نے تو مسجد بنائی ہے، یہ مسئلہ کتابوں کا حوالہ دے کر لکھ کر بھیجنا،

ہمارے یہاں اعتراض چلتا ہے مسئلہ کا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہ پتھرے دوبارہ اس مسجد میں لگائے نہیں جاسکتے تھے، اس لیے ان کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں لگائی تو جائز ہے۔

فعلی هذا يباع النقض في موضعين عند تعذر عوده، وعند خوف هلاكه. (شامی ۴۱۹/۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ ربیع الآخر ۱۴۰۸ھ

بالائی حصہ میں مسجد، نیچے مکان، دوکان وغیرہ

سوال: ایک شخص کا مکان ایک مسجد کے نیچے کے حصہ میں ہے، اس کے مکان کے لوازمات، مثلاً حمام، بیت الخلاء اور دیگر ضروریات بھی اسی جگہ پورے ہوتے ہیں، بعض علماء کا کہنا ہے کہ اوپر کے حصہ کے مسجد ہونے سے نیچے کا حصہ خود بخود مسجد میں شامل ہو جاتا ہے، اور اس بناء پر اس شخص کا اس جگہ پر قیام جائز نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا ان علماء کرام کا یہ کہنا درست ہے؟ پھر یہ بات بھی قابلِ توجہ رہے کہ اگر بنانے والوں نے اس تحتانی حصہ کو بھی مسجد ہونے کی نیت کی ہو تو کیا حکم ہے؟ اور اگر نیت نہ کی ہو تو کیا خود بخود مسجد میں شامل ہو جائے گا؟ اور اگر بنانے والوں کی نیت کا علم نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ کیا "من العرش الی تحت الثری" مسجد ہو جائے گا؟ درخواست ہے کہ مسئلہ کو مع التحقیق والتفصیل اور کتب کے حوالوں کے ساتھ نیز عبارتوں کے ساتھ تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مسجد کے اوپر آسمان تک اور نیچے زمین کی انتہاء تک سب کا سب قیامت تک کے لیے مسجد ہے۔

درمختار میں ہے: وکره تحريما الوطء فوقه والبول والتغوط؛ لأنه مسجد الى عنان السماء. (درمختار)

علامہ شامیؒ اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (قوله الى عنان السماء) بفتح العين، وكذا الى تحت الثرىٰ كما فى البيرى عن الاسبيجابى. (شامی ۱/۴۸۵)

اس کے (تحتانی یا فوقانی) کسی حصہ کو کرایہ پر دے کر ذریعۂ آمدنی بنانا یا سامان بھرنے کے لیے استعمال کرنا یا رہائش کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔

ولايجوز اخذ الاجرة منه، ولا ان يجعل شيئا منه مستغلا ولا سكنىٰ بزازية. (درمختار) (قوله ولا ان يجعل الخ) هذا ابتداء عبارة البزازية والمراد بالمستغل أن يوجر منه شئ لأجل عمارته وبالسكنىٰ محلها وعبارة البزازية على مافى البحر، ولا مسكناً، وقد رد فى الفتح مابحثه فى الخلاصة من انه لو احتاج المسجد الى نفقة توجر قطعة منه بقدر ماينفق عليه، بانه غير صحيح، قلت: وبهذا علم ايضا حرمة احداث الخلوات فى المساجد كالتى فى رواق المسجد الاموى، ولا سيما مايترتب على ذلك من تقذير المسجد بسبب الطبخ والغسل ونحوه ورأيت تاليفا مستقلا فى المنع من ذلك. (شامی ۳/۴۰۶)

البتہ اگر کوئی مسجد (ابتداء ہی سے) اس طرح بنائی جائے کہ نیچے دکانیں یا تہ خانہ وغیرہ بنا کر ان کی چھت پر مسجد کا صحن یا مسجد کی کوئی عمارت ہے، تو یہ اس شرط پر جائز ہے کہ

نیچے کی دکانیں مسجد کی طرح وقف ہوں، اور ان کی آمدنی مسجد کے مصالح میں صرف ہوں، اور اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ مسجد کی چھت پر کوئی مکان بغرض مصالح مسجد بنا دیا جائے، ان دونوں صورتوں میں اس مسجد کی مسجدیت میں کوئی خلل نہ آئے گا؛ چنانچہ فتاویٰ شامی میں بحوالۂ اسعاف نقل کیا ہے: وبه صرح في الاسعاف، فقال: واذا كان السرداب او العلو لمصالح المسجد، أو كان وقفا عليه صار مسجداً. یعنی اگر مسجد کے نیچے کا تہ خانہ یا اوپر کا بالا خانہ مسجد ہی کے سامان وغیرہ رکھنے کے لیے ہو یا مسجد پر وقف ہو، یعنی اس کی آمدنی مسجد میں صرف ہوتی ہو تو یہ مسجد ہو جائے گی، اس صورت میں نیچے کی دکانیں اور اوپر کا مکان وغیرہ مسجد میں داخل نہ ہوگا، اور اسی بناء پر ان کا کرایہ پر دینا، ان میں تجارت کرنا، غسل کی حاجت والے آدمی اور حیض ونفاس والی عورت کا ان میں داخل ہونا وغیرہ سب جائز ہوگا؛ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ صورت صرف اسی وقت ہوسکتی ہے کہ مسجد بنانے کے وقت اول ہی بنانے والے نے اوپر کے مکان یا نیچے کے تہ خانہ یا دکان وغیرہ کو مسجد سے علیحدہ کر کے کرایہ پر دینے، اور اس کو مسجد پر وقف کرنے کی نیت کر لی ہو، ورنہ اگر اول مسجد بنا دی گئی پھر بعد میں اس کے نیچے کوئی دکان یا اوپر کرایہ کے لیے مکان بنانا، ہرگز جائز نہیں؛ کیونکہ مسجد کے اوپر آسمان تک اور نیچے زمین کی انتہاء تک سب کا سب قیامت تک کے لیے مسجد ہے، اس میں کسی جزء کو اب مسجد سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ (منية الساجد فی آداب المساجد للمفتی محمد شفیعؒ ص/۲۳)

چنانچہ درمختار میں ہے: واذا جعل تحته سردابا لمصالحه، أي المسجد جاز، كمسجد القدس، ولو جعل لغيرها أو جعل فوقه بيتا، وجعل باب

المسجد إلى طريق، وعزله عن ملكه لا يكون مسجدا، وله بيعه ويورث عنه خلافاً لهما، كما لو جعل وسط داره مسجدا واذن للصلوٰة فيه حيث لا يكون مسجدا؛ إلا اذا شرط الطريق زيلعي. (درمختار)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله أو جعل فوقه بيتا الخ) ظاهره أنه لا فرق بين ان يكون البيت للمسجد، أو لا الا انه يوخذ من التعليل ان محل عدم كونه مسجدا فيما اذا لم يكن وقفا على مصالح المسجد، وبه صرح فى الاسعاف فقال: واذا كان السرداب او العلو لمصالح المسجد او كانا وقفاعليه صار مسجدا، اه. شرنبلالية. قال فى البحر: حاصله ان شرط كونه مسجدا ان يكون سفله وعلوه مسجدا لينقطع حق العبد عنه لقوله تعالىٰ ﴿وان المساجد لله﴾ بخلاف ما إذا كان السرداب والعلو موقوفا لمصالح المسجد، فهو كسرداب بيت المقدس، هذا هو ظاهر الرواية، وهناك روايات ضعيفة مذكورة فى الهداية. اه. (شامی ۳/۴۰۶)

اسی طرح اگر امام کے لیے مسجد کے اوپر یا نیچے مکان بنادیا گیا، تو اگر ابتدا ہی سے ایسا کیا تو درست ہے ورنہ نہیں۔

درمختار میں ہے: لوبنى فوقه بيتا للامام لا يضر؛ لانه من المصالح، اما لوتمت المسجدية، ثم اراد البناء منع، ولوقال عنيت ذلك لم يصدق. تاتارخانية. فاذا كان هذا فى الواقف، فكيف بغيره فيجب هدمه ولو على جدار المسجد. (درمختار)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قولہ اما لوتمت المسجدیة) ای بالقول علی المفتی بہ، أو بالصلوٰة فیه علی قولهما.ط. وعبارة التاتارخانیة: وان کان حین بناه خلی بینه وبین الناس ثم جاء بعد ذلك بینی لایترك.اھ. (شامی ٤٠٦/٣)

اور یہ بھی یاد رہے کہ اگر یہ مکان مسجد کی آمدنی یا امام مسجد کی رہائش کے لیے بنایا گیا ہے، تو بہ شرائطِ بالا اس لیے جائز ہے کہ وہ مصالح مسجد کے لیے وقف ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی صورت نہیں؛ بلکہ واقف نے اپنی رہائش کے لیے اس کو رکھا ہے، یا مصالح مسجد کے علاوہ اور کسی مقصد کے لیے رکھا ہے، تو اس صورت میں وہ مسجد شرعی نہیں کہلائیگی، جیسا کہ منقولہ بالا عبارت (خطِ کشیدہ) سے ظاہر ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں وہ مکان مسجد کی مصالح کے لیے وقف ہے، اور وہ شخص جو اس میں سکونت پذیر ہے، وہ امام مسجد ہے یا اجنبی آدمی ہے؛ لیکن کرایہ ادا کرتا ہے اور وہ کرایہ مسجد پر خرچ ہوتا ہے، اور ساتھ ہی مسجد کی ابتدائے بناء سے واقف نے اس مکان کے لیے یہ نیت کی تھی، تب تو اس کا اس میں رہنا درست ہے ورنہ نہیں، اور اگر واقف کی نیت کا علم نہ ہو تو احتیاطاً اس میں سکونت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ١٥/ جمادی الاولیٰ ١٤٠٨ھ

مسجد کی زمین میں مدرسہ بنانا، واجب التملیک رقوم خاص مد کی رقوم اور رقومِ ہدیہ کا مصرف

سوال: دیہات (گوٹا) کے مسلمانوں کے پاس ایک زمین تقریباً آدھا ایکڑ مسجد کے لیے تھی، وہاں کے مسلمانوں کی جماعت نے باہم اتفاق رائے سے معتبر

صاحبان کی ایک ٹرسٹ کمیٹی قائم کی، اب اس کمیٹی کی نگرانی میں بنام ''جامعہ عربیہ ابراہیمیہ دارالعلوم'' کا کام شروع ہوگا۔

اب اس ریز روز مین کو کمپاونڈ کرنا، پانی کے لیے بورنگ مارنا، حوض کی تعمیر، تعلیم وتعلم، درس وتدریس کے لیے جدا جدا کمرے، فرنیچر، اساتذۂ کرام کے لیے قیام گاہیں، ویتیم ونادار طلباؤں کے لیے قیام وطعام کا انتظام، ادارہ سے منسلک ومتعلق خادموں کے لیے قیام گاہیں، اسی احاطہ کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد۔

(الف) مندرجۂ بالا کام پورا کرنے کے لیے صدقہ، فطرہ، خیرات، زکوٰۃ، ہدیہ، عطیہ، تحفہ، چرمِ قربانی وغیرہ مدات سے وصول ہونے والی رقومات خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

(ب) اساتذۂ کرام ودیگر خادموں کی تنخواہیں، یتیم ونادار طلباؤں کا خرچ مندرجۂ بالا صورت سے وصول شدہ رقومات سے دے سکتے ہیں یا نہیں؟

طالب علموں سے کوئی فیس لی نہیں جاتی؛ البتہ دینی تعلیم کی ضرورت محسوس کرنے والے چند حضرات نے ہر ماہ حتی المقدور امداد کرنے کا اظہار کیا ہے؛ لیکن امداد کرنے والوں کی تعداد قلیل ہے، ماہانہ وصولی کم اور خرچ زیادہ، برائے کرم آسان زبان میں مفصل جواب دیں تاکہ بآسانی سمجھ میں آجائے اور ادارہ صحیح، درست اور جائز طریقہ سے قائم ہو، عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

زمین کے متعلق سوال میں یہ تو لکھا گیا کہ وہ ''مسجد کے لیے تھی''، لیکن اس کی

تصریح نہیں کی گئی کہ مسجد کے لیے کیسے ہوئی؟ یعنی مسجد کی کسی ضرورت کے لیے ان لوگوں نے خریدا تھا، یا اس کی آمدنی مسجد میں خرچ کی جائے اس مقصد کے لیے اصل مالک نے مسجد کے لیے وقف کیا تھا، اگر دوسری صورت ہے تو اب اس میں مدرسہ بنانا درست نہیں؛ بلکہ واقف نے جس مقصد کے لیے وقف کیا ہے اسی کے مطابق اس کا نظم ونسق ضروری ہے۔

فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع. (شامی ۳۹۵/۳) شرط الواقف كنص الشارع. (درمختار علی هامش الشامی ۴۵۶/۳)

اور اگر مسجد کی ضرورت کے لیے خریدا گیا تھا، اور اب مسجد کو ضرورت نہیں رہی، تو اگر مسجد کی رقم سے خریدا گیا تھا تو اس کی قیمت مسجد کے حساب میں داخل کرنا ضروری ہے۔

اشترى المتولى بمال الوقف دارا للوقف، لا تلحق بالمنازل الموقوفة، ويجوز بيعها فى الاصح. (درمختار) قال العلامة الشاميؒ قلت: وفى التاتر خانية والمختار انه يجوز بيعها ان احتاجوا اليه. (شامی ۴۴۵/۳)

زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ وچرمِ قربانی وصدقۃ الفطر اور اس جیسی واجب التملیک رقومات کو "صرف ان ضروریات پر خرچ کیا جائے جن کا تعلق فقراء وطلباء سے ہے، مثلاً ان کا طعام ولباس، دواء وعلاج، ان کی رہائشی ضرورتیں، ان کے لیے کتابوں کی خریداری وغیرہ" (فتاویٰ دارالعلوم مطبوعہ کراچی ۱۰۸۶/۲)

اور جو رقوم دینے والے کی طرف سے کوئی خاص مدمتعین کرکے دی جائیں، مثلاً کمرہ کی تعمیر، یا استاذ کی تنخواہ یا کوئی خاص فرنیچر خریدنے کے لیے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کو "دینے والے کی ہدایت اور منشاء کے مطابق خرچ کرنا لازم ہے" (نظام الفتاویٰ ۹۴/۱)

اور جو رقوم عطیہ یا ہدیہ وتحفہ کے طور پر ملیں ان کو کمیٹی نے جو ضابطہ اس کے خرچ کا حدودِ شرع میں رہتے ہوئے مقرر فرمایا ہے، اس کے مطابق خرچ کرے۔ (نظام الفتاویٰ ۱/۹۶)

یہ رقمیں تعمیری کاموں میں، فرنیچر کی خریداری میں، مدرسین وخدام کی تنخواہوں میں، طلبہ کی ضروریات میں؛ الغرض مدرسہ کی تمام ضروریات (جو کمیٹی نے حدودِ شرع میں متعین فرمائی ہیں ان) میں خرچ کر سکتے ہیں، نمبر اول کی رقومات (جو واجب التملیک ہیں ان) کو بغیر تملیکِ شرعی کے تعمیری کاموں اور مدرسین وخدام کی تنخواہوں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۸/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

مسجد کا سامان ذاتی کام میں استعمال کرنا

سوال: اگر میں نے مسجد میں سے کچھ سامان یا روپیہ وغیرہ اپنے خرچ کرنے کے لیے لایا، یعنی سامان استعمال کرنے کے لیے لایا اور پھر کام ہونے کے بعد واپس رکھ دیا تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مسجد کا سامان یا روپیہ ذاتی کام میں استعمال کرنا ناجائز ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۵/۱۲۵ مکتبۃ الاحسان دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

احاطۂ مسجد کے مختلف حصوں کے نام، مسجد کی حدود کو ممتاز کرنے کا حق کس کو ہے؟

سوال: (۱) مسجد کسے کہتے ہیں؟ احاطۂ مسجد کے مختلف حصوں کو الگ الگ ناموں

سے موسوم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ مثلاً جماعت خانہ، صحن مسجد، متعلقاتِ مسجد، مسجد شرعی، داخل مسجد، خارج مسجد وغیرہ۔ اگر کیا جا سکتا ہے تو احکام مسجد کے پیش نظر داخل مسجد کی حدود کو متعین کرنا، وہاں کوئی علامت، اسٹیکر، کالی یا ہری پٹی کے ذریعہ نشان دہی کرنا کیسا ہے؟

(۲) مساجد میں صحن اور فناء بھی ہوتا ہے؟ صحن اور فناء کسے کہیں گے؟ اور دونوں ایک ہی ہیں یا علاحدہ علاحدہ؟ دونوں کا حکم کیا ہے؟ اور کبھی کسی حالت میں یہ مسجد سے خارج ہوتے ہیں یا نہیں؟

(۳) احاطۂ مسجد میں شامل تمام حصوں کے ممتاز کرنے کی ذمہ داری یا اختیار کس کو ہے؟ واقف مسجد یا بانیٔ مسجد کو یا متولیان مسجد کو؟ بانی وواقف کے انتقال کے بعد متولیان مسجد حدود متعین کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۴) مسجد کے نام پر وصول کیا گیا چندہ متعلقات مسجد پر خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) مسجد میں داخل ہونے کی دعا اور اعتکاف کی نیت کہاں سے کی جائے گی؟

(۶) ہمارے شہر مالیگاؤں کے چند علماء بشمول مفتیان کرام شہر کی تمام مساجد کا سروے کر کے مساجد کی حدود کو ممتاز کرنے کا کام کرنا چاہ رہے ہیں؛ تاکہ معتکفین کو لاحق پریشانی کا خاتمہ ہو اور دیگر احکام مسجد کی بجا آوری اور مسجد کی حرمت کا لحاظ ہو سکے، ان کا یہ اقدام کہاں تک درست ہے؟ ضروری ہے یا نہیں؟ اور یہ کام واقفین مسجد و بانیین مسجد کی عدم موجودگی کی صورت میں موجودہ ٹرسٹیان وانتظامیہ سے گفت وشنید کر کے کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہ تحریر

فرماتے ہیں: ''مسجد ایسی جگہ، ایسی زمین اور ایسے مکان کا نام ہے، جس کو کسی مسلمان نے اللہ تعالیٰ کی خاص عبادت، فرض نماز ادا کرنے کے لیے وقف کر دیا ہو، اس پر عمارت اور تعمیر، درو دیوار اور چھت یا چھپر کا ہونا شرط نہیں، مذہب حنفی کی معروف ومعتبر مستند کتاب ''طحطاوی، شرح درمختار'' میں ہے۔ واعلم انه لايشترط فى تحقق كونه مسجداً البناء. یعنی جان لو کہ مسجد کے تحقق (مسجد قرار دئے جانے) کے لیے بناء (تعمیر) ہونا شرط نہیں۔ (طحطاوی ۲/ ۵۳۶) (قاضیخان ۴/ ۷۱۲)

جگہ زیادہ ہو تو مسجد کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک عمارت والا، دوسرا خالی، عمارت والی جگہ میں موسم باراں وسرما میں نماز پڑھی جاتی ہے، جس کو مسجد شتوی اور جماعت خانہ سے تعبیر کرتے ہیں، بلا عمارت کی جگہ میں موسم گرما میں نماز پڑھی جاتی ہے، جسکو مسجد صیفی اور صحن مسجد سے تعبیر کرتے ہیں، جس طرح بارش اور سردی کے موسم میں جماعت خانہ میں نماز باجماعت ہوتی ہے، اسی طرح گرمی میں صحن مسجد میں نماز باجماعت پڑھی جاتی ہے، یہ دونوں حصے مسجد میں شامل ہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور ومعتبر اور مستند کتاب شامی میں ہے: وان كان للمسجد موضعان مسجد شتوى، أومسجد صيفى (۱/ ۶۷۱)

اس عبارت میں گرمی وسردی دونوں موسم کی مسجد کا ذکر ہے، اور دونوں کو مسجد ہی کہا گیا ہے۔ (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۵۸)

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: مسجد کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک تو وہ حصہ جو مہیا للصلوۃ یعنی ادائے نماز وعبادت کی غرض سے بنایا جاتا یا معین کیا جاتا ہے، دوسرا وہ حصہ جو پہلے

حصہ (مہیا للصلوۃ) سے خارج؛ مگر احاطۂ مسجد یا فناء مسجد میں شامل ہوتا ہے، ان دونوں حصوں کے احکام جدا جدا ہیں، پہلے حصہ میں ناپاک (جنابت والے انسان اور حیض ونفاس والی عورت) کا داخل ہونا حرام ہے، اوراس میں نماز پڑھنے والے کومسجد کا ثواب ملتا ہے، اس میں بیع وشراء ناجائز ہے، معتکف کواس حصہ کے اندر رہنا لازم ہے، یہ حصہ اوپر آسمان تک اور نیچے تحت الثری تک مسجد کا حکم رکھتا ہے، دوسرے حصے میں جومہیا للصلوۃ سے خارج ہے، ناپاک آدمی داخل ہوسکتا ہے، اس میں نماز پڑھنے والے کومسجد کا ثواب نہیں ملتا، اس میں بیع وشراء حرام نہیں ہے، معتکف اس حصہ میں بغیرعذر شرعی چلا جائے، تو اعتکاف فاسد ہوجاتا ہے، اوراس کا یہ حکم نہیں کہ اوپر آسمان تک اور نیچے تحت الثری تک مسجد کے احکام جاری کئے جائیں۔ (کفایت المفتی ۳/۱۵۵)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: کسی جگہ کے مسجد ہونے کے لیے یہ باتیں ضروری ہیں: (۱) واقف نے (جو صحیح طور پرزمین کا مالک تھا اور وقف کرنے کا اختیار شرعی رکھتا تھا) اس کومسجدیت کے لیے وقف کیا ہو، خواہ وہ زمین خالی عن العمارۃ ہو یا عمارت بھی ہو۔ (۲) اس کواپنی ملک سے ایسی طرح پرعلاحدہ کردیا ہوکہ کسی دوسرے شخص کا یا خود واقف کا کوئی حق متعلق نہ رہے۔ (۳) وقف کرکے اس کومتولی کے سپرد کردیا ہو یا واقف کی اجازت سے اس میں ایک مرتبہ بھی نماز باجماعت ہوگئی ہو۔

جس زمین یا عمارت میں یہ باتیں متحقق ہوجائیں وہ مسجد ہوجائے گی، ان میں سے پہلی بات یعنی مسجدیت کے لیے وقف کرنا واقف کی نیت سے متعلق ہے، اگر نیت کی تصریح موجود ہوتب تو کوئی اشکال ہی نہیں؛ لیکن اگر تصریح نہ ہوتو پھر قرائن سے اس کی

نوعیت متعین کی جاسکتی ہے۔(کفایت المفتی ۳/ ۱۶۹)

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت نبی اکرم ﷺ کے مبارک وقت میں مسجد میں نالی، لوٹا، حوض، کنواں، نل، پانی، غسل خانہ، کھڑکی، پنکھا، بجلی وغیرہ کسی چیز کا انتظام نہیں تھا، مسجد کی چھت بھی ایسی تھی کہ دھوپ بھی بارش بھی اس میں کو آتی تھی، غرض بہت سادہ جگہ تھی، اس پر دری اور چٹائی بھی نہیں تھی، یہ سب چیزیں آہستہ آہستہ مسجد سے متعلق کی جاتی رہی ہیں؛ حتی کہ بعض علاقوں میں مہمان خانہ بھی مسجد سے متعلق ہوتا ہے، وہاں بسترے رہتے ہیں، امام اور مؤذن کے رہنے کے لیے کمرہ بھی ہوتا ہے، بعض جگہ مدرسہ بھی ہوتا ہے، جس میں بچے تعلیم پاتے ہیں، بعض جگہ پیشاب خانہ اور بیت الخلاء بھی نمازیوں کی سہولت کے لیے ہوتا ہے، خاص کر بڑے شہروں میں جہاں بکثرت باہر کے آدمی زیادہ آتے ہوں، اگر ضرورت رفع کرنے کی جگہ وہاں نہ ہو تو ان کو بڑی دشواری ہوتی ہے، اگر باہر کے آدمی زیادہ نہ آتے ہوں؛ بلکہ عامۃً مقامی آدمی نماز پڑھتے ہوں، جن کو اللہ نے گھر دیا ہے، اور وہاں سب ضرورت کی چیزیں موجود ہیں، تو پھر محض شان وشوکت دکھانے کے لیے ایسی چیزیں مسجد سے متعلق جگہ میں نہ بنائی جائیں۔'' (فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۴/ ۵۴۱-۵۴۲)

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''صحن مسجد کا اطلاق دو معنوں پر کیا جاتا ہے: اول مسجد کے اس غیر مسقّف حصہ کو صحن کہتے ہیں جو مہیا للصلوۃ تو ہوتا ہے، یعنی نماز و جماعت ادا کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے؛ لیکن بغیر چھت کے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوم اس حصہ کو بھی صحن کہہ دیا جاتا ہے، جو موضع مہیا

للصلوۃ کے مسقّف اور غیر مسقّف حصہ کے بعد خالی زمین یا فرش کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے؛ مگر وہ نماز و جماعت ادا کرنے کے لیے نہیں بنایا جاتا۔

پہلے معنی کے لحاظ سے تو صحن مسجد کا ہی ایک حصہ ہے، اور اس کے احکام مسجد کے احکام ہیں، اس میں حوض اور نالی وغیرہ بنانا جائز نہیں ؛ کیونکہ جو جگہ ایک مرتبہ مسجد ہو جائے اور اس کو نماز کے لیے مخصوص کر دیا جائے ، پھر اس کو کسی دوسرے کام میں نہیں لا سکتے ، اور دوسرے معنی کے لحاظ سے صحن ایک علاحدہ چیز ہے، یعنی اگر چہ وہ مسجد کے ساتھ وقف ہونے میں شامل ہے؛ مگر مسجد کے احکام اس کے لیے ثابت نہیں، اس میں جوتیاں پہن کر جانا، جنابت کی حالت میں گزرنا جائز ہے، مسجد کی توسیع کی ضرورت سے اس کو مسجد میں شامل کر لینا یا اس میں حوض اور وضو کی نالی بنالینا جائز ہے، اگر وہ مسجد میں ایک مرتبہ شامل کرلیا جائے گا، تو پھر وہ مسجد کے حکم میں ہو جائے گا، اسی صحن بالمعنی الثانی کے کسی ایسے گوشے میں جو نفس مسجد سے دور ہو، پائخانہ بنالینا بھی جائز ہے؛ بشرطیکہ اس کی بدبو مسجد تک نہ پہنچے، مسجد کو منہدم کر کے صحن بنا لینا بالمعنی الاول جائز ہے، اور مسجد کو صحن بالمعنی الثانی بنانا ناجائز ہے۔ (۳/۱۵۶-۱۵۷)

اکابر کی کتب فتاوی سے نقل کیے گئے اقتباسات بالا سے معلوم ہوا کہ احاطۂ مسجد کے مختلف حصوں کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاسکتا ہے، چونکہ بعض احکام کے اعتبار سے ان کے مختلف حصوں میں فرق کیا جاتا ہے، اس لیے ایسا کرنا ضروری ہے اور ایک حصہ کو دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے کسی علامت کے ذریعہ نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

(۲) جواب نمبر (۱) کے اخیر میں کفایت المفتی سے اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے،

اس میں اس کا جواب آ چکا۔

(۳) کوئی آدمی اگر تعمیر مسجد کے لیے اپنا قطعۂ زمین وقف کر کے اپنی ذاتی رقم سے مسجد تعمیر کر رہا ہے، تب تو ان تمام حصوں کی تعیین اور تمیز کا اختیار اسی کو ہے، اور اگر کسی نے مسجد کے لیے قطعۂ زمین وقف کر کے تعمیر مسجد کا کام متولیان مسجد کے حوالہ کر دیا کہ وہ اپنی صواب دید سے جس طرح چاہیں مسجد تعمیر کریں، اس صورت میں یہ اختیار ان کو حاصل ہوگا۔

رہی بات بانی وواقف کے انتقال کے بعد متولیان مسجد کا حدود کو متعین کرنا، تو چونکہ ایک جگہ جب ایک مرتبہ شرعی مسجد بن چکی تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس کو مسجدیت سے خارج کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، اس لیے بانی وواقف کے انتقال کے بعد متولیان مسجد کو یہ اختیار تو نہیں کہ بانی وواقف نے احاطۂ مسجد کے جس حصہ کو مسجد شرعی قرار دیا ہے اس میں کوئی تغیر وتبدل کرسکیں؛ البتہ احاطۂ مسجد کے دیگر حصے جن کا تعلق مصالح مسجد سے ہے، ان میں زمانہ اور نمازیوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے تغیر وتبدل کریں اس کا ان کو اختیار رہے، مثلاً: ایک مدت کے بعد نمازیوں کی کثرت کے پیش نظر مسجد میں توسیع کی ضرورت محسوس کی گئی، اس صورت میں اگر متولیان مسجد احاطۂ مسجد کا وہ حصہ جہاں بانی وواقف نے وضوخانہ یا طہارت خانہ بنوایا تھا، ان کو ختم کر کے مسجد شرعی میں شامل کرلیں، یا اسی طرح کا کوئی تصرف کرنے کا متولیان مسجد کو اختیار رہے۔

(۴) اگر چندہ دینے والوں کا اذن صراحۃً یا دلالۃً موجود ہے تو جائز ہے، ورنہ ناجائز۔ (احسن الفتاویٰ ۶/۴۵۴) آج کل جیسا کہ دستور ہے کہ مسجد کے لیے جس وقت چندہ کی اپیل کی جاتی ہے اس وقت مسجد کا پورا نقشہ کہ اس میں کیا کیا چیزیں بنائی جائیں گی، لوگوں

کو بتلایا جاتا ہے، اگر ایسا کیا گیا ہے، تو نقشہ میں جن جن چیزوں کے بنانے کا تذکرہ ہے اس چندہ سے وہ بنائی جاسکتی ہیں۔

(۵) احاطۂ مسجد میں جو حصہ مسجد شرعی کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے، اس میں داخل ہوتے وقت دعا پڑھی جائے، اور اعتکاف کی نیت کی جائے۔

(۶) جیسا کہ اوپر کے جوابات سے معلوم ہوا کہ احاطۂ مسجد میں واقع مختلف حصوں کے احکام الگ الگ ہیں، اور ان احکام شرعیہ کا لحاظ اور اس کی رعایت اسی وقت ممکن ہے، جب کہ یہ سب حصے الگ الگ طور پر ممتاز کر دئے جائیں، اس لیے ان حضرات علماء اور مفتیان کرام کا یہ ارادہ قابل تحسین ہے؛ البتہ اس کے لیے موجود ٹرسٹیان اور انتظامیہ سے گفت وشنید کر کے ان کو اعتماد میں لینا ضروری ہے؛ تا کہ کوئی فتنہ نہ ہو؛ نیز اس کام کی انجام دہی میں احکام شرعیہ کو پوری احتیاط کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے، خصوصاً واقفین مسجد اور بانیین مسجد کی عدم موجودگی میں کوئی ایسا حصہ جس کے مسجد شرعی کا جز ہونے کے قرائن موجود ہوں یا امکان ہو، اس کو خارج مسجد قرار نہ دیا جائے۔ وعلی هذا القياس.

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح عباس داؤد بسم اللہ

الجواب صحیح عبد القیوم راجکوٹی

سوسائٹی کی زمین پر مسجد کا بور اور اس کا پانی مسجد اور سوسائٹی میں استعمال کرنا

سوال: ہماری پاکیزہ سوسائٹی میں انسٹھ (۵۹) فلیٹ ہیں، سب اونر (onar)

ہیں، اور سوسائٹی میں ۱۵، ۲۰ گھر شیعہ حضرات کے ہیں، اور کچھ گھر محبین حضرات کے ہیں، باقی گھر دیو بندی حضرات کے ہیں، سوسائٹی سے لگ کر کچھ جھونپڑے خرید کر دیو بند کے مسلک کی مسجد بنائی، جس کا نام پاکیزہ مسجد ہے، سوسائٹی کی کمیٹی الگ ہے اور مسجد کا ٹرسٹ الگ ہے، سوسائٹی اور مسجد دونوں کو ایک دوسرے سے کچھ لینا دینا نہیں ہے؛ کیونکہ مسجد دیو بندی مسلک کی ہے، اور سوسائٹی کا چیئر مین شیعہ ہے، اور سکریٹری سنی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، کئی سال تک مسجد میں پانی ہماری سوسائٹی سے دیا گیا ہے؛ لیکن اس کی اجازت سوسائٹی کے ممبروں سے نہیں لی ہے، تین سال پہلے ایک ممبر نے سکریٹری سے مل کر کہا کہ میرے والد کے نام سے پانی کا ایک بور کرنا ہے اور وہ بور سوسائٹی کی زمین پر ہے، تو کیا اس جگہ پر بور ہوسکتا ہے؟ اور کوئی اجازت نہیں، کوئی خلاصہ نہیں سوسائٹی والوں سے، اور اس بور کا پانی مسجد میں استعمال ہوتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کی پانی کی لائن پاس ہوئی ہے اور اس کا پانی مسجد میں پینے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور کچھ پانی سوسائٹی میں دیا جاتا ہے، مسجد کا پانی سوسائٹی میں دینا جائز ہے؟ اور بور کے پانی کا لائٹ بل سوسائٹی بھر رہی ہے اور چیئر مین جو شیعہ ہے، سکریٹری سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ اس کا لائٹ بل سوسائٹی کیوں بھرے؟ لیکن سکریٹری صاحب سنتے ہی نہیں ہیں، اور سوسائٹی میں رہنے والے مختلف حضرات ناراض ہیں، سکریٹری صاحب اور جس ممبر نے بور کروایا ہے وہ دونوں مسجد کے ٹرسٹی بھی ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم مسجد کی پانی کی لائن کا جو پانی سوسائٹی کو دے رہے ہیں اس کے عوض بورنگ کا پانی ہم مسجد میں استعمال کر رہے ہیں، کیا ان کا یہ حیلہ درست ہے یا نہیں؟

(۱) پاکیزہ سوسائٹی میں اس کے ممبروں کی اجازت کے بغیر مسجد کے پانی کا بور کیا گیا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

(۲) اس بور کے لائٹ بل کی بھرپائی سوسائٹی کے سکریٹری- جو مسجد کے ٹرسٹی بھی ہے- سوسائٹی پر ڈالتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) زمین کے اندر پانی کے جو قدرتی ذخائر ہیں وہ کسی کی ملک نہیں، ان کو حاصل کر کے فائدہ اٹھانے کی سب کو اجازت ہے، اب اگر وہ پانی بور کر کے حاصل کیا گیا تو اس کو حاصل کرنے کے لیے سوسائٹی کے ممبران کی اجازت لینا ضروری نہیں؛ البتہ سوسائٹی کی وہ مشترکہ زمین جس میں بور کیا گیا ہے وہ اس بور کی وجہ سے اتنی زیادہ مشغول ہوتی ہے کہ لوگوں کو اس سے آنے جانے یا عام انتفاع میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، تب تو دیگر ممبران کو اعتراض کا حق ہے ورنہ نہیں۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ۳/۲۷۰،۲۷۱)

(۲) بور کے لائٹ بل کی ادائیگی سوسائٹی کے مشترکہ سرمایہ سے نہ کی جائے؛ بلکہ اس کے لیے الگ انتظام کیا جائے؛ البتہ مسجد کے پانی کی جو لائن پاس ہوتی ہے اس میں سے کچھ حصہ سوسائٹی میں دیا جاتا ہے، اگر پانی کی اس لائن سے پانی حاصل کرنے پر مصارف آتے ہیں، اور وہ مصارف مسجد ادا کرتی ہے تو اس صورت میں جتنا پانی سوسائٹی کو دیا جاتا ہے، اس کے حصہ کے مصارف سوسائٹی سے وصول کئے جائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/محرم الحرام ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ   الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

مسائل قبرستان

قدیم قبرستان میں سائیکل کی دوکان کھولنا

سوال: ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے بہت ہی پرانا قبرستان ہے، حالیہ وہ قبرستان قطعاً بند ہو چکا ہے، فی الحال ایک مسلمان نے اس پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے، اس کو ہموار کرتے ہوئے سائیکل کی دوکان کھول رکھی ہے، اور اس کی آمدنی وہ خود اپنے استعمال میں لا رہا ہے، تو مذکورہ آمدنی کو اپنے استعمال میں لانے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہ قبرستان موقوفہ ہے، یعنی اس جگہ کو قبروں کے لیے وقف کیا گیا تھا، تو اب اس پر اس طرح قابض ہو جانا، اور اس جگہ کو دوسرے کام میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اور وہ آمدنی بھی حلال نہیں ہے، اور اگر وہ قبرستان مملوکہ زمین میں تھا، تو اس کے مالک کو اختیار ہے کہ اس کو استعمال کرے، اور قبریں ایک دم پرانی ہو چکی ہیں، ان کے مردے گل سڑ کر ختم ہو چکے ہیں، تو مالکِ زمین اس میں دکان بھی بنا سکتا ہے، اور کرایہ پر بھی دے سکتا ہے۔ (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۲۴۶) اور وہ قبرستان موقوفہ یا مملوکہ نہیں؛ بلکہ سرکاری زمین ہے تو سرکار کی اجازت سے اس میں تصرف کرسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

قبرستان کو اسکوٹر رکھنے کی جگہ بنانا

سوال: ہمارے محلّہ میں قبرستان بند ہوئے کو (۳۰/۳۵) سال ہوئے ہیں،

اس قبرستان کے (۱۲/۱۰) مالک ہیں، ان میں سے ایک نے قبروں کو توڑ کر سپاٹ کر دیا، اور وہاں پر اسکوٹر اسٹینڈ بنایا ہے، اس کو آٹھ سال ہوئے ہیں، غیر مذہب عورت یہ اسکوٹر لگاتی ہے، وہ کمائی جائز ہے یا جائز نہیں؟ ساری کمائی اکیلا کھاتا ہے، کسی بھائی بند کو نہیں دیتا، وہی جگہ پر پرانی شاہی مسجد ہے ''وہ ہماری مسجد ہے''۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر یہ قبرستان وقف شدہ ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں، کرنے والا گنہگار ہے، اور تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ اس قبرستان کی حفاظت کا بندوبست کریں۔ (عالمگیری ۲/۲۷، ۴۷۱) اور اگر کسی کی ملک ہے تو دیکھا جائے گا اگر اتنا زمانہ گزر چکا ہے کہ اندر کا مردہ گل سڑ کر مٹی ہو گیا ہے، تو اس میں کھیتی کرنا، تعمیر کرنا وغیرہ درست ہے، ورنہ نہیں۔ (تبیین الحقائق ۱/۲۴۶)

مسجد کسی کی ملک نہیں ہوتی وہ اللہ کی ملک ہے، اس کو بند کر دینا اور مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے سے روکنا حرام اور ناجائز ہے، اس پر بڑی وعید آئی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

قبرستان میں مسجد بنانا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہم گاؤں والے پرانی مسجد شہید کر کے نئی اور بڑی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں، مگر جس طرف کی جگہ مسجد میں لینا چاہتے ہیں وہاں پر پچاس سے سو سال تک کی پرانی قبریں ہیں، اور دوسری طرف سے بھی جگہ مسجد میں لینے کی کوئی گنجائش نہیں، زید کہتا ہے کہ قبریں پرانی ہیں، اس لیے ان قبروں کی جگہ کھدائی کر کے وہ مٹی اور انسانی عضو قبرستان میں ہی دوسری جگہ دفن کر کے اور قبر کی

جگہ کو مسجد میں شامل کر کے نئی مسجد تعمیر کریں، بکر کہتا ہے کہ قبریں پرانی ہو یا نئی قبرستان میں قبر پر یا قبر کی کھدائی کر کے مٹی اور انسانی عضو دوسری جگہ دفن کرنا اور مسجد تعمیر کرنا کسی حدیث سے ثابت نہیں؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبرستان اور قبروں پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ براہِ کرم زید اور بکر کی تکرار کا خلاصہ قرآن وحدیث اور شافعی مسلک سے دیجئے۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

جس جانب مسجد میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں وہاں قبریں ہیں، اور آپ کے سوال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبرستان کا ایک حصہ ہے، اب اگر اس جگہ کو مسجد میں داخل فرمائیں گے تو اس صورت میں مسجد کا قبرستان کے درمیان ہونا لازم آوے گا، اور قبرستان کے درمیان مسجد بنانا مکروہ ہے۔ علامہ بدرالدین زرکشی شافعیؒ فرماتے ہیں: يكره بناء المساجد بين المقابر؛ لأنه نهي عن الصلوٰة في المقبرة، وقد صح: لا تتخذوا قبري مسجدا. قال صاحب المغني: وقد روى قتادة رضي الله عنه أن أنسا رضي الله عنه مرّ على مقبرة وهم يبنون فيها مسجدا، فقال أنس رضي الله عنه: كان يكره أن يبنى مسجد فى وسط القبور. (اعلام الساجد باحكام المساجد ۳۵۶)

اور اس حصہ میں نماز بھی مکروہ ہوگی۔ "تحفة المحتاج" میں ہے: ويكره تنزيها أيضا الصلوٰة في الحمام ...... (المقبرة) بتثليث الباء (الطاهرة) لغير الانبياء عليهم السلام بأن لم يتحقق نبشها أو تحقق وفرش عليها حائل. (والله أعلم) للخبر السابق مع خبر مسلم لا تتخذوا القبور مساجد أي أنها كم عن ذلك وصح خبر لا تجلسوا على القبور، ولا تصلوا إليها، وعلته محاذاته للنجاسة

سواء ماتحته أو أمامه أو بجانبه، نص عليه في الأم، ومن ثم لم تفترق الكراهة بين المنبوشة بحائل وغيرها، ولا بين المقبرة القديمة والجديدة، بأن دفن فيها أول ميت بل لو دفن ميت بمسجد كان كذلك، وتنفى الكراهة حيث لا محاذاة وإن كان فيها لبعد الموتى عنه عرفا. (۱٦٧/٢ على الهامش)

''شرح مہذب'' میں ہے: أما حكم المسئلة فإن تحقق أن المقبرة منبوشة لم تصح صلوٰته فيها بلا خلاف، إذا لم يسبط تحته شيء، وإن تحقق عدم نبشها صحت بلا خلاف، وهي مكروهة كراهة تنزيه الخ (١٥٨/٣)

اور اگر قبرستان کی وہ زمین وقف شدہ ہے، یعنی دفن اموات کے لیے وقف کی گئی ہے، تو اب اس میں مسجد بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ زمین جس مقصد کے لیے وقف کی گئی ہے، اس کے علاوہ دوسرے کام میں اس کا استعمال کیا جارہا ہے، اور یہ جائز نہیں ہے۔

''تحفة المحتاج'' میں ہے: وفي الانوار: ليس للإمام إذا اندرست مقبرة ولم يبق بها اثر، عارتها للزراعة، أي مثلاً، وصرف غلتها للمصالح، وحمل على الموقوفة الخ (٢٨٤/٦ على الهامش) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ملحوظہ: ہمارے دارالافتاء سے فقہ حنفی کے مطابق جوابات دیے جاتے ہیں، آپ کی طلب پر کتب شافعیہ سے جواب دیا گیا ہے، کسی شافعی مفتی کی تصدیق کے بعد ہی اس کو عمل میں لائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

كتاب الهبة

ہبہ میں قبضہ ضروری ہے۔ قبضہ دشوار ہو تو کیا کریں؟
حدیث "لا تصح الهبة إلا مقبوضة" کی تحقیق

از مرتب: عبدالقیوم راجکوٹی

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان دین متین مسئلۂ ذیل میں؟

ایک شخص نے اپنی بیوی کو آدھا گھر ہبہ کرلیا، یہ ہبہ سچ مچ تھا، ایجاب وقبول بھی ہوا اور گواہ بھی موجود تھے، واہب، موہوب لہ اور شاہدین؛ سب نے ہبہ نامہ پر دست خط کرلیے؛ لیکن مکان میں شوہر کا سامان موجود ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے یہ ہبہ صحیح نہیں ہے؛ لیکن حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں گذارش یہ ہے کہ، امور ذیل مدنظر ہوں:

(۱) اس طرح کا ہبہ متعارف ہے، بہت سے لوگوں نے اس طرح کا ہبہ کیا ہے۔

(۲) بڑا مکان بنگلے کا خالی کرنا اور سب قیمتی سامان: فرنیچر (میز، کرسیاں، سوفہ وغیرہ) گھریلو مشینیں (appliances) وغیرہ باہر نکالنا، یا دوسرا مکان کرایے پر لے کر عارضی طور سے سامان کو اس میں جمع کرنا، پھر بیوی کی اجازت سے سارا سامان مکان مذکور میں واپس لے آنا، جس میں بہت خرچہ تکلیف اور کافی وقت صرف ہوگا، یہ سب باتیں مشکل ہے۔

سامان کے نکالنے باہر جمع کرنے دوسری جگہ تلاش کرنے اور پھر پہلے گھر میں لوٹا لینے میں جو واقعی حرج اور دقت ہے، ان سب کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

تخلیہ یہاں محض برائے نام ہوگا، چوں کہ بیوی خوب جانتی ہے کہ سامان اسی گھر واپس لایا جائے گا۔

(۳) سامان بہت اور بیش قیمت کا ہے، اگر مکان بڑا ہو تو فرنیچر اور گھریلو مشینی آلات وغیرہ کبھی لاکھوں روپیے کی قیمت کے آتے ہیں۔

(۴) سامان منتقل کرنے میں ہزاروں روپیے خرچ کرنے پڑیں گے۔

(۵) خالی کرنے اور لوٹا لینے میں نازک سامان ٹوٹ جائے گا، یہ بات کثیر الوقوع ہے۔

(۶) خالی کرنے میں بیوی اور مکان کے سب رہنے والوں کو بڑی دقت اور پریشانی کا سامنا ہوگا، چوں کہ سب گھر والے سامان، فرنیچر، اسٹو، فریج (Fridje) وغیرہ ذاتی استعمال میں لاتے ہیں۔

اس تخلیہ وتسلیم سے سب گھر والوں کو دوسرا مکان عارضی طور پر کافی کرایے میں لینا پڑے گا، اور اس دوران میں دار موہوبہ کے خالی کرنے اور پھر پُر کرنے میں سامان بالکل الٹا سیدھا رکھا جائے گا۔

(۷) بیوی (موہوب لہا) کا اصرار ہے کہ سامان باہر نہ نکالا جائے، طیبِ خاطر سے سامان مکان میں رہنے دینے کی اجازت دیتی ہے؛ کیوں کہ اسے خود روزمرہ کے کام کے لیے سامان کی ضرورت ہے۔

(۸) یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ مکان کوئی معمولی مکان دو چار پائیوں اور چند برتن والا کا نہیں ہے، ایک بڑا بنگلہ ہے جس میں کتب خانہ کئی لاکھ روپیے کی کتابوں پر مشتمل ہے، ساری کتابیں اور دفتر کے سامان نکالنے سے شوہر کے کام میں بڑا خلل واقع ہوگا، جب کہ اسے روزانہ اپنے کتب خانے میں طرح طرح کے کام میں مصروفیت رہتی ہے،

ساری کتابیں اور دفتری سامان نکالنے میں بھی ایک آدھ ہفتہ لگ جائے گا، بہت کچھ گڑبڑ ہوگی، اس کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا تاوقتیکہ سامان دفتر اپنی اصلی جگہ لوٹایا جائے، اور کتب خانے کی از سرنو ترتیب دی جائے جو ہفتوں تک کا کام ہے۔

ان واقعی مشکلات اور دشواریوں کی بنا پر کیا مالکی وحنبلی مذہب کے موافق فتویٰ صادر کرنا جائز ہوگا؟ کہ ہبۂ مذکورہ تام ہوگیا، ان دو مذہبوں میں ہبہ کی صحت کے لیے قبضہ ضروری نہیں ہے۔

مزید براں امور ذیل بھی ذہن نشین رہیں:

(۱) البنایہ میں تصریح ہے کہ، جس حدیث سے احناف قبضے کی شرط پر استدلال کرتے ہیں وہ حدیث منکر اور بے اصل ہے۔

(۲) مسئلۂ مسئول عنہا میں واقعی حرج ہے۔

(۳) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا ارشاد کہ: میرا ارادہ تھا کہ ایک رسالہ احکام معاملات میں ایسا لکھوں کہ جن معاملات میں عوام مبتلا ہیں اگر وہ صورتیں کسی مذہب میں بھی جائز ہوں تو اس کی اجازت دے دوں؛ تاکہ مسلمانوں کا فعل کسی طرح سے صحیح ہو سکے۔ مَیں نے احتیاطاً اس کے بارے میں حضرت مولانا گنگوہی سے بھی دریافت کیا کہ: ایسے مسائل میں دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرت نے بھی اجازت دے دی۔ مولانا بہت پختہ حنفی تھے۔

(۴) ضرورت کے وقت دوسرے مذہب کے موافق فتویٰ دینا عام قاعدہ ہے۔

(۵) ترکی کتاب ''دررالحکام'' میں یہ جزئیہ ملتا ہے: لو وهب أحد داره

المشغولة بأمتعته، أو مزرعته المشغولة يزرعه، أو تصدق بهما عليه وأشهد عليٰ ذلك كان ذلك صحيحاً.(درر الحكام شرح مجلة الاحكام ۲/۳۹۵)

لیکن اس مسئلہ کا پتہ کسی دوسری کتاب میں ہمیں نہیں ملا، اس بنا پر اس کا ماخذ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ بينوا توجروا. والسلام

احقر محمد شعیب عفی عنہ، ۱۰/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ م ۱۹/ اکتوبر ۲۰۱۰ء

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

فقہ حنفی میں ہبہ کے صحیح ہونے اور مکمل ہونے کی شرائط میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ، شئ موہوب غیر موہوب کے ساتھ مشغول نہ ہو، یعنی ایسی اشیاء سے خالی ہو جو ہبہ نہیں کی گئی ہیں، مثلاً وہ گھر ہبہ کیا جس میں واہب کا سامان بھرا ہوا ہے، یا کرایہ دار بسا ہوا ہے تو یہ ہبہ صحیح نہ ہوگا۔ (مجموعۂ قوانین اسلامی: ۲۳۴، ۲۳۵)

صورت مسئولہ میں شوہر نے اپنی بیوی کو اپنا آدھا گھر اس طور پر ہبہ کیا ہوا ہو کہ حدود متعین کردی ہو اور موہوب آدھے مکان کو سامان سے خالی کر کے بیوی کو شرعی قبضہ دے دیا ہو تو یہ ہبہ صحیح ہے، اور اگر موہوب حصہ میں شوہر کا سامان موجود ہے تو حنفی فقہ کی رو سے یہ ہبہ صحیح نہیں۔

(ومن وهب شقصا مشاعا فالهبة فاسدة)لما ذكرنا،(فان قسمه و سلمه جاز)لان تمامه بالقبض وعنده لا شيوع. (هدايه اخيرين:۲۸۸)

رجل وهب دارا فيها متاع الواهب او جوالق او جرابا فيها طعام الواهب وسلم لا يجوز؛ لان الموهوب مشغول بما ليس بهبة. (فتاوى قاضى خان

علی هامش الفتاوی العالمکیریة:۳/۲٦۸)

آپ نے جن وجوہ کے پیشِ نظر حنبلی و مالکی مسلک کے مطابق فتویٰ صادر کرنے کی گنجائش طلب فرمائی ہے، صحیح نہیں۔ حضرات فقہاء نے دفعِ حرج کے لیے جن خاص حالات میں دوسرے امام کے مسلک پر عمل اور فتوے کی اجازت دی ہے، جس کی نظیریں کتبِ فقہ میں موجود ہیں، صورتِ مسئولہ اس قبیل سے نہیں ہے۔

آپ نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ نقل فرمایا ہے، اس کا حوالہ تحریر نہیں فرمایا، حضرت کے اس ملفوظ میں قید ہے "جن معاملات میں عوام مبتلاء ہے" اس کا مفہوم ہے ابتلائے عام ہو، اور ہر کس و ناکس کو اس امر سے واسطہ پڑتا ہو، اور فقہ حنفی میں اس کا کوئی حل نہ ہو تو ایسے شدید اِبتلاء میں دوسرے امام کے مسلک پر فتویٰ کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ کیجئے! حضرت تھانویؒ رقمطراز ہیں:

اور ضرورت شدیدہ اور ابتلائے عام کے وقت حنفیہ کے نزدیک دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دے دینا بھی جائز ہے؛ لیکن عوام کو خود اپنی رائے سے جس مسئلہ میں چاہیں ایسا کر لینے کی اجازت نہیں؛ بلکہ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

وذلك لما صرح به العلامة الشامیؒ فی رسالة "شرح المنظومة فی رسم المفتی" وقد مر نصه فی تمهید هذه الرسالة.

اور اس زمانہ میں احتیاط اس طرح ہو سکتی ہے کہ، جب تک محقق و متدین علمائے کرام میں سے متعدد حضرات کسی مسئلہ میں ضرورت کا تحقق تسلیم کر کے دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ نہ دیں اُس وقت تک ہرگز اپنے امام کے مذہب کو نہ چھوڑے؛ کیوں کہ

مذہب غیر کو لینے کے لیے یہ شرط ہے کہ اتباع ہویٰ کی بناء پر نہ ہو؛ بلکہ ضرورت داعیہ کی وجہ سے ہو، اور ضرورت وہی معتبر ہے جس کو علمائے اہل بصیرت ضرورت سمجھیں۔ اور نیز یہ بھی ضروری ہے کہ فتویٰ دینے والا ایسا شخص ہو جس نے کسی ماہر استاذ سے فن کو حاصل کیا ہو، اور اہل بصیرت اس کی فقہ میں مہارت تامہ حاصل ہونے پر شہادت دیتے ہوں۔

لما قال الشامیؒ فی عقود رسم المفتی: فان المتقدمين شرطوا فی المفتی الاجتهاد، وهذا مفقود فی زماننا، فلا أقل من أن يشترط فيه معرفة المسائل بشروطها وقيودها التی كثيرا ما يسقطونها ولا يصرحون بها اعتمادا علىٰ فهم المتفقه، وكذا لابد من معرفة عرف زمانه واحوال اهله والتخريج فی ذلك علىٰ استاذ ماهر. (ص٤٦ بحواله: الحيلة الناجزة ٤٥، ٤٦)

ہبہ بلا قبض میں ابتلائے عام نہیں، اگر ابتلائے عام ہوتا تو ہمارے اکابر کے فتاویٰ میں ضرور تصریح ہوتی، اور بلا قبضہ ہبہ تام ہونے پر فتویٰ ہوتا؛ لیکن اکابر علماء میں کسی نے اس پر فتویٰ دیا ہو یہ بات ہمارے علم میں نہیں، خود حضرت تھانویؒ کا فتویٰ ملاحظہ کیجیے:

سوال (۴۹۶): بروقتِ تعمیر اور مکان تیار ہونے کے بعد حاجی صاحب مرحوم نے بہت دفعہ کہا کہ: یہ مکان مسماۃ زوجہ ثانیہ کے لیے بنوایا گیا ہے، اور اسی وجہ سے چار سو روپیہ کا زیور مسماۃ مذکورہ کا حاجی صاحب نے فروخت کر کے اس میں لگایا، آیا اس مکان کی میراث جاری ہوگی اور سب وارثوں میں تقسیم ہوگا یا مسماۃ کا ہوگا؟

الجواب: اگر اس کو ہبہ مان لیا جاوے تو ہبہ اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب ہبہ کرنے والا بالکل اس مکان کو اپنی چیزوں سے خالی کر کے موہوب لہا کو قبضہ کرادے۔

اگرایسا ہوا ہے تو بعد اقامت شہود ہبہ صحیح ہوگا؛ ورنہ نہیں۔

فی الدر المختار: وتتم الھبة بالقبض الکامل ولو الموھوب شاغلا بملك الواھب، لا مشغولا به (الیٰ قوله) فلو وھب جرابا فیه طعام الواھب، او دارا فیھا متاع، او دابة علیھا سرجه وسلمھا کذلك لا تصح وبعکسه تصح.

اورزیور اس میں لگانا غایۃ مافی الباب قرینہ ہبہ کا ہوگا؛ مگر ہبہ میں جو شرط ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے جیسا اوپر بیان ہوا۔ پس جب تک ہبہ صحیح نہ ہوگا وہ زیور بطور احسان کے زوجہ کی طرف سے سمجھا جاوے گا۔ (امدادالفتاویٰ ۳/۴۶۹)

نیز ملاحظہ کیجیے: (امداد المفتین ۲/ ۸۸۵۔ کفایت المفتی ۸/۱۷۲،۱۷۴۔ عزیز الفتاویٰ ۱/ ۶۴۱ تا ۶۴۴۔ فتاویٰ محمودیہ ۱۶/ ۴۷۰۔ فتاویٰ رحیمیہ ۱۰/ ۲۶۳۔ احسن الفتاویٰ ۷/ ۲۵۳۔ امداد الاحکام ۴/ ۲۹۔ فتاویٰ مفتی محمود ۹/ ۹۱، ۹۲، ۲۶۵۔ کتاب الفتاویٰ ۶/ ۳۲)

مذکورہ تمام کتب فتاویٰ میں ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ ضروری بتایا ہے۔

آپ نے لکھا ہے: البنایہ میں تصریح ہے کہ جس حدیث سے احناف قبضہ کی شرط پر استدلال کرتے ہیں وہ حدیث منکر اور بے اصل ہے۔

آپ نے ناقص حوالہ دیا ہے، جہاں مذکورہ بات لکھی ہے وہاں آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے استدلال کو احسن کہا ہے۔

البنایہ شرح ہدایہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

ولنا قوله علیه السلام: "لا تجوز الھبة الا مقبوضة" ھذا حدیث منکر، لا اصل له. والعجب من الکاکیؒ حیث یقول قبل ھذا الحدیث: "غیر مرفوع؛

بل قول على ﷺ وعمر ﷺ ولم يبين ذلك"، وليس كذلك؛ بل هذا الذى ذكره المصنف قول ابراهيم النخعیؒ، رواه عبد الرزاقؒ فى مصنفه، وقال: اخبرنا سفيان الثوریؒ عن منصورؒ عن ابراهيمؒ قال: "لا يجوز الهبة حتىٰ تقبض، والصدقة يجوز قبل ان تقبض" واما قول عمر ﷺ فهو ما رواه البيهقیؒ من حديث يزيد بن زريعؒ، نا سعيدؒ عن قتادةؒ عن يحيىٰ بن يعمرؒ عن ابى موسیؒ قال عمر بن الخطاب ﷺ: لا محال ميراث ما لم يقبض. والاحسن ان يستدل علىٰ اشتراط القبض فى الهبة بما اخرجه البيهقیؒ من حديث عبدالله بن وهب اباماكؒ ويونسؒ وغيرهما، ان ابن شهابؒ اخبرهم عن عروةؒ عن عائشة: أن أبابكر ﷺ نحلها جداد عشرين وسقا من مال بالغابة، فلما حضرت الوفاة قال: والله يا بنية! ما من الناس احد احب الى بعدى منك، ولا اعز على فقراء بعدى منك، والا انى كنت نحلت من مالى جداد عشرين وسقا، فلو كنت جددته وجزته كان لك ذلك، وانما هو اخواك واختاك، فاقتسموه علىٰ كتاب الله عزوجل. الحديث وكذا رواه الطحاویؒ فى شرح الآثار، وقال: حدثنا يونسؒ اخبرنا ابن وهبؒ أن مالكاؒ حدثه الى آخره. فهذا ادل دليل على اشتراط القبض، وبه استدل فى المبسوط واصحاب الشافعیؒ فى كتبهم، قوله: "نحلها" اى وهب لها، والجداد بكسر الجيم من: جددت الشئ اجده بالضم جدا قطعته، وروى جاد عشرين وسقا، قال الخطابیؒ: الجاد بمعنىٰ المجدود، فاعل بمعنىٰ مفعول؛ والوسق ستون صاعا؛ والغابة

بـالغين المعجمة وبعد الالف باء موحدة محققة، وهو موضع مشهور بالمدينة.

وفي رواية من ماله بالعالية، وهو ايضا موضع بالمدينة. (عينى شرح هداية:۳/٥٨٦)

اعلاء السنن میں بارہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم نقل کئے ہیں، جس سے صحیح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہبہ قبضہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔

أقـول: الآثار المذكورة تدل على أن الهبة لا يصح الا مقبوضة، والدلالة ظاهرة لا تحتاج الى التقرير. (اعلاء السنن:١٦/٧١)

علامہ عینیؒ نے حدیث شریف لا تـجـوز الهبة الا مـقبوضة کو بے اصل کہا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام فقہاء ومحدثین کے نزدیک بے اصل ہو؛ اس لیے کہ احادیث کی تصحیح وتضعیف ایک اجتہادی معاملہ ہے، جس میں علماء کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی متقدم کو ایک حدیث بالکل صحیح سند سے پہنچی؛ لیکن ان کے بعد کے لوگ اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ بعد کے لوگوں کی یہ تضعیف متقدم پر حجت نہیں ہوسکتی۔ (مأخوذ از: درس ترمذی:۱/۸۳)

اس لیے یہ ضروری نہیں کہ، جس حدیث کے بارے میں علامہ عینیؒ نے منکر اور بے اصل کہا وہ پہلے زمانہ میں بھی بے اصل ہو۔ اسی حدیث کو لے لیجیے، علامہ عینیؒ (م۸۵۵ھ)، جو نویں صدی کے عالم ہیں، انہوں نے اس کو بے اصل قرار دیا ہے، جب کہ علامہ سرخسیؒ (م۴۹۰ھ) جو پانچویں صدی کے فقیہ ہیں، صاحب ہدایہ (م۵۹۳ھ) جو چھٹی صدی کے فقیہ ہیں، ان دونوں حضرات نے حدیث لا تـجـوز الهبة الا مـقبوضة سے ہی قبضہ ضروری ہونے پر استدلال کیا ہے۔

مبسوط سرخسی کی عبارت یہ ہے: "وحجتنا فی ذلك ماروی عن النبی ﷺ: لا تجوز الهبة، معناه لا يثبت الحكم وهو الملك". (مبسوط سرخسی:۵۷/۱۲)

ہدایہ میں ہے: تصح بالایجاب والقبول والقبض (الیٰ قوله:) ولنا قوله علیه السلام: لا تجوز الهبة الا مقبوضة. (هداية اخيرين ۲۸۵-۲۸۶)

ایک اور جگہ باب نکاح الرقیق میں ایک مسئلہ کے تحت تحریر فرمایا: ان الهبة من شرطها القبض بالنص.

لفظ ''نص'' کے ذیل میں حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں: "ای قوله ﷺ: لا تصح الهبة الا مقبوضة. عناية. (هدايه اولين، ۳۴۴)

اس لیے بہت ممکن ہے کہ، بعد کے دور میں کسی متہم راوی یا کسی اور سقم کی وجہ سے علامہ عینیؒ نے اس کو بے اصل کہا ہو۔ بالخصوص آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے جب مضمون حدیث کی پوری تائید ہو رہی ہے؛ اس لیے اس حدیث کو بے اصل نہیں کہا جا سکتا۔

مصنف عبدالرزاقؒ میں سند و حدیث کا مضمون یہ ہے: عبدالرزاقؒ عن معمرؒ عن الثوریؒ عن منصورؒ عن ابراهيمؒ قال: الهبة لا تجوز حتیٰ تقبض. (مصنف عبدالرزاق ۱۰۷/۹)

سند میں ابراہیمؒ سے مراد ابراہیم نخعیؒ ہیں جو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے استاذ ہیں، ابراہیم نخعیؒ تابعی ہیں، ان کے اقوال حنفیہ کے نزدیک حجت ہیں بشرطیکہ کسی صحابی کے قول کے معارض نہ ہو۔ بعض مسائل میں حضرت امام صاحبؒ نے ان کے اقوال کو اقوالِ صحابہ پر ترجیح دی ہے؛ اس لیے کہ وہ اقاویل درحقیقت ابرہیم نخعیؒ کے نہیں ہوتے؛ بلکہ دیگر

کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہوتے ہیں۔

اعلاء السنن میں ہے: اختار ابو حنیفةؒ محجة ابراهیمؒ وصار الزم الناس به وبأقرانه، فاذا وجد فی المسئلة قولا عنه لایخالفه قول صحابی ونحوه اختار قول ابراهیمؒ، وترك به القیاس واحتج به، کما لا یخفیٰ علی من طالع "الآثار" لمحمد رحمه الله، وما ذلك الا لکون اقواله فی الاکثر منسوبة الیٰ احد من السلف صریحا او ایماء؛ بل ربما احتج ابو حنیفةؒ بقول ابراهیمؒ مع وجود قول بعض الصحابةؓ علیٰ خلافه، وذلك فیما علم الامامؒ ان قول ابراهیمؒ فیه هو قول عبدالله رضی اللہ عنہ اوعمر رضی اللہ عنہ اوعلی رضی اللہ عنہ، ولیس برأی منه، وبالجملة فیکون قول ابراهیمؒ حجة وان لم یصرح به اصحابناؒ؛ولکن صنیعهم یدل علیه. (مقدمه اعلاء السنن: ٨٤)

متقدمین ومتأخرین حنفیہ کی تمام کتب فقہ میں ہبہ تام ہونے میں قبضہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ملاحظہ کیجئے: جامع الصغیر مع نافع الصغیر ۴۳۵، موطا امام محمد ۳۵۰، زیادات ۱۱۴۲/۴، قدوری ۱۳۵، ہدایہ اخیرین ۲۸۳،شرح وقایہ ۲۷۹/۳، تبیین الحقائق ۹۱/۵، ملتقی الابحر مع شرحہ ۳۵۳/۲۔

خلاصہ یہ ہے کہ، ہبہ میں قبضہ کا ضروری ہونا نص یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔جو امر نص سے ثابت ہو اس کو حرج کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاسکتا، جب کہ زیر بحث مسئلہ میں تو حرج بھی درپیش نہیں۔

وفی الاشباه ایضا: الفائدة الثالثة: المشقة والحرج، انما یعتبران فی موضع لا نص فیه، اما مع النص بخلافه فلا. (رسائل ابن عابدین ۱۱۵/۲)

آپ نے سامان ہٹانے کے سلسلہ میں جو دشواریاں تحریر فرمائی ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ مکان سے جو سامان نکالنا دشوار ہے اس کے ساتھ ہبہ کر دیں، یعنی آپ مکان کا جو حصہ بیوی کو ہبہ کرنا چاہتے ہیں اس حصہ میں جو سامان ہے اس کے ساتھ ہبہ کر کے اتنا حصہ مع سامان کے بیوی کے قبضہ میں دے دیں، بیوی مالک بن جانے کے بعد معمولی قیمت سے سامان آپ کو بیچ دے اور سامان پر قبضہ کے لیے تخلیہ کرا دیں؛ بایں طور کہ آپ سامان پر قبضہ کرنا چاہیں تو بآسانی کرلیں، کوئی رکاوٹ نہ ہو، ایجاب وقبول اور تخلیہ کے بعد آپ سامان کے مالک بن جائیں گے اور سامان پر قبضہ بھی ہو چکا، پھر اس سامان کو بیوی سے اس مکان میں رکھنے کی اجازت لے لیں، یا سامان بیوی کو عاریۃً دے دیں، نمبر ۷ کے مطابق بیوی کو اس کی ضرورت بھی ہے؛ اس لیے یہ کام اَور زیادہ آسان ہے۔

دررالحکام میں ہے: المسألة الرابعة عشرة: هبة الشاغل جائزة، يعنى لو وهب احد ماله الشاغل ملكه جاز؛ لان المظروف يشغل الظرف فلا يشغل المظروف. (الحموی)

مثلا: لو وهب الواهب ما فى داره من اشياء لاحد وسلمها مع الدار له صح ذلك، كذلك لو وهب كل ما فى مكتبته من الكتب لابنه وسلمها مع المكتبة وقبض الاخر الكتب والمكتبة تمت الهبة. (على آفندى)

لو وهب دارا بما فيها من المتاع او وهبه الجوالق بما فيها من المتاع وسلمها الى الموهوب له ثم استحق المتاع فالهبة تامة فى الدار والجوالق؛ لان يد الواهب كانت ثابتة علىٰ الدار والمتاع جميعا حقيقة، فصح تسلمه.

(الطحطاوی)(درر الحكام شرح المجلة الاحكام،۲/۳۹٤-۳۹٦)

دوسری صورت یہ ہے کہ، وہ آدھا مکان بیوی کوفروخت کردیں، بیع صرف مکان کی کی جائے سامان کی نہیں، بعدہٗ سامان کے ساتھ اتنا حصہ بیوی کوسپرد کردیں پھر مکان کا ثمن بیوی کو معاف کردیں، اس صورت میں مکان پر بیوی کا قبضہ ملکاً ہوگا اور سامان پر امانۃً۔

وفي فتاویٰ أبي الليث: اذا باع دارا وسلمها الى المشتري وفيها متاع قليل للبائع لايصح التسليم حتى يسلمها اليه فارغة، فان اذن البائع للمشتري بقبض الدار والمتاع صح التسليم؛ لأن المتاع صار وديعة عند المشتري، كذا في الذخيرة. (فتاویٰ عالمگیری ۱۷/۳)

حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریرفرماتے ہیں: مشترک کا ہبہ جائز نہیں؛ لہٰذا وہ جس کو دینا چاہتے ہوں زبانی فروخت کردیں اور وہ زبانی قبول کرلے، پھر زرثمن زبانی معاف کردے۔ (امدادالفتاویٰ ۳/۳۶۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبدعبدالقیوم راجکوٹی، معین مفعی جامعہ ڈابھیل، ۲۸/ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: العبداحمدعفی عنہ خانپوری، صدرمفتی دارالافتاء جامعہ ڈابھیل

سودی آمدنی والے کا ہدیہ لینا

سوال: ایک آدمی کا سودی کاروبار ہے، اس نے کسی کو کپڑا ہدیہ دیا، تو اس کپڑے کواستعمال کرسکتے ہیں یانہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اس کی تمام یا اکثر آمدنی سودی ہے، تو یہ ہدیہ لینا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر وہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ کپڑا حلال طریقہ سے حاصل کیا ہوا ہے، تو لے سکتے ہیں، اور اگر اس کی اکثر آمدنی حلال ہے، تو لینا جائز ہے؛ البتہ اگر معلوم ہو جائے کہ یہ کپڑا حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوا ہے، تو لینا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۴۸۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لڑکوں کو جائیداد دینے کے بعد واپس لینا

سوال: حاجی عبدالرحیم محمد حسین کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، آج سے تقریبا ۲۲/ سال قبل چاروں بھائیوں کو زمین و مکان و پوری جائداد تقسیم کر کے لڑکوں کو دے دی، اور لڑکیوں کے لیے زمین و مکان کے حصوں کے بجائے نقد رقم مقرر کر دی کہ ایک بہن کو چاروں بھائی مل کر ایک ایک ہزار روپئے دیدیں، زمین کے چار حصے الگ کر کے ہر ایک لڑکے کو بخشش و قبضہ کل اختیار سپرد کر دیا تھا؛ لیکن جس وقت ۲۲/ سال پہلے تقسیم کی، اس وقت چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن مدرسہ میں پڑھتے تھے اور شادی بھی نہ ہوئی تھی؛ اس وجہ سے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن کے حصہ کی زمین والد صاحب نے اپنی تحویل میں رکھی تھی، بعد میں وہ بھی تقریبا ۲۰/ سال پہلے چھوٹے بھائی کے قبضہ اور اختیار میں کر دی؛ الغرض سالہا سال سے والد محترم نے اپنی کل جائیداد تقسیم کر دی، اور والد و والدہ کے لیے ایک ہزار روپئے ۲۰/ من اناج، گھی، دودھ وغیرہ کل سالانہ خرچ طے کر دیا جس کو سب لڑکے ادا کرتے رہے، اب جبکہ مہنگواری کی بناء پر نقد رقم دودھ وغیرہ بڑھا دیا ہے، والد کی زمین چار جگہوں میں تقسیم تھی، عمدہ ہلکی مختلف قسم کی تھی، ان چار جگہوں میں سے ایک جگہ جس کا نام ڈبھاڈ والی ہے، وہ زمین اس وقت ایسے موقع پر تھی کہ وہاں چوری وغیرہ کا خطرہ تھا، اور زمین قیام گاہ سے بہت

دور اور اس زمین میں کنواں وغیرہ بھی نہ تھا، اور زمین بھی ناہموار و ناقابل کاشت ہونے کی وجہ سے کوئی بھی بھائی اس حصہ کو لینے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا، اب والد صاحب نے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن کے حصہ کی زمین خود مانگ کر لے لی کہ یہ حصہ چھوٹے کا ہے، اور جو زمین ڈبھاڈ والی تھی جس کو لینے کے لیے کوئی بھائی تیار نہ ہوتا تھا تو والد صاحب نے کہا کہ ان حصوں کو میں جس کو دوں گا ان کو وہاں جانا ہوگا، تو والد صاحب نے عبدالمجید بھائی کو بوڑھی کا آدھا حصہ اور ڈبھاڈ والی کا آدھا حصہ، ساتھ میں بوڑھی کا ایک مکان سپرد کر دیا، اور قبضہ تک دے دیا، تقسیم کے وقت عبدالمجید بھائی کے گنے کی کھیتی میں سے کوئی حصہ نہیں دیا تھا جو چاروں کے حصہ میں تھی، اس بناء پر ان کے حصہ میں مکان کر دیا تھا، اور ابراہیم بھائی کو بوڑھی کا آدھا حصہ اور ڈبھاڈ والی کا آدھا حصہ سپرد کر دیا، اب جبکہ ڈبھاڈ والی زمین میں کنواں کا خرچ کیا اور زمین کو ہموار کر کے اس میں کافی خرچ کر چکے اور کھیتی کے قابل بنائی، اب والد صاحب نے جو مکان عبدالمجید بھائی کو دیا تھا وہ بھی لے لیا، اور بوڑھی کی زمین میں سے وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی زمین نکال کے عبدالرحمٰن بھائی کو دیتے جاتے ہیں، خرچ کے تین چار سال کے بعد والد صاحب نے کہا کہ ان دونوں حصوں میں سے کچھ زمین عبدالرحمٰن کو اب بھی دینا چاہتا ہوں، تم راضی ہو جاؤ تو دونوں بھائی نے انکار کیا کہ ہمارے پاس زمین عبدالرحمٰن سے کچھ زیادہ ہے؛ لیکن یہ زیادتی آپ نے ہمیں اس لیے دی ہے کہ ہماری اس زمین میں سب طرح کا خرچ تھا اور قابلِ کاشت نہیں تھی، اور کوئی جانے کے لیے تیار نہیں تھا، اور آپ نے ہم سے دیتے وقت کہا تھا کہ تم لے لو، تم کو اس سے زیادہ دیتا ہوں خرچ کی بناء پر اور پھر میں واپس نہیں لوں گا، پھر بھی والد صاحب دونوں کی ناراضگی پر زمین نکال کے

عبدالرحمٰن کو دیتے جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمھارے پاس زیادہ ہے، تو دونوں نے کہا کہ ایسا ہوتو ہماری زمین عبدالرحمٰن کو دو، اور ان کی زمین ہمیں دو، اور ہم نے جو خرچ کیا ہے وہ ہمیں مل جائے تو بھی والد صاحب انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ کہاں سے لاوے اور ان دونوں بھائیوں کی بات ٹھکرادی، جب رشتہ داروں کو شکوہ کیا تو سب کے کہنے پر انھوں نے کہا کہ اب میں مزید نہیں نکالوں گا، اور تمھارے سب کے نام پر کردیتا ہوں، پھر سرکاری کاغذات ہوئے جس میں عبدالرحمٰن کے پاس جو ابتداء حصہ تھا وہ ان کے نام پر کردیا، اور باقی میں تین بھائیوں کو نند میں رکھ کر اپنے نام پر رکھی، بعد میں لڑکوں نے کہا کہ یہ ناانصافی کیوں ہوئی؟ تو جواباً کہا کہ میں ہوں نا، اس میں سے تمھارے پاس سے کون لے لے گا، مجھ پر اعتبار رکھو؛ لیکن پھر بھی زمین نکالنا چاہتے ہیں، جس میں دونوں بھائی خلاف ہیں، دونوں بھائی اولاً تقسیم پر جانا چاہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہمیں جو زمین اولاً دی اس کے بعد آپ نے جو نکالی ہے، یہ سب ناجائز ہے، اور عبدالرحمٰن کا لینا بھی درست نہیں ہے آپ کا اس طرح نکالتے جانا بھی۔ تو مفصل جواب طلب ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

باپ نے جب اپنی پوری جائیداد (زمین ومکان) تقسیم کر کے اپنے لڑکوں کو دے دی اور اس پر لڑکوں کا قبضہ بھی مکمل ہو چکا، اب اس کے بعد باپ اس کو ان کے پاس سے واپس لینا چاہتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، اب واپس لینے کا باپ کو حق نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: (ویمنع الرجوع فیها) حروف (دمع خزقه) .... (والقاف القرابة، فلو وهب لذي رحم محرم منه) نسبا (ولو ذميا او مستأمنا

لا یرجع) (درمختار مع الشامي ٤/٥٧٨)

البتہ اگر باپ (واھب) اور بیٹا (موھوب لہ) دونوں مل جل کر واپسی پر متفق ہوجائیں تو جائز ہوگا۔

(اتفقا) الواهب الموهوب له (على) الرجوع في (موضع لا يصح) رجوعه من المواضع السبعة السابقة (كالهبة لقرابته جاز) هذا الاتفاق منهما (درمختار مع الشامی، ٤/٥٧٩) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

مشترک دکان کے منافع کا ہبہ درست نہیں

سوال: (۱) زید نامی ایک شخص ہے، اس کے پانچ لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں، اور زید کے پاس ایک دوکان میں نو آنہ حصہ ہے، اور ایک طبیلہ اور طبیلے کی ضروریات مثلاً جیپ، گاڑیاں اور ٹرک ہے، اور اس کے علاوہ دوسرا بھی سامان موجود ہے، زید نے اپنی حیات ہی میں بڑے لڑکے کے سامنے یہ کہا تھا کہ دوکان کے نو آنہ میں سے ایک آنہ رفیقہ نامی لڑکی کو بخشش کر رہا ہوں، اور بقیہ آٹھ آنے پانچوں لڑکوں کو بخشش کر رہا ہوں، یہ کہنے کے بعد سالانہ نفع جو دوکان کا آتا تھا، اس میں رفیقہ نامی لڑکی کے حصے کی رقم رفیقہ کی الگ فہرست بنا کر اس میں نقل کرتے تھے، اور لڑکوں کا نفع خود زید استعمال کرتے تھے اور اس طرح دو سال تک کیا، تیسرے سال کے درمیان میں زید کا انتقال ہوگیا، زید کے انتقال کے وقت دوکان حکومت کے کاغذات میں زید ہی کے نام تھی، آیا باقی لڑکیاں اس دکان میں وراثت کی مستحق رہے گی یا نہیں؟

(۲) زید نے طبیلے کے متعلق چوتھے نمبر کے لڑکے کے سامنے یہ کہا تھا: کہ یہ طبیلہ پانچوں لڑکوں کو بخشش کرتا ہوں، اس کے بعد سالانہ نفع لڑکوں کے درمیان تقسیم کرتے تھے، اور یہ طبیلہ زید کے نام پر حکومت کے کاغذات میں نہیں تھا، تو یہ طبیلے میں لڑکیاں وراثت کی حقدار ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو طبیلے کی ضروریات، مثلاً جیپ گاڑیاں اور ٹرک - جو سامان اور دودھ غیرہ کے منتقل کرنے کے لیے ہے - اس کا کیا حکم ہے مندرجۂ ذیل کے جوابات مطلوب ہیں؟

(۱) زبانی کہہ دینے سے ہبہ صحیح ہوسکتا ہے؟

(۲) لڑکی کے منافع کی رقم الگ فہرست میں درج کردینے سے وہ لڑکی کی ملکیت مانی جائے گی یا نہیں؟

(۳) لڑکوں کا نفع زید خود استعمال کرتے تھے تو کیا اب وہ نفع ہر ایک کا رہے گا یا اس میں بھی وراثت جاری ہوگی؟

(۴) جس دکان کے حصوں کو پانچ لڑکے اور ایک لڑکی کے درمیان ہبہ کردیا ہے، وہ زید کے انتقال کے وقت سرکاری کاغذات میں زید کے ہی نام پر تھی، اب اس دکان میں وراثت جاری ہوگی؟ بقیہ لڑکیوں کے درمیان میراث جاری ہوگی یا نہیں؟

(۵) طبیلہ کے ضروریات میں سے ٹرک اور جیپ، گاڑیاں ہیں، جو طبیلے ہی کی ضروریات کے لیے رکھے جاتے ہیں، تو ان چیزوں کو مستقل ملکیت مانیں گے یا طبیلہ کے تابع؟

(۶) قبضہ کا مفہوم کیا ہے؟ مندرجہ بالا امور کے جوابات مع حوالہ عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دوکان میں زید کا حصہ نو آنہ ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوکان مشترک ہے، اور مشترک چیز جو قابلِ تقسیم ہو اس کا ہبہ قبل تقسیم جائز نہیں ہے۔

درمختار میں شرائط صحتِ ہبہ کے ذیل میں ہے: وشرائط صحتها فی الموهوب: ان يكون مقبوضا غير مشاع الخ. (درمختار) (قوله مشاع) اى فيما يقسم كما ياتى. (شامى ٤/٥٦٧) آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: لانها لاتتم بالقبض فيما يقسم، ولووهبه لشريكه او لأجنبى لعدم تصور القبض الكامل كما فى عامة الكتب، فكان هو المذهب . (درمختار) (قوله فى عامة الكتب) وصرح به الزيلعى وصاحب البحر، منح. (شامى ٤/٥٧٠)

عالمگیری میں ہے: ولا تصح فى مشاع يقسم، ويبقى منتفعا به قبل القسمة وبعدها هكذا فى الكافى. (٤/٣٧٦) هبة المشاع فيما يحتمل القسمة لا تجوز، سواء كانت من شريكه، أو من غير شريكه. (عالمگیری ٤/٣٧٨) ما من جزء من المشاع وان دق إلا وللشريك فيه ملك، فلا تصح هبته ولو من الشريك؛ لان القبض الكامل فيه لا يتصور. (شامى ٤/٥٧١)

طبیلہ پانچوں لڑکوں کو مشترکہ طور پر ہبہ کیا تو یہ بھی درست نہ ہوا۔

درمختار میں ہے: وهب اثنان دارا لواحد صح لعدم الشيوع، وبقلبه لكبيرين لا عنده؛ للشيوع فيما يحتمل القسمة (درمختار) (قوله وبقلبه) وهو هبة واحد من اثنين الخ. (شامى ٤/٥٧٣)

جب دونوں صورتوں میں ہبہ درست وصحیح نہ ہوا، تو اب یہ دونوں چیز اوران کے

متعلقات بوقت وفات زید ہی کی ملک ہیں، اور زید کی متروکہ دیگر املاک کی طرح ان دونوں میں بھی وراثت جاری ہوگی اور اس کے تمام شرعی ورثاء کو اس میں حقِ وراثت حاصل ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

ہبہ میں بیوی کو محروم کرنا

سوال: ایک آدمی اپنی زندگی میں ہی مال کو اولاد کے درمیان تقسیم کردیتا ہے، اور مذکر و مؤنث دونوں کو برابر دیتا ہے قبل الموت کو عطیہ شمار کرکے؛ لیکن اپنی بیوی کو کچھ بھی نہیں دیتا ہے، تو اس طریقہ سے بیوی کو محروم کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اس کا مقصد بیوی کو محروم کرنا ہے تو گنہ گار ہوگا۔

قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيٰمة. رواه ابن ماجة (مشکوٰۃ ۲۶۶)

عن رسول الله ﷺ: قال إن الرجل ليعمل والمرأة بطاعة الله ستين سنة، ثم يحضرهما الموت فيضاران في الوصية فتجب لهما النار. (مشکوٰۃ ۲۶۵)

(فيضاران فى الوصية) من المضارة أي يوصلان الضرر إلى الوارث بسبب الوصية للاجنبى باكثر من الثلث، أو بأن يهب جميع ماله لواحد من الوارث كيلا يرث وارث آخر من ماله شيئا فهذا مكروه، وفرار عن حكم اللّٰه تعالىٰ، ذكره إبن الملك، وفيه أنه لا يحصل بهما ضرر لأحد أللّٰهم إلا

أن يقال معناه فيقصدان الضرر. (مرقاة شرح مشكوٰة ٦/١٨٤) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مسجد کے مدرس کو حسن سلوک کے طور پر کچھ رقم دی اس کو لینا کیسا ہے؟

سوال: زید مدرس ہے اور امام بھی، صبح مدرسہ میں بچے پڑھاتا ہے، جس کی تنخواہ ملتی ہے، محلّہ کے ایک صاحب کا ایک لڑکا مدرسہ کے وقت میں پڑھنے نہیں آسکتا، لہٰذا ان صاحب نے زید سے کہا میرے بچے کو پڑھانے کا انتظام کریں، زید نے کہا مغرب بعد مسجد میں بھیج دیجئے، میں پڑھا دوں گا، اب زید نے پڑھانا شروع کیا، پندرہ دنوں بعد لڑکے کے والد نے زید کو کچھ رقم دی، جس کو لینے سے زید نے انکار کیا؛ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر دی کہ اپنے بچوں کو کھلا دینا، اب وہ ہر مہینہ وہ رقم دیتے ہیں، لیکن چند روز پہلے ایک صاحب نے کہا کہ مسجد میں ٹیوشن پڑھانا جائز نہیں ہے، آپ بتائیں، اس طرح پڑھانے پر جو رقم ملتی ہے اس کا لینا میرے لیے جائز ہے کہ نہیں؟ اگر جائز نہیں تو آج تک رقم لی ہے، اس کا لوٹانا ضروری ہے؟ شرعی حکم بتا کر ممنون فرمائیں؛ تاکہ ناجائز رقم سے حفاظت ہو۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ عقد اجارہ نہیں، اس لیے بچہ کے والد کی طرف سے دی جانے والی رقم اجرت نہیں؛ بلکہ حسنِ سلوک ہے، لہٰذا مسجد میں پڑھا بھی سکتے ہیں، اجرت لے کر مسجد میں پڑھانا درست نہیں ہے؛ لیکن اس صورت میں بھی اجرت حلال ہے۔ (احسن الفتاویٰ ٦/ ٤٥٨) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ٢٦/ ربیع الآخر ١٤١١ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتاب الضمان

مستعمل چپل کا ضمان

سوال: ایک شخص نے دوسرے شخص کے چپل بلا اجازت لیے اور اس نے گم کر دیئے، تو کیا وہ چپل کا مالک اس شخص سے اس کا بدلہ لے سکتا ہے؟ اور اس شخص نے بھی اپنے چپل استعمال کیئے ہیں، تو کتنی مقدار میں دوسرے شخص سے بدلہ لے سکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں چپل کا مالک اس دوسرے آدمی سے اپنے چپل کی قیمت وصول کرسکتا ہے؛ لیکن چونکہ جس وقت اس آدمی نے وہ چپل لیے، اس وقت وہ نئے نہیں تھے؛ بلکہ مستعمل تھے، اس لیے ایسے مستعمل چپل کی جو قیمت بازار میں ہوسکتی ہے، وہ اس کے پاس سے وصول کرے۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۲/ ۵۱۹۔ مادہ: ۸۹۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کرایہ کے برتن ٹوٹنے پر ضمان

سوال: (۳) ہم کرائے پر کھانے کے برتن پلیٹ وغیرہ دیتے ہیں، پلیٹ ٹوٹ جانے میں کیا قیمت پرانی لگائی جائے گی یا نئی؟ ہمیں خریدنا پڑتا ہے، نئی قیمت پر جس سے تجارت میں خسارہ آتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۳) کرائے پر دی گئی چیز کرائے پر لینے والے کے ہاتھ میں امانت ہے، اگر اس کی طرف سے کسی بھی قسم کی تعدی اور زیادتی کے بغیر ہلاک ہوجائے، تو اس پر اس کا

ضمان واجب نہیں ہے۔

البتہ اگر اس کی تعدی اور زیادتی کے نتیجہ میں ہلاک ہوئی تو ضمان واجب ہوگا، اور اس وقت (یعنی جب وہ ہلاک ہوئی) اس کی جو قیمت ہوگی وہ وصول کی جائے گی، یہ یاد رہے کہ وہ چیز اگر مستعمل تھی، تو مستعمل کی جو قیمت موجودہ نرخ سے ہوگی، وہی وصول کی جاسکتی ہے، جدید کی نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مودَع کے ترکہ سے ودیعت کا ضمان

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک معمر بڑی بی (خاتون) نے بندہ کی اہلیہ صاحبہ کے پاس اپنی کچھ چیزیں بطورِ امانت رکھی تھیں، جو کئی سال ان کے پاس محفوظ رکھیں رہیں، اس دوران میں وہ ان چیزوں کو کبھی لے گئی اور کبھی پھر رکھ گئی، اور یہ میرے علم میں بھی تھا کہ فلاں بڑی بی (خاتون) کی کچھ چیزیں میری اہلیہ صاحبہ کے پاس امانت رکھیں ہیں؛ چونکہ ان بڑی بی خاتون کا میری اہلیہ صاحبہ کے پاس آنا جانا تھا، علاوہ ازیں ایک بار میری اہلیہ صاحبہ نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا کہ فلاں کی کچھ چیزیں میرے پاس امانت رکھی ہیں، یہاں تک کہ ایک دفعہ اس خاتون نے میری اہلیہ صاحبہ سے اپنی چیزوں کو طلب کیا اور دیکھا اور پھر کہا ابھی رکھ لو پھر لے جاؤں گی، چنانچہ انھوں نے پھر ان چیزوں کو بدستِ خود اپنی صندوق میں بحفاظت رکھ دیا تھا، اور مجھ سے بھی بتایا کہ ''فلاں کی چیزیں میں یہاں صندوق میں رکھ رہی ہوں'' اس

کے چند روز بعد پھر ان کی علالت میں شدت پیدا ہوئی، چونکہ وہ عرصہ کئی سال سے ایک مرض مہلک میں مبتلا تھیں؛ غرض ان کا انتقال ہو گیا، اور انھوں نے انتقال سے قبل اپنی حالت ہوش وحواس میں ضروری امور کے متعلق اور جو ان کے اوپر کسی کا مطالبہ دین وغیرہ تھا اس کے متعلق ہمیں وصیت اور تاکید کی؛ لیکن ان چیزوں کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا، اور نہ ہمیں وہ یاد آئیں، ان کے انتقال کے بعد ایک روز ان چیزوں کا خیال آیا کہ شاید وہ لے گئی ہوں گی، اس وقت وہ بڑی بی خاتون باہر گئی ہوئی تھی، ان کے انتقال کے ڈیڑھ دو مہینے بعد وہ آئیں، تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ تم وہ چیزیں تو لے گئیں تھیں، اس نے کہا نہیں وہ تو انھیں کے پاس تھیں، میں نے اس وقت بھی صندوق کھول کر نہیں دیکھا، اور ان سے کہہ دیا کہ اچھا تو لے جانا، اس خیال سے کہ جب وہ نہیں لے گئی تو وہ صندوق میں محفوظ ہی ہیں، چند روز کے بعد وہ اپنی چیزیں لینے آئیں تو میں نے بغیر کسی تأمل کے اپنی اہلیہ کا صندوق کھولا تو اس میں وہ چیزیں نہیں ملیں، تمام گھر میں اور صندوق، بکسوں میں تلاش کیں؛ لیکن کوئی سراغ ان کا نہیں ملا، اور میں حیران ہو گیا کہ بڑی بی چیزیں نہیں لے گئیں تو اس میں سے کہاں گئیں؟ اگرچہ سرقہ بھی ممکن ہے لیکن مشکل ہے؛ کیونکہ وہ صندوق ایک مکان کے اندر دوسرے مکان میں محفوظ ہے؛ بہر حال وہ چیزیں غائب اور ضائع ہو گئیں، اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو بڑی بی لے گئی یا نہیں، اس لیے آنجناب مندرجۂ بالا بیان پر غور فرما کر اور مندرجۂ ذیل امور پر بھی نظر فرما کر خدا اور رسول کا جو فیصلہ ہو تحریر فرمائیں، آپ کا عین کرم ہو گا۔

(۱) میری اہلیہ مرحومہ نے ان چیزوں کی اپنی بقدر امکان حفاظت فرمائی، اور

سب کو معلوم ہے کہ دیانت دار تھیں۔

(۲) نیز ان چیزوں کو میری اہلیہ مرحومہ نے میرے حوالہ اور سپرد نہیں کیا، اور نہ ہی بڑی بی (خاتون) نے میرے حوالہ اور سپرد کیا؛ البتہ میری اہلیہ ان کو میرے علم میں لے آئیں تھیں۔

(۳) نیز ان چیزوں کو نہ ہی میری آنکھوں نے دیکھا کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں؟ اور کتنی ہیں؟ اور کیسی ہیں؟ میرا تعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں رہا کہ میرے علم میں تھا کہ فلاں کی چیزیں میری اہلیہ کے پاس رکھیں ہیں۔

(۴) نیز میں خدا کو حاضر اور ناظر سمجھ کر بحلف اقرار وعہد کرتا ہوں کہ واللہ باللہ مجھے اس بڑی بی (خاتون) کی چیزوں کا قطعاً کوئی علم نہیں ہے، اور نہ میرے پاس ہیں، اور اگر میں سارق یا خائن ہوں تو اللہ کے یہاں دین دار ہوں گا۔

(۵) ان جملہ امور کی وضاحت کے بعد اگر میں ہی ان چیزوں کا ذمہ دار ہوں اور اس کا تاوان میرے ذمہ واجب ہے، تو میں حتی الامکان اس کو ادا کروں گا، اور خدا کے یہاں اس کا دادخواہ ہوں گا، اس لیے عرضِ خدمت ہے کہ اس مسئلہ صورت مذکورہ کے متعلق خدا، رسول کا جو حکم اور فیصلہ ہو اس کو بغیر خوف لامۃ لائم بیان فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں بڑی بی کی ان چیزوں کا تاوان آپ پر واجب نہیں ہے؛ البتہ آپ کی اہلیہ مرحومہ کے ترکہ سے ان چیزوں کا تاوان ادا کیا جائے گا۔

درمختار میں ہے: ومنه أي من المنع ظلماً موته أي موت المودع

مجهلا، فإنه يضمن فتصير دينا في تركته إلا إذا علم أن وارثه يعلمها فلا ضمان. (درمختار) ومعنى موته مجهل: أن لا يبين حال الأمانة كما في الاشباه. (شامی۴/۵۵۲مطبوعہ کراچی)

آپ کی اہلیہ نے جب ان اشیاء کی تفصیل سے آپ کو آگاہ نہیں کیا اور نہ آپ کو تفصیل معلوم تھی، تو گویا مودَعْ (آپ کی اہلیہ) کی وفات ایسی حالت میں ہوئی کہ اس نے ودیعت سے ناواقف رکھا، اس لیے مودَع کے ترکہ میں سے ودیعت کا ضمان ادا کیا جاوے گا، آپ کی اہلیہ نے آپ کو جو اجمالی اطلاع دی تھی وہ کافی نہیں، جبکہ آپ خود اقرار فرماتے ہیں کہ آپ کی آنکھوں نے ان اشیاء کو دیکھا نہیں، اور وہ کیا کیا اور کتنی ہیں؟ یہ بھی آپ کو معلوم نہیں۔

وفي نور العين: لومات المودَع مجهلا ضمن، يعني لومات ولم يبين حال الوديعة اما إذا عرفها الوارث والمودع يعلم أنه يعرف فمات لم يضمن، فلو قال الوارث أنا علمتها وأنكر الطالب لو فسرها بأن كانت كذا وكذا وقد هلكت صدق لكونها عنده. (تكملة شامی٢/٢٦٨) قال سيدي الوالد رحمه الله تعالىٰ في تنقيحه في جواب سوال: والذي تحرر من كلامهم، ان المودع إن اوصى بالوديعة في مرض موته، ثم مات ولم توجد فلا ضمان في تركته، وإن لم يوص فلا يخلو إما ان يعرفها الورثة او لا، فان عرفوها وصدقهم صاحبها على المعرفة، ولم توجد لا ضمان في التركة، وإن لم يعرفوها وقت موته فلا يخلو اما ان تكون موجودة او لا، فان كانت موجودة وثبت أنها وديعة، إما

ببينة أو اقرار الورثة أخذها صاحبها، ولا يتوهم أنه في هذه الحالة مات مجهلا، فصارت دينا فيشارك اصحاب الديون صاحبها؛ لان هذا عند عدم وجودها، أما عند قيامها فلا شك أن صاحبها احق بها، فان لم توجد فحينئذ هي دين في التركة وصاحبها كسائر غرماء الصحة، وان وجد بعضها وفقد بعضها فان كان مات مجهلا اخذ صاحبها الموجود ورجع بالمفقود في التركة، وإلا أخذ الموجود فقط، وان مات وصارت دينا فان كانت من ذوات الامثال وجب مثلها وإلا فقيمتها. فعليك بحفظ هذا التحرير. والله سبحانه وتعالیٰ اعلم. (تکملۂ شامی ۲/ ۲۶۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نشہ کرنے والے شخص کا مال رضامندی کے بغیر اس کی اولاد کو دینا

سوال: میرا بھائی عبداللہ جن کی عمر ۴۵/ سال ہے، ان کے چار لڑکے ہیں، جس میں ۳ شادی شدہ صاحب عیال ہیں، اور چوتھا لڑکا جوان ہے؛ لیکن شادی نہیں ہوئی، عنقریب ہوجائے گی، بھائی عبداللہ کو ۲۵/ سال سے نشہ کرنے کی عادت ہے، ویسے باہوش وحواس ہیں؛ لیکن نشہ زیادہ کرتے ہیں، کبھی ایک ماہ اچھے ہوجاتے ہیں، اور پھر نشہ کرنے کا دورہ پڑتا ہے، میرے بھائی کا کاروبار کا حساب میرے پاس ہے، اور بہت کنٹرول سے خرچ بھی دیتا ہوں، اس لیے کہ زیادہ دوں گا تو لہولعب میں اڑادیں گے، تو بچوں کے لیے کمی ہوجائے گی، بمبئ میں میرے بھائی کا ایک روم تھا، اور تھوڑی اور جگہ تھی جسے فروخت

کر کے وطن میں اپنے لیے گھر بنانا چاہتے ہیں، یہ رقم جو جائداد فروخت کرنے پر آئی میرے پاس ہے، چاروں لڑکوں میں سے چھوٹے دو لڑکے کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں اور نوکری کر کے زندگی بسر کرتے ہیں، جبکہ دو بڑے لڑکے وطن میں رہتے ہیں، چاروں لڑکوں میں سے کسی کے پاس اپنا خود کا گھر نہیں ہے، اور اب بھائی کے پاس بھی گھر نہیں ہے، اور وہ بھائی فی الحال ہمارے گھر میں مقیم ہیں، دو بڑے لڑکے تقاضہ شدت سے کرتے ہیں کہ ہمیں گھر بنانا ہے، اس لیے باپ کے روپیوں میں سے ہمیں رقم دو، اور ساتھ میں گاؤں کے رشتے داروں کو ملا کر بہت زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں، بھائی کے کہنے کے مطابق لڑکوں کا رویہ چونکہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہے، اس لیے میری ملکیت میں سے ایک پیسہ بھی ان لڑکوں کو مت دینا بغیر میری اجازت کے، یہاں پر ایک مولوی صاحب سے میں نے بات کی تھی تو ان کا کہنا ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر ایک پیسہ آپ کسی کو نہیں دے سکتے؛ یہاں تک کہ مالک کے لڑکے ہی کیوں نہ ہو، تمھارے بھائی کی عادتیں بھلے خراب ہوں یہ ان کا ذاتی فعل اور ان کے اعمال ہیں، رہا شریعت کا مسئلہ تو آپ ان کا خرچ بھی نہیں روک سکتے جو جائز ہو ان کی زندگی کے معیار کے مطابق، اور گھر بھی ان کا دینا ہوگا، اگر تمھیں لڑکوں پر رحم آتا ہو تو اپنی جیب میں سے قرض دو یا کچھ بھی کرو؛ لیکن صاحب ملکیت کی اجازت کے بغیر آپ ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتے، کیونکہ آپ اس جائداد کے امین ہیں، ورنہ آپ گنہگار رہوں گے، اب سوال یہ ہے کہ لڑکوں کا روپیوں کے بارے میں مطالبہ اور اصرار شرعاً صحیح ہے؟ اور لڑکوں کے لیے دوسرے رشتہ داروں کا مجھ پر دباؤ ڈالنا شرعاً کیسا ہے؟ مزید برآں برائے کرم یہ بھی مشورہ دیں کہ میں ان حالات میں کیا رویہ اختیار کروں ایک طرف

لڑکوں کا مسئلہ ہے، اور دوسری طرف امانت کا سوال ہے، جواب جلد عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مولوی صاحب نے آپ کو جو مسئلہ بتلایا ہے وہ بالکل درست ہے، لڑکوں کا آپ سے مطالبہ شرعاً درست نہیں ہے، اور لڑکوں کے اس مطالبہ پر دیگر رشتہ داروں کا آپ پر دباؤ ڈالنا ناجائز وحرام ہے، اگر آپ نے ان کے دباؤ میں آکر اس رقم میں سے کچھ بھی بلااجازت مالک اس کے لڑکوں کو دیدیا تو آپ گنہگار ہوں گے، اور آپ پر ضمان بھی واجب ہوگا، اگر آپ ان حالات میں امانت کا تقاضا پورا کرنے سے قاصر ہوں تو وہ امانت مالک کے حوالہ فرمادیں، اور اپنے ذاتی مال میں سے ان لڑکوں کی مدد کر سکتے ہوں تو کریں، ورنہ ان کے لیے دعاء پر اکتفاء فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتاب اللقطة

لقطہ کی تشہیر کا طریقہ

سوال: (۱) میرے والد محترم (ST) سرکاری بس STATION میں آفیسر ہیں، ایک دن جب میں آفس گیا تو میز پر "تفسیر خازن جلد نمبر ایک" کو دیکھا معلومات حاصل کرنے سے پتہ چلا کہ بالکاڈ سے مالا پرم (جہاں مسلمان اور علماء زیادہ ہیں) تک جانے والی بس سے یہ ملی تھی، مزید بتایا گیا کہ آپ کو اس سے فائدہ ہوگا اس لیے ہم نے اس کو یہاں رکھا ہے، والد صاحب اس کو گھر لے آئے یہ لقطہ ملنے کے بعد سے لے کر ابھی تک چار ماہ گزر چکے۔

مذہب شافعی میں مفتی بہ قول یہ ہے کہ: اگر چہ لقطہ کو بغرض حفاظت اٹھایا جائے تب بھی اعلان ضروری ہے۔ مغنی المحتاج ۲/۵۰۹ میں ہے:

"ومنه اخذ لقطة للحفظ ابدا...... فهی امانة ...... ولم یوجب الاكثرون منه الاصحاب التعريف، والحالة هذه وهی أخذاللقطة للحفظ ابدا؛ لان التبرع إنماأوجبه لماجعل له التملك بعده، ورجح الامام والغزالی وغيرهما وجوبه، وهذا هو المعتمد كماصححه المصنف فی شرح مسلم، وقال فی زيادة الروضة أنه الاقوى المختار".

اور تعریف تو ایک سال ہے۔ مغنی ۲/۵۱۰ میں ح ہے: ثم يعرف هافی الاسواق وفی ابواب المساجد عند خروج الناس ونحوهامن المجامع والمحافل ومحال الرجال ومناخ الأسفار...... سنة أی منه يوم التعريف......على العادة يعرف اولاً كل يوم طرفی النهارثم كل يوم مرة ثم كل أسبوع.

پھر اس کو حقیر میں بھی کیسے شمار کریں گے؛ کیونکہ مغنی جلد نمبر ۲/۵۱۲ میں ہے:

"والاصح أن الحقیر أی القلیل والمتمول، ولا یقدر شیئی فی الاصح؛ بل هو ما یغلب علی الظن، أن فاقده لا یکثر أسفه علیه، ولا یطول طلبه له غالباً ...... لا یعرف سنة؛ بل زمنا یظن أنه فاقده یعرض عنه غالباً".

اس میں حقیر کی جو تعریف ہے اس میں اس کتاب کو شامل کرنا مشکل ہے؛ کیونکہ فاقد کا افسوس کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اگر وہ چیز اس کی ملکیت میں ہے تو وہ صرف اس جلد کو خرید نہیں سکتا؛ بلکہ پورا سیٹ خریدنا ہوگا اور اگر کسی سے عاریۃً لیا تھا، تو مسئلہ اور پیچیدہ ہوجاتا ہے۔

جب حال یہ ہے تو پھر اعلان کی کیا صورت اختیار کی جائے؟ اگر کوئی وسائلِ اعلان کا سہارا لیا جائے، تو اس کو خرچہ بہت زیادہ ہوگا، تو اب ہم کیا کریں؟ حضرت والا سے مسلک حنفی کے مطابق رہنمائی کی امید ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اعلان کا طریقہ جیسا کہ کتب فقہ میں مصرح ہے، یہ ہے ایسی جگہیں جہاں لوگ جمع ہوتے ہوں، جیسے کہ بازار یا نمازوں کے بعد مسجد کے سامنے کا حصہ یا دور حاضر میں ہوٹل اور ریسٹورنٹ وغیرہ جگہوں پر اعلان کیا جائے، اسی طرح چھوٹے سے پوسٹر کی شکل میں چھپوا کر مسجد کے دروازوں اور عام جگہوں پر چپکا دیا جائے، اخبار میں دینا چاہے، تو دیا جاسکتا ہے؛ لیکن ضروری نہیں، آپ نے خرچہ کے متعلق جو لکھا ہے وہ اخباروں میں دینے کی صورت میں تو زیادہ آسکتا ہے؛ لیکن چھوٹے پمفلٹ کی شکل میں چھپوانے میں زیادہ

مصارف نہیں ہوں گے؛ نیز چوں کہ یہ کتاب بس میں سے ملی ہے، اس لیے سرکاری بس کے تمام اسٹیشنوں پر بھی یہ پوسٹر لگوادیا جائے خاص کر اس علاقہ میں جہاں سے یہ کتاب ملی ہے، تو انشاء اللہ ذمہ بری ہوجائے گا۔

درمختار میں ہے: وعرف أی نادی علیها حیث وجدها وفی المجامع الی ان علم ان صاحبها لا یطلبها. اس پر شامی میں ہے: (قوله وفی المجامع) أی محلات الاجتماع کالأسواق وابواب المساجد. بحر. وکبیوت القهوات فی زماننا. (درمختار مع الشامی ۳/۳۵۰)

''الفقہ الاسلامی'' میں ہے: والأولیٰ کتابة اعلانات والصاقها علی ابواب المساجد وغیرها فتحققت الغایة المطلوبة من التعریف، وقد أصبح هذا مألوفا فی عصرنا کما یمکن التعریف بالجرائد والصحف الیومیة. (الفقه الاسلامی ۶/۴۸۶۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مدفون خزانہ کا استعمال

سوال: اگر زمین میں مدفون خزانہ نکلے تو اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر خزانہ کسی کی مملوکہ زمین سے درآمد ہوا ہے، تو اس کو دیدیا جائے، ورنہ جس کو ملا ہے وہ اس کو استعمال کرسکتا ہے؛ بشرطیکہ اس پر اہل اسلام کی علامت نہ ہو، اگر اہل اسلام کی علامت ہے تو وہ لقطہ کے حکم میں ہے، جس کا اعلان کرکے مالک تک یا اس کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔ (درمختار شامی ۲/۵۱، ۵۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

كتاب الأضحية

پورے خاندان کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی

سوال: کیا احناف کے یہاں ایک بکرا پورے خاندان کی طرف سے قربانی کے لیے کافی نہیں ہے؟ جبکہ اس بارے میں حدیثیں موجود ہیں؛ چنانچہ ترمذی، ابن ماجہ، موطا امام مالک، میں ہے: حضرت عطاء بن یسارؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا، کہتے تھے: ہم قربانی کرتے تھے، ایک بکرا اپنے اور اپنے تمام گھر والوں کی طرف سے، بعد اس کے فخر سمجھ کر ہر ایک کی طرف سے ایک ایک بکرا قربانی کرنا شروع کیا۔ ابوداؤد میں ہے: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بقرعید کے دن عیدگاہ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ چکے، ایک مینڈھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، آپ نے اپنے ہاتھ سے اسے ذبح کیا، اور فرمایا "بسم اللّٰہ اللّٰہ اکبر" یہ میری طرف سے ہے، اور میری امت میں اس شخص کی طرف سے جس نے قربانی نہیں کی۔ مسلم کی روایت میں بھی یہ الفاظ ہیں: ایک مینڈھا پکڑ کر لٹایا، اور فرمایا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آل کی طرف سے۔ ہماری کونسی دلیل ہے جس کی بناء پر ہم ایک مینڈھا پر ایک قربانی کر سکتے ہیں؟ کیا روایتیں صحیح ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جو آدمی صاحبِ نصاب واستطاعت ہو، اس پر اپنی قربانی ضروری ہے، اس پر یہ لازم نہیں کہ وہ اپنی اولاد یا اپنی بیوی، یا دیگر اہلِ خانہ کی طرف سے قربانی کرے، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی روایت کا یہی مطلب ہے کہ جو غنی اور صاحبِ نصاب ہوتا تھا، وہ اپنی اولادِ صغار اور اہلِ بیت کی طرف سے مستقل قربانی نہیں کرتا تھا؛ یہاں تک کہ لوگ فخر ومباہات

کے طور پر سب اہلِ بیت کی طرف سے مستقل قربانی کرنے لگے؛ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی؛ اس لیے کہ ان پر وجوب بھی نہیں، اس روایت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اگر دیگر اہلِ خانہ بھی غنی ہوں، اور صاحبِ نصاب ہوں تب بھی ایک بکری سب کی طرف سے کافی ہوجاوے گی؛ چنانچہ حضرت ابوسریمہ رضی اللہ عنہ کی روایت جو ابن ماجہ میں موجود ہے، اس سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں: "حملني أهلي على الجفاء بعد ما علمت من السنة كان أهل البيت يضحون بالشاة والشاتين، والآن يخلنا جيراننا" دیکھئے: اس روایت میں الشاۃ کے ساتھ شاتین بھی وارد ہے، اگر یہ بطریقِ اشتراک تھا، تو ایک بکری سے زیادہ کی ضرورت بالکل نہیں تھی، لیکن چونکہ وجوب کا مبنیٰ یسار ہے جو گھر کے ذمہ دار کو حاصل ہوتا ہے، اور عموماً گھر کا ذمہ دار ایک یا کبھی دو ہوتے ہیں، اس لیے اہل بیت واحد ایک اور دو بکری کی قربانی کرتے تھے، اور دیگر خورد وکلاں کی طرف سے نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ بعد میں یہ چیز فخر ومباہات کے طور پر چل پڑی۔

دوسرا واقعہ جو آپ نے نقل فرمایا ہے، اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں تو یہ الفاظ ہیں: "اللّٰهم هذا عني وعمن لم يضح من امتي" (اے اللہ یہ میری طرف سے، اور میری امت میں سے جو قربانی نہ کر پائے اس کی طرف سے) اور حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: "اللّٰهم هذا عن امتي جميعا لمن شهدلك بالتوحيد وشهد لي بالبلاغ" (اے اللہ یہ میری تمام امت جو تیری وحدانیت اور میری رسالت کی مقر ہو، اس کی طرف سے) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قربانی کے ثواب میں سب کو شریک کرلیا گیا، یعنی کوئی آدمی اگر خود قربانی کرے اور اس کے ثواب میں اپنے علاوہ دوسرے کو

بھی شامل کرلے، (چاہے وہ دوسرا ایک فرد ہو یا متعدد افراد ہوں) تو یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی جائز ہے، باقی اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے جو آپ سمجھ رہے ہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی وہ قربانی (بہ روایت ابورافع رضی اللہ عنہ) تمام امت محمدیہ کی طرف سے کافی ہوگئی، اور اس کے بعد کسی امتی کو قربانی دینے کی ضرورت ہی نہیں، گویا قربانی کا باب ہی شریعت میں نہیں رہے گا؛ حالانکہ کوئی بھی یہ مطلب نہیں سمجھتا، اور اگر یہی مطلب ہوتا تو آپ ﷺ کے اس قربانی کردینے کے بعد امت میں قربانی کا طریقہ رائج ہی نہ ہوتا؛ حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کے بعد بھی برابر قربانی دیتے رہے، دلائلِ احناف تو وہ بھی کتبِ مطولہ میں مذکور ہیں، ایک دو نقل کردیتا ہوں؛ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتلادوں کہ کسی مقلد کو دلیل کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، کیا آپ نے تمام مسائلِ دین کے دلائل پر واقفیت حاصل فرمالی؟ اگر نہیں تو پھر کیوں ان مباحثوں میں الجھتے ہیں؟ دین کی ناقص معلومات کے ساتھ یہ روش آپ کی دینداری کے لیے مضر ہوگی۔ بہرحال وہ روایات بھی ملاحظہ فرمالیں:

عن ابي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من كان له سعة ولم يضح، فلا يقربن مصلانا.

عن ابن عباس رضي الله عنه أن النبي ﷺ أتاه رجل، فقال: إن على بدنة وأنا موسر، ولاأجدها، فاشتريها فأمره النبي ﷺ أن يبتاع بسبع شياه، فيذبحهن.

عن جابر رضي الله عنه قال: أمرنا رسول الله ﷺ أن نشترك في الإبل والبقر كل سبعة منا في بدنة؛ لما ثبت أن النبي ﷺ عدل البدنة بسبع شياه، ثم جعل البدنة عن سبعة أنفس، ثبت من كلا الأمرين أن الشاة عن واحد كما لا

يخفى، فثبت من النصوص كون الشاة عن واحد من دون حاجة إلى القياس. (اعلاء السنن ۱۷/۲۰۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بکرے کی قربانی میں شرکت پر مشتمل ایک مباحثہ کا جواب

سوال: کیا ایک بکرا یا بھیڑ پر گھر کے کل آدمیوں کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے؟ زید شافعی کہتا ہے سات آدمی کی طرف سے ایک بیل یا گائے اور ایک آدمی کی طرف سے ایک بکرا قربانی کرنا درست ہے، گھر کے کل آدمیوں کی ایک بکرا یا بھیڑ میں شرکت ناجائز اور غلط ہے، عمر کہتا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک قربانی سنت ہے، اور ایک بکرا گھر کے کل آدمیوں کی طرف سے کافی ہے۔ "کتاب الأم" ۱۸۷/۲ پر امام شافعیؒ نے ایسا ہی لکھا ہے۔ اور امام نووی شافعیؒ "روضة الطالبين" ۱۹۸/۲ پر لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے تمام گھر والوں کی طرف سے ایک بکرا قربانی کرے تو کافی ہوگی اور یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا، شافعی مسلک سے زید اور عمر کے تکرار کا تفصیل سے جواب دیجئے۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

"شرح المهذب" اور "تحفة المحتاج بشرح المنهاج مع حاشيه" عبدالحمید کی "كتاب الاضحية" کا مطالعہ کرنے سے امام شافعیؒ کا مسلک درباب قربانی احقر جو سمجھا ہے، پہلے وہ عرض کرتا ہوں، اس کے بعد زید و عمر کے مباحثہ پر لکھوں گا، انشاءاللہ۔

اصل مسئلہ سے پہلے بطورِ تمہید ایک بات سمجھئے کہ جس طرح فرض کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ؛ اسی طرح سنت کی بھی دو قسم ہیں: سنت عین اور سنت کفایہ۔

فرض عین کا مطلب یہ ہے کہ شخصی طور پر ہر آدمی پر اس کی ادائیگی ضروری ہے، گویا اس کام کا ہر ایک کی طرف سے وجود میں آنا ضروری ہے، مثلاً: پنج وقتہ نمازیں فرض عین ہیں، اب ہر شخص (جو مکلّف ہو) کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کو انجام دے؛ جبکہ فرض کفایہ میں مقصود اس کام کا وجود میں آنا ہے، چاہے تمام حضرات (جن سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہے) اس کو انجام دیں یا ان میں سے ایک فرد اس کو انجام دے، مثلاً: نماز جنازہ، کہ مطالبہ تو سب سے لیا گیا ہے، لیکن اگر ایک فرد بھی نماز جنازہ پڑھ لے گا تو شریعت کا مقصود حاصل ہو جاوے گا؛ البتہ ثواب تو صرف اسی کو ملے گا، جس نے نماز پڑھی ہے، لیکن ذمہ داری سب سے ساقط ہو جائے گی، اور اگر سب پڑھیں گے، تو اس صورت میں بھی شریعت کا مقصود حاصل ہو جاوے گا اور ثواب سب کو ملے گا اور کسی نے نہیں پڑھی، تو شریعت کا مقصود فوت ہو جاوے گا، جس کی وجہ سے سب گنہ گار ٹھہریں گے۔ سنت کی دونوں قسموں کو بھی اسی طرح سمجھئے کہ سنتِ عین میں ہر ایک سے مطالبہ ہے کہ اس سنت کو ادا کرے، اب اگر ایک یا بعض افراد اس کو ادا کریں گے، تو باقی افراد پر مطالبۂ سنت باقی رہے گا؛ جبکہ سنت کفایہ میں اگر ایک یا بعض افراد نے ادا کر دیا، تو اصل سنت ادا ہوگئی؛ لیکن ثواب صرف اسی کو ملے گا، جس نے ادا کی ہے، علامہ نوویؒ نے شرح مہذب ۴/۵۹۴ میں جہاں سلام وغیرہ کے مسائل ذکر کئے ہیں، وہاں اس کی تفصیل فرمائی ہے۔

تمہید مذکورۂ بالا کے بعد اب ہمارا اصل مسئلہ سمجھئے: امام شافعیؒ کے نزدیک ایک گھر والوں پر قربانی سنت کفایہ ہے، چنانچہ علامہ نوویؒ ''شرح مہذب'' میں فرماتے ہیں:

قال أصحابنا: التضحية سنة على الكفاية في حق أهل البيت الواحد الخ.

(٣٨٤/٨) جس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر کے تمام افراد پر سنت ہے، گویا ادائے سنت کے مطالبہ میں تمام شریک ہیں، اب اگر تمام افراد الگ الگ قربانی کریں گے، تو ہر ایک سنت کی ادائیگی کرنے والا سمجھا جاوے گا، لیکن اگر گھر کے تمام افراد میں سے ہر ایک نے قربانی نہیں کی؛ بلکہ کسی فرد واحد نے قربانی کی، تو اس صورت میں تمام پر سے مطالبہ ساقط ہوگیا، لیکن سنت کا ثواب تو صرف اسی آدمی کو ملے گا، جس نے قربانی کی ہے، اور قربانی ادا صرف اسی کی طرف سے ہوئی، جس نے کی ہے۔

چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: فإذا ضحى حصل سنة التضحية في حقهم، قال الرافعي: الشاة الواحدة لا يضحى بها إلا عن واحد؛ لكن إذا ضحى بها واحد من أهل بيت، تأتي الشعار، والسنة لجميعهم، قال: وعلى هذا حمل ماروي أن النبي ﷺ ضحى بكبشين، قال: اللّٰهم تقبل من محمد، و آل محمد. قال: وكما أن الفرض ينقسم إلى فرض عين وفرض كفاية، فقد ذكر الأصحاب أن التضحية كذلك، وإن التضحية مسنونة لكل أهل بيت، هذا كلام الرافعي الخ. (شرح مهذب ٣٨٤/٨)

"تحفة المحتاج" میں ہے: ومعنى كونها سنة كفاية مع كونها تسن لكل منهم سقوط الطلب بفعل الغير لا حصول الثواب لمن لم يفعل كصلاة الجنازة. (٣٤٥/٩) اس کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے محشی رقمطراز ہیں: (قوله سقوط الطلب بفعل الغير) يحتمل أن المراد أصل الطلب، لا الطلب على الاطلاق؛ حتى لو فعلها كل ولو على الترتيب وقعت أضحية وأثيب. (٣٤٥/٩)

لیکن اس کے باوجود ایک بکری کی قربانی ایک آدمی کی طرف سے ہوگی، زیادہ کی طرف سے نہیں۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: تجزئ الشاة عن واحد، ولا تجزئ عن أكثر من واحد؛ لكن إذا ضحى بها واحد من أهل البيت تأدى الشعار في حق جميعهم الخ. (شرح المهذب ۳۹۷/۸) "تحفه" میں ہے: وتجزئ الشاة الضائنة والماعزة عن واحد فقط اتفاقاً لا عن أكثر. (تحفة المحتاج ۳۴۹/۹)

اب زید وعمر کی گفتگو کی طرف توجہ دیجئے: زید کا کہنا کہ ایک آدمی کی طرف سے ایک بکرا قربانی کرنا درست ہے، گھر کے کل آدمیوں کی ایک بکرا یا بھیڑ میں شرکت ناجائز اور غلط ہے، اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اس کے بالمقابل عمر کا یہ فرمانا کہ ایک بکرا گھر کے کل آدمیوں کی طرف سے کافی ہے، اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ اس سے سنت کفایہ ادا ہوجاوے گی، تو یہ بھی درست ہے۔ اور اگر اس کا مطلب یہ لیا جاوے کہ ایک بکرے میں تمام کی شرکت جائز ودرست ہے، تو اس صورت میں غلط ہوگا، اور چونکہ عمر کا یہ کلام زید کے کلام کے جواب میں ہے، اور زید کے کلام میں شرکت کا مسئلہ چھیڑا گیا ہے، اس لیے عمر کے کلام میں بھی شرکت والا مطلب ہی لیا جاوے گا، اور اس کے کلام کی تغلیط کی جاوے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

قربانی کے شرکاء گوشت کس طرح تقسیم کریں؟

سوال: یہاں قربانی کے دنوں میں قربانی کے گوشت کے سلسلے میں یہ طریقہ

رائج ہے کہ قربانی کے بڑے جانور کے ساتوں شرکاء اپنی رضامندی سے یہ کہتے ہیں: آپس میں جو شریک اپنے لیے جتنا چاہے اتنا لے لیوے اور باقی تمام صدقہ کر دیا جائے، تو کیا اِس طریقے پر صدقہ اور تقسیم کرنا درست ہے یا نہیں؟

نیز ایک ہی فیملی کے سات شرکاء ہو، اس وقت بھی تقسیم ضروری ہے یا بہ قدر ضرورت چار پانچ کیلو گوشت لے کر باقی کو صدقہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

اور اگر ایک فیملی کے چار شریک ہوں اور باقی اجنبی ہوں، تو اس صورت میں برابر سرابر سات حصے کرنا ضروری ہے؟ یا ایک جانب چار وزن کر کے الگ کر دیا جائے اور باقی تینوں کو وزن کر کے علاحدہ کر دیا جائے، یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تقسیم ضروری نہیں ہے؛ لیکن اگر شرکاء آپس میں تقسیم کرنا چاہیں تو وزن کر کے برابر کرنا ضروری ہے، اندازہ اور تخمین سے درست نہیں۔

ایک خاندان کے تمام شرکاء ہونے کی صورت میں بہ قدر ضرورت رکھ کر بقیہ کا صدقہ کر دینا درست ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تقسیم اندازہ سے کرنا چاہتے ہو تو ساتھ سر، پائے اور کھال کو بھی ملالیں؛ تاکہ درست ہو جائے۔

ويقسم اللحم وزنا لا جزافا؛ إلا إذا ضم معه من الأكارع والجلد صرفا للجنس لخلاف جنسه (درمختار) (قوله: ويقسم اللحم) انظر هل هذه القسمة متعينة أو لا؟ حتىٰ لو اشترىٰ لنفسه ولزوجته وأولاده الكبار بدنة ولم يقسموها تجزيهم أو لا؟ والظاهر أنها لا تشترط؛ لأن المقصود منها الإراقة

وقد حصلت ....وحاصله أن المراد بيان شرط القسمة إن فعلت، لا أنها شرط. إلخ(شامي ٥/٢٢٣)فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ:العبد احمد عفی عنہ خانپوری،۸/شعبان ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح:عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

قربانی اور زکوٰۃ کا نصاب

سوال: قربانی کے لیے کتنا مال ہونا ضروری ہے؟ کیا زکوٰۃ کی مقدار یا اس سے کم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اپنی حوائجِ اصلیہ اور دَین کو چھوڑ کر بقدرِ نصاب مال اگر موجود ہے تو قربانی واجب ہے، زکوٰۃ میں بھی یہی نصاب ہے؛ البتہ اس میں نامی ہونا ضروری ہے، جبکہ قربانی کے لیے نمو کی قید نہیں ہے۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

حضور ﷺ کی طرف سے قربانی اور گوشت کا حکم

سوال: حضور اکرم ﷺ کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں؟ کیا بغیر وصیت کے قربانی کر سکتے ہیں؟ اس کے گوشت کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ اللہ کے نام سے قربانی کرتے ہیں تو بتاؤ یہ کرنا کیسا ہوگا؟ کیا کوئی غیر مسلم اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو کھانا حلال ہوگا؟ کیا قربانی کا گوشت کافر کو دے سکتے ہیں؟ جبکہ یہ مسلمانوں کی ضیافت ہے، اللہ رب العزت کی جانب سے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضور ﷺ کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں، اور بغیر وصیت کے بھی میت کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے، ان دونوں قربانیوں کے گوشت کا بھی یہی حکم ہے جو اپنی قربانی کے گوشت کا ہے، قربانی تو اللہ کے نام سے ہی ہوتی ہے؛ اس لیے کہ یہ بھی ایک عبادت ہے، اور یہ عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے، ذبح کرنے والا مسلم یا کتابی ہونا ضروری ہے، وہ غیر مسلم جو کتابی نہ ہو اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرے، غیر مسلم ذمی کو قربانی کا گوشت دینا جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۷/۴۳۴) یہ اجازت غیر مسلم ذمی کے حق میں تبعاً للمسلم دی گئی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ایک سال سے کم بالغ بکرے کی قربانی

سوال: ایک بکرا ہے جس کی عمر ایک سال سے کم ہے؛ لیکن وہ بالغ ہے (اتنی عمر میں بکری کو اس سے حمل ٹھہر جاتا ہے) تو کیا ایسے بکرے کی قربانی کرنا صحیح ہے؟ اثبات یا نفی میں جواب مع الدلیل مطلوب ہے، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

ایسے بکرے کی قربانی درست نہیں ہے، پورے سال کا ہونا ضروری ہے۔ لا يجوز الجذع من المعز وغيره بلا خلاف، كما في القهستاني. (شامي ٥/٢٢٦) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۱۹/ صفر ۱۴۱۰ھ

ایک ہی جانور میں قربانی اور عقیقہ کرنا

سوال: کیا جائز ہے ایک جانور پر قربانی وعقیقہ بیک وقت کرنا؟ اگر جائز ہے تو عام فہم زبان میں جواب مع الدلیل مطلوب ہے، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اگر بڑے جانور میں جس میں شرکت کی اجازت شریعت کی طرف سے ملی ہوئی ہے، (مثلاً: اونٹ یا گائے میں) اگر شریک ہونے والے حضرات میں سے ایک نے قربانی کی نیت کی ہے، اور دوسرے نے عقیقہ کی نیت کی ہے تو درست ہے، اس لیے کہ ان تمام کا مقصود اللہ تعالیٰ کا تقرب ہے، اگر چہ جہتیں مختلف ہیں، قربانی بھی تقرب الی اللہ کی غرض سے کی جاتی ہے، اور عقیقہ بھی اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے: إن الجهات وإن اختلفت صورة فهي في المعنى واحد؛ لأن المقصود من الكل التقرب إلى الله عز شانه، وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد وُلِد له من قبل، لأن ذلك جهة التقرب إلى الله عز شانه بالشكر عما أنعم عليه من الولد. (۷۲/۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

فاسد بیع کے ذریعہ خریدی گئی گائے کی قربانی

سوال: زید اور بکر نے ایک گائے خریدی سالم سے، اور گائے کی قربانی ان دونوں نے کردی، بعدہ علم ہوا کہ زید وبکر کا بیع کرنا فاسد ہے، تو آیا زید اور بکر کی قربانی

درست ہوگی یا نہیں؟ مع حوالہ کتب جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صورتِ مسئولہ میں زید اور بکر کی قربانی درست ہوگئی۔

ولو اشترىٰ شاة بيعا فاسدا، فقبضها، فضحى بها، جاز؛ لأنه يملكها بالقبض. (بدائع الصنائع ٥/٧٧) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

فقہ شافعی میں جس نے اپنی قربانی نہ کی ہو اس کا مرحوم والدین کی جانب سے قربانی کرنا

درج ذیل مسائل کا جواب مسلک شافعی کے مطابق دیجئے۔

سوال: (۱) میرے والدین نے مجھ کو قربانی کرنے کی وصیت کی ہے، اس کے مطابق میں صرف مرحومین والدین کی جانب سے قربانی کرنا چاہتا ہوں، اور میں نے ابھی تک اپنی جانب سے قربانی نہیں دی ہے؛ لہذا میں اپنے والدین کی جانب سے قربانی دے سکتا ہوں یا نہیں؟ اور اس طرح کی قربانی دینا شرعاً درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ یاد رہے کہ ہمارے دارالافتاء سے فقہ حنفی کے مطابق فتاویٰ صادر کئے جاتے ہیں، ہم فقہ شافعی کے مطابق فتاوی نہ تو صادر کرتے ہیں اور نہ ہمیں فقہ شافعی کی کتابوں سے مزاولت ہے، اس لیے آپ کے لیے مناسب یہی ہے کہ کسی شافعی المسلک مفتی سے

حکم معلوم کریں؛ البتہ آپ کی سہولت کے پیشِ نظر شرح المہذب (علامہ نوویؒ) سے آپ کی دریافت کردہ باتوں کا جواب تحریر ہے، کسی شافعی المسلک مفتی سے تصدیق کئے بغیر اس کو آخری نہ سمجھیں۔

(۱) میت کی طرف سے قربانی کرنا جبکہ اس کی وصیت میت نے کی ہے بلا تردد درست ہے، اس لیے جب آپ کے والدین نے وصیت فرمائی ہے تو آپ کا ان کی طرف سے قربانی کرنا صحیح ہے۔ واما التضحية عن الميت فقد اطلق ابوالحسن البعادى جوازها؛ لانها ضرب من الصدقة، والصدقة تصح عن الميت وتنفعه وتصل اليه بالاجماع، وقال صاحب العدة والبغوى: لا تصح التضحية عن الميت؛ إلا ان يوصى بها، وبه قطع الرافعى فى المجرد. (شرح المهذب ۸/۴۰۶)

رہا آپ کا اپنی ذات کا معاملہ تو امام شافعیؒ کے نزدیک خوشحال پر قربانی واجب نہیں ہے؛ بلکہ سنتِ مؤکدہ ہے، اور وہ بھی علی الکفایہ ہے، یعنی ایک گھرانے والوں میں سے ایک فرد نے قربانی کردی تو سب کی سنت ادا ہوگئی۔

قال اصحابنا: التضحية سنة على الكفاية فى حق اهل البيت الواحد، فاذا ضحى احدهم حصل سنة التضحية فى حقهم، قال الرافعى: الشاة الواحدة لا يضحى بها الا عن واحد؛ لكن اذا ضحى بها واحد من اهل بيت تأتى الشعار والسنة لجميعهم الخ (شرح المهذب ۸/۳۸٤) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

ایضاً

سوال: (۲) فلاں ابن فلاں اپنے مرحومین والدین کی جانب سے قربانی دینا

چاہتا ہے؛ حالانکہ اس کے والدین نے وصیت نہیں کی ہے کہ وہ ان کی جانب سے قربانی کریں، اوراس فلاں ابن فلان نے اپنی جانب سے ابھی تک قربانی تو نہیں کی ہے؛ مگر وہ اپنی جانب سے صرف اپنے مرحومین والدین کی جانب سے قربانی کرنا چاہتا ہے لہٰذا شرعاً وہ قربانی دے سکتا ہے کیا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۲) جب ان صاحب کے والدین نے وصیت نہیں کی ہے، تو ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ بجائے والدین کی طرف سے قربانی کرنے کے اپنی طرف سے کرے، اس لیے کہ میت کی طرف سے وصیت نہ ہونے کی صورت میں اس کی طرف سے قربانی درست ہونے کے مسئلہ میں مشائخِ شافعیہ کا اختلاف ہے، ابوالحسن بعادیؒ کے نزدیک درست ہے، اور صاحبِ عدۃؒ وعلامہ بغویؒ کے نزدیک درست نہیں ہے، اور علامہ رافعیؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ (عبارتِ منقولہ بالا) اس لیے اختلافی بات میں پڑنے کے بجائے ایسا کام کیوں نہ کریں جو سب کے نزدیک درست ہو، اور وہ اپنی طرف سے قربانی کرنا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سوال: (۳) ایک شخص کی اولاد صاحبِ استطاعت ہے، اور وہ اولاً اپنے والدین کی جانب سے قربانی کرنا چاہتے ہیں، (اور والدین حیات نہیں) مگر اس شخص کی اولاد نے ابھی تک اپنی جانب سے قربانی تو نہیں کی ہے، تو اس صورتِ مسئولہ میں یہ اولاد ایسے والدین کے لیے قربانی کا انتظام کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کی قربانی نہ ہوتے ہوئے ان کا اپنے والدین کی جانب سے قربانی دینا شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۳) اگر اولاد نے یہ قربانی والدین سے اجازت لیے بغیر ان کی طرف سے کی تو والدین کی طرف سے نہیں ہوئی۔

ولو ضحى عن غيره بغير اذنه لم يقع عنه. (شرح المهذب ۸/۴۰۶)

جب والدین کی طرف سے نہیں ہوئی تو خود قربانی کرنے والے کی طرف سے ہوئی یا نہیں؟ تو یہ اختلافی مسئلہ ہے، بعض مشائخ کہتے ہیں کہ اگر وہ جانور نذر کے ذریعہ متعین کر لیا گیا تھا تو خود قربانی کرنے والے کی طرف سے ہوئی، ورنہ نہیں، اور بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ بہر صورت قربانی کرنے والے کی طرف سے ہوگئی۔

قال اصحابنا واذا ضحى عن غيره بغير اذنه فان كانت الشاة معينة بالنذر وقعت عن المضحى، والا فلا، كذا قاله صاحب العدة وآخرون، واطلق الشيخ ابراهيم المروزى انّها تقع عن المضحى. (شرح المهذب ۸/۴۰۶،۴۰۷)

اس لیے اگر اولاد والدین کی طرف سے قربانی کرنا چاہتی ہے تو ان کی اجازت لے کر کرے، ورنہ اپنی طرف سے کرے کہ اس صورت میں بھی سنت سب کی طرف سے ادا ہو جاتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتے نے کاٹ لیا ہوا ایسی گائے کی قربانی

سوال: اگر کسی گائے کو کتے نے کاٹ لیا ہو، اور ایک سال گزر گیا ہو اور زخم بالکل مندمل ہو چکا ہو، آیا ایسی گائے کی قربانی جائز ہے؟ اور اگر جائز ہے تو اس کا گوشت

کھانے کے کام میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کتے کا کاٹ لینا ان عیوب میں سے نہیں ہے جن کی بناء پر جانور قربانی کے لائق نہیں رہتا، اس لیے سوال میں مذکور گائے کی قربانی، بشرطیکہ کوئی دوسرا عیب مانع عن الاضحیۃ نہ ہو تو بلا تردد درست ہے؛ نیز جب اس کا زخم مندمل ہو کر سال بھر گزر گیا ہے تو اس کے گوشت میں بھی کوئی مضر مادہ موجود نہیں ہے اس لیے اس کے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۳۹۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مقروض پر قربانی

سوال: میرے پاس پچاس ہزار روپیہ قرض ہے، وہ قرض ادا نہیں ہوا ہے، اور میں مہینہ میں ایک ہزار روپیہ کماتا ہوں، تو میرے اوپر قربانی کرنا اور زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آپ پر جو قرض ہے، وہ اور آپ کی دیگر حوائجِ اصلیہ کو وضع کرنے کے بعد اگر آپ کے پاس اتنی رقم بچ جاتی ہے جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی ہے، اور اس پر ایک سال بھی گزر چکا ہے تو آپ پر زکوٰۃ واجب ہے، اور اگر اس پر سال نہیں گزرا تو زکوٰۃ واجب نہیں؛ البتہ قربانی دونوں صورتوں میں واجب ہے، اور اگر اتنی رقم جو ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر نہیں پہنچتی، اور دوسرا کوئی زائد از ضرورت سامان بھی آپ کے پاس

موجود نہیں ہے تو قربانی بھی واجب نہیں۔ (شامی جلد دوم) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چرمِ قربانی کی قیمت مسجد میں استعمال کرنا

سوال: کیا متولی کا چرمِ قربانی کی قیمت کو مسجد کے کام، مثلاً مسجد کی مرمت، لائٹ وغیرہ میں خرچ کرنا جائز ہوگا؟ باحوالہ بالتفصیل جواب سے نوازیں کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

متولی کو جو کھال دی گئی ہے، اگر بطورِ وکالت ہے، (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) تب تو متولی اس کی قیمت کو مسجد کے کسی بھی کام میں خرچ نہیں کرسکتا؛ بلکہ اس قیمت کا غریب کو دینا واجب ہے، اور اگر بطورِ تملیک ہے، تب متولی اس کی قیمت کا خود مالک ومختار ہے، چاہے اپنی کسی ضرورت میں استعمال کرے اور اگر چاہے مسجد کے کسی کام میں یا اور کوئی کارِ خیر میں لگائے، یہ کھال متولی کو بطورِ تملیک دی گئی ہے، اس کی علامت یہ ہے کہ متولی اگر اس کی قیمت خود اپنے استعمال میں لائے، تب بھی اس پر اعتراض نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸/ ذوالحجۃ ۱۴۱۰ھ

مرحوم کے لیے قربانی کی چند صورتیں

سوال: زید بدنہ یعنی بڑے جانور کی قربانی کرتا ہے اور اس میں اپنے مرحوم والد اور آنحضور ﷺ کو ایصالِ ثواب کی غرض سے اپنی طرف سے دو حصہ رکھتا ہے اور ایصالِ ثواب کی نیت کرتا ہے، تو شرعاً یہ صورت جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

میت کی طرف سے اور میت کے لیے قربانی کرسکتے ہیں اور اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱) میت نے وصیت کی ہو کہ میرے مال میں سے میری طرف سے قربانی کر دینا اور وصیت کے مطابق اس کے مال میں سے قربانی کرے تو جائز ہے؛ مگر قربانی کا تمام گوشت وغیرہ حقداروں کو (جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں) صدقہ کر دینا واجب ہے۔

شامی میں ہے: (وعن ميت) أي ضحى عن ميت وارثه بأمره، الزمه بالتصدق بها، وعدم الأكل منها. (۲۹۳/۵)

(۲) میت نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، ان کے عزیز واقارب یا احباب اپنے پیسوں سے نفل قربانی کر دیں تو درست ہے، اور اس کا گوشت امیر وغریب سب کھا سکتے ہیں۔

وإن تبرع بها عنه له الأكل؛ لأنه يقع على ملك الذابح والثواب للميت. (شامی ۲۹۳/۵)

(۳) اپنے مال سے اور نام سے نفل قربانی کر کے اس کا ثواب ایک یا ایک سے زائد میت کو بخشدے، تو وہ بھی درست ہے اور اس کا گوشت بھی امیر وغریب سب کھا سکتے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۸۶/۲)

حضور اکرم ﷺ کے لیے مستقل ایک حصہ رکھ کر اس کی قربانی درست ہے اور اس میں ایصالِ ثواب کی نیت بھی درست ہے۔

والأصل أن كل من أتى بعبادة ماله جعل ثوابها لغيره. (درمختار) قوله (لغيره) أي من الأحياء، والاموات. بحر عن البدائع. قلت: وشمل اطلاق الغير النبي ﷺ، ولم أر من صرح بذلك من أئمتنا، وفيه نزاع طويل لغيرهم، والذي رجحه الإمام السبكي وعامة المتاخرين منهم الجواز، كما بسطناه

آخر الجنائز. (شامی ۲/۲۵۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

مشترکہ کاروبار میں قربانی کس پر واجب ہوگی؟

سوال: ہم چار بھائی ہیں، سارے شادی شدہ ہیں، اور ایک ہی دوکان پر بیٹھتے ہیں، ہماری تقریباً تین لاکھ پر زکوٰۃ، یعنی ساڑھے سات ہزار روپیہ زکوٰۃ نکلتی ہے، ہمارا کاروبار بھی شامل میں ہے اور کھانا پینا بھی شامل میں ہے، ہم پر کتنی قربانی واجب ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دوکان میں جو چار بھائی شریک ہیں، ان میں سے ہر ایک کا حصہ دوکان میں اتنا ہو جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوتی ہو، تو ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہے، اور ہر ایک پر قربانی بھی واجب ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۷/۳۱۳۔ امداد الفتاویٰ ۲/۵۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۸/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

چرم قربانی کا مصرف

سوال: ادارہ ہر سال اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے چرمِ قربانی جمع کرتا ہے، اس چرم قربانی کو فروخت کرنے پر حاصل ہونے والی رقم کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ اطلاعاً عرض ہے کہ اس ادارہ میں کوئی غریب یا یتیم بچہ نہیں ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چرمِ قربانی کے فروخت سے حاصل شدہ رقم غرباء ومساکین (یعنی مستحقین

زکوٰۃ) کو بطورِ تملیک دیدی جائے، یا اگر ادارہ میں کوئی ایسا شعبہ ہو جس کے ذریعہ غرباء ومصیبت زدہ لوگوں کی امداد کی جاتی ہو، تو اس کام میں لگائیں، مثلاً غریب بیمار کی دوائیاں خریدنے میں، غریب بیوہ عورت کی امداد میں وغیرہ۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۹/صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

چرمِ قربانی کا مصرف

سوال: (۱) چرم قربانی کے مصرف کیا کیا ہیں؟ (۲) کیا متولی، امام، مؤذن کو دینا جائز ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱،۲) قربانی کی کھال امیر، فقیر سب کو دینی جائز ہے، اس کے لیے فقیر ہونا شرط نہیں؛ لیکن اگر فروخت کردی ہے، تو اس کی قیمت کا صدقہ کرنا، یعنی غریب کو دینا واجب ہے، قربانی کی کھال کو خود اپنے کام میں لانا، یعنی ڈول (مصلیٰ) وغیرہ بنانا بھی جائز ہے، مگر کھال یا اس کی قیمت کو کسی اجرت میں دینا درست نہیں، امام (یا مؤذن) عام طور پر اس کو اپنی اجرت میں شمار کرتے ہیں؛ لہٰذا ان کو بھی درست نہیں؛ البتہ اگر امام کی تنخواہ مستقل ہو اور کھال اس کو نہ دی جاتی ہو، پھر اس کو کوئی دیدے، تو درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۳۳۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

چرمِ قربانی کا مصرف

سوال: (۱) ہمارے محلّہ کے مدرسہ میں گاؤں کے لڑکے پڑھتے ہیں، باہر کے

طالب علم نہیں ہیں، جن کو کھانا پینا دیا جائے۔

(۲) ہمارے محلّہ کے اکثر لڑکے کویت کے سفری ہیں، یہ لڑکے ہر ماہ مدرسین کی تنخواہ کویت سے بھیجتے ہیں، اس کے علاوہ مدرسہ کی چند دکانیں ہیں، اور دو مکان مدرسہ کے نباہنے کے لیے۔

(۳) ہمارے محلّہ میں لوگ اکثر صاحبِ نصاب وخوش حال ہیں۔

(۴) ہمارے مدرسہ کی کمیٹی کے کچھ ممبران محلّہ کی قربانی کی کھالوں کو جمع کر کے بیچ کر اس کی قیمت کو حیلہ کر کے اپنی مرضی کے موافق خرچ کرتے ہیں، اور کمیٹی کے کچھ ممبران اس حیلہ کو ناپسند کرتے ہیں۔

(۵) ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قربانی کی کھالوں کی قیمت میں تملیک شرط ہے، اور یہ قیمت غربا ومساکین کا حق ہے۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

قربانی کی کھال قربانی دینے والا اپنے استعمال میں لانا چاہے، مثلاً: اس کا ڈول بنایا یا مصلیٰ بنایا اور کسی کام میں استعمال کیا تو درست ہے، اسی طرح کسی دوسرے کو دیا، اور اس نے اپنے کام میں استعمال کیا، تو یہ بھی درست ہے؛ لیکن اگر قربانی دینے والے یا اس کے وکیل نے وہ کھال بیچ دی، تو اب اس سے جو رقم حاصل ہوئی اس کا صدقہ کر دینا ضروری ہے، جس میں تملیک شرط ہے، اس رقم کو مدرسین کی تنخواہ میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

(درمختار مع شامی ۵/ ۲۳۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۷/ ذوالقعدہ الحرام ۱۴۰۸ھ

چرمِ قربانی کا مصرف

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرح متین دریں مسئلہ کہ قربانی کے چمڑے کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں یا فرش مسجد بنا سکتے ہیں؟ اس کا جواب باصواب مدلل عنایت فرمائیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر قربانی کی کھال آپ یا دیگر حضرات متولی مسجد کی ملک کر دیں، پھر ان کو فروخت کر کے متولی نے مسجد میں صرف کر دیا تو درست ہے اور اگر بغیر تملیک کے ان کو فروخت کر کے قیمت تعمیر مسجد میں خرچ کی گئی، تو یہ صورت ناجائز ہے، ایسی صورت میں ان قیمتوں کا صدقہ کرنا لازم ہے، چرمِ قربانی کو اگر فروخت کر دیا جائے، تو قیمت کا صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس قیمت کو مسجد میں صرف کرنا درست نہیں ہوتا؛ ہاں اگر صاحب قربانی خود (یا اس کا نائب و وکیل) فروخت نہ کرے؛ بلکہ کسی دوسرے کو مالک بنا دے، تو وہ فروخت کر کے جہاں چاہے، قیمت صرف کر سکتا ہے۔ (از فتاوی محمودیہ ۴/ ۳۳۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۳/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

چرمِ قربانی وغیرہ کی قیمت تعمیرِ مسجد وغیرہ میں صرف کرنا

سوال: چرمِ قربانی کو محلّہ میں جمع کر کے اس کو فروخت کر کے تعمیرِ مسجد کرنا جائز ہے؟

(۱): فرش جماعت خانہ کے باہر والا حصہ کو بنانا اس پیسے سے جائز ہے؟

(۲): کیا مسجد کی تعمیر کرنا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

چرمِ قربانی کو جب فروخت کردیا گیا، تو اس کی رقم کا صدقہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اس لیے اس رقم سے مسجد یا فرش مسجد کی تعمیر درست نہیں؛ البتہ اگر وہ رقم کسی محتاج فقیر کو دے کر اس کو مالک بنا دیا گیا، اور اس نے اپنی مرضی سے بلا کسی جبر کے وہ رقم تعمیرِ مسجد یا فرشِ مسجد میں استعمال کے لیے دی تو درست ہے۔ (درمختار مع شامی ۵/۲۳۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عقیقہ میں ولیمہ کا حصہ

سوال: ہمارے یہاں شادی ہے اور ہم اپنے بچوں کا (دو لڑکوں کا) عقیقہ کرنا چاہتے ہیں، ہمارا ارادہ عقیقہ میں بڑا جانور ذبح کرنے کا ہے؛ لیکن پورے سات حصے عقیقہ کے نہیں، صرف چار حصے ہیں، بڑا جانور ذبح کر کے چار حصے عقیقے کے نکال کر بقیہ تین حصے جو عقیقہ کے نہیں وہ شادی کے کھانے میں استعمال کریں، تو کیا ایسا کر سکتے ہیں؟ اور کیا عقیقہ میں اس طرح جانور ذبح کرنا (کہ چار حصے عقیقہ کے ہوں، اور تین نہ ہوں) کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اگر ولیمہ مسنونہ ہے، تو عقیقہ کے جانور میں ولیمہ کا حصہ رکھا جا سکتا ہے، اور اس کی وجہ سے عقیقہ باطل نہیں ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ ۴/۳۱۳ سے ماخوذ) اگر محض گوشت خوری کی نیت سے بقیہ حصے رکھے ہیں تو عقیقہ باطل ہوجاوے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بڑے جانور میں دو کا عقیقہ

سوال: یا دو لڑکوں کی طرف سے پورا (بڑا) جانور ذبح کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

بڑے جانور میں دو بچوں کا عقیقہ درست ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۴/۳۲۶) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قربانی میں عقیقہ کا حصہ

سوال: بالغ ہونے سے قبل قربانی کر سکتے ہیں جبکہ اس کا عقیقہ نہیں ہوا ہے؟ کیا بلوغ کے بعد عقیقہ کر سکتے ہیں؟ گائے، بیل اور اونٹ پر کتنے بچوں کا عقیقہ ہوگا؟ کیا اس کا حکم قربانی کی طرح ہے؟ اگر قربانی کے دنوں میں کسی نے گائے ذبح کرنے کا ارادہ کیا، اس میں اس کے تین حصے ہوں، باقی کی جانب سے عقیقہ ہوسکتا ہے؟ کیا عقیقہ کے گوشت کے تقسیم کا حکم قربانی کے گوشت کی طرح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نابالغ کی طرف سے اس کا باپ اپنے مال میں سے قربانی کرے یہ مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔ (شامی ۵/۲۲۲) قربانی کا درست ہونا عقیقہ ہونے پر موقوف نہیں ہے، اس کا عقیقہ نہ ہوا ہو تب بھی اس کی طرف سے قربانی درست ہے، بلوغ کے بعد بھی عقیقہ کیا جاسکتا ہے، بڑے جانور میں سات حصے عقیقہ کے بھی رکھے جا سکتے ہیں، قربانی کے جانور میں عقیقہ کے حصہ کی نیت بھی کر سکتے ہیں، یعنی مثلاً: تین حصے قربانی کے ہیں اور بقیہ چار حصوں میں عقیقہ کی نیت کریں، یہ بھی درست ہے، عقیقہ کے گوشت کی تقسیم کا وہی حکم ہے جو قربانی کے گوشت کا ہے۔ (احکام عقیقہ مالا بدمنہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

كتاب الحظر والإباحة

ضرورت کی وجہ سے مرغیوں کی چونچ کاٹنا

سوال: دراصل ہمارے علاقہ میں بڑے پیمانہ پر پولٹری فارم (مرغی خانہ) کا کاروبار چلتا ہے اور فارمر (مرغی خانہ کے مالک) بالعموم مولوی صاحبان ہیں، اس وجہ سے جو اشیاء مشتبہ ہیں، ان کی تحقیق کر کے جائز صورتیں اختیار کرنا چاہتے ہیں:

(۱) من جملہ ان مسائل کے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ضرورتاً ان کی چونچ (منقار) سال بھر کے عرصہ میں دو مرتبہ کاٹی جاتی ہے اور کاٹنے کی ضرورت اور علت یہ ہے:

(الف) کاٹنے میں خود ان کی حفاظت ہوتی ہے، کیونکہ اگر نہ کاٹی جائے تو آپس میں لڑتی ہیں اور جہاں کسی مرغی کو ایک قطرہ بھی خون نکلا تو ساری مرغیاں مل کر اس کو مار ڈالتی ہیں، اسی طرح روزانہ مرغیاں مرتی جائیں گی؛ اس لیے چونچیں سب کی کاٹ دی جاتی ہیں؛ تاکہ لڑائی نہ کر سکیں اور یہ سب سے بڑی وجہ کاٹنے کی ہے۔

(ب) دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر نہ کاٹی جائیں تو دانہ (خوراک) بگاڑتی زیادہ ہیں اور کھاتی کم ہیں۔

(ج) ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان مرغیوں کو مخصوص قسم کا خوراک (فیڈ) کھلایا جاتا ہے، جس میں بعض باریک قسم کے پاؤڈر ان کی نشو ونما اور تقویت کے لیے ملائے جاتے ہیں، تو اگر چونچیں نہ کاٹی جائیں تو فیڈ میں سے بڑے بڑے دانے کھالیں گی اور باریک پاؤڈر جو ان کے تقویت کے لیے کھلانا ضروری ہے، نہیں کھا سکتی، جس کی وجہ سے ان کے نشو ونما میں کمی ہوگی، جس سے پروڈکشن (انڈوں کی پیداوار) پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے، اور فارمر کو نقصان اٹھانا پڑے گا؛ لہٰذا اس کا شرعی حکم واضح فرمائیں۔

(۲) چونچیں کاٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ کاٹنے کا ایک خاص برقی آلہ ہوتا ہے، جس کی بلیڈ بجلی سے گرم سرخ ہوتی ہے، جس کے نیچے دبا کر چونچ کا اوپر والا حصہ تقریباً نصف اور نیچے والا تہائی کے قریب کاٹا جاتا ہے اور کاٹتے وقت خون بھی آجاتا ہے، جس کو بند کرنے کے لیے گرم بلیڈ پر داغ دیا جاتا ہے، لہٰذا یہ طریقہ شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟ بصورت عدمِ جواز کوئی دیگر شکل جواز کی دل میں آئے تو تحریر فرما کر ممنون فرمائیں، چونچیں کاٹنے کا اور اس کا طریقہ جو مذکور ہوا، ان دونوں کا تفصیلی جواب مطلوب ہے۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

(۱،۲): جائز ہے۔

ويجوز (فصد البهائم، وكيُّها، وكل علاج فيه منفعة لها). (درمختار على هامش الشامي ٥/٥٣٠) ولا بأس بقطع إلية الشاة إذا انفلتت ويمنعها اللحوق بالقطيع، يخاف عليها الذئب. (عالمگيري ٥/٣٦١) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کشیدہ کاری میں جاندار کی تصویر بنانا

سوال: یہ ہمارا ریگستان علاقہ ایک پسماندہ علاقہ ہے، ابھی سرکار نے کشیدہ کاری کا کام شروع کروایا ہے فلاح کے لیے جس کو عموماً مسلم خواتین جانتی ہیں اور دستی کام ہونے کی وجہ سے وہ ماہر بھی ہیں اور ذریعہ معاش بھی اکثروں کا کشیدہ کاری ہے، مسئول مطلوب اب تک اس میں کئی قسم کے آئٹم ہوتے ہیں، جس میں ہاتھی کی شکل، اونٹ، سور وغیرہ جو پلاسٹک کے لیے کٹائے ہوتے ہیں، وہ ان کو کپڑے پر گوٹھے کر لیتی، چاروں طرف سے کشیدہ کر کے پھر اس پر ستارو کانچ کی ٹکیہ وغیرہ لگا دیتی ہیں؛ تاکہ وہ شتر دار

ہوجائے اور ایسا ہی آڈر ہوتا ہے تو یہ کسب بت گری میں تو نہیں آتا؟ جوحکم ہواز روئے شریعت کے، مرقوم فرماویں، اللہ تعالیٰ آپ کومزید علم کے فیوض وبرکات وانوارات سے نوازے، وفلاح دارین عنایت فرمائے۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

کسی جاندار کی تصویر بنانا چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، کشیدہ کاری کی شکل میں ہو یا پینٹ کے ذریعہ؛ بہرحال حرام ہے۔ واعلم: أن فعل التصوير حرام مطلقاً - أي تصوير الحيوان - سواء كانت صغيرة أو كبيرة، مجسمة أو سطحة، ممتهنة أو موقرة. (فيض الباری ٤/٣٨٢،٣٨٣) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کعبہ کے فوٹو میں انسانوں کی تصویر ہو تو رکھنا کیسا ہے؟

سوال: اکثر کعبہ شریف کے فوٹو فریم ہوکر جس میں انسانوں کی بھی صاف تصویریں نظر آتی ہیں، لوگ اس کو خرید کر مسجدوں میں لگاتے ہیں، تو کیا یہ اس حدیث کی خلاف ورزی نہیں ہے جس میں حضور ﷺ نے جاندار کی تصویر لگانے سے منع فرمایا ہے، مدلل مع حوالہ کے جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

اگر ان انسانی تصویروں کے اعضاء بھی نمایاں ہیں تو ان کا لگانا جائز نہیں۔

ولا يكره (إلىٰ قوله) أو كانت صغيرة لا تتبين تفاصيل أعضائها

للناظر قائما، وهي على الأرض، ذكره الحلبي. (درمختار علی ھامش الشامی ۱/۴۷۹)

اوراس صورت میں نماز بھی مکروہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

قبر کی تصویر لینا

سوال: قبرستان میں جا کر فوٹو کھینچ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

صرف قبر کی تصویر لی جا سکتی ہے۔(جواہر الفقہ ۳/۲۰۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بوری شیعہ کو سلام کرنا

سوال: کیا بوری شیعہ اسلام سے خارج ہیں؟ کیوں؟ کیا ان کو سلام کر سکتے ہیں؟ اگر وہ سلام کریں تو اس کا کیا جواب دیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شیعوں کے بہت فرقے ہیں، بعض کافر ہیں، مثلاً جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت یا حلول کا اعتقاد رکھتے ہیں، یا غلط فی الوحی یا افک عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا قرآن مجید میں کمی زیادتی کے قائل ہیں۔ (کفایت المفتی ۱/۲۸۶) چونکہ مذکورہ تمام صورتوں میں نصوصِ قطعیہ متواترہ کی تکذیب لازم آتی ہے، اس لیے تکفیر کی جاتی ہے، ان لوگوں کو سلام نہیں کرنا چاہئے، اگر یہ لوگ سلام کریں تو جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا جائے۔ یا "هداك الله" کہہ دینا چاہئے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۵/۲۲۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ہر سلام کے ساتھ مصافحہ کرنا

سوال: ایک شخص سے روزانہ دن میں پانچ مرتبہ ملاقات ہوتی ہو،، اور وہ ہر دفعہ سلام کے ساتھ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاوے، تو اس طرح ہر دفعہ مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حدیث پاک میں مصافحہ کی بڑی فضیلت آئی ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مامن مسلمین یلتقیان فیتصافحان الا غفر لهما قبل ان یتفرقا" (ابوداؤد شریف)

جب دو مسلمان مل کر باہم مصافحہ کریں، تو ان کے جدا ہونے سے پہلے ہی ان کی مغفرت ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ باہم ملاقات کے وقت سلام کے بعد مصافحہ مسنون و مستحب ہے۔ چنانچہ علامہ نووی "کتاب الاذکار" میں فرماتے ہیں: اعلم انها سنة مجمع علیها عند التلاقی. (الاذکار ۲۳٦)

بوقتِ ملاقات مصافحہ کا مسنون ہونا متفق علیہ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

فان محل المصافحة المشروعة اول الملاقاة. (مرقات شرح مشکوٰۃ ٤/٥٧٥)

مشروع مصافحہ کا محل شروع ملاقات کا وقت ہے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا جب تم لوگ نبی کریم ﷺ سے ملتے تھے تو آنحضرت ﷺ تم لوگوں سے مصافحہ فرماتے تھے؟ تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: مالقیته قط الا صافحني. (ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعانقة) میں نے جب بھی نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی تو آنحضرت ﷺ نے مجھ سے مصافحہ فرمایا؛ چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: اعلم ان هذه

المصافحة مستحبة عند كل لقاء. (الاذكار ۲۳۷) کہ ہر ملاقات کے وقت مصافحہ مستحب ہے، اس لیے اگر کوئی شخص ہر ملاقات کے وقت سلام کے ساتھ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس کے ساتھ مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ اس کو ضروری اور لازم نہ سمجھے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ذکر و تلاوت میں مشغول شخص کو سلام و مصافحہ کرنا

سوال: جماعت خانہ میں کوئی شخص ذکر، تلاوت یا تسبیح وغیرہ میں مشغول ہو اس کو سلام کرنا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانا کیسا ہے؟

نوٹ: ہمارے امام صاحب ہمیشہ جواباً ہر نماز سے پہلے یا کبھی نماز کے بعد ایک شخص سے مصافحہ کیا کرتے ہیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

جو شخص مسجد میں ذکر، تلاوت یا تسبیح میں مشغول ہو اس کو سلام و مصافحہ نہ کیا جائے، مکروہ ہے۔

درمختار میں ہے: سلامك مكروه على من ستسمع ومن بعد ما ابدیٰ يسنّ ويشرع مصل وتال، ذاكر، ومحدث. (درمختار)

علامہ شامیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (قوله سلامك مكروه) ظاهره التحريم. ط. (شامی ۱/۴۵۵) یعنی اس قسم کے لوگوں کو سلام کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں يأثم بالسلام على المشغولين بالخطبة او الصلوٰة او قراءة القرآن. (۱/۴۵٦) جو حضرات نماز خطبہ یا تلاوت قرآن میں مشغول

ہوں ان کو سلام کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ: اگر کسی نے ان کو سلام کیا تو ان پر جواب لازم نہیں ہے۔ یکره السلام على المصلي والقاری والجالس للقضاء او البحث فی الفقه او التخلی، ولو سلم عليهم لا يجب عليهم الرد؛ لانهم في غير محله. اه ومفاده ان كل محل لا يشرع فيه السلام لا يجب رده الخ.(شامی ۱/۴۵۷)

نوٹ میں تحریر کردہ عبارت سے آپ کا کیا مقصد ہے؟ اس کی وضاحت کے بعد جواب دیا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۶/ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا

سوال: اگر کوئی آدمی ہندوستان کے اندر ریل گاڑی کے اندر بغیر ٹکٹ کے سفر کرے، تو کیا اللہ کے نزدیک کوئی گناہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ جائز نہیں۔ (ماخوذ از امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۵۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بچہ کی برابر پرورش نہ کرنے کے خوف سے عزل کرنا

سوال: میں پچیس سالہ شادی شدہ عورت ہوں، شادی کا دوسرا مہینہ چل رہا ہے، سسرال میں ہم آٹھ لوگ 10/B کے روم میں رہتے ہیں، بمبئی میں میں گریجویٹ ٹیچر ہوں، کانوینٹ سے پڑھی ہوں، دین میں بہت دلچسپی رکھتی ہوں؛ جہاں تک خدا توفیق دے،

عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور دنیا کی لائن سے بھی جائز حدود تک میں واقف ہوں، مجھے بڑا کٹھن مسئلہ درپیش ہے، امید ہے کہ آپ اپنے فتویٰ سے میری تسکین فرمائیں گے۔

میرے گھر والے بستی (U.P.) کے ہیں، بھوجپوری زبان استعمال کرتے ہیں، گھر کا ماحول نہ دین کے لائن سے قابل برداشت ہے، نہ دنیا کے لائن سے ڈھنگ ہے جینے کا، صرف میرے شوہر جو کمپیوٹر انجینئر ہیں ٹھیک ہیں، جس Locality میں ہم رہ رہے ہیں، وہ بھی بچوں کی پرورش کے لیے بالکل صحت مند نہیں، دور تک کوئی مسجد نہیں ہے، وہاں کے مسلم اذان سننے کو ترس جاتے ہیں۔ دوسری بات: دوسرا مکان لینے کے لیے ابھی وقت نہیں ہے کیونکہ نیا بزنس ہے میرے شوہر کا، دو سے تین سال تو نیا گھر اچھے AREA میں لینے کو لگ جائیں گے اور اس ماحول میں- جو جاہلانہ ہے- میں اپنی اولاد کی پرورش نہیں کرسکوں گی، اپنے ڈھنگ سے دین ودنیا کے میل میں ان کی پرورش نہ کر پاؤں گی، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ دوسال تک بچہ نہ ہونے دوں، بعد میں سوچ لیں گے، میں نوکری پیشہ عورت ہوں، اگر بچہ فوراً ہوگیا، تو وہ گھر کے ماحول میں رنگے گا، جو میں بالکل برداشت نہ کرسکوں گی، زبان بھی بھوجپوری سیکھ لے گا، بتائیے! میں اس مسئلہ کو کیسے حل کروں، میں بہت پریشان رہتی ہوں، دن رات اس بارے میں سوچتی ہوں، مجھے برائے کرم مہربانی! کوئی میرے حق میں ٹھیک فتوی دے کر تسکین فرمائیں اور بچوں میں فاصلہ رکھنا ایسی حالت میں کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں آپ کے شوہر آپ کی اجازت سے عزل کرنا چاہیں تو

کر سکتے ہیں، عزل کا مطلب یہ ہے کہ جماع میں انزال کے وقت عضو مخصوص کو باہر نکال لیں، جس کی وجہ سے انزال باہر ہو۔ (درمختار ۲/ ۴۱۱، ۴۱۲ کوئٹہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ضبطِ تولید شریعت کی نظر میں

سوال: آج کل سائنسی ترقی کی بناء پر ضبط تولید کے لیے عورتیں اپنی شرمگاہ میں کوئی خاص چیز جو رسی کے طرح ہوتی ہے، لگا لیتی ہیں، پھر جماع کرنے سے حمل نہیں ٹھہرتا ہے، پھر دو سال میں جب چاہتی ہیں نکال لیتی ہیں، پھر حمل ٹھہرنے لگتا ہے، ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے، جیسے آج کل دنیا میں ضبط تولید کے نام سے اس کی سینکڑوں صورتیں رائج ہوگئی ہیں، اس کو بھی رسول اللہ ﷺ نے "وأد خفي" فرمایا ہے، یعنی خفیہ طور سے بچہ کو زندہ درگور کر دینا۔ (کما رواہ مسلم عن حذافه بنت وهب) اور بعض دوسری روایات میں جو عزل یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے، اس پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے سکوت یا عدم ممانعت منقول ہے، وہ ضرورت کے موقع کے ساتھ مخصوص ہے، وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لیے قطع نسل کی صورت نہ بنے۔ (مظہری) (معارف القرآن ۸/ ۶۸۳) ضرورت کی تعیین کے سلسلہ میں اپنی رائے پر عمل نہ کرے؛ بلکہ وجہ ضرورت ظاہر کر کے سوال کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ضبطِ تولید کا حکم

سوال: توالد وتناسل کو بند کرنے کے لیے عزل کا طریقہ مشروع ہے، کیا اس کے علاوہ عصرِ حاضر میں دائمی طور پر آپریشن کرانا، یا عارضی طور پر جدید طور طریقہ استعمال کرنا بلا عذر کے جیسے (NIRODH) یا (TAB) کا استعمال کیسا ہے؟ اگر کسی عورت نے کرالیا دائمی آپریشن، تو اس کی تلافی کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ (FAMILY PALANING) کب جائز ہے؟ اور عذر کب شمار ہوگا؟ جواب سے ممنون ومشکور فرمائیں تو عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر ضرورت محسوس ہو تو بحالتِ عذر جب تک عذر باقی ہے، چند دن کے لیے ضبطِ حمل کی تدبیر ومعالجہ کرسکتے ہیں؛ لیکن بدون شرعی عذر کے بچہ دانی نکال کر دائماً اولاد سے محروم ہونے کی کوشش کفرانِ نعمت ہے۔

اگر عورت کی صحت خراب ہونے کی وجہ سے اس میں حمل برداشت کرنے کی قوت نہ رہی ہو، اور جان کا خطرہ ہو اور آپریشن کے بغیر چارۂ کار نہ ہو، اور اس کی اجازت مسلمان دیندار حکیم حاذق یا مسلمان دیندار تجربہ کار ڈاکٹر دیتا ہو تو آپریشن کراسکتے ہیں۔ (از فتاویٰ رحیمیہ ۲/۲۳۴) عزل یا جدید طریقوں میں سے کوئی ایسا طریقہ جس کے نتیجہ میں نطفہ رحم میں نہ جائے، ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے، وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لیے قطع نسل کی صورت نہ بنے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بذریعۂ آپریشن بچہ دانی نکال دینا

سوال: ہندہ زوجۂ زید کو تقریباً ڈیڑھ دو سال سے دم حیض بند تھا، علاج کے بعد وقتاً فوقتاً آتا رہا ہے، وہی شکایت کھڑی ہونے پر اطباء سے رجوع کیا گیا، ان کا کہنا یہ ہے کہ بچہ دانی میں گانٹھ ہونے کی وجہ سے خون کا راستہ بند ہوگیا ہے، اس کا آپریشن کرنا ضروری ہے، ساتھ ہی ساتھ بچہ دانی نکلوانے کا بھی مشورہ دیا ہے، بتاتے ہیں اس وقت بائیں طرف گانٹھ ہے، آئندہ دائیں طرف ہونے کا امکان قوی ہے، اور یہ گانٹھ عرصہ کے بعد کینسر کا اثر بھی پیدا کرسکتی ہے، گانٹھ کی وجہ سے رحمدانی کا منہ کشادہ ہوگیا ہے، اس لیے استقرارِ حمل منہ بند نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، ڈاکٹروں نے زید سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کے پہلے ہم گانٹھ نکالیں گے، پھر آپ کو رحمدانی کی حالت اور اس کی پوزیشن بتلائیں گے، آپ کو اگر تشفی ہوگی اور آپ حکم دیں گے تو ہم رحمدانی نکالیں گے، ورنہ آپ کی رائے پر چھوڑ دیں گے، تو دریں صورت از روئے شرع شریف زید کے لیے کیا حکم ہوگا؟ کیا زید ہندہ کی رحمدانی بھی نکلوانے پر آمادہ ہوجائے، یا پھر صرف گانٹھ کا آپریشن کرنے پر اکتفاء کرے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

موجودہ صورتِ حال میں صرف احتمال ہے، اس لیے صرف گانٹھ کا آپریشن کرنے پر اکتفاء کریں، آئندہ چل کر اگر واقعی جان کا خطرہ لاحق ہو اور بذریعۂ آپریشن بچہ دانی نکالے بغیر چارۂ کار نہ ہو اور اس کی اجازت مسلمان دیندار حکیم حاذق، یا مسلمان دیندار تجربہ کار ڈاکٹر دیتا ہو، تو آپریشن کرسکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کمزوری کی وجہ سے مانعِ حمل طریقہ کا استعمال

سوال: عورت بہت کمزور ہوگئی ہے، بچوں کی صحیح پرورش بھی نہیں کرسکتی، یا بچوں کی ولادت سے بہت زیادہ کمزوری آجاتی ہے، یا نطفہ ٹھہرنے کے بعد تین چار ماہ تک کچھ کھانا پینا مشکل ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں خون کی کمی واقع ہوجاتی ہے، ان تمام وجوہات کی وجہ سے عورت اگر آپریشن کرلے جس کی وجہ سے ولادت کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے، درست ہے یا غیر درست؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

پرورش کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے، اگر وہ کمزوری کی وجہ سے نہیں کرپاتی تو باپ کو چاہئے کہ دایا کا نظم کرے، رہی کمزوری جو ولادت کے بعد آتی ہے تو یہ مرحلہ ہر عورت کو پیش آتا ہے؛ البتہ کمزوری اتنی زیادہ ہو جو مہلک ثابت ہوسکتی ہے، تو آپریشن نہ کرائے، وقتی طور پر مانعِ حمل طریقہ استعمال میں لاوے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/ شعبان ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

حیض بند ہونے کی عمر، حصول اولاد کے لیے معالجہ کیا جائے نہ کہ مبالغہ

سوال: شادی کو دس سال ہوئے، اس دوران میں اولاد نہ ہونے پر مختلف دوا ومعالجہ کیا جاتا رہا، چھ سال کے عرصہ کے بعد ایک اولاد مردہ حالت میں بذریعۂ آپریشن (سیزر) کے ذریعہ ہوئی، اس کے بعد سے اب تک یعنی ۴، ۵ سال تک بیوی کی (M.C.) ماہواری بند ہے، مختلف ماہر طب کی خدمات میں بھی لے گیا، جدید مشینوں کے ذریعہ

Clearing کرکے (M.C.) ماہواری کو جاری کیا گیا، پھر بھی بند ہے، بہت سارے دوا علاج مختلف قسم کے دعاء، تعویذ کا بھی اہتمام کیا گیا، اس دوران میں میاں بیوی میں آپس میں رنجش نفرت وغیرہ بھی ہوا کرتی تھی، دوا معالجہ اور تعویذ ودعا پر بھی خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا، اس صورت مسؤلہ میں جب کہ بیوی کی عمر بہ مشکل ۳۰/ سال ہے، دس سال کے عرصہ میں اولاد کے لیے دعا، اولاد کا مردہ حالت میں آپریشن (سیزر) کے ذریعہ اور اس کے بعد سے اب تک یعنی چار پانچ سال تک بیوی کو (M.C.) ماہواری کا بند ہونا، مختلف دوا معالجہ کے بعد بھی افاقہ نہیں ہوا، اس کا شرعی حل کیا ہے؟ کیا کرنا چاہئے؟ عام طور پر عورتوں میں ماہواری کی مدت پچاس سے پچپن سال تک ہے، حصول اولاد کے لیے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عموماً عورتوں کو پچپن سال کی عمر کے بعد حیض کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، اس لیے فقہاء نے اس عمر کو سن ایاس (یعنی حیض کا سلسلہ بند ہونے کی عمر) قرار دیا ہے؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی عورت کو اس کے بعد حیض نہیں آ سکتا؛ بلکہ جہاں سن ایاس کی یہ مقدار فقہاء نے لکھی ہے، وہیں یہ مسئلہ بھی موجود ہے، کہ اس عمر کے بعد بھی عورت کو اگر خون آئے اور اس کا رنگ خالص خون کا رنگ ہو، یعنی خوب سرخ یا سیاہ ہو تو وہ حیض شمار ہوگا۔

ومارأته بعدهاأى المدة المذكورة فليس بحيض فى ظاهر المذهب إلا اذا كان دما خالصاً (درمختار) أى كالأسود، والأحمر القانى. درر. (شامى ۱/۲۲۲)

اسی طرح ہوسکتا ہے کہ کسی عورت کے حیض کا سلسلہ اس مقررہ مدت سے پہلے بند ہو جائے، صورت مسؤلہ میں بھی اگر چہ عورت کی عمر تیس سال ہے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ

حیض نہ آوے، اس لیے کہ حیض کے بند ہونے کے مختلف طبعی اسباب ہوا کرتے ہیں، خاص کر کے صورت مسؤلہ میں جب اس عورت کو مردہ بچہ بذریعہ آپریشن پیدا ہوا ایسی صورتوں میں بعض مرتبہ حیض کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، اس لیے شرعی اعتبار سے جب تک اس کو باقاعدہ شرعی اصول کے مطابق خون نہ آوے، وہاں تک اس پر حائضہ کا حکم جاری نہ ہوگا؛ نیز شرعی اعتبار سے یہ بھی ضروری نہیں کہ علاج معالجہ کر کے حیض کو جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

رہا حصول اولاد کا مسئلہ تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر عورت کو بچہ پیدا ہی ہو، اس سلسلہ میں قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا صاف صاف ارشاد موجود ہے: ﴿لله ملك السموت والارض يخلق مايشاء، يهب لمن يشاء اناثا، ويهب لمن يشاء الذكور، اويزوجهم ذكرانا واناثا، ويجعل من يشاء عقيما، انه عليم قدير﴾ ترجمہ: اللہ ہی کی ہے (سب) سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے؛ (چنانچہ) جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے، یا ان کو (جس کے لیے چاہے) جمع کر دیتا ہے (کہ) بیٹے بھی (دیتا ہے) اور بیٹیاں بھی، اور جس کو چاہے بے اولاد رکھتا ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔ (معارف القرآن ۷/۷۱۱)

اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: ''انسان کی تخلیق میں کسی کے ارادہ واختیار؛ بلکہ علم وخبر کا بھی کوئی دخل نہیں اور کسی کا دخل تو کیا ہوتا، انسان کے ماں باپ جو اس کی تخلیق کا ظاہری سبب بنتے ہیں،

خود ان کے ارادے اور اختیار کا بھی بچہ کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں، تخلیق میں دخل ہونا تو دور کی بات، بچہ کی ولادت سے پہلے ماں کو بھی کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اس کے پیٹ میں کیا، کیسا اور کس طرح بن رہا ہے؟ یہ صرف حق تعالیٰ کا کام ہے کہ کسی کو اولاد لڑکیاں دے دیتا ہے، کسی کو نرینہ اولاد لڑکے بخش دیتا ہے، کسی کو لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا فرما دیتا ہے، اور کسی کو بالکل بانجھ کر دیتا ہے کہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن ۷/ ۷۱۱،۷۱۲)

جب اولاد کا دینا اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھا ہے، تو اس کے حصول کے لیے شرعی حدود میں رہ کر اعتدال کی راہ چلتے ہوئے جو تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں، ان کو اپنانے میں تو کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد بھی ضروری نہیں کہ اولاد پیدا ہی ہو، جیسے دنیا کے دوسرے کاموں میں اسباب کا جو حال ہے کہ اس کو اختیار کیا جاتا ہے؛ لیکن بعض مرتبہ اس پر مطلوبہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے، اور بعض مرتبہ نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ ان اسباب کے اندر بھی تأثیر ڈالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، وہ چاہے تو ان میں تأثیر ڈال کر مطلوبہ نتیجہ پیدا کر دے ورنہ نہیں، اس لیے آپ بھی حصول اولاد کے لیے اسباب اختیار کرنے میں مبالغہ اور غلو سے کام نہ لیں، اور بقدر ضرورت بطریق اعتدال علاج معالجہ اور دعا کا اہتمام کرنے کے باوجود اولاد نہیں ہوئی تو اب اللہ کے اس فیصلہ پر دل سے راضی رہیں، اولاد نہ ہونے میں بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عسى ان تكرهوا شيئاً وهو خير لكم، وعسى ان تحبوا شيئاً وهو شر لكم، والله يعلم وانتم لا تعلمون﴾ (الآية) یعنی یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو برا سمجھو، اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو، اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر

کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو، اور (ہر شئ کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے۔ (سورۂ بقرۃ آیت ۲۱۶)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

حصول اولاد کے لیے رحم میں کیپسول رکھنا

سوال: اگر کوئی آدمی اس دور کے اندر جو دوائیں نکلی ہیں، کہ عورت کے پیٹ میں یا پھر بچہ دانی کے اندر اس طرح کا کیپسول رکھ دیا جاتا ہے، تو اس دوا کے اثر سے بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس طرح کا بچہ پیدا کرنا کیسا ہے؟ حرام کا ہوگا یا حلال؟ اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہ دوا ایسی ہے، جس کی وجہ سے عورت کے رحم کی قوتِ تولید اور صلاحیتِ استقرارِ حمل کو تقویت پہنچتی ہے، باقی بچہ تو اس عورت کے شوہر کے نطفہ سے ہی پیدا ہوتا ہے، تب تو اس دوا کا استعمال درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر یہ بات نہیں ہے؛ بلکہ کوئی دوسری صورت ہے، تو وہ کیا صورت ہے؟ اس کی تفصیل تحریر فرما کر حکم معلوم فرمالیں۔

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۶/ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

حصول ولد کے لیے مادۂ منویہ شرمگاہ میں رکھوانا

سوال: اگر کوئی آدمی اپنی عورت کی شرمگاہ میں اس لیے گولی رکھتا ہے کہ اس کی

عورت بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن مرد بھی برابر ہے؛ لیکن اس کی منی کے اندر وہ جراثیم نہیں جن سے بچہ پیدا ہوتا ہے، اور ڈاکٹروں نے انکار کر دیا ہے کہ اب چاہے کتنی ہی دوا کراؤ؛ لیکن وہ جراثیم تمہاری منی کے اندر پیدا نہیں ہوں گے، اس صورت کے اندر ڈاکٹر لوگ کسی دوسرے کی منی لے کر اپنی عورت کی شرمگاہ کے اندر یا پھر بچہ دانی میں رکھتے ہیں، اور اگر اس سے بچہ پیدا ہوا تو وہ بچہ حرام کا ہوگا یا حلال کا؟ اور اس طرح کا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اس سوال کا جواب مدلل اور تفصیل کے ساتھ مع حوالات کے جلد از جلد تحریر کیجئے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

غیر شوہر کا مادۂ منویہ لے کر اپنی بیوی کی بچہ دانی میں ڈاکٹروں سے رکھوانا حرام اور ناجائز ہے، زنا کو شریعت نے اسی لیے حرام ٹھہرایا کہ اس میں اختلاط اور اشتباہ نسب ہے، جو صورتِ مذکورہ میں پایا جاتا ہے؛ بلکہ خود شوہر کا مادۂ منویہ بھی اگر ڈاکٹروں کے ذریعہ اس کی بیوی کے رحم میں رکھوایا جائے، تو یہ بھی حرام اور ناجائز ہے؛ اس لیے کہ سترِ عورت فرض ہے، عورت کی شرمگاہ عورت غلیظہ ہے، شرمگاہ کے بالائی حصہ کو بلا وجہ شرعی دوسرے کے لیے دیکھنا جائز نہیں ہے، تو اندرونی حصہ کو دیکھنا اور شرمگاہ کو چھونا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ میاں بیوی سخت گنہگار رہوں گے اور شوہر از روئے حدیث دیوث بنے گا اور جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا۔ (مشکوۃ ۲/ ۳۱۸ باب بیان الخمر) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ریش بچہ کا حکم

سوال: ہونٹوں کے نیچے کے بال یعنی ڈاڑھی کے اوپر کے بال کا کیا حکم ہے؟

کیا اسے کاٹ سکتے ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ گنجان ڈاڑھی کے نیچے (زیادہ نیچے) کے بال جو حلق کے قریب کے بال ہوتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ امید ہے بیان فرما کر مطمئن فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ریش بچہ کے جانبین لب زیریں کے بال منڈوانے کو فقہاء نے بدعت لکھا ہے۔ (بہشتی زیور حصہ ۱۱ ص ۷۷ مدنی) حلق کے بال منڈوانا نہ چاہئے؛ مگر ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ (ایضاً) حلق کے بالوں کا چنوانا اور منڈوانا شرعاً درست ہے، نہ منڈوانا بہتر ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۸/۲۸۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ڈاڑھی کتروانا

سوال: ڈاڑھی ایک بالشت سے کم کتروانا کیا جائز ہے؟ کتنی لمبی ڈاڑھی رکھنا واجب ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ڈاڑھی قبضہ سے کم کرنا حرام ہے؛ بلکہ یہ دوسرے کبیرہ گناہوں سے بھی بدتر ہے، اس لیے کہ اس کے علانیہ ہونے کی وجہ سے اس میں دینِ اسلام کی کھلی توہین ہے اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے بغاوت کا اظہار واعلان ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۳/۲۶۰)

ڈاڑھی ایک مشت تک بڑھنے دینا واجب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مختون کی ختنہ

سوال: میرے ایک دوست کا لڑکا ہے، وہ قدرتی طور پر ختنہ شدہ ہے، ختنہ سنتِ ابراہیم ہے، کرنا ضروری ہے؛ مگر وہ چیز ہی نہیں جو کاٹی جاتی ہے، ہر طرح ختنہ شدہ ہے، اب اس کے لیے کیا مسئلہ ہے؟ آپ کا مشورہ کیا ہے؟ لکھئے، کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر اس بچہ کی سپاری اتنی کھل ہوئی ہے کہ دیکھنے والا اس کو ختنہ شدہ سمجھتا ہے اور اب مزید کھال کاٹنا اس کے لیے باعثِ تکلیف والم ہے تو ختنہ کی ضرورت نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: صبي حشفته ظاهرة بحيث لو رآه انسان ظنه مختونا ولا تقطع جلدة ذكره الا بتشديد آلمه ترك على حاله. (درمختار على هامش الشامي ٥٢٩/٥، ٥٣٠) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حرام کمائی والے کی دعوت قبول کرنا

سوال: تبلیغی جماعتوں کی اکثر شہروں میں یا گاؤں میں بہت سے لوگ دعوتیں کرتے ہیں، جن میں سے بہت سوں کی آمدنی سود، جوا، شراب کی ہوتی ہے، یا اکثر کمائی مالِ حرام کی ہوتی ہے، اور جماعت اس دعوت دینے والے کا حال نہیں جانتی کہ اس کا کیا کاروبار ہے؟ اس صورت میں اگر دعوت قبول نہیں کرتے تو حدیث کی خلاف ورزی جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ دعوت کو قبول کرو؛ نیز دعوت دینے والا بھی ناراض ہوتا ہے، اور

اگر قبول کرتے ہیں تو پہلی بات یہ ہے کہ دعوت دینے والے کی کمائی معلوم نہیں، اور اگر معلوم ہو جائے جیسا کہ فی الحال اکثر سودی کاروبار ہے، اور مالِ حرام کے کھانے سے عبادت قبول نہیں ہوتی؛ لہذا ان دونوں صورتوں کو پیش نظر رکھ کر مدلل مع حوالے کے جواب تحریر فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دعوت قبول کرنے کا استحباب کسی مانع شرعی نہ ہونے کے ساتھ مشروط ہے، اس لیے اگر دعوت کرنے والے کی تمام آمدنی یا اکثر حرام ہے تو دعوت قبول نہ کرے؛ البتہ ایسا آدمی کسی حلال ذریعہ سے حاصل کیے ہوئے مال سے دعوت کرتا ہے تو دعوت قبول کی جاسکتی ہے، مانع شرعی ہونے کی صورت میں دعوت قبول نہ کرنے سے حدیث کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، اور داعی کی ناراضگی کی پرواہ بھی اس صورت میں نہ کی جائے۔ "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" (مشکوۃ ۳۲۱) معلوم نہ ہونے کی صورت میں بلاوجہ شبہ کرنا درست نہیں ہے، اور اگر شبہ کی کوئی وجہ موجود ہے تو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ — یکم رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

دعوت میں دوست کو شریک کردیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: مجھے ایک جگہ ولیمہ کی دعوت تھی، شادی کی دعوت کے ساتھ ولیمہ کی دعوت تھی، اس میں لکھا رہتا ہے تم، تمھارے رشتہ دار اور دوستوں کو دعوت ہے، میرا ایک دوست ہے جبکہ اس کو دعوت نہ تھی؛ مگر مجھے دعوت تھی، میں اسے لے کر دعوت میں گیا

جہاں اس نے کھانا کھایا؛ حالانکہ اس کو دعوت نہ تھی تو کیا اس پر کوئی گناہ ہے؟ اگر گناہ ہے تو کیا کھائے ہوئے کا صدقہ کرے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دعوت دینے والے کی طرف سے اگر آپ کو اس بات کی اجازت تھی کہ آپ اپنے دوست کو بھی ساتھ لیتے جاویں، تو اس صورت میں دوست کو لے جانا بغیر دعوت نہیں، اس لیے گناہ نہیں ہے، نہ توبہ کی ضرورت ہے نہ کفارہ کی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

میوزک والی گھڑی پہننا

سوال: میوزک والی گھڑی جو دیوار پر لگاتے ہیں، یا جو ہاتھ میں میوزک والی پہنتے ہیں، اور جو آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے پر بولتی ہے تو ایسی گھڑی دیوار پر لگانا یا ہاتھ میں پہننا جائز ہے یا نہیں؟ آپ حوالہ کے ساتھ لکھ کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

میوزک سننا جائز نہیں ہے، اس لیے ایسی گھڑی جس میں گھنٹہ بجنے سے پہلے میوزک بجتا ہو، استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

وفي البزازية: استماع صوت الملاهي كضرب قصب، ونحوه حرام، لقوله عليه السلام: استماع الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر. أي بالنعمة، فصرف الجوارح إلى غير ما خلق لأجله كفر بالنعمة، لا شكر فالواجب كل الواجب. الخ (شامی ۵/۲٤٦)

البتہ اگر اس میں کوئی تدبیر عمل میں لاکر میوزک کی آواز کو بند کردیا جائے تو اس

صورت میں بلا تردد استعمال درست ہے، یہ یاد رہے کہ گھنٹہ یا الارم کی آواز اور میوزک کی آواز میں فرق ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نوکر سے پردہ

سوال: اگر کسی کے وہاں کوئی نوکر رکھا ہو صرف اس لیے کہ جب بھی چاہے اس سے کام لے سکتے ہیں، تو اس گھر کی عورتیں پردہ رکھیں گی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہر غیر محرم سے پردہ ضروری ہے، چاہے وہ گھر کے کام کاج کے لیے رکھا ہوا نوکر ہی کیوں نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کولگیٹ وغیرہ میں حرام چربی کی آمیزش

سوال: کیا کولگیٹ، (Colget) لائف بائے صابن، چائنا گھاس، جیلی؛ کیا اس کا استعمال کر سکتے ہیں جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس میں کسی جنگلی جانور کی چربی کا استعمال ہوتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مذکورہ اشیاء میں جنگلی جانور کی چربی کی ملاوٹ کا مجھے علم نہیں ہے، اگر شرعی طریقہ سے ان اشیاء میں جنگلی جانور کی چربی کی ملاوٹ ثابت ہو جائے اور وہ جانور حرام ہے یا حلال ہے؛ لیکن غیر مذبوحہ ہے، تو اس صورت میں ان کا استعمال جائز نہ ہوگا؛ لیکن

بلاتحقیق حرام کہنا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کولگیٹ میں خنزیر کی چربی کی آمیزش

سوال: کثرت سے سننے میں آتا ہے، کولگیٹ میں خنزیر کی چربی کا استعمال ہوتا ہے، تو اس کا استعمال جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہمارے سننے میں تو ایسی کوئی بات نہیں آئی، باقی اگر کسی کو اس میں خنزیر کی چربی ڈالے جانے کا یقین یا ظن غالب ہو، تو اس کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ذوالحجۃ ۱۴۱۰ھ

محمد نام رکھنے کی فضیلت

سوال: شمع شبستان رضا حصہ دوم ۵۶ پر حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو میری محبت کی وجہ سے اپنے لڑکے کا نام محمد یا احمد رکھے گا، اللہ تعالیٰ باپ اور بیٹے کو بخشے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ ملائکہ اس کے گھر کی زیارت کو آتے ہیں جس میں کسی کا نام محمد یا احمد ہے۔ ایک روایت میں ہے جس مشوروں میں اس نام کا آدمی شریک ہو اس میں برکت رکھی جاتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ تمھارا کیا نقصان ہے کہ تمھارے گھروں میں دو یا تین محمد ہوں۔ تو اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیثیں صحیح ہیں یا نہیں؟ اور کونسی کتاب کی ہیں؟ امید ہے کہ حضرت والا تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

"الفوائد المجموعة في الاحاديث الموضوعة" میں پہلی روایت کے متعلق لکھا ہے: ذكره إبن الجوزي في الموضوعات: وقال في اسناده من تكلم فيه، وقال في اللآلي: هذا أمثل حديث اورده في الباب واسناده حسن. (٤٧١)

علامہ سیوطیؒ کی "اللآلي الموضوعة" کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی گئی "الفوائد المجموعة" کے محشی تحریر فرماتے ہیں: هيهات! راح السيوطي ينظر في آخر السند، وغفل عن أوله، وفي "الميزان واللسان" (حامد بن حماد العسكرى عن اسحٰق بن سيار النصيبي خبر موضوع) نذكر هذا وهذا أول سنده. (ايضاً)

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: مامن أهل بيت فيهم إسم نبي إلا بعث اللّٰه تعالىٰ إليهم ملكا (يقدسهم) بالغداة والعشي. اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے صاحب "الفوائد المجموعة" لکھتے ہیں: رواه الخطيب عن علي وابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہم مرفوعاً، وفي اسناده من رمى بالكذب، وقد أورده ابن الجوزي في الموضوعات، ورواه ابن عدى بلفظ: من بركة الطعام أن يكون عليه رجل إسمه اسم نبي، وقال: باطل، ورواه ايضاً بلفظ مااطعم طعام على مائدة ولا جلس عليها وفيها إسمي الأقدس كل يوم مرتين، وقال هذا الحديث غير محفوظ، انتهى. وفي اسناده من لا يجوز الاحتجاج به. (٤٦٩، ٤٧٠)

تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: مااجتمع قوم في مشورة فيهم رجل إسمه محمد لم يدخلوه في مشورتهم إلا لم يبارك لهم فيه. اس پر تبصرہ فرماتے

ہیں: رواه ابن عدي عن علي مرفوعاً، وقال: حديث غير محفوظ، وقال في الميزان: أنه كذب، وقد اورده ابن الجوزى في الموضوعات. (۴۷۱)

چوتھی روایت باوجود تلاش کے نہ ملی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نومسلم کے ساتھ سیٹھ کا نام لگانا

سوال: اگر کوئی غیر مسلم مسلمان ہوگیا اور اب وہ اس کا سیٹھ جو مسلمان ہے، اس کے وہاں ہی رہتا ہے، اس کے بعد سیٹھ نے سوچا کہ لڑکا اچھا ہے، اس کی شادی کروادیں، تو اس نے اس کی شادی کروادی اور شادی کے اندر لڑکے کے نام کے ساتھ اس کے سیٹھ کا نام لگادیا، جو کہ اس کا باپ نہیں ہے، تو کیا یہ سیٹھ کا نام لگانا جائز ہے؟ اور اگر جائز ہے تو اس سیٹھ کے مال میں وارث ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ سیٹھ اس نومسلم لڑکے کا باپ نہیں ہے، اس لیے اگر اس سیٹھ نے اپنا نام اس نومسلم لڑکے کے نام کے ساتھ بحیثیت باپ لگایا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے۔ ﴿ادعوهم لآبائهم﴾ الخ سیٹھ کے مال میں اس نومسلم کو میراث نہیں ملے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

خسر کو باپ کہنا

سوال: ہمارے یہاں مسجد کے اندر ایک مولانا نے تقریر کی اور اس کے اندر بیان فرمارہے تھے اور بیان تھا حجۃ الوداع کا، اور انھوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے عرفات کے میدان میں فرمایا: اے لوگو! اپنے باپ کے علاوہ کسی کو باپ نہیں کہہ سکتے؛ لیکن

ہمارے یہاں اگر کوئی پوچھتا ہے کہ فلاں کون ہے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ وہ میرے خسر ہیں، لیکن داماد خود پکارتا ہے تو باپ کہہ کر پکارتا ہے، تو یہ مولانا کے بیان کے مطابق خسر کو باپ کہنا ہوا، تو باپ کہنا کیسا ہے؟ مفتیان کرام حدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب دیں اوراسی طرح ماں کے بارے میں بھی بتادیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حدیث پاک میں نبیٔ کریم ﷺ کاارشاد ہے: لا ترغبوا عن آباء كم، فمن رغب عن أبيه فهو كفر. (بخاری شریف ۲/ ۱۰۰۱) یعنی اپنے والد کی طرف انتساب سے نفرت نہ کیا کرو، جس شخص نے (صرف فخر ومباہات کے لیے) اپنے والد سے رشتہ توڑا (اور کسی مشہور شخصیت سے جوڑا) تو یہ بھی ایک کفر کی بات ہے۔ (ترجمان السنہ ۲/ ۳۶۶ دارالاشاعت)

ایک دوسری حدیث میں ہے: من أدعى إلى غير أبيه وهو يعلم أنه غير أبيه فالجنة عليه حرام. (بخاری ۲/ ۱۰۰۱) یعنی جو شخص اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کی طرف یہ جانتے ہوئے کرے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے، تو ایسے آدمی پر جنت حرام ہے۔

چونکہ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگ فخر ومباہات کے طور پر اپنی بڑائی جتلانے کے لیے خود کو اپنے باپ کی طرف نسبت کرنے کے بجائے کسی مشہور شخصیت کی طرف منسوب کرتے تھے، اس لیے نبیٔ کریم ﷺ نے اس حرکت پر یہ وعید ارشاد فرمائی، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ان دونوں حدیثوں کی شرح فرماتے ہوئے ابن بطالؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: وإنما المراد به من تحول عن نسبته لأبيه إلى غير أبيه عالماً عامداً مختاراً الخ. (فتح الباری ۱۲/ ۵۵) علامہ عثمانیؒ پہلی حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں: لاترغبوا عن آباء

کم الخ، يقال رغب عن أبيه أي ترك الانتساب إليه وجحده. (فتح الملہم ۱/۲۳۶)

رہا کسی آدمی کا اپنے کسی خاندانی بزرگ کو تعظیم وتکریم کے طور پر مجازاً باپ کہنا، یہ اس میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ جائز ہے، قرآن وحدیث میں اس کے نمونے موجود ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے بوقتِ وفات جب اپنے بیٹوں سے اقرار لیا کہ تم لوگ میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ تو بیٹوں نے جواب میں عرض کیا ﴿قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰـهَكَ وَإِلٰـهَ اٰبآئك ابرٰهم واسمٰعيل واسحٰق﴾ (سورہ بقرہ ۱۳۳)

دیکھئے یہاں آباء میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی شمار کردیا، حالانکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپ نہیں؛ بلکہ چچا ہوتے ہیں۔

علامہ آلوسیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: وقدم اسمٰعيل في الذكر على اسحٰق عليه السلام لكونه أسن منه، وعده من آباء يعقوب عليه السلام مع أنه عمه تغليباً للأكثر على الأقل، أو لأنه شبه العم بالأب لانخراطهما في سلك واحد، وهو الاخوة، فاطلق عليه لفظه، ويؤيده ما أخرجه الشيخان عم الرجل صنو ابيه .... والآية على حد ما أخرجه إبن أبي شيبة وغيره من قوله عليه الصلوٰة والسلام: إحفظواني في العباس، فإنه بقية آبائي. (روح المعانی پ۱/۳۹۱)

اسی طرح قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے: ﴿واذ قال ابرٰهيم لابيه اٰزر﴾ الخ (سورہ انعام ۷۴) بہت سے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، قرآن پاک میں مجازاً اس کو باپ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: ومنهم من قال: إسم جده، ومنهم من قال: إسم عمه،

والعم والجد يسميان اباً مجازاً. (روح المعاني پ۷/۱۹٤)

حدیث پاک میں غزوۂ حنین کے قصہ میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد: "أنا النبي لا كذب أنا ابن عبدالمطلب" منقول ہے، اس میں حضور ﷺ نے اپنی نسبت اپنے دادا عبدالمطلب کی طرف فرمائی، اس لیے کہ عرب میں آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی شہرت آپ کے والد عبداللہ کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ علامہ عینیؒ "شرح بخاری" میں فرماتے ہیں: واما انتسابه إلى عبدالمطلب دون أبيه عبدالله فلشهرة عبدالمطلب بين الناس، بخلاف عبدالله فإنه مات شابا. (عمدة القاري ۲۹٦/۱۷)

ایک مرتبہ آیت کریمہ ﴿الذين استجابوا لله والرسول من بعد ما اصابهم القرح﴾ الخ (سورۂ آل عمران ۱۷۲) کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خطاب فرماتے ہوئے فرمایا کہ: "كان أبواك منهم الزبير وأبوبكر" (تمھارے باپ زبیر رضی اللہ عنہ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں) حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے باپ نہیں؛ بلکہ نانا ہوتے ہیں، لیکن مجازاً ان پر باپ کا اطلاق کیا گیا، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: "واطلق الأب على أبي بكر رضي الله عنه وهو جده مجازاً." (عمدة القاري ۱٦۲/۱۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عرفی عالم واصطلاحی عالم

سوال: "عالِم" کس کو کہتے ہیں؟ کیا عالم یعنی بزبان العام "مولٰنا" ہی کو

کہیں گے، جس نے کسی دارالعلوم میں چند سال زانوئے تلمذ طے کیا ہو اور نصابِ تعلیم کی تکمیل کی ہو، یا ہر اس کو جسے دین کی بنیادی چیزوں کا صحیح صحیح علم ہو؟ اور احادیث میں کس عالم کی فضیلت وارد ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

آیتِ کریمہ: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: آیت میں لفظ علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات وصفات کا کما حقہ علم رکھتے ہیں اور مخلوقاتِ عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات وانعامات پر نظر رکھتے ہیں، صرف عربی زبان یا اس کے صرف ونحو وفنون بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا، جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو۔ حسن بصریؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ: عالم وہ شخص ہے جو خلوت وجلوت میں اللہ سے ڈرے اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے، وہ اس کو مرغوب ہو اور جو چیز اللہ کے نزدیک مبغوض ہے، اس کو اس سے نفرت ہو۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ليس العلم بكثرة الحديث ولكن العلم عن كثرة الخشية" یعنی بہت سی احادیث یاد کر لینا یا بہت باتیں کرنا کوئی علم نہیں؛ بلکہ علم وہ ہے جس کے ساتھ اللہ کا خوف ہو۔

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کسی میں خدائے تعالیٰ کا خوف ہے، وہ اسی درجہ کا عالم ہے اور احمد بن صالح مصریؒ نے فرمایا کہ خشیت اللہ کو کثرت روایت اور کثرت معلومات سے نہیں پہچانا جا سکتا؛ بلکہ اس کو کتاب اللہ اور سنت کے اتباع سے پہچانا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس شخص میں خشیت نہ ہو وہ عالم نہیں۔ (مظہری) اس کی تصدیق اکابر سلف کے اقوال سے ہوتی ہے: حضرت ربیع بن انسؒ نے فرمایا: "من لم يخش فليس بعالم" یعنی جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں۔ اور مجاہدؒ نے فرمایا: "إنما العالم من خشي الله" یعنی عالم تو صرف وہی ہے جو اللہ سے ڈرے۔ سعد بن ابراہیمؒ سے کسی نے پوچھا کہ مدینہ میں سب سے زیادہ افقہ کون ہے؟ فرمایا: "اتقاهم لربه" یعنی جو اپنے رب سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فقیہ کی تعریف اس طرح فرمائی: "إن الفقيه حق الفقيه من لم يقنط الناس من رحمة الله، ولم يرخص لهم في معاصي الله تعالىٰ، ولم يومنهم من عذاب الله تعالىٰ، ولم يدع القرآن رغبة عنه إلى غيره، أنه لا خير في عبادة لا علم فيها، ولا علم لا فقه فيه، ولا قراءة لا تدبر فيها." (قرطبي) فقیہ: مکمل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو گناہوں کی رخصت بھی نہ دے اور ان کو اللہ کے عذاب سے مطمئن بھی نہ کرے اور قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہ کرے، (اور فرمایا) اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جو بے علم کے ہو اور اس علم میں کوئی خیر نہیں جو بے فقہ یعنی بے سمجھ بوجھ کے ہو اور اس قرأت میں کوئی خیر نہیں جو بغیر تدبر کے ہو۔

مذکورہ تصریحات سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ بہت سے علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا کا خوف وخشیت نہیں؛ کیونکہ تصریحاتِ بالا سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک صرف عربی جاننے کا نام علم اور جاننے والے کا نام عالم نہیں، جس میں خشیت نہ ہو وہ

قرآن کی اصطلاح میں عالم ہی نہیں؛ البتہ خشیت کبھی اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے آدمی بہ تکلف احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکۂ راسخہ کے درجہ میں ہوجاتی ہے، جس میں اتباع شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے، خشیت کا پہلا درجہ مامور بہ اور عالم کے لیے ضروری ہے، دوسرا درجہ افضل واعلیٰ، ضروری نہیں۔

(از بیان القرآن) (معارف القرآن ۷/ ۳۳۷، ۳۳۸)

تفصیلِ بالا سے معلوم ہوا کہ عرف عام میں جس کو عالم کہا جاتا ہے، اس میں اور قرآن کی اصطلاح میں جس کو عالم کہتے ہیں، اس میں عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لفظ ''مولانا'' اور ''مولوی'' کا مطلب واستعمال

سوال: کسی عالم دین کے لیے ''مولٰنا'' کا استعمال جائز ہے؟ جبکہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے (انت مولٰنا) استعمال ہوا ہے؟ اور کیا قرونِ اولیٰ سابقہ میں دین کے عالم کے لیے ''مولٰنا'' کا لفظ مستعمل ہوا؟ اور ''مولوی'' کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ ''مولٰنا'' اور ''عالم'' کا لفظ کب سے استعمال میں آنے لگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

''مولٰنا'' دو لفظ سے مرکب ہے: ''مولی'' اور ''نا'' ضمیر مجرور متصل جمع متکلم۔ عربی زبان میں مولیٰ متعدد معنوں کے لیے آتا ہے: صاحب ''تاج العروس'' علامہ زبیدیؒ نے مولی کے معانی کی تفصیل لکھ کر تحریر فرمایا ہے کہ: ''فهذه أحد وعشرون معنى للمولى: وأكثرها قد جاء ت في الحديث، فيضاف كل واحد إلى

مـايقتضيه الحديث الوارد فيه.“ (تاج العروس ۳۹۹/۱۰) یعنی یہ اکیس معنی لفظ مولی کے ہیں، اوران میں سے اکثر معانی حدیث میں آئے ہیں، اس لیے جس حدیث میں لفظ مولیٰ وارد ہوا ہے، وہ حدیث جس معنی کی مقتضی ہوگی، وہ مراد لیے جائیں گے۔

صاحب ”مجمع البحار“ محمد بن طاہرؒ رقمطراز ہیں: وإسم المولى يقع على الـرب، والـمـالك، والسيـد، والمنعم، والمعتق، والناصر، والمحب، والتابع، والـجـار، وابـن العم، والحليف، والعقيد، والصهر، والعبد، والمعتق، والمنعم عليه؛ وأكثرها جاء في الحديث. (مجمع البحار ۱۱۳/۵)

اس لیے جہاں یہ لفظ استعمال ہورہا ہے، اس مقام کے مناسب جو معنی ہوگا، وہ مراد ہوگا، قرآن کریم میں دعاء کے موقعہ پر باری تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے ”انـــت مـولٰـنـا“ آیا ہے وہاں رب اور پروردگار والا معنی متعین ہے، قرآن پاک ہی میں لفظ مولی دوسرے معنی میں بھی آیا ہے۔ ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا﴾ (سوره دخان ۴۱) ﴿ولـكل جعلنا موالى مما ترك الوالدٰن والاقربون﴾ الخ (سوره نساء ۳۳) ﴿مأوٰكم الـنار هى مولٰكم﴾ (الحديده ۱۵) ﴿وهـو كل على مولٰه﴾ (نحل ۷۶) ﴿وانى خفت الموالى من ورآء ى﴾ (مريم ۵) ﴿فـان لـم تعلموآ آبآء هم فاخوانكم فى الدين ومواليكم﴾ (الاحزاب ۵) ”بخاري شريف“ ”كتاب الصلح“ میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی طویل روایت ہے، اس کے آخر میں ہے: وقـال لـزيد أنت أخونا ومولانا. (۳۷۲/۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مولانا فرمایا۔

اس لیے کسی عالم دین کو ”مولانا“ کہنے میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس صورت

میں لفظ مولی آقا اور سردار کے معنی میں ہوگا، اور مطلب ہوگا ''ہمارے سردار'' ظاہر ہے عالم دین کو اپنے علم کی وجہ سے مسلمانوں کی سیادت وسرداری حاصل ہے۔

''مولوی'' یہ ''مولی'' کی طرف نسبت ہے، یعنی مولیٰ والا، علامہ زبیدیؒ فرماتے ہیں: والنسبة إلى المولىٰ مولوي ومنه استعمال العجم المولوي للعالم الكبير، ولكنهم ينطقون به ''ملا'' وهو قبيح. (تاج العروس ۱۰/۴۰۱) یعنی مولیٰ کی طرف نسبت کرنے (یائے نسبتی لگانے) سے مولوی بنا ہے اور اسی معنی میں اہل عجم بڑے عالم کو مولوی کہتے ہیں، لیکن اب اہل عجم مولوی کو ''ملا'' بولنے لگے ہیں، جو برا ہے۔ ان دونوں الفاظ کی ابتداء کب سے ہوئی؟ یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سینٹ کا استعمال

سوال: اسپریٹ جو انجکشن لگانے سے پہلے لگائی جاتی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس میں شراب کا حصہ ہوتا ہے اور سینٹ بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو کپڑوں پر لگایا جاتا ہے اور لوگ نشہ کے طور پر پیتے ہیں اور سینٹ بنانے کے لیے جو استعمال ہوتا ہے اس میں شراب کا حصہ جتنا ہوتا ہے، اتنا اعلیٰ سینٹ تیار ہوتا ہے اور دوسرے کاموں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو اس کا خریدنا اور فروخت کرنا اور سینٹ بنا کر فروخت کرنا کیسا ہے اور کپڑوں پر لگانا کیسا ہے؟

اسپریٹ کی دوسری قسم جس کا نام جَیسُوْل ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس میں شراب کا حصہ نہیں ہوتا ہے اور ڈاکٹر اس کو کم استعمال کرتے ہیں اور دوسرے کاموں میں بھی استعمال کم ہوتا ہے اور وہ کیمیکل سے بنایا جاتا ہے اور اس سے بھی سینٹ بنایا جاتا

ہے، جو کم دام سے فروخت کیا جاتا ہے، تو اس کا فروخت کرنا اور خریدنا اور سینٹ بنا کر فروخت کرنا اور کپڑوں پر لگانا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اسپریٹ اگر انگور، کشمش یا کھجور سے حاصل کی گئی ہو، تو بالاتفاق نجس ہے اور ان کے سوا کسی دوسری چیز سے بنائی گئی ہو، تو شیخینؒ کے نزدیک پاک اور امام محمدؒ کے نزدیک نجس ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ آج کل اسپریٹ اور الکحل کے لیے انگور اور کھجور استعمال نہیں کی جاتی، لہذا شیخینؒ کے قول کے مطابق پاک ہے، حضرات فقہاءؒ نے اگرچہ فساد زمان کی حکمت کی بنا پر امام محمدؒ کے قول کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے؛ مگر آج کل ضرورت تداوی اور عموم بلویٰ کی رعایت کے پیشِ نظر شیخینؒ کے قول پر طہارت کا فتویٰ دیا جاتا ہے، ویسے بھی اصولِ فتویٰ کے لحاظ سے قول شیخینِؒ کو ترجیح ہوتی ہے، الا العارض. (احسن الفتاویٰ ۲/ ۹۵)

سینٹ میں جب تک ناپاکی کا یقین یا ظن غالب نہ ہو، اس کا استعمال جائز ہے، اور یقین یا ظنِ غالب ناپاکی کا ہو جائے، تو جائز نہ ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ ۵/ ۱۸۳) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

عورتوں کی آواز ٹیپ میں سننا

سوال: عورتوں کی آواز ٹیپ میں سننا، چاہے وہ تلاوت قرآن ہو، یا مدح رسول ہو، یا تقاریر ہو اور عورتوں کا آنا مجلس عامہ میں، کیا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ٹیپ میں عورت کی آواز سننا، چاہے تلاوت قرآن پاک ہو یا مدح رسول یا تقریر، ایسا ہی ہے جیسا کہ براہِ راست عورت کی زبان سے سننا، چاہے پردہ کے ساتھ ہو اور یہ جائز نہیں۔ لأنه اسماع صوت المرأة بلا ضرورة شرعية. (ماخوذ از امداد الفتاویٰ ۴/۲۰۰)

عورتوں کو فقہائے حنفیہ نے نماز کی جماعتوں اور عیدین اور مجالس وعظ میں جانے سے منع کیا ہے، اور کتبِ فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ عورتوں کے لیے مجالسِ وعظ اور جماعتِ نماز اور عیدین میں جانا مکروہ تحریمی ہے، جو حرام کے قریب ہے۔ (کفایت المفتی ۵/۳۹۱ والتفصيل فيه) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

لوٹ کھسوٹ کا مال جائز نہیں

سوال: مسلم اور غیر مسلم میں لوٹ گھسوٹ عام ہوگئی، دونوں فریق ایک دوسرے کے مال لیتا ہے، تو کیا یہ جائز ہوگا مسلمانوں کے لیے؟

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

مسلمان کے لیے لوٹ کھسوٹ کا مال کسی حال میں جائز نہیں ہے، چاہے وہ مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا۔ "من انتهب فليس منا" (ترمذی شریف ۱/۲۸۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

دعا برائے سفر

سوال: مندرجۂ ذیل دعاء کے ثبوت کے بارے میں؛ نیز یہ دعا جن فضائل کے ساتھ بیان کی گئی ہے، کیا مستند کتابوں میں بھی یہی فضائل موجود ہیں؟ دعاء برائے حفاظت سفر "اللّٰه حفيظ، لطيف، قديم، أزلي، حي، قيوم لاينام" جو کوئی سفر پر جانے سے پہلے اس دعا کو سات مرتبہ پڑھے، تو ہر قسم کے حادثے سے محفوظ رہے گا۔ جو

کوئی سفر کے وقت اس دعا کی نقل اپنے ساتھ رکھے، تو سواری ہر قسم کے حادثے سے محفوظ رہے گی، اگر اس دعا کی نقل سامان یا گھر میں رکھی جاوے، تو چوری سے محفوظ رہیں گے، اگر کوئی صبح وشام گیارہ مرتبہ اس دعا کو پڑھے، تو امن وامان رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت دے گا۔ (انشاء اللہ)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عام متداول کتبِ حدیث میں، صحاح ستہ میں اس دعا کے یہ فضائل نظر سے نہیں گذرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

آپسی تعاون کی سوسائٹی (اسکیم)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین حسبِ ذیل مسئلہ میں:

کہ ہمارے علاقے پالن پور کے اکثر دیہات وقصبوں اور شہروں میں؛ نیز بمبئی میں بلا سودی قرض سے امداد کی مختلف شکلیں رائج ہیں، ان شکلوں کو ہمارے عرف میں سوسائٹیاں کہا جاتا ہے، ان سوسائٹیوں کو جاری کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو بلا سودی قرض ملتا ہے، جس کی ادائیگی بھی آسان ہے، جس کے سبب سے لوگ بینکوں سے سودی معاملات سے اجتناب کریں، اس کے بہت زیادہ مفید ہونے کی بناء پر کثرت سے رائج ہیں؛ چنانچہ جن کا نام قرعہ اندازی میں پہلے نکلتا ہے، تو وہ رقم لے کر کسی کاروبار میں ڈالتا ہے، جن کی بناء پر ان کی اقتصادی حالت بہتر ہوتی ہے، اور جن کا قرعہ تاخیر سے نکلتا ہے، ان کی اتنی رقم آسانی سے جمع ہو جاتی ہے۔

اس کی ایک صورت یہ رائج ہے کہ ایک متحرک شخص ننانوے اشخاص کو اس کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک شخص ہر ماہ کی کسی متعین مثلاً ۱۵/ تاریخ میں اس متحرک آدمی کے پاس پانچ پانچ سو روپئے جمع کریں اور خود وہ متحرک آدمی بھی اس میں اپنے پانچ سو روپئے جمع کرے، جس سے خود اس متحرک آدمی سمیت سب ممبروں کی مجموعی رقم پچاس ہزار روپئے جمع ہوگئی، اس طرح ہر ماہ اتنی اتنی رقم جمع ہوتی رہے گی۔

پہلے ماہ میں جمع شدہ رقم اس متحرک ذمہ دار شخص کو بلا قرعہ اندازی قرض دینا شرط ہوتا ہے، تمام ممبران خوشی و رضامندی سے اس ذمہ دار کو یہ رقم بطورِ قرض دیتے ہیں، پھر دوسرے ماہ کی جمع شدہ رقم جب اسی متعین تاریخ میں جمع ہوجاتی ہے، تو ایک دن کے بعد مثلاً ۱۷/ تاریخ کو وہ متحرک شخص ننانوے ممبران کے ناموں کے درمیان قرعہ اندازی کرتا ہے اور جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلتا ہے، اس کو یہ پچاس ہزار کی رقم دے دیتا ہے، اسی طرح ہر ماہ ہر ممبر خواہ اس کا قرعہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو، رقم جمع کرتا ہے اور اسی طرح قرعہ اندازی ہوتی رہتی ہے، جس کا قرعہ نکل جاتا ہے اس کا نام دوبارہ قرعہ اندازی میں شامل نہیں ہوتا، یہ سلسلہ آٹھ سال اور چار ماہ تک چلتا رہتا ہے، اس مدت میں سب ممبران کو پچاس ہزار رقم مل جاتی ہے، اس میں رقم جمع کرنے میں معین تاریخ پر تاخیر کرنے پر کچھ جرمانہ بھی شرط ہوتا ہے، جن کا قرعہ ابھی تک نہیں نکلا ہے، ان سے بھی فی یوم تاخیر کرنے پر دس روپئے، اور جن کا قرعہ نکل چکا ہے ان سے فی یوم تاخیر پر پچاس روپئے بطورِ جرمانہ وصول کئے جاتے ہیں، یہ جرمانہ کی رقم یہ متحرک ذمہ دار شخص اپنے ذاتی تصرف واستعمال میں لاتا ہے، پھر سوسائٹی کی مدت ختم ہونے پر وہ رقم اس ممبر کو واپس کردیتا ہے۔

(۱) اس مذکورہ بالا شکل رائج میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ پہلے ماہ کی جمع شدہ رقم تمام ممبران بغیر قرعہ اندازی کے رضامندی سے اس ذمہ دار شخص کو دے دیتے ہیں، اس لیے کہ یہی ذمہ دار شخص تمام امور کا، مثلاً: ہر ممبر سے معین تاریخ میں وصول کرنے، قرعہ اندازی کرنے اور جس کا قرعہ نکلے، اس کو رقم دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر اس کو پہلے ماہ کی جمع شدہ رقم بلا قرعہ اندازی نہ دیں؛ بلکہ اس کو بھی قرعہ کی ترتیب سے دیں، تو وہ ہرگز بلا اجرت اس سوسائٹی کو چلانے کے لیے جس کی مدت بھی آٹھ سال، چار ماہ ہے، تیار نہ ہوگا، تو کیا یہ شکل "كل قرض جر نفعا فهو ربوا" میں داخل ہو کر نا جائز وحرام ہوگی؟ یا داخل نہیں اور جائز ہے؟

(۲) اگر یہ شکل وصورت جائز ہے تو جو رقم بطورِ جرمانہ وصول کی جاتی ہے، اس کو وصول کرنا، اور روکے رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ وصول کرنا جائز ہے، تو اس رقم کا ممبران کی رضامندی سے ذمہ دار شخص کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟ جرمانہ کے طور پر وصول کردہ رقم اپنے پاس محفوظ رکھیں، تو کیا حکم ہے؟

(۳) سوسائٹی کی مذکورہ بالا صورت اگر "كل قرض جر نفعا فهو ربوا" میں داخل ہو کر یا کسی اور شرعی قباحت کے سبب ناجائز ہے، تو اس ذمہ دار شخص کو بجائے پہلے ماہ کی جمع شدہ رقم بلا قرعہ دینے کے ممبران کی طرح اس کو بھی قرعہ کی ترتیب میں شامل رکھ کر سوسائٹی بنانے کے لیے اگر یہ شکل اختیار کی جائے کہ تمام ممبران اس ذمہ دار شخص کو آٹھ سال، چار ماہ تک سوسائٹی چلانے اور ذمہ داری سنبھالنے کے عوض میں ماہانہ ایک روپیہ بطورِ اجرت کے دیں، تو ہر ماہ ننانوے روپئے اس کو اجرت کے طور پر ملتے رہیں گے، اور

وہ سوسائٹی چلاتا رہے گا تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

یہ آپسی تعاون کی ایک ایسی صورت ہے، جس میں سود یا قمار لازم نہیں آتا ہے؛ بلکہ پہلے مہینہ میں تو یہ خالص اقراض ہے کہ بقیہ ننانوے ممبران متحرک شخص کو پانچ پانچ سو روپئے قرض دیتے ہیں، اس کے بعد والے مہینوں میں بعض (یعنی جو قرض لے چکے ہیں وہ) ممبر تو جس کا نام قرعہ میں نکل رہا ہے اس کو ادا کر رہے ہیں، اور وہ جس کا نام قرعہ میں نکل رہا ہے وہ اس سے تو اپنا قرض وصول کر رہا ہے، اور جن کا اب تک نہیں نکلا ان سے قرض لے رہا ہے، اور آخری مہینہ میں تمام ننانوے ممبران اس کو جو آخر میں بچ گیا ہے، قرض ادا کر رہے ہیں؛ البتہ اس سوسائٹی کے قانون میں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اب تک جس کا نام قرعہ میں نہیں نکلا ہے، وہ اس سے الگ ہونا چاہے، اور اس کی علیحدگی کے وقت تک جن لوگوں کو قرض مل چکا ہے ان سے اپنا حساب کتاب وصول کرنا چاہے، تو اس کا اس کو اختیار رہنا چاہئے، اگر آپ یہ اختیار اس کو نہیں دیں گے؛ بلکہ آخر تک سوسائٹی سے منسلک رہنا اس پر لازم قرار دیں گے، تو قرض میں تاجیل لازم آئیگی جو درست نہیں ہے۔ "التاجيل في القرض باطل." (شامی ۱۸۹/٤)

(۱) پہلے ماہ کی جمع شدہ رقم بطورِ قرض ذمہ دار آدمی کے حوالہ کر دینا "کل قرض جر نفعا" میں اس لیے داخل نہیں ہے کہ اس وقت اس نے جو وصولیابی کی، وہ سب اپنے لیے کی ہے، کوئی آدمی کسی سے قرض لینا چاہتا ہے، تو اس کے پاس آمد و رفت اور اس سے رقم کی وصولیابی وغیرہ کی زحمت برداشت کرتا ہی ہے؛ نیز قرعہ اندازی سے کسی کا حق

ثابت نہیں ہوتا، اصل تو یہ ہے کہ رقم دینے والے تمام حضرات متفق ہو کر جس کے متعلق کہہ دیں کہ فلاں کو رقم قرض دی جائے، اس کو وہ رقم مل سکتی ہے، اب ذمہ دار آدمی کے متعلق (اس کی قربانی کے پیش نظر) تمام حضرات نے برضاء ورغبت اجازت دے دی ہے؛ جبکہ دیگر تمام حضرات اس حیثیت سے یکساں درجہ میں ہیں، اس لیے ان میں سے کسی کو متعین کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی صورت اختیار کی گئی ہے؛ تا کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

(۲) مالی جرمانہ درست نہیں ہے۔ لا بأخذ مال في المذهب. (درمختار مع الشامي ۳/۱۹۵) البتہ اس زائد رقم کی ادائیگی لازم نہ رکھی جائے؛ بلکہ تاخیر والی صورت میں برضاء ورغبت وہ تاخیر کرنے والا زائد رقم دیتا ہو، تو اس کا رکھ لینا درست ہے، اس کے بعد اس کو محفوظ رکھے یا مالک کی اجازتِ مستقلہ کے بعد استعمال کرے۔

(۳) اس کے لیے الگ اجرت کے طور پر ہر ممبر ایک روپیہ دینا چاہے، تو دے سکتا ہے؛ البتہ جس مہینہ میں خود اس کے نام کا قرعہ نکلا ہو، اس مہینہ میں وہ رقم نہ دی جاوے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

خودرو جڑی بوٹی اور درخت دوسرے کی زمین سے لینا

سوال: بہت سے خودرو بیل بوٹے، پودے، علاوہ ازیں بڑے درخت جن کی ڈالیاں، پتیاں، پھول، پھل، جڑی؛ ہومیو پیتھک وایلو پیتھک دواؤں اور دیگر چیزوں کی بناوٹ میں کام آتی ہیں، ان چیزوں کی خاصیتوں کا جاننے والا ہی اس کی افادیت سمجھتا ہے، ورنہ ہر کوئی شخص ان چیزوں کی خاصیتوں سے واقف نہیں رہتا، یہ چیزیں سرکاری

وغیر سرکاری یعنی کسی کی ملکیت والی زمین پر بھی اگتی ہیں، مالک چونکہ ان چیزوں کی خاصیت وافادیت سے واقف نہیں رہتا، اس لیے اس کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں رہتا کہ سڑے، گلے، ضائع ہوجائے، کوئی اکھاڑ کر توڑ کرلے جاوے، کوئی پرواہ نہیں؛ لہٰذا ان چیزوں کی خاصیت وافادیت سے واقف شخص ایسی چیزیں مالک کی اجازت حاصل کئے بغیر تجارت یا ادویات میں استعمال کرتے ہوئے نفع حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ان میں سے جو چیزیں گھاس کی جنس سے ہیں، انہیں تو مالک کی اجازت کے بغیر لینا جائز ہے، اور جو درخت کے قبیل سے ہیں، وہ اگر کسی کی مملوکہ زمین میں ہیں تو مالک کی اجازت لی جائے، اور اگر سرکاری زمین میں ہیں تو سرکار کی طرف سے اس کے لینے پر پابندی نہیں ہے، تو لینا جائز ہے؛ ورنہ بغیر اجازت لینا درست نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۱۹۵، ۱۹۴)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

چغل خور بیوی کو میکہ جانے سے روکنا

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام وعلمائے دین مندرجۂ ذیل مسئلہ کے بارے میں: کہ زید کی بیوی نافرمان ہے، زید کا کہنا نہیں مانتی ہے، نافرمانی کی تشریح یہ ہے کہ بیوی میں چغل خوری کی عادت ہے، اگر کوئی بات مذاقاً یا اتفاقاً بلا اختیار بھی کسی کے متعلق زید کی زبان سے نکل جاتی ہے، خواہ بیوی کے میکے والے کے متعلق ہو یا اور کسی شخص کے متعلق ہو، بیوی اس شخص سے کہہ دیتی ہے، اور اس شخص سے زید کا جھگڑا ہوجاتا

ہے، خصوصاً میکے والوں سے زید کا بہت ہی بڑا جھگڑا ہو جاتا ہے، زید نے پہلے بطورِ نصیحت بہت سمجھایا، پھر بھی اپنی اس عادتِ بد سے باز نہیں آئی، پھر بسترِ خواب واستراحت بھی الگ کر کے ناراضگی ظاہر کی، پھر بھی بیوی اپنی عادتِ مذکور سے باز نہیں آئی، پھر مناسب مار پیٹ کر بھی تنبیہ کی، پھر بھی اپنی اس عادتِ چغل خوری سے باز نہیں آئی، غرض کہ جب سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی اور بیوی نے ایک نہ سنی؛ بلکہ اپنی اسی عادت پر برقرار رہی، تو زید نے بیوی کو اس کے میکے والوں سے جھگڑا وفساد سے بچنے کے لیے میکے جانے سے روک دیا، اور کہا کہ والدین خود میرے گھر آ کر اپنی لڑکی کو دیکھ جایا کریں، بیوی کے والدین میں اتنی قدرت ہے کہ وہ میرے گھر آسکیں، وہ معذور نہیں ہیں؛ تاکہ اس فتنہ وفساد، جھگڑا سے - جو میکے جانے کے سبب بیوی کی چغل خوری کے ذریعہ میکے کے افراد سے بڑھتا چلا جارہا ہے - کسی قدر فرصت ملے؛ لیکن بیوی نہیں مانتی، اور بغیر اجازتِ شوہر (زید) میکے چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس مرتبہ زید بیوی کو میکے جانے سے سختی سے منع کر کے پردیس چلا آیا، ساس (زید کی ماں) سخت بیمار ہے، کوئی دوسرا تیماردار نہیں ہے، پھر بھی بیوی بغیر اجازتِ زید میکے چلی گئی۔

اب آگے جو شرعی حکم ہو بالتفصیل وضاحت کے ساتھ مدلل بحوالۂ کتبِ معتبرہ مرحمت فرمایا جاوے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

صورتِ مسئولہ میں مصالحِ مذکورہ کے پیشِ نظر شوہر کو حق ہے کہ وہ اپنی بیوی کو والدین کے گھر جانے سے روک دے، خصوصاً جبکہ والدین خود آ کر اپنی لڑکی سے ملنے پر

قادر ہیں۔درمختار میں ہے: ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على اتيانها الخ اس کی تشریح میں علامہ شامیؒ رقم طراز ہیں: ماذكره الشارح اختاره في فتح القدير، حيث قال: وعن أبي يوسف في النوادر، تقييد خروجها بأن لا يقدرا على اتيانها، فإن قدرا لا تذهب، وهو حسن. .... والحق الأخذ بقول أبي يوسف إذا كان الأبوان بالصفة التي ذكرت الخ (درمختار مع الشامي ۲/۷۲۱)

شوہر کے منع کرنے کے باوجود اگر بیوی بلا اجازت بھی جاتی ہے تو وہ گنہگار ہے، اور شوہر کی نافرمان ہے۔رہی ساس (یعنی شوہر کی ماں) کی تیمارداری تو یہ بیوی پر ضروری نہیں ہے، محض ایک اخلاقی ذمہ داری ہے، اور اگر وہ انجام دے تو مستحقِ تعریف ہے، ورنہ اس کے لیے شوہر مجبور نہیں کرسکتا۔فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ہوائی جہاز کا گوشت اور سبزی وغیرہ کھانا

سوال: بہشتی زیور حصہ:۳، باب نمبر:۳۴، مسئلہ:۷ کے اندر ذیل کا مسئلہ بیان کیا ہے: جو گوشت ہندو بیچتا ہے، اور یوں کہتا ہے کہ میں نے مسلمان سے ذبح کرایا ہے، تو اس سے مول کر کھانا درست نہیں؛ البتہ جس وقت سے مسلمان نے ذبح کیا اگر اسی وقت سے کوئی مسلمان برابر بیٹھا دیکھ رہا ہے، یا وہ جانے لگا تو دوسرا کوئی اس کی جگہ بیٹھ گیا، تب درست ہے۔تو اصل عرض یہ کرنا ہے کہ ہوائی جہاز میں کام کرنے والے زیادہ تو ہندو ہی

ہوتے ہیں، کھانا وہی تقسیم کرتے ہیں، تو ان کا کھانا کیسا ہے؟ تفصیلی جواب دے کر ممنون ومشکور فرماویں۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

اگر وہ گوشت ہے تو نہیں کھانا چاہئے، اور اگر کھانے کی کوئی ایسی چیز ہے جس کا تعلق ذبیحہ سے نہیں ہے، مثلاً سبزی یا چاول، روٹی وغیرہ تو اگر برتن پاک ہیں، یا ان کی ناپاکی کا علم نہ ہو تو کھا سکتے ہیں، اور اگر یہ علم ہو کہ برتن ان کے ناپاک ہیں تو کھانا درست نہیں۔

قال محمدؒ: ويكره الأكل والشرب في اواني المشركين قبل الغسل، ومع هذا لو اكل او شرب فيها قبل الغسل جاز، ولا يكون آكلا ولا شاربا حراما، وهذا اذا لم يعلم بنجاسة الاواني، فاما اذا علم فانه لا يجوز.

(فتاویٰ عالمگیری ۵/ ۳۴۷، فتاوی محمودیه خامس ۱۷۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کھانا کھانے کے درجات کی شرعی حیثیت

سوال: ایک مولانا صاحب نے طعام کے متعلق کھانے میں دو فرض بتائے ہیں:

(الف) بھوک سے مر جانے کا ظن غالب ہو تو کھانا کھانا فرض ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسی بھوک کہ نہ کھائے تو مر جائے تو ایسے وقت کھانا کھانا فرض ہے۔

(ب) دوسرا فرض کھانا حلال کا ہو کہ آج سٹہ مٹکا، جوا، لاٹری، کرکٹ، سود کا لین دین، کسی غیر کے نام کا کھانا یہ سب حرام ہے، تو حلال کا کھانا ہونا فرض ہے، اور ان مولوی

صاحب نے ثبوت میں ''فتاوی عالمگیری'' اور ''فضائل صدقات'' کو پیش کیا ہے؛ مگر ان مولوی صاحب کے پاس نہ کوئی کتاب ہے، اور نہ کسی مدرسہ کا ثبوت ہے اس لیے ہم کو آپ کی طرف رجوع کرنا پڑا، اور آپ کو زحمت دینی پڑی، اور وہ بھی اس لیے کہ ہم کو جماعتوں کو لے کر جانا ہوتا ہے، اور ساتھیوں کو کھانے پینے اور سونے کے آداب بتلانے ہوتے ہیں، اور ان سب باتوں کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہوتی ہے کہ کہیں حرام کا لقمہ ان ساتھیوں کے پیٹ میں نہ جائے، اور کہیں ہم غلطی نہ کر جائیں؛ لہذا یہ سب فرض ہو یا پھر شرط یہ تو آپ فیصلہ کریں گے، اور ہم آپ کی طرف سے جو بھی جواب آئے گا عمل میں لائیں گے ان شاء اللہ۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

''فتاوی عالمگیری'' میں کھانے کے کئی درجات لکھے ہیں: پہلا درجہ فرض ہے، اور وہ یہ ہے کہ اتنا کھاوے کہ ہلاکت اور موت نہ آوے، اب اگر اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا؛ یہاں تک کہ مر گیا تو وہ گنہگار رہے۔ دوسرا درجہ ثواب کا ہے، اور وہ یہ کہ اتنا کھاوے کہ نماز کھڑا رہ کر ادا کر سکے، اور آسانی سے روزہ رکھ سکے۔ تیسرا درجہ مباح اور جائز کا ہے، اور وہ یہ کہ دوسرے درجہ پر اتنی زیادتی کرے کہ پیٹ بھر جائے، اور بدن کی قوت میں اضافہ ہو اس میں نہ ثواب ہے، اور نہ گناہ، اور اس میں روز قیامت معمولی محاسبہ ہوگا؛ بشرطیکہ کھانا حلال ہو۔ چوتھا درجہ حرام کا ہے اور وہ پیٹ بھر سے زیادہ کھانا ہے؛ البتہ اس کے ذریعہ اس کا ارادہ کل کے روزہ میں قوت حاصل کرنا ہے، یا اس کا مقصد یہ ہے کہ مہمان شرمندہ نہ ہو، تو پیٹ بھر کر سے زیادہ کھانے میں گناہ نہیں۔

أماالاكل فعلى مراتب: فرض: وهو مايندفع به الهلاك، فان ترك الاكل والشرب؛ حتى هلك فقد عصى. ومأجور عليه: وهومازاد عليه ليتمكن من الصلاة قائما، ويسهل عليه الصوم. ومباح: وهومازاد على ذلك الى الشبع لتزداد قوة البدن، ولاأجر فيه ولاوزر، ويحاسب عليه حسابا يسيرا ان كان من حل. وحرام: وهو الأكل فوق الشبع الا اذا قصد به التقوى على صوم الغد أو لئلايستحيي الضيف فلابأس بأكله فوق الشبع. (۳۳٦/٥)

رہا کھانے کا حلال ہونا تو اس کا ضروری اور فرض ہونا ایک ایسی واضح چیز ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، پھر بھی چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

مشکوۃ میں مسلم شریف کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ پاک ہے، اور پاک (مال یعنی حلال) ہی کو قبول کرتا ہے، اور بیشک اللہ نے مؤمنین کو اس چیز کا حکم دیا ہے جس کا رسولوں کو حکم دیا؛ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یآ یھاالرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا﴾ اور باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یآ یھاالذین آمنوا کلوامن طیبات مارزقناکم﴾

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے آدمی کا تذکرہ فرمایا جو ایک طویل سفر میں ہے اور اس کی وجہ سے اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے میلے کچیلے ہیں، اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے، حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے، اور اس کا پینا حرام ہے، اور اس کا لباس حرام ہے، اور حرام غذا سے اس کی پرورش ہوئی ہے، بھلا اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟ (مشکوۃ ۲۴۱) نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم

ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس گوشت کی پرورش حرام سے ہوئی وہ جنت میں نہیں جائے گا، اور ہر وہ گوشت جس کی پرورش حرام سے ہوئی جہنم اس کی زیادہ حقدار ہے۔ (مشکوۃ ۲۴۲)

نیز حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حلال کمائی کا حاصل کرنا یہ بھی ایک فریضہ ہے۔ (مشکوۃ ۲۴۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ، نائب مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی، معین مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

بیوی کا دودھ پی لیا

سوال: اگر کسی مرد نے شادی کے بعد اپنی بیوی کا دودھ پیا، کیا اس کا نکاح باقی رہے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مدتِ رضاعت یعنی دو سال کی عمر کے اندر اندر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے، تو حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے، صورتِ مسئولہ میں جب وہ شادی شدہ مرد مدتِ رضاعت یعنی دو سال کی عمر سے تجاوز کر چکا ہے، تو اب اپنی بیوی کا دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، اس لیے نکاح باقی رہے گا، درمختار میں ہے۔

مص رجل ثدي زوجته لم تحرم. (درمختار علی هامش الشامي ۲/ ٤٤٩) البتہ اس کا اس طرح اپنی بیوی کے دودھ کو پینا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ساڑھی پہننا

سوال: اور اس وقت دیکھا گیا کہ دیہات میں عورتیں ساڑی پہنتی ہیں، اور

برقع ہوتا ہی نہیں ہے، تو کیا مسلمان عورتوں کو ساڑی پہننا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کس صورت میں جائز ہے، خلاصہ لکھیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جہاں مسلمان عورتوں کے اپنے لباس میں ساڑھی داخل ہو، وہاں جائز ہے، جہاں مسلمانوں میں ساڑھی مروج نہ ہو، صرف غیر مسلم عورتوں کے لباس میں داخل ہو وہاں مکروہ ہے۔ (کفایت المفتی ۹/۱۶۱)

یاد رہے کہ یہ حکم اس ساڑھی کا ہے جو پورے جسم کو ساتر ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۴/ ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ

منسوبہ لڑکی سے خط وکتابت

سوال: ایک لڑکے کی نسبت ایک لڑکی کے ساتھ طے ہوچکی ہے، لڑکا اس نسبت کے ہوجانے کے بعد تحصیلِ علم کے لیے بیرونِ ملک چلا گیا، فراغت کے بعد شادی کا ارادہ ہے، شادی سے پہلے تحصیل علم کے دوران اس لڑکی سے خط وکتابت جائز ہے یا نہیں؟ اس کے خطوط زیادہ تر پند ونصائح پر مشتمل ہوتے ہیں، خط نہ لکھنے کی صورت میں لڑکی کی طرف سے نسبت ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے، کیا اس نسبت کو باقی رکھنے کے لیے خط وکتابت جائز ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نسبت طے ہوچکنے کے بعد بھی جب تک نکاح نہیں ہوا ہے وہ لڑکی اس لڑکے

کے حق میں اجنبیہ ہے، اور جو حکم اجنبیہ کا ہے وہی اس لڑکی پر بھی جاری ہوگا، خط و کتابت چاہے پند و نصائح پر مشتمل ہو فتنہ اور استلذاذ سے خالی نہیں ہے، اور حضرات فقہاءؒ نے مرد کے حق میں عورت (اجنبیہ) کے جھوٹے کو اور عورت کے حق میں مرد کے جھوٹے کو مکروہ لکھا ہے۔ درمختار میں ہے: يكره للمرأة سؤر الرجل وسؤرها له. (در علی هامش الرد ۳۰۲/۵) اَوَ امرأة؟ نعم، يكره سؤر ها للرجل كعكسه للاستلذاذ، واستعمال ريق الغير وهو لا يجوز، مجتبىٰ. (در علی هامش الرد ۱۶۳/۱) (قوله نعم يكره سؤرها الخ) اى فى الشرب لا فى الطهارة، بحر. قال الرملى: ويجب تقييده بغير الزوجة والمحارم. (شامی ۱۶۳/۱)

مخطوبہ کو دیکھنے کی شریعت نے جو اجازت دی ہے، وہ بھی ضرورت کی وجہ سے خلافِ قیاس ہے، جو اپنی حد تک محدود رہے گی، اسی لیے اگر ایک مرتبہ دیکھ چکا ہے تو دوسری مرتبہ حرام ہے۔ وتقييد الاستثناء بما كان لحاجة انه لو اكتفى بالنظر إليها بمرة حرم الزائد؛ لانه ابيح لضرورة فيتقيد بها. (شامی ۲۶۲/۵)

سوال میں مذکور اندیشہ کی وجہ سے ممنوع شرعی کا ارتکاب جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس کا آسان علاج یہ ہے کہ عقدِ نکاح کرلیا جائے چاہے رخصتی نہ ہو، اس صورت میں اختیار بھی لڑکے کے ہاتھ میں رہے گا، اور خط و کتابت بھی جائز؛ بلکہ مستحسن ہوجاوے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بلڈ بینک میں خون لینا دینا از روئے فقہ حنفی وشافعی

سوال: آج کل جو بلڈ بینک (Blood Bank) کے نام سے ایک اسکیم چل رہی ہے، جس میں ہوتا یہ ہے کہ اگر ایک دو بوتل ہم خون دیں تو ہمیں ایک سٹیفکیٹ ملتا ہے، جس کے بل بوتے پر جب بھی ہمیں خون کی ضرورت پڑے اور جتنے بھی خون کی ضرورت پڑے بروقت مل سکتا ہے، اس بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا یہ خون دینا جائز ہے؟ اسی طرح کیا لینا جائز ہے؟ (اگر ہو سکے تو مسلکِ شافعی پر جواب دیں تو عین کرم ہوگا۔)

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

کسی انسان کا خون بضرورتِ مرض دوسرے انسان کے بدن میں پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے (بقدرِ ضرورت عبارت پیش کرتا ہوں) چنانچہ فرماتے ہیں:

اصل حکم تو یہ ہے کہ خون نجاست غلیظہ ہے، اور نجاست کا استعمال خارجِ بدن میں بھی حرام ہے، داخلِ بدن میں بدرجۂ اولیٰ حرام ہے۔ كما صرح به في الدر المختار ورد المحتار من فصل الأنجاس .... اس کے علاوہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور اجزاءِ انسانی کا استعمال کرنا مطلقاً حرام ہے۔ ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے: الانتفاع بأجزاء الآدمي لم يجز، قيل: للنجاسته، وقيل: للكرامته، وهو الصحيح. كذا في جواهر الاخلاطى. یعنی آدمی کے کسی جزء کا استعمال جائز نہیں، اور اس کی وجہ اور علت میں دو قول ہیں: بعض نے فرمایا کہ ناپاک ہونے کی وجہ سے، اور بعض نے فرمایا کہ شرافت اور تکریم کی وجہ سے۔ پہلی وجہ کی بنا پر تو انسانی اجزاء

میں سے صرف وہی چیز حرام ہوگی جو نجس ہو، جیسے: خون، یا جیسے: بدن کا کٹا ہوا ٹکڑا، یا کھال وغیرہ؛ اور دوسری وجہ کا اثر یہ ہوگا کہ جو چیزیں نجس نہیں، مثلاً: ناخن، بال وغیرہ ان کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا، اور ''عالمگیری'' میں یہ دونوں وجہ ذکر کے دوسری ہی وجہ کو صحیح قرار دیا ہے، اور عام فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے، اسی لیے انسان کے بالوں سے کوئی چیز بنا کر استعمال کرنے کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

(آگے مفتی صاحبؒ نے ''عالمگیری'' کے حوالہ سے ایک جزئیہ نقل کیا ہے)

مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاك، فقال له رجل: إقطع يدي وكُلْها، او قال: إقطع مني قطعة وكلها، لا يسعه ان يفعل ذلك ولا يصح امره به.

(اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں) یہ جزئیہ فقہیہ بالکل مسئلۂ زیرِ بحث کی نظیر ہے کہ ایک انسان کی جان بچانے کے لیے کوئی انسان اپنے بدن کا خون اپنی مرضی سے دینا چاہتا ہے؛ مگر اس کو مذکورہ تصریح کی انسانی جزء ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، یہ حکم تو اصل مسئلہ کا ہے؛ لیکن علاج ودواء کے لیے بعض فقہاء نے خاص اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے، درمختار شامی وغیرہ میں اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے، او شرط یہ ہے کہ کسی مسلمان ڈاکٹر یا طبیب کی تجویز سے یہ معلوم ہو کہ اس حرام چیز کے سواء کوئی دوسرا علاج ممکن نہیں، اور اس کے استعمال سے بغالب ظن تندرستی کی امید ہے۔

(شامی آخر باب المياه قبل فصل في البير)

اس فتویٰ پر بھی ''عالمگیری'' کی مذکورہ تصریح سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسانی خون کو دوسری حرام چیزوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن ''عالمگیری'' کی مذکورہ تصریح میں ایک

ایسے عضوِ انسانی کا ذکر ہے جس کے قطع کرنے سے اس انسان کو نہایت سخت تکلیف پہنچے گی، جس سے بعض اوقات اس کی جان کا بھی خطرہ ہوسکتا ہے، اور خون لینے کا جو طریقہ رائج ہے، اس سے انسان کو کوئی ایسی تکلیف لاحق نہیں ہوتی، معمولی کمزوری ہوتی ہے، جو چند روز کے علاج سے دفع ہو جاتی ہے، اس فرق کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بطورِ علاج ودواء ایسے حالات میں جبکہ کسی مسلمان ڈاکٹر یا طبیب کے کہنے کے مطابق اور کوئی دوا کارگر نہ ہو، اور خون دینے سے جان بچنے کی قوی امید ہو تو صرف ایسے حالات میں خون دے کر علاج کیا جا سکتا ہے۔ (آلات جدیدہ ص/۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱)

یہ تو بوقتِ ضرورت واضطرار خون لینے دینے کا حکم ہوا، اب آپ کا سوال رہ جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ "الضرورة تتقدر بقدر الضرورة" حالتِ ضرورت واضطرار کا حکم اسی حالت تک محدود رہتا ہے، اور صورتِ مسئولہ میں اضطراری حالت پیدا نہیں ہوئی، اس لیے خون دینا جائز نہیں ہے، مستقبل میں ہمیں بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، یہ احتمال اضطراری حالت کو ثابت نہیں کر سکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مندرجۂ بالا تفصیل فقہ حنفی کے مطابق تھی، فقہ شافعی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشائخِ شافعیہ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے۔

علامہ نوویؒ نے "شرح المهذب" میں: ومن اضطر إلى أكل الميتة أو لحم الخنزير، فله أن يأكل منه مايسد به الرمق الخ کے ماتحت تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ (دیکھئے جلد تاسع از ص ۳۹ تا ص ۵۳) اس کی چند عبارتیں تحریر کرتا ہوں:

وإن اضطر ووجد آدميا ميتا جاز له أكله؛ لأن حرمة الحي آكد من

حـرمة الـميـت، وإن وجد مرتدا أو من وجب قتله في الزنا جاز له أن يأكله؛ لأن قتـلـه مستحق، وإن اضطر ولـم يجد شيئا فهل يجوز له أن يقطع شيئا من بدنه ويأكله؟ فيه وجهان: (قال) ابواسحٰق: يجوز؛ لأنه إحياء نفس بعضو فجاز كما يجوز أن يقطع عضواً إذا وقعت فيه الآكلة لاحياء نفسه، ومن اصحابنا قال: لا يجوز؛ لانه إذا قطع عضوا منه كان المخافة عليه اكثر. (ص٤١)

اجـمـعـت الأمة عـلـى أن المضطر إذا لـم يجد طاهرا يجوز له أكل النجاسات كالميتة، والدم، ولحم الخنزير، ومافى معناها. (ص٤١،٤٢)

قـال اصـحابنا: يباح لمضطر ان يأكل من الميتة مايسد الرمق بلاخلاف، ولا يباح له الزيادة على الشبع بلا خلاف، وفي حل الشبع قولان مشهوران. (ص٤٢)

قـال اصـحـابـنـا: الـمحرم الذي يحتاج المضطر إلى تناوله ضربان: مسـكـر، وغيـره، امـا الـمسكر: فسنذكره ان شاء الله تعالىٰ بعد انقضاء هذه الـمسائل حيث ذكره المصنف بعد هذا. واما غير المسكرفيباح جميعه مالم يكن فيه اتلاف معصوم، فيجوز للمضطر أكل الميتة، والدم، ولحم الخنزير، وشـرب البـول، وغيـر ذلك مـن الـنجاسات؛ ويجوز له قتل الحربي والمرتد وأكلهما بلا خلاف. (٤٣،٤٤)

لـو اراد المضطر أن يقطع قطعة من نفسه من فخذه او غيرها لياكلها، فـان كـان الـخـوف مـنـه كـالـخـوف فى ترك الاكل او اشد حرم القطع بلا خلاف، وصرح به امام الحرمين وغيره؛ والا ففيه وجهان مشهوران ذكرهما

المصنف بدليلهما، اصحهما جوازه، وهو قول ابن سريج وابى اسحق المروزى. والثانى لايجوز، اختاره ابوعلى الطبرى، وصححه الرافعى فى المحرر، والصحيح الاول، وممن صححه الرافعى فى الشرح والنسخ: واذا جوزناه فشرطه ان لا يجد شيئا غيره فان وجد حرم القطع بلا خلاف، ولا يجوز ان يقطع لنفسه من معصوم غيره بلا خلاف، وليس للغير ان يقطع من اعضائه شيئا ليدفعه الى المضطر بلا خلاف صرح به امام الحرمين والاصحاب. (٤٥)

قال اصحابنا وانما يجوز التداوى بالنجاسة اذا لم يجد طاهراً يقوم مقامها، فإن وجده حرمت النجاسات بلا خلاف، وعليه يحمل حديث "ان اللّٰه لم يجعل شفاء كم فيما حرم عليكم" فهو حرام عند وجود غيره، وليس حراماً اذا لم يجد غيره، قال اصحابنا: وانما يجوز ذلك اذا كان المتداوى عارفا بالطب يعرف انه لا يقوم غير هذا مقامه، او اخبره بذلك طبيب مسلم عدل ويكفى طبيب واحد صرح به البغوى. (٥٠،٥١)

وقال البيهقي: هذان الحديثان ان صحا حملا على النهي عن التداوي بالمسكر وعلى التداوي بالحرام من غير ضرورة. (٥٣)

مندرجۂ بالا تمام عبارتوں سے صاف مستفاد ہوتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں ضرورت واضطرار کی حالت نہ ہونے کی وجہ سے بلڈ بینک میں خون دینا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نوٹ: فقہ شافعی کے مطابق دیئے گئے جواب پر کسی شافعی مفتی کی تصدیق کے

بعد ہی اعتماد کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

انجکشن کے ذریعہ جانور سے دودھ و بچہ حاصل کرنا

سوال: ہمارے یہاں گائے اور بھینس کو نر سے جفتی نہیں کرواتے؛ بلکہ انجکشن کے ذریعہ سے منی کا نطفہ مادہ کی رحمدانی میں پہنچا دیا جاتا ہے، تو اس کا دودھ پینا؛ نیز پیدا ہونے والے بچہ کا ذبح کرکے اس کا کھانا کیسا ہے؟ امید ہے جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں گے، اور پہلے والے سوال کا تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اس کا دودھ پاک اور حلال ہے۔ (ماخوذ از فتاوی محمودیہ ۶/ ۳۴۷)

اس کا ذبح کرکے کھانا بھی درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ رجب ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مشینی ذبیحہ کا حکم

سوال: (۱) امریکہ میں مرغوں کو کاٹنے کے لیے بڑے بڑے پلانٹ ہیں، جن میں مرغے آٹومیٹک کٹتے ہیں اور صاف ہوتے ہیں، اسی قسم کے ایک پلانٹ سے ایک مسلمان مرغے ذبح کرواتا ہے، اور اس پلانٹ کی تفصیل یہ ہے یہ پلانٹ بہت بڑا پلانٹ ہے، رات دن اس میں مرغے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کٹتے ہیں، یہ مرغے ایک لائن پر

الٹے لٹکے ہوئے آتے ہیں اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر ایک خود کار مدور چھری سے (جو دائرے کی شکل میں چلتی ہے) ذبح ہوتے ہیں، یعنی ان کا گلا یا اکثر کٹ جاتا ہے اور آگے جا کر خود کار طریقہ سے صاف بھی ہو جاتے ہیں، جب مسلمان مرغ ذبح کرنے کو جاتا ہے، تو فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ علامت اور نشانی کے لیے ایک جگہ کپڑا باندھ لیتا ہے؛ تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس نشانی کے بعد جو مرغ آرہے ہیں، وہ مسلمان کے ہیں، اور دوسرے مرغوں سے اختلاط نہ ہو، نشانی لگانے کے بعد اس آلے پر ہاتھ رکھ کر جس میں خود کار چھری لگی ہوئی ہے، بسم الله الله اکبر پڑھتا ہے اور بڑی تیزی سے مرغ ذبح ہوتے ہیں، بسا اوقات ہر مرغ پر پورا فقرہ بسم الله الله اکبر کا نہیں پڑھ سکتا، لیکن اگر بسم اللہ کو ایک مرغ پر اور اللہ اکبر کو دوسرے پر تصور کیا جائے، تو پھر ہر ایک پر پورا ہو جاتا ہے، یہاں کے دو علماء نے (جو دیوبند، ندوہ اور ازہر کے فارغ ہیں) اس پلانٹ کا معائنہ کیا اور اس کو جائز اور حلال قرار دیا ہے، ان میں ایک فاضل کی رپورٹ - جو انگریزی میں ہے - مع اردو ترجمہ کے استفتاء کے ساتھ منسلک ہے، اس کے علاوہ مفتی محمد فرید صاحب مفتی دار العلوم حقانیہ نے اس ذبح کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے؛ البتہ بنوری ٹاؤن دار العلوم کراچی تعلیم القرآن پنڈی اور جامعہ اشرفیہ نے ذبح شرعی نہ ہونے کا فتویٰ دیا، جن کے نقول استفتاء کے ساتھ منسلک ہیں، اس تفصیل کے بعد کیا اس ذبیحہ کو اسلامی ذبح قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۲) کیا ذبح اسلامی کے لیے مسلمان یا اہل کتاب ہونے، تسمیہ پڑھنے اور چھری وغیرہ سے مطلوبہ رگیں (مری، حلقوم، ودجین) کاٹنے کے علاوہ، ذابح کا عمل بھی شرط ہے، اگر شرط ہے، تو کیا گھر سے ذبح کے لیے تیار ہو کر چلنا، گاڑی چلا کر جانا اور اس

آلے پر ہاتھ رکھنا جس میں خودکار چھری لگی ہوئی ہے، کو عمل ذبح قرار دیا جا سکتا ہے، واضح رہے کہ مشین کا بٹن چلانے کے لیے خود پلانٹ والے دباتے ہیں۔

(۳) ذبح اختیاری میں تسمیہ مذبوح پر مطلوب ہے نہ کہ آلہ پر، تو اس صورت میں مذبوح پر تو تسمیہ پڑھ لیا جاتا ہے؛ البتہ کاٹنے والی مشین ہے، نہ کہ انسان کے ہاتھ۔

(۴) فرض کیا جائے کہ ایک چھری مشین سے چلتی ہے یا نصب ہے، اس پر مسلمان مرغ کو پکڑ کر ذبح کر لے تو جائز ہوگا یا نہیں؟ بظاہر تو جائز ہے، اگر یہ جائز ہے تو مندرجۂ بالا مسئلہ کو اس پر کیوں قیاس نہیں کیا جا سکتا؟

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ غور وخوض کے بعد جلد جواب عنایت فرمائیں؛ کیونکہ لوگوں میں اختلاف ہے، بعض کھاتے ہیں بعض نہیں کھاتے، کیا کراہت کے ساتھ اس کا کھانا صحیح ہے؟ اور کراہت سے کون سی کراہت مراد ہے؟

نوٹ: کارخانے کے بارے میں یا اس مسئلہ کے بارے میں مزید وضاحت کی ضرورت ہو، تو براہِ کرم ضرور مطلع فرمادیں، تفصیلات بھیج دی جائیں گی۔ بینوا توجروا، وأجركم على الله.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) یہ ذبح شرعی نہیں ہے۔

(۲) ذبح اختیاری میں ذابح کا فعل (اپنے ہاتھ سے گلا کاٹنا) اور اس کی تحریک کا مؤثر ہونا شرط ہے، صورتِ مسئولہ میں مشینی چھری کو چلانے والی اور جانور کا گلا کاٹنے والی برقی لہر ہے، نہ کہ مسلمان کے ہاتھ کی قوتِ محرکہ اور یہ گلا کاٹنا برقی قوت اور مشین کا فعل

ہے، نہ کہ مسلمان کے ہاتھ کی قوتِ محرکہ، باقی اس مسلمان کا گھر سے تیار ہوکر جانا وغیرہ افعال اس کا عمل ضرور ہیں، لیکن عملِ ذبح نہیں ہیں۔

(۳) صرف مذبوح پر تسمیہ تو کافی نہیں، کیا کوئی مجوسی جانور ذبح کرر ہا ہو اور کوئی مسلمان اس جانور کو پکڑے ہوئے تسمیہ پڑھ رہا ہے، تو وہ کافی ہوگا؟ ظاہر ہے جواب نفی میں ہے، اس لیے اگر چہ مذبوح پر تسمیہ پڑھا گیا، مگر عمل ذبح مجوسی نے کیا ہے۔ (هندیہ ۵/ ۲۸۷)

(۴) مشین سے چلنے والی چھری پر آپ نے جو صورت فرض کی ہے، وہی فاسد ہے اور آپ کا قیاس بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کتاب السیاسة

احیائے خلافت کی سعی

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کی وفات کے عین بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ الرسول منتخب کیا گیا، اور اس طرح ادارہ خلافت کا قیام عمل میں آیا، جس کا سلسلہ خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی یعنی ۱۳۳۱ھ سال تک بلا انقطاع رہا، ۱۹۲۴ء میں ترکی کے آمر مصطفیٰ کمال پاشا کی ناعاقبت اندیشی معاندینِ اسلام کی مخالفانہ سازشوں سے ادارہ خلافتِ اسلامیہ کو ختم کر دیا گیا، اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ آیا:

(۱) ادارہ خلافت اسلامیہ ایک دینی ادارہ ہے؟

(۲) ایک شرعی ضرورت ہے؟

(۳) اعلائے کلمۃ الحق، اخوۃ اسلامی، مسلمانوں کے ناموس کے تحفظ، مسلمانوں کی مرکزیت اور ایسے ہی امور کے لیے ادارہ خلافت ضروری ہے؟

(۴) ارکان اسلام، مثلاً: اقامتِ صلوٰۃ، انتظام زکوۃ، فرائض حج، وخدمتِ حرمین شریفین اور حکمِ جہاد خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ متاثر ہیں؟

(۵) محتسب کے ذریعہ عمومی احکامِ اسلام کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل درآمد، اور شرعی حدود کا مکمل نفاذ خلافت کی عدم موجودگی کی وجہ سے متأثر ہے؟

(۶) ادارہ خلافت اسلامیہ کا احیاء ایک دینی خدمت ہے؟

(۷) احیاء خلافت کے لیے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کی کوشش مستحسن ہے؟

(۸) احیاءِ خلافت کی کوشش اور جدوجہد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا موجب ہے؟

ظاہری اسباب، موجودہ مسلم حکمرانوں کے طرزِ عمل، مسلمانوں کی بے حسی اور غیر مسلم سیاسی طاقتوں کی مخالفت کے پیشِ نظر خلافت کا دوبارہ قیام مشکل نظر آتا ہے، ایسی صورت میں کیا (۱) مسلمانوں کو احیائے خلافت کا خیال ترک کردینا چاہئے؟ (۲) کسی اور ادارہ کو خلافت کا بدل سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے؟ یا یہ سمجھ کر کہ احیاء خلافت اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں اور اسلام کا غلبہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت ہے، خلافت کے احیاء کی پوری پوری کوشش کرنی چاہئے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہر زمانہ میں مسلمانوں کا ایک امام (رئیس) ہونا چاہئے، اور ایسا ہونا چاہئے کہ نہ صرف لوگوں کی صحیح رہنمائی کرے؛ بلکہ مظلوم کا انصاف بھی ظالم سے دلوائے، کفر وشرک کی بیخ کنی بھی کرے، حدود وقصاص بھی جاری کرے، بوقت ضرورت جہاد بھی جاری کرے، اور فتنہ وفساد کا انسداد کر کے عدل وانصاف اور امن قائم کرے۔ (کفایت المفتی ۱/۱۳۶، ۱۳۷)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں: اہل سنت کہتے ہیں کہ مکلفین کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک رئیس چنیں، اور شریعت کی روشنی میں اس کی اتباع اپنے اوپر لازم جانیں، اور امور شرعیہ میں اپنے رئیس کی مدد ومعاونت کریں۔ (تحفۂ اثنا عشریہ مترجم ۲۷۲)

علم کلام کے مشہور متن ''عقائد نسفیہ'' میں ہے: والمسلمون لا بد لهم من إمام يقوم بتنفيذ احكامهم، وإقامة حدودهم، وسد ثغورهم، وتجهيز جيوشهم، وأخذ صدقاتهم، وقهر المتغلبة، والمتلصصلة، وقطاع الطريق، وإقامة الجمع والأعياد، وقطع المنازعات الواقعة بين العباد، وقبول الشهادات

القائمة على الحقوق، وتزويج الصغار والصغائر الذين لا أولياء لهم، وقسمة الغنائم ونحو ذلك من الأمور التي لا يتولاها آحاد الامة. (مع شرح عقائد ۱۱۰)

علامہ سعد الدین تفتازانیؒ عبارت بالا کی تشریح سے پہلے فرماتے ہیں:

والمذهب أنه (أي نصب الإمام) يجب على الخلق. (۱۱۰)

فقہ حنفی کے مشہور متن ''درمختار'' میں ہے: والإمامة هي صغرى وكبرى، فالكبرىٰ استحقاق تصرف عام على الأنام، وتحقيقه في علم الكلام، ونصبه أهم الواجبات، فلذا قدموه على دفن صاحب المعجزات. (درمختار علی هامش الشامی ۱/۴۰۴،۴۰۵) علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله أهم الواجبات) أي من أهمها لتوقف كثير من الواجبات الشرعية عليه. (شامی ۱/۴۰۵)

عبارتِ بالا سے معلوم ہوا کہ یہ کام امام ورئیس کی تقرری کی شکل میں ہونا چاہئے، ادارہ کی شکل میں نہیں، یہ الگ بات ہے کہ مقرر شدہ امام ورئیس اپنی تقرری کے بعد نظم ونسق بہتر طریقہ سے چلانے کے لیے ادارہ قائم کرے، مندرجۂ بالا تفصیل سے جب اس کام کا واجبات میں سے ہونا معلوم ہوا، تو اب اس کے قائم کرنے کے خیال کو ترک کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ تمام مسلمانان عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس واجب کی ادائیگی کے لیے مشترکہ وانفرادی کوشش جاری رکھیں؛ یہاں تک کہ یہ واجب قائم ہوجائے۔ وما ذلك على الله بعزيز. فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کمیونزم پارٹی کے ساتھ راہ رسم رکھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرعِ متین کہ مارکس کمیونسٹ پارٹی (سی-پی-ایم) جس کی بنیاد دہریت اور لادینیت پر ہے اور جس نے شروع ہی سے مذہب اور دین کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے تحریراً تقریراً عملاً، اس نے زندگی کے ہر شعبوں میں اتباعِ دین وشریعت کو، مذہبی کتاب کو خدا کا کلام اور نا قابل تفسیخ ماننا، دینی وعظ وتقریر، مسلم پرسنل لا، مدارس ومکاتب، خالص دینی اداروں کا قیام اور مساجد کی تعمیر وغیرہ؛ کو مذموم، بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی بتلا کر اور آل انڈیا تبلیغی جماعت، جمعیتِ علمائے ہند وغیرہ کو اس بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی کا سب سے بڑا مجرم اور سرغنہ قرار دے کر اپنے کارکنوں کو اس قسم کے افراد اور اداروں کے خلاف للکارا ہے اور ہدایت جاری کی ہے کہ وہ اس قسم کے ادارے اور افراد سے تعلقات منقطع کرلیں اور دوسروں کو ان سے قطع تعلق کرائیں؛ چنانچہ حسبِ ہدایت پارٹی کے لوگوں نے مختلف انداز سے اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔

مزید برآں وہ نکاح کے لازمی رجسٹریشن کے نام پر بنگال اسمبلی میں ایک بل پاس کرنے جارہی ہے، جس کا مقصد ضبطِ تولید، نکاحِ نابالغاں پر پابندی، عمر کا تعین بتلایا گیا ہے اور یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اس بل کے سلسلہ میں کسی بھی مذہب اور رواج کی پروانہیں کی جائے گی اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی قوانین کے مطابق شادی ہو، اگر رجسٹرڈ ہے تو واجب التسلیم، ان حالات میں تحفظِ دین وایمان کی خاطر مسلمانوں کو ایسی جماعتوں اور اس قسم کے افراد کے ساتھ کیا رویہ اور کیا سلوک ہونا چاہئے؟

ان اصول ونظریات سے اتفاق کرنا، ان کا ممبر بننا، ان کا تعاون کرنا، ان کے

مشن کو فروغ دینا، ان کی ہدایت پر عمل کرنا، ان سے باہمی راہ رسم اور دوستانہ تعلق قائم کرنا شرعاً جائز ہے کہ نہیں؟ اس کے باوجود جو مسلمان ان کے ممبر بنتے ہیں اور حکم شرعی کے خلاف پارٹی کے حکم پر عمل کرتے ہیں، ان کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ اس پارٹی کے جو ممبر اپنے کو مسلمان کہلاتے ہیں، کیا وہ حقیقت میں مسلمان ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کمیونیزم کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑایا جائے؛ چنانچہ ''واٹ کمیونیزم از دیب'' میں ہے ۸۱۲: کہ کمیونیزم کا ممبر اس شخص کے علاوہ کوئی نہیں بن سکتا، جو صدقِ دل سے صاف صاف اس کا اعلان کردے کہ وہ دہریہ، یعنی: منکرِ خدا ہے۔ اینجلز لکھتا ہے کہ ہماری پارٹی طبقہ وار شعور رکھتی ہے اور مزدوروں کی آزادی کے لیے جدو جہد کرتی ہے، ایسی پارٹی مذہبی اعتقادات سے پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی ہے، ہمارا بنیادی مقصد ہے کہ مذہبی فریب خوردگی کو دور کیا جائے۔ (اینجلز ۱۵) مارکس نے مذہب کے انفرادی معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں قدم آگے بڑھا کر انسانیت کو مذہب کے اقتدار سے آزاد کرنا ہے، مذہب پر تنقید علمِ تنقید کا مبدأ ہے۔ (مارکس سوشلزم ۱۹۲) مذہب عوام کے حق میں افیون کا اثر رکھتا ہے۔ (بحوالۂ سابق) مذہب آوازِ قدیم کی نظامی غلامی کی بازگشت ہے۔ (کمیونسٹ مینوفیسٹو کی تشریح دفعہ ۵۵ از ریزنیوف بحوالۂ ''الحق ۱۰۰۹ جمادی الاولیٰ ۸۹ھ'')

کمیونیزم پر بحث کرتے ہوئے ''حكم الاسلام في الاشتراكية'' کے مصنف لکھتے ہیں: إن العقيدة الاسلامية للنظام الاشتراكي: هي العقيدة المادية، التي تقول أن المادة هي أصل الاشياء، ولا شيء لغير المادة، وهذا، يعنى

انکار وجود الخالق العظیم سبحانه وتعالى. وبالثاني انکار کل دین سماوی، واعتبار ها الایمان بذلك افیونا یحذر الشعوب، کما یعتقد بذلك المارکسون والتینویون وامثالهم. یعنی کمیونیزم کی بنیاد یہی عقیدہ مادیہ ہے، جو کہتا کہ مادہ ہی اصل چیز ہے اور مادہ کے علاوہ کوئی چیز نہیں، اور یہ یعنی باری تعالیٰ کا انکار اور انجام کار ہر دین سماوی کا انکار، اور ایمان کو نشہ آور افیون سمجھنا ہے، جیسا کہ مارکس اور ٹیٹو کے ماننے والے سمجھتے ہیں۔ (حکم الاسلام في الاشتراکیه ۱۱۹)

اور کمیونیزم ایک تحریک ہی نہیں؛ بلکہ ایک جدید مذہب ہے، جس کے بانی مارکس ولینین وغیرہ یہودی تھے؛ چنانچہ علامہ طنطاویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، ان مختصر جوابات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ کمیونیزم صرف ایک معاشی تحریک نہیں؛ بلکہ ایک جدید مذہب ہے، جو تمام ادیانِ سابقہ اور الٰہی تعلیمات اور اخلاقی اقدار اور دین حق، یعنی: ذاتِ خداوندی کے خلاف ہے، اور کامریڈوں کی درندگی کی راہ میں سے ہر رکاوٹ کو دور کرنا اس دینِ جدید یا دینِ یہود کا مسلک ومقصد ہے، دین سوشلزم جو دشمن انسانیت ہے، اس کے بانی شیونن ہار مارکس ولینین جو یہودی تھے، اور جن کا قول تھا کہ ہم نے بے زبان حیوانات پر تو سواری کی، اب ہم نے اس زمانہ کے انسانوں کو سواری بنادیا، جن کو جانوروں کی طرح استعمال کرلیں گے۔ (جواہر۲/ ۱۲۸بحوالہٗ الحق)

یہ کمیونیزم کا اجمالی خاکہ ہے، جس سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اعتقاد کے اعتبار سے بھی وہ صراحتاً اسلام کے خلاف ہے، سیاسی حیثیت سے اس میں شرکت وقتی طور پر اگر مفید بھی نظر آتی ہو، پھر بھی دینی حیثیت سے اس کا ضرر واضح ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ا/ ۱۰۳، ۱۰۴)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۱۰/صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی کا حکم

سوال: (۱) حکومت کا گناہ کرنا کیسا ہے؟ حکومت کا گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہو دونوں برابر ہیں؟ امید ہے کہ تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں گے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حکومت اسلامیہ کے قوانین کی پابندی اس حیثیت سے کہ وہ اطاعت اولی الامر ہے ضروری ہے، اور حکومت غیر اسلامیہ کے قوانین کی خلاف ورزی میں اپنے آپ کو قانونی سزاؤں کے لیے پیش کرنا لازم آتا ہے، جس میں اپنی تذلیل ہے، اس لیے ممنوع ہے۔

ولكونه عرضا للنفس لعقوبات قانونية اذا كانت الحكومة غير اسلاميه. (تکملہ فتح الملهم ۱/ ۵۹۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

متفرقات

تشبہ بالکفار کی چند صورتیں

سوال: (۱) حدیث "من تشبہ بقوم فهو منهم" کا کیا مطلب ہے؟ نیز اسلامی معاشرہ کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے اور اس کے تحفظ کا کیا حکم ہے؟

(۲) مسلمانوں کے لیے، خاص طور پر مسلمان بچیوں کے لیے غیر اسلامی ہندو اور عیسائی وضع قطع ولباس پہننا اور پہنانا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) مسلمان بچیوں کو حتی کہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو اسکول میں، انگریزی اسکول ان کی تربیت اور ماحول میں بھیجنا، اور ان کا وضع وقطع پہنانا کہاں تک جائز ہے؟

اہلِ علم کے لیے امرِ منکر سے بچنا مؤکد ہے

(۴) علمائے کرام اور علمی اداروں کے ذمہ دار اور اساتذہ اگر اپنی بچیوں تک کو انگریزی لباس وضع وقطع میں اسکول بھیجیں؛ حتی کہ عیسائی مشنری اسکول میں بھیجیں، تو ان کے حق میں کیا حکم ہے؟

امرِ خیر پر خود عمل نہ کرنا دوسروں کو ترغیب دینا

(۵) کیا اسی حالت میں انہیں حق پہنچتا ہے کہ دوسرے کے بچوں اور بچیوں کو بھی تعلیم کی ترغیب دیں؟ مدرسہ میں داخل کریں؟ اسلامی وضع وقطع کی پابندی کے لیے سختی کریں؟

مدرسہ کے حق میں مضر فعل کرنے پر مدرس کو الگ کرنا

(۶) جو استاذ اپنی بچیوں کو غیر اسلامی وضع وقطع کے ساتھ غیر اسلامی ماحول والی اسکول میں بھیجتا ہے، روکنے سے، سمجھانے سے باز نہیں آتا، اگر مہتمم مدرسہ اس بنا پر ایسے

استاذ کو مدرسہ کی ملازمت سے برطرف کردے، تو شرعاً اس کا حکم کیا ہوگا؟

حکمِ شرعی کی خلاف ورزی پر بیٹے سے قطع تعلق

(۷) اگر کوئی عالم دین باپ اپنے عالم دین بیٹے کو، اپنی پوتی کو اسکول میں داخلہ کرائے، غیر اسلامی وضع وقطع سے پرہیز کرنے کے لیے کہے، سمجھائے، خوشامد وبلجاجت ہاتھ سر جوڑ کر اس اقدام سے باز رہنے کے لیے کہے؛ مگر اس کے باوجود بیٹا اپنے کو انگریزی وضع وقطع میں رکھے اور اسکول میں داخلہ پر بضد اور مصر رہے اور باپ بیٹے کے اس اقدام کو غیر شرعی اور اسلامی معاشرہ کے لیے تباہ کن سمجھ کر اسلامی معاشرہ کی حفاظت، کم سے کم اپنے ماحول میں اس زہر کے سرایت کرنے سے بچنے کے لیے بیٹے کو عاق کردے، گھر سے نکال دے، تو ایسے باپ اور ایسے بیٹے کے حق میں شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟ براہ کرام فوری اور تشفی بخش جواب سے ممنون فرمائیں۔

قومی دھارے پر بہنے کا الزام

(۸) برادرانِ وطن کو مسلمانوں سے شکایت ہے کہ قومی دھارے میں تیز بہتے اور بنیاد پرست ہیں، براہِ کرم اگر اس پر بھی مختصر روشنی ڈالیں، تو بہت ہی کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

(۱) مذکورہ حدیث کی تشریح کے سلسلہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کی گراں قدر تالیف "التشبہ في الإسلام" کا مطالعہ فرمالیں، انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے انشراحِ صدر کا باعث ہوگا، پھر بھی اس کی مختصر تشریح حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب نور اللہ مرقدہ کی فرمودہ نقل کرتا ہوں۔ تشبہ بالکفار کی

چند صورتیں ہیں:

(الف) فطری امور میں مشابہت، مثلاً: کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، لیٹنا، صفائی رکھنا وغیرہ (یعنی وہ کھاتے ہیں ہم بھی کھاتے ہیں، وہ پیتے ہیں ہم بھی پیتے ہیں الخ از احقر) یہ مشابہت حرام نہیں۔ قال في الدر: فإن التشبه بهم لا يكره في كل شيء؛ بل في المذموم، وفيما يقصد به التشبه كما في البحر، اهـ. قال الشامي تحت قوله لا يكره في كل شيء: فإنا نأكل ونشرب كما يفعلون. (۶۵۲/۱)

(ب) عادات میں مشابہت، مثلاً: جس ہیئت سے وہ کھانا کھاتے ہیں، اسی ہیئت سے کھانا یا لباس ان کی وضع پر پہننا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہماری کوئی خاص وضع پہلے سے ہو اور کفار نے بھی اس کو اختیار کرلیا ہو، خواہ ہمارا اتباع کر کے یا ویسے ہی، اس صورت میں یہ مشابہت اتفاقیہ ہے، اور اگر ہماری وضع پہلے سے جدا ہو اور اس کو چھوڑ کر ہم کفار کی وضع اختیار کریں، یہ ناجائز ہے، اگر ان کی مشابہت کا قصد بھی ہے، تب تو کراہت تحریمی ہے اور اگر مشابہت کا قصد نہیں ہے؛ بلکہ اس لباس و وضع کو کسی اور مصلحت سے اختیار کیا گیا ہے، تو اس صورت میں تشبہ کا گناہ نہ ہوگا؛ مگر چونکہ تشبہ کی صورت ہے اس لیے کراہت تنزیہی سے خالی نہیں۔

قال هشام: رأيت على أبي يوسف نعلين مخسوفين بمسامير، فقلت: أترى بهذا الحديد بأسا؟ قال: لا، قلت: فسفيان وثور بن يزيد كرها ذلك، لأن فيه تشبها بالرهبان، فقال: أن رسول الله ﷺ كان يلبس النعال التي لها شعر، وانها من لباس الرهبان، فقد أشار إلى أن صورة المشابهة فيما تعلق به صلاح العباد

لا یضر، فإن الأرض مما لا یمکن قطع المسافة البعیدة فیها إلا بهذا النوع.

اھ. قلت: وفعله علیه السلام محمول علی بیان الجواز إذا کان بدون القصد.

مگر چونکہ آج کل عوام جواز کے لیے بہانے ڈھونڈتے ہیں، ان کا قصد تشبہ ہی کا ہوتا ہے، اس لیے اکثر احتیاط کے لیے عادات میں بھی تشبہ سے منع کیا جاتا ہے، خواہ تشبہ کا قصد ہو یا نہ ہو۔

(ج) ان امور میں تشبہ جو کفار کا مذہبی شعار یا دینی رسم اور قومی رواج ہے، جیسے زنّار وغیرہ پہننا، یا مجوس کی خاص ٹوپی جوان کے مذہب کا شعار ہے، اس میں تشبہ حرام؛ بلکہ بعض صورتوں میں کفر ہے۔ عالمگیری وغیرہ میں اس کی تصریح ہے۔ (امداد الاحکام ۱/۱۹۴)

اس مسئلہ کے متعلق حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں ''شریعت اسلامیہ میں چونکہ ''تشبہ بالکفار'' کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، جو بے شمار آیات واحادیث سے ثابت ہے، اس لیے تفسیر اور حدیث اور فقہ اور علم العقائد کی کوئی کتاب مسئلہ تشبہ کے بیان سے خالی نہیں، حضراتِ فقہاء و متکلمین نے مسئلہ تشبہ کو ''باب الارتداد'' میں بیان کیا ہے کہ مسلمان کن چیزوں کے ارتکاب سے مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، ان میں سے ایک تشبہ بالکفار بھی ہے اور اس کے درجات اور مراتب ہیں اور ہر ایک کا حکم جداگانہ ہے''۔ (سیرۃ المصطفی ۲/۵۵۱ شائع کردہ ربانی بکڈپو، ۳/۳۹۱ دار الکتاب)

''سیرۃ المصطفی'' میں اس مقام کا بھی مطالعہ فرمالیا جائے جس میں اسلامی معاشرہ کی اہمیت وحقیقت پر بھی کلام ہے اور اس کی حفاظت کی ضرورت کو بھی خوب واضح کیا گیا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تفسیر ''معارف

القرآن'' میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''ان تینوں آیتوں کا حاصل مسلمان کو برے ماحول اور بری صحبت سے بچانا ہے، جو انسان کے لیے سمِ قاتل ہے، قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص کے علاوہ مشاہدہ اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ انسان کو تمام برائیوں اور جرائم میں مبتلا کرنے والی چیز اس کی بری سوسائٹی اور برا ماحول ہے، جس میں پھنسنے کے بعد انسان اول تو خلافِ ضمیر اور خلافِ طبع برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے، تو یہ برائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے؛ بلکہ برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی سمجھنے لگتا ہے''۔ آگے فرماتے ہیں: ''اور جہاں تک غور کیا جائے انسان کو اس حالت پر پہونچانے والی چیز اکثر اس کا غلط ماحول اور بری صحبت ہوتی ہے، "نعوذ باللہ منهما" اسی لیے بچوں کے مربیوں کا فرض ہے کہ بچوں کو ایسے ماحول اور سوسائٹی سے بچانے میں پوری کوشش کریں۔ (معارف القرآن ۳/۳۷۴،۳۷۵)

ابوعثمان نہدیؒ فرماتے ہیں کہ ہم آذربیجان میں تھے کہ ہمارے امیرِ لشکر عتبہ بن فرقدؓ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان پہنچا کہ اے عتبہ بن فرقد! تم سب کا یہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو عیش پرستی اور کافروں اور مشرکوں کے لباس اور ہیئت اور وضع وقطع سے اپنے کو دور اور محفوظ رکھو۔ (مسلم شریف ۲/۱۹۱، مسند احمد ۱/۱۶)

(۲،۳) جواب نمبر ایک میں تفصیل آچکی ہے۔

(۴) جو کام عوام مسلمین کے حق میں ناجائز ومکروہ ہو، حضرات علمائے کرام کے لیے اس سے احتراز اور زیادہ مؤکد ہے، اہل علم کی ذمہ داریاں بڑی ہیں۔ ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر آیت:۹)

(۵) دوسرے کے بچوں، بچیوں کو دینی تعلیم کی ترغیب دینا، اور ان سے اسلامی وضع قطع کی پابندی کروانا، ایک کارِ خیر ہے، ایک نیکی چھوڑنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُم﴾ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: ''لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لیے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے؛ کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا، تو اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا، تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لیے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے اور اپنے زیر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعاني)

چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص یہ سوچ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا، تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا؛ کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں۔

(قرطبي) بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے، تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں؛ تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے، الخ۔ (معارف القرآن ۱/ ۲۱۸، ۲۱۹)

دوسرے موقعہ پر حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: ''اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ ونصیحت کرنے والوں کو اس بات پر شرمندہ کیا ہے کہ لوگوں کو ایک نیک کام کی دعوت دو اور خود اس پر عمل نہ کرو، اور مقصد یہ ہے کہ جب دوسروں کو نصیحت کرتے ہو، تو خود اپنے آپ کو نصیحت کرنا اس سے مقدم ہے، جس کام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو، خود بھی اس پر عمل کرو؛ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ جب خود نہیں کرتے، تو دوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو''، الخ۔ (معارف القرآن ۸/ ۴۲۵)

(۶) مدرسہ کے کسی مدرس کا ایسا فعل، جو مدرسہ کے حق میں مضر اور مدرسہ کے وقار کے منافی ہو، اس پر علیحدہ کرنے کا مہتمم مدرسہ کو اختیار ہے۔

(۷) کسی حکم شرعی کی خلاف ورزی بیٹے کی طرف سے ہونے کی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو تنبیہ کرے، اس کے باوجود وہ باز نہ آئے تو باپ اس سے قطع تعلق کرسکتا ہے۔ ''ابن ماجہ شریف'' میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے، ان کا ایک بھتیجا ان کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے ایک چھوٹی کنکری انگلی پر رکھ کر پھینکی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس کو منع کیا، اور فرمایا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس سے کوئی شکار نہیں مرتا اور نہ دشمن زخمی ہوتا ہے، وہ کسی کا دانت توڑ دیتی ہے، یا آنکھ پھوڑ دیتی ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس

کے بعد بھی اس بھتیجے نے دوبارہ وہ حرکت کی اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تیرے سامنے بیان کررہا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اس کے باوجود تو یہ حرکت کررہا ہے، میں تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ (ابن ماجہ شریف ۳) ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث نقل فرمائی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اپنے اہل کو مسجد میں آنے سے منع نہ کرے، اس پر ان کے ایک صاحب زادہ (جن کا نام واقد یا بلال تھا) نے کہا کہ ہم تو منع کریں گے، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تیرے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کررہا ہوں اور تو ایسا کہہ رہا ہے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے وفات تک ان سے بات نہیں کی۔ (مسند احمد بن حنبل ۲/۳۶)

(۸) قومی دھارے میں بہنے سے مراد یہ ہے کہ مسلمان شعارِ کفر اختیار کرنے لگیں، تو اس سے صد بار نعوذ باللہ!! خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اتباع کا نام بنیاد پرستی ہے، تو یقیناً ہم بنیاد پرست ہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے، باقی غیروں کے طعن وطنز سے ہم شریعت کو تو نہیں چھوڑ سکتے، آخر مشرکینِ مکہ کی طرف سے وہ کون سی تجویز صلح رکھی گئی تھی جس پر سورۂ کافرون کا نزول ہوا؟ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: کفارِ مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں، ان سب میں کم از کم کفر واسلام کے حدود میں التباس یقینی ہے اور بعض صورتوں میں تو اصولِ اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا ہے، ایسی صلح سے سورۂ کافرون نے اعلانِ براءت کردیا اور دوسری جگہ جس صلح کو جائز قرار دیا اور معاہدۂ یہود سے اس کی عملی صورت معلوم ہوئی، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں، جس میں اصولِ اسلام کے خلاف کیا گیا ہو، یا کفر واسلام کی حدود آپس میں

ملتبس ہوئی ہوں، اسلام سے زیادہ کوئی مذہب رواداری، حسن سلوک، صلح وسالمیت کا داعی نہیں؛ مگر صلح اپنے انسانی حقوق میں ہوتی ہے، خدا کے قانون اور اصولِ دین میں کسی مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سنیچر کی تعطیل میں یہود سے تشبہ ہے

سوال: ہمارے یہاں دینی مکتبوں میں پچھلے چند سالوں سے جمعہ کو تعلیم جاری رکھی جاتی ہے، اور بجائے جمعہ کے سنیچر کو تعطیل رکھی جاتی ہے، ایسا کرنے میں بچوں کی حاضری زیادہ رہتی ہے، یہ عذر پیش کیا جاتا ہے، آیا ذمہ داروں کا یہ فعل یعنی سنیچر کو تعطیل تشبہ بالیہود ہے یا نہیں؟ اس کو باقی رکھنا چاہئے یا بدل دینا چاہئے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شنبہ کی تعطیل یہ یہودیوں کا مذہبی شعار ہے، اس لیے ہمارے دینی مدارس میں شنبہ کو تعطیل کرنے سے ان کے ساتھ تشبہ لازم آتا ہے، اور یومِ یہود کی تعظیم کو بھی مستلزم ہے، اس لیے اس کو بدل کر حسبِ سابق یومِ جمعہ کو تعطیل کی جائے۔ (ماخوذ از امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۶۶)

فقط واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۲۸/ جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ

اِس زمانہ میں کسی کو غلام باندی بنانا

سوال: ہندوستان میں باندی یا غلام بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی مرد یا

عورت یا ان کے سرپرست کسی سے مثلاً یہ کہے کہ مجھے پانچ ہزار روپئے دو مجھے ضرورت ہے، اورتم مجھے یا ان کو جس کے بارے میں سرپرست کہے، غلام یا باندی بنالو تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ مفصل جواب مع مدلل تحریر فرمائیں۔ (خواہ کافر ہو یا مسلمان)

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مذکور فی السوال صورت تو آزاد کی بیع ہے، جو باطل ہے، ایسا کرنے سے نہ تو کوئی مرد غلام بنتا ہے، نہ کوئی عورت باندی، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اور ایسی بیع پر حدیث میں شدید وعید آئی ہے، آیت کریمہ: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (سورۂ نساء۳) کی تفسیر کے ضمن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: قرآن کریم نے صاف صاف فرمادیا کہ اگر عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بیوی رکھو، یا کنیز سے گزارہ کرلو، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مملوک کنیز جس کا ذکر آیت میں ہے، اس کی خاص شرائط ہیں جو عموماً آج کل مفقود ہیں، اس لیے اس زمانہ میں کسی کو مملوک شرعی کنیز کہہ کر بے نکاح رکھ لینا حرام ہے۔ (معارف القرآن ۲/۲۹۴) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

باندیوں کا رواج کب ختم ہوا؟

سوال: حضور ﷺ کے زمانے میں باندیوں کا رواج تھا، کب رواج ختم ہوا؟ کیا قرآن میں کوئی آیت یا حدیث موجود ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

حضور ﷺ کے بعد بھی رہا، اور صدیوں تک رہا، دھیرے دھیرے آپ ہی ختم ہوا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۲/ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ

ماءِ زمزم کافر کو دینا

سوال: زمزم کا پانی غیر مسلم کو پینے کے لیے دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دے سکتے ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ ۴/۸۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کافر کو زمزم کا پانی دے سکتے ہیں

سوال: کافر کو کھجور اور زمزم (اس کی طلب پر باعتقاد متبرکاً) پلا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

احرام کی چادر کو کیا کرے؟

سوال: احرام کی چادروں کو اب گھر آ کر کیا کریں؟ آدمی اپنے کفن کے لیے رکھنا چاہتا ہے کیا حکم ہے؟ یا پھر اسے صدقہ کرنا چاہیے، افضل کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کفن کے لیے بھی رکھ سکتا ہے، دوسرے کام بھی لا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بیوہ عورت شادی کر لے تو جنت میں کس کو ملے گی؟

سوال: زید نے ایک بیوہ عورت سے شادی کی، تو انتقال کے بعد جنت میں وہ عورت کس زوج کی رفاقت میں ہوگی؟ زوجِ اول کی رفاقت میں یا زوج ثانی (زید) کی

رفاقت میں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جس عورت نے دنیا میں متعدد شوہر کئے ہیں، اس کے متعلق علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ اخیر شوہر کو ملے گی۔ دوسرا یہ کہ اس کو اختیار دیا جائے گا جس کو وہ پسند کرے گی، اس کو ملے گی۔

اختلف الناس في المرأة إذا كان لها زوجان في الدنيا لأيهما تكون في الآخرة؟ قال بعضهم: تكون لآخرهما، وقال بعضهم: تخير فتختار أيهما شاء ت، وقد جاء في الاثر مايؤيد قول كلا الفريقين: أما من قال هي لآخرهما فقد ذهب إلى ما روي عن معاوية بن أبى سفيان أنه خطب أم الدرداء، فأتتْ وقالت: سمعت أبالدرداء يحدث عن النبي ﷺ أنه قال: المرأة لآخر زوجها في الآخرة، وقال إني أردت أن تكون زوجتي في الآخرة، فلا تتزوجي بعدي. وأما من قال بأنها تخير فذهب إلى ماروي عن أم حبيبة زوج النبي ﷺ أنها سألت النبي ﷺ، فقالت يارسول الله ﷺ: المرأة منا ربما يكون لها زوجان لأيهما تكون في الآخرة؟ قال: تخير فتختار أحسنهما خلقاً معها، ثم قال عليه السلام: ذهب حسن الخلق بخير الدنيا والآخرة.

اهـ. "بستان الفقه" أبي الليث السمرقندي ١٥١ (فتاویٰ محمودیہ ۸/۳۲۱، ۳۲۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کیا غوث پاک پیدائشی حافظ تھے؟

سوال: کیا غوث پاک پیدائشی سترہ پارہ کے حافظ تھے؟ کیا اس میں صداقت ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کوئی بچہ پیدائشی حافظ وعالم ہو؟ ایک رافضی نے بحث کی تھی جس میں یہ بات کہی تھی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق ایسا کوئی واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا، جو صاحب ایسا دعویٰ کرتے ہیں انہی سے ثبوت طلب کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بیوی کو راضی رکھے یا ماں کو؟

سوال: اگر شوہر کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی سے شوہر کی ماں زیادہ کام لیتی ہے اور بغیر قصور کے اس کو برا بھلا کہتی ہے اور کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ شریعت سے جائز نہیں اس طرح کے واقعات بھی ہوتے ہیں اور اس کا شوہر سب کچھ سنتا ہے؛ لیکن اگر وہ اپنی ماں کو روکنے جاتا ہے تو اس کے اوپر سب آجاتا ہے، یعنی اس کی ماں کہتی ہے کہ تو اس کا ہوگیا ہے، میری بات نہیں مانتا ہے، ماں کو ناراض کرنا یہ بھی اس کو پسند نہیں، تو اب وہ اس کا شوہر اس طرح کے حالات سامنے ہو تو کیا کریں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جو امر شرعاً ناجائز ہو، اور ماں باپ اس کا حکم کریں تب بھی ان کی اطاعت جائز نہیں۔ (تعدیل حقوق الوالدین، رسالہ امداد الفتاویٰ ۴/۴۸۴)

ایسی باتیں احکام شرع سے ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے پیش آتی ہیں، شوہر

کو چاہیے کہ اپنے والدین کو ان سے خوب واقف کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

شوہر کا پسندیدہ لباس پہننا

سوال: ایک آدمی ہے، اس نے شادی کی، اب وہ چاہتا ہے کہ میری بات مانے اور اس طرح کا میری بیوی لباس پہنے جو کہ مجھ کو پسند ہے، چاہے اس کو پسند نہیں اور وہ بھی صرف مجھ کو دکھلانے کے لیے پہنتی ہے؛ لیکن اس طرح کا لباس پہننے سے شوہر کے ماں باپ لڑکی کو یعنی کہ اس شخص کی بیوی کو برا بھلا کہتے ہیں، تو اس کے لیے مسئلہ کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شوہر جس وضع قطع کا لباس اپنی بیوی کو پہنانا چاہتا ہے، اگر وہ جائز ہے تو بیوی اس وضع کا لباس شوہر کو خوش کرنے کے لیے پہنے، یہ شرعاً مستحسن اور مطلوب ہے، شوہر کو چاہیے کہ بیوی کو اس نوع کا لباس پہنانے سے پہلے اپنے والدین کو حقیقت مسئلہ سے آگاہ کرکے بتلائے کہ میرے حکم سے یہ اس لباس کو پہن رہی ہے؛ تاکہ وہ اس کو برا بھلا نہ کہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مظلومہ بیوی کو ماں کے ساتھ رکھنا

سوال: اگر کوئی شخص کی بیوی کے اوپر اس کے گھر والے ظلم کرتے ہو، یعنی شوہر کے گھر والے، اور یہ سب شوہر کو پسند نہیں، اس وجہ سے وہ شوہر اپنے گھر ایک سال کے بعد جاتا ہے، یعنی زیادہ نہیں جاتا ہے، اس لیے کہ اگر جائے گا تو پھر اس شوہر کی ماں اس کی بیوی سے کچھ زیادتی کرے گی اور اس سے برداشت نہیں ہوگا اور یہ آدمی بول پڑے گا، پھر ماں اور بیٹے کے درمیان ان بن ہوگی، اس لیے یہ شخص ایک ایک سال کے بعد جاتا

ہے، تو کیا اس طرح کے اس کے جانے میں کوئی خرابی لازم آسکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اپنی بیوی کو اس طرح ظلم کے لیے ظالم کے حوالہ چھوڑ دینا جائز نہیں، اگر شوہر جانتا ہے کہ واقعۃً بیوی پر ظلم ہو رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کو اپنے ساتھ رکھے، یا الگ مکان کا نظم کرے؛ البتہ اگر بیوی از خود ان مظالم کو برضاء ورغبت برداشت کرکے ان کے ساتھ رہنے کو تیار ہے، تو اس صورت میں شوہر گنہ گار نہ ہوگا۔ (ہدایہ ۲/۴۴۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

بیوی سے دو سال دور رہنا

سوال: اگر کوئی آدمی شادی کرے، اس کے بعد وہ ایک سال کے بعد گھر آیا، پھر آیا، آہستہ آہستہ گھر کے ماحول اور دوسرے رشتہ داروں کے ماحول نے اس کا دماغ تنگ کردیا، مطلب کہ اس کا گھر پر رہنا بھاری ہوگیا، اس کی بیوی بھی اس میں شامل ہے، اب اس نے سوچا کہ اب میں گھر پر دو سال کے بعد آؤں گا اور دو مہینے رہ کر چلا جاؤں گا، اس کے اندر میاں بیوی کے حقوق رہ جاتے ہیں، تو کوئی خرابی لازم آئے گی یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

شوہر اپنی عورت کی رضا اور اجازت کے بغیر چار ماہ سے زائد جدا نہ رہے۔

ويجب أن لا يبلغ له مدة الإيلاء إلا برضاها، وطيب نفسها به. (شامی ۲/۵۴۷)

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رات کے وقت مدینہ طیبہ کی گلیوں میں (گلی

کوچوں میں) گشت لگاتے تھے، کہ ایک مکان سے جوان عورت کی آواز سنائی دی، وہ فراق شوہر میں شعر پڑھ رہی تھی:

فوالله لولا الله تخشى عواقبه لزحزح من هذا السرير جوانبه

یعنی قسم بخدا! اگر مجھ کو خوف خدا نہ ہوتا، تو آج چار پائی کی چولیں ہلتی ہوئی ہوتیں۔

آپ رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی، تو کہنے لگی کہ کافی عرصہ ہوا، میرا شوہر جہاد میں گیا ہے، اس کے فراق میں یہ شعر پڑھ رہی تھی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ محزون ہوئے، گھر آکر اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا کہ عورت شوہر کے بغیر کتنی مدت تک صبر کرسکتی ہے؟ عرض کیا کہ چار ماہ؛ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمان جاری کیا کہ، ''شادی شدہ فوجی کو چار ماہ ہونے پر اپنے گھر جانے کی اجازت دیدی جائے''۔

(فتاویٰ رحیمیہ ۳/۱۲۴، ۱۲۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ

آپسی تنازع کو دور کرنے میں مصالحت

سوال: ہماری بستی مانگرول میں سالِ گذشتہ بریلوی اور دیوبندی حضرات کے درمیان عید الفطر کی شام سخت اختلاف برپا ہوگیا تھا؛ چونکہ بریلوی حضرات نے پولیس افسران کو رشوت دے کر پہلے سے ہی اپنے طرف دار بنا لیے تھے، بناء بریں ہمارے دس حضرات پولیس فائرنگ سے جان بحق ہوگئے تھے، اس واقعہ کو تقریباً ایک سال سے زیادہ زمانہ گزر چکا، عدالتی کاروائی کی طرف سے اس وقت تک کوئی فیصلہ آیا نہیں ہے، اب یہاں صلح کا مسئلہ آ کھڑا ہوگیا ہے، جبکہ فریق مقابل (بریلوی) کا کہنا یہ ہے کہ ہم لوگ صلح

تو کرنا چاہتے ہیں، مگر ہم اپنی رسوماتِ بدعات کو کسی بھی صورت میں چھوڑیں گے نہیں، علاوہ ازیں ہمارے شہداء کے پس ماندگان کو مصالحت گوارہ نہیں، ایسی صورت حال میں اگر سربراہانِ فریقین مصالحت کر لیتے ہیں، تو کیا وہ عنداللہ گنہ گار ہیں؟ جبکہ دس شہداء کے پس ماندگان کے دل ایسی دب کر مصالحت کرنے سے ناراض، ناخوش ہیں؛ نیز ان پس ماندگان کو گناہ ہوگا، اگر وہ مصالحت کے لیے آمادہ نہ ہوئے تو؟

نوٹ: پس ماندگانِ شہداء کا کہنا یہ ہے کہ اگر مصالحت نہ کرنے کی صورت میں خوفِ گناہ ہو، تو ہی ہم مصالحت کے لیے آمادہ ہوں گے، ورنہ نہیں۔

یہاں پر بعضے حضرات ایسے بھی ہیں، جو ولا الی ھؤلاء کے مصداق ہیں، وہ حضرات ہر دو فریق سے ملتے ملاتے رہتے ہیں، نتیجۃً ان کے افعال واقوال سے ہمیں بہت ہی ضرر پہنچا ہے، تو کیا شریعتِ مطہرہ ان حضرات سے قطع تعلق کرنے کی اجازت دے گی؟

نوٹ: مذکورہ بالا سوالات کے جوابات مع حوالہ بالوضاحت دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مسلمانوں کا آپس کا نزاع اور لڑائی شریعتِ مطہرہ کی نظر میں ناپسندیدہ اور مبغوض ہے، قرآن وحدیث میں اس سلسلہ میں صاف صاف ہدایات اور احکام موجود ہیں، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (نزاع مت کرو، ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائیگی اور صبر کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں) (سورۂ انفال) اس میں باہمی نزاع کے دو نتیجے بیان کئے گئے ہیں: ”ایک یہ کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل

ہو جاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی، دشمن کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے“
اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿واصبروا﴾ یعنی صبر کو لازم پکڑو۔

سیاقِ کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتلایا گیا ہے، اور بیان اس کا یہ ہے کہ کوئی جماعت کتنی ہی متحد الخیال اور متحد المقصد ہو؛ مگر افرادِ انسانی کی طبعی خصوصیات ضرور مختلف ہوا کرتی ہیں؛ نیز کسی مقصد کے لیے سعی وکوشش میں اہلِ عقل وتجربہ کی رایوں کا اختلاف بھی ناگزیر ہے، اس لیے دوسروں کے ساتھ چلنے اور ان کو ساتھ رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، کہ آدمی خلافِ طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا عادی ہو اور اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اس کو قبول نہ کیا جائے، تو لڑ بیٹھے، اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے، آج کل یہ تو ہر شخص جانتا اور کہتا ہے کہ آپس کا نزاع بہت بری چیز ہے؛ مگر اس سے بچنے کا جو گُر ہے کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے کا خوگر بنے، اپنی بات منوانے اور چلانے کی فکر میں نہ پڑے، یہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے؛ اسی لیے اتحاد واتفاق کے سارے وعظ وپند بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں، آدمی کو دوسرے سے اپنی بات منوانے پر تو قدرت نہیں ہوتی؛ مگر خود دوسری کی بات مان لینا، اور اگر اس کی عقل ودیانت کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو نہ مانے، تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لیے سکوت کر لینا، تو بہرحال اختیار میں ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے نزاع سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی ہر فردِ جماعت کو کر دی؛ تاکہ نزاع سے بچنا عملی دنیا میں آسان ہو جائے۔ (معارف القرآن ۴/۲۵۲، ۲۵۳)

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”ألا أخبر کم بأفضل من درجة الصیام والصدقة

والصلوٰۃ؟ قال: قلنا: بلی! قال: اصلاح ذات البین، وفساد ذات البین، ھی الحالقة" (مشکوٰۃ ۴۲۸) یعنی تمہیں نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ سے افضل چیز بتلاؤں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، ضرور! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپس کا سلوک سب سے افضل ہے اور آپس کی لڑائی دین کو مونڈنے والی ہے، یعنی جیسے استرے سے سر کے بال ایک دم صاف ہوجاتے ہیں، آپس کی لڑائی سے دین اسی طرح صاف ہوجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سود کے ستر سے زیادہ باب ہیں، سب سے سہل اور ہلکا درجہ اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر ہے اور ایک درہم سود کا پینتیس زنا سے زیادہ سخت ہے۔ (مشکوٰۃ ۲۴۶) اور بدترین سود اور سب سے زیادہ خبیث ترین سود مسلمان کی آبروریزی ہے۔ (مشکوٰۃ ۴۲۹)

آپس کی لڑائی میں عموماً مسلمان کی آبروریزی ہوتی ہی ہے، جس کے نتیجہ میں آدمی اس وعید کا مصداق بنتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ آپس کی لڑائی ختم کر کے آپس میں صلح صفائی سے رہیں، خصوصاً دور حاضر میں اس ملک میں جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے استیصال اور ان کو بیخ وبُن سے اکھاڑنے کی منظّم سعی جاری ہے، صلح میں کوئی ایسی شرط لگانا جس سے شریعتِ مطہرہ کی حرام کردہ کسی چیز کا حلال کرنا لازم آتا ہو، یا شریعت مطہرہ کی کسی حلال کردہ چیز کا حرام کرنا لازم آتا ہو، جائز نہیں ہے، اور شریعت ایسی صلح کی اجازت نہیں دیتی، ابوداؤد شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "الصلح جائز بین المسلمین" (زاد احمد) إلا صلحاً حرم حلالا أو أحل حراماً. (ابوداؤد شریف ۲/ ۵۰۶) یعنی مسلمانوں کے درمیان ہونے والی ہر صلح جائز ہے؛ مگر وہ صلح جو شریعت کی حلال کردہ کسی جائز چیز کو حرام ٹھہراتی ہو، یا شریعت کی حرام کردہ کسی ناجائز چیز کو حلال ٹھہراتی ہو۔

اس لیے اگر فریقِ مخالف صلح میں یہ شرط رکھتا ہو کہ ہم اپنی بدعات پر قائم رہیں گے، تو اس شرط کے ساتھ صلح جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بدعت کو شریعتِ مطہرہ نے حرام اور گمراہی قرار دیا ہے، ہاں! اگر ایسی کوئی شرط صلح میں نہیں رکھی گئی، تو صلح درست اور جائز؛ بلکہ پسندیدہ ہے، جن لوگوں کے اعزہ شہید ہوئے ہیں، ان کو قتل کرنے میں اگر کسی نے براہِ راست حصہ لیا ہے، یعنی فعلِ قتل کے انجام دینے میں وہ شریک ہے، تو مقتول کے شرعی ورثاء کو اختیار ہے کہ قاتل کو معاف کریں، اور اگر وہ معاف نہیں کرتے، تو ان کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے؛ لیکن صورتِ مسئولہ میں فریق مخالف نے براہِ راست فعل قتل انجام نہیں دیا ہے؛ بلکہ قتل کرنے والی تو پولیس ہے، جس نے پیسہ کے لالچ میں یہ کام کیا ہے، اس لیے شرعی طور پر اس کام کے لیے رقم دینے والے لوگ قاتل نہیں کہے جا سکتے، ہاں! ان کو اپنی اس حرکت کی وجہ سے گناہِ عظیم ضرور لازم آتا ہے، جس سے توبہ کرنا ان کے لیے ضروری ہے؛ بہر حال موجودہ صورت میں مقتولین کے اعزہ کو چاہئے کہ مصالحت میں رکاوٹ نہ ڈالیں، ورنہ ایک کارِ خیر میں رکاوٹ کے مجرم بنیں گے، جو لوگ دونوں فریق سے ملتے ملاتے رہتے ہیں، اگر ان کا مقصد اس سے دونوں فریق کے درمیان تعلقات کو ٹھیک کرنا اور دونوں کے نزاع کو ختم کرنا ہے، تو ان کا یہ فعل شرعاً پسندیدہ اور مستحسن ہے؛ بلکہ اگر اس مقصد کے حصول کے لیے کبھی کوئی خلاف واقعہ بات کرنا پڑے، تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ليس الكذاب الذي يصلح بين الناس، ويقول خيراً ويمني خيراً.'' متفق عليه. (مشكوٰة شريف ٤٢٨، ٤١٢) (یعنی وہ آدمی غلط بیانی کرنے والا نہیں ہے، جس کا مقصد لوگوں

کے درمیان صلح صفائی کرانا ہو، اور (اس مقصد کے لیے وہ) دوسروں کی طرف نسبت کر کے کوئی بھلی بات پہنچاتا ہے۔

اور اگر ان لوگوں کا مقصد دونوں کے درمیان اختلافات کو بڑھانا اور اس کی خلیج کو وسیع کرنا ہے، تو ان کی یہ حرکت نہایت درجہ شنیع اور قابلِ نفرت ہے، ایسے لوگوں کے متعلق ''بخاری و مسلم'' میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد موجود ہے کہ: "تجدون شر الناس يوم القيٰمة ذا الوجهين، الذي يأتي هؤلاء بوجه، وهؤلاء بوجه." متفق عليه. (مشكوة شريف ٤١١) (یعنی قیامت کے دن سب سے بدترین حال دورخ والے کا ہوگا، جو ایک فریق سے کچھ کہتا ہے، اور دوسرے فریق سے کچھ کہتا ہے) چونکہ ایسے لوگوں کی برائی اور بھلائی کا مدار ان کی نیت پر ہے، اس لیے جب تک ان کی طرف سے کوئی بات ان کی برائی پر شرعی دلیل سے ثابت نہ ہو، وہاں تک ان کے معاملہ کو بھلائی پر ہی محمول کرنا چاہئے، اس لیے کہ حدیث پاک میں مومنین کے ساتھ نیک گمان کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد: "ظنوا بالمؤمنين خيراً" (یعنی مسلمانوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھو) نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے: "حسن الظن من حسن العبادة." (مشکوٰۃ ۴۲۹) (یعنی حسنِ ظن من جملہ حسن عبادت کے ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

عورت کے ارتکابِ زنا میں شوہر پر گناہ ہے؟

سوال: ایک شخص اپنی بیوی کی رضامندی کے ساتھ بیرونِ ممالک (خاص طور پر سعودی) جاتا ہے اور تقریباً تین یا چار سال بعد آتا ہے، تو اس عرصہ میں عورت سے

بدکاری زنا وغیرہ ہوگیا، تو شوہر گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اور اگر بغیر رضامندی کے گیا، تو کیا حکم ہے؟ دونوں صورتوں کو مفصل واضح فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مرد اپنی بیوی کی رضامندی اور اجازت کے بغیر چار ماہ سے زائد جدا نہ رہے۔

قال في الفتح: واعلم أن ترك جماعها مطلقاً لا يحل له، صرح أصحابنا بأن جماعها أحيانا واجب ديانة؛ لكن لا يدخل تحت القضاء والالزام الوطئة الأولىٰ، ولم يقدروا فيه مدة، ويجب أن لا يبلغ به مدة الإيلاء إلا برضاها، وطيب نفسها به. اهـ (شامی ۴۳۲/۲) شوہر عورت کی اذن ورضا سے چار ماہ سے زائد جدا رہے یا بغیر اذن ورضا کے ایسا کرے؛ بہر صورت عورت پر اپنی عصمت وعفت کی حفاظت لازم اور ضروری ہے اور زنا کے ارتکاب کی صورت میں وہ گنہگار ہوگی؛ البتہ اگر عورت کے متعلق شوہر کا یہ خیال تھا کہ میری جدائی کی صورت میں وہ اپنی عفت وعصمت کی حفاظت نہ کرسکے گی، اس کے باوجود شوہر اتنی مدت غائب رہا، تو چونکہ عورت کے ارتکابِ زنا میں شوہر کے عدم ادائے حقوق زوجیت کو بھی دخل ہے، اس لیے اس درجہ میں وہ بھی گنہگار ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

کسی کے نام محمد پر درود شریف کی علامت لگانا

سوال: اگر کوئی آدمی اپنا نام محمد رکھے اور اس کے اوپر ؐ اس طرح لگا سکتا ہے؟ حالانکہ ''محمد ﷺ'' اس طرح جب وہ لکھے گا اس وقت اس کے دل میں یہ نیت ہے کہ میں

محمد کا غلام ہوں، بذات خود نہیں ہوں، تو اس کا نام محمد ہونے کے ناطے اس کے اوپر اس طرح کا محمد کا ''ص'' رکھنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

جب لفظ محمد اس آدمی کے لیے بطورِ علم استعمال ہورہا ہے، تو اس پر درود شریف کی علامت کے طور پر استعمال ہونے والا ''ص'' لگانا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کلمۂ ترضی کا استعمال ائمۂ اربعہ پر

سوال: ائمۂ اربعہ کو ''رضی اللہ عنہ'' لکھنا، کیا یہ صحیح ہے؟ جبکہ بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کلمۂ ترضی کا استعمال ائمہ کے حق میں بھی درست ہے۔ (درمختار علی ھامش الشامی ۵/۵۳۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ، ۲۶/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کلمۂ ترضی و ترحم کا استعمال

سوال: رضی اللہ عنہ یہ صحابہ کے ساتھ خاص ہے، پھر بعض جگہ ائمہ اربعہ کے نام کے ساتھ کیوں لکھا جاتا ہے؟ یہ کسی امام کے نام کے ساتھ لکھے تو کیا مطلب ہوگا؟ کیا وہی مطلب ہوگا جو صحابہ کے ساتھ خاص ہے؟ سمجھائیے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مستحب یہ ہے کہ صحابہ کے لیے کلمۂ ترضی، اور تابعین و دیگر صلحاء و علماء کے لیے کلمۂ ترحم استعمال کرے؛ لیکن اس کے برعکس صورت بھی جائز ہے۔

وكذا يجوز عكسه؛ الترحم للصحابة، والترضي للتابعين ومن بعدهم. (در مختار على هامش الشامي ٥/٥٣٢)

آپ کا کلمۂ ترضی کو صحابہ کے لیے مخصوص سمجھنا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

درود تاج اور درود لکھی کا ورد

سوال: (۱) ہمارے علمائے دین درود تاج اور درودِ لکّھی سے کیوں منع کرتے ہیں؟ اچھا اس میں کیا خرابی ہے؟

حضور اکرم ﷺ کی قبر مبارک پر غلاف

(۲) آپ کی قبر مبارک پر جو غلاف چڑھا ہے، کیا صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا تھا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) درود تاج میں حضور ﷺ کے لیے دافع البلاء، والوبا، والقحط، والمرض، والألم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جو موہمِ شرک ہیں، اور عوام میں مفسدہ کا باعث ہیں، اس لیے قابل اجتناب واحتراز ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں درود بھیجنے کے لیے دوسرے صحیح درود شریف بہت ہیں، ان کو ہی پڑھا جائے۔ (خیر الفتاویٰ ۱/۳۳۸)

درودِ لکّھی کے متعلق جو فضائل بیان کئے جاتے ہیں، وہ سب بے بنیاد ہیں، صحیح حدیثوں میں درود شریف کے جو صیغے آتے ہیں، ان کو چھوڑنا اور اس درود میں بہت کچھ

ثواب کی امید رکھنا اور اس کا ورد کرنا گمراہی ہے۔

(۲) مجھے یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک پر غلاف ہے، قبر پر غلاف چڑھانے کا حضور ﷺ نے حکم نہیں دیا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بھی قبر مبارک پر غلاف ہونا ثابت نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

ورکروں کو قرض دے کر تنخواہ سے وصول کرنا

سوال: (۱) دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے بزنس کا کاروبار ہمارے والد صاحب کے ہاتھ میں ہے، اور ہم بھائی لوگوں کو الگ الگ بزنس پے بٹھا دیا ہے، اور کاروبار سنبھالتے ہیں، اور ہمیں ہر مہینہ پر تنخواہ مقرر کر دی ہے وہ لیتے ہیں، بزنس سے فی الحال ہم کو کوئی حصہ ملتا نہیں ہے، تو ہمیں کاروبار سنبھالنے میں بہت دشواریاں ہوتی ہیں، اس میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ کاروبار میں نوکر یعنی ورکروں سے کام لینا ہوتا ہے، جب ان سے کام لیا جاتا ہے تو ورکر اپنی ضرورت یا کوئی کام کی وجہ سے ہم سے کچھ رقم یعنی پیسہ مانگا کرتے ہیں، تو ان کو دینا پڑتا ہے، اگر نہیں دیویں تو کاروبار میں خلل ہوتا ہے، اور جب ہم نے رقم دیدیا، پھر وہ رقم اپنے والد صاحب سے مانگتے ہیں، تو کہتے ہیں میں نہیں جانتا، تم نے دیا ہے تو تم بوجھ اٹھاؤ، میں نہیں دوں گا، اب میرے جیب سے دینا پڑی ہے، تو کیا میرے اس رقم کی وصولی کا کوئی طریقہ ہو تو وضاحت کریں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): آپ ورکروں کو رقم قرض کے طور پر دے سکتے ہیں، اور بعد میں ان کی تنخواہ

سے وصول کر سکتے ہیں، اس صورت میں آپ پر بار نہیں پڑے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

نقولِ فتاویٰ کے رجسٹر کا مالک کون؟ مفتی یا مدرسہ؟

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ زید عرصہ سولہ سترہ سال سے ایک عربی مدرسہ سے وابستہ رہا، تقرر بحیثیتِ عربی مدرس کے ہوا تھا، اس کے کچھ عرصہ کے بعد زید کے فقہی ذوق اور مناسبت کو دیکھتے ہوئے صدر مدرس مدرسہ ہذا نے جو اس وقت تک خود فتاویٰ لکھتے تھے، زید سے یہ کام بھی لینا شروع کیا، اور خود مناسب رہنمائی اور مکمل دیکھ بھال اور نگرانی فرماتے رہے، کچھ دنوں کے بعد کلیۃً فتویٰ نویسی کا کام زید کو سونپ دیا، مگر مدرسہ نے دوسرا کوئی انتظام بسلسلہ نقل وغیرہ نہیں کیا، فتاویٰ مدرسہ میں اور مدرسہ کے پتے پر آتے؛ مگر اکثر زید ہی کے نام سے آتے تھے، زید نے بارہا ناقل کا مطالبہ بھی کیا؛ مگر اس مطالبے کے باوجود مستقل ناقل کا کبھی کوئی انتظام مدرسہ کی طرف سے نہیں کیا گیا، زید نے یہ بھی کہا کہ مدرسہ استطاعت نہ رکھتا ہو تو میں الگ سے اس کام کے لیے چندہ کر کے دوں گا، پھر میری تنخواہ سے ناقل کا خرچ وضع کر لیا جایا کرے، اس پر بھی کوئی توجہ نہیں ہوئی، کئی مرتبہ انتظامیہ کے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ یہ انتظام تو نہیں ہوسکتا، ضرورت ہے تو فتاویٰ کی فوٹو کاپی رکھ لیا کریں، ان حالات میں اپنے ریکارڈ کو باقی رکھنے کے لیے زید نے ذاتی طور پر یہ انتظام کیا کہ خود ہی جزءوقتی ناقل کا انتظام کرتا، اس کا مشاہرہ بھی خود دیتا، کبھی ناقل نہ ہوتا تو طلبہ سے نقل کراتا، اور بیشتر انہیں بھی کسی نہ کسی عنوان سے اپنے پاس سے اس کا معاوضہ دیتا، مدرسہ نے کبھی یہ مصارف برداشت نہیں کئے، حد تو یہ ہے رجسٹر بھی نہیں دیئے گئے، مجبوراً زید نے رجسٹروں کا انتظام بھی خود ذاتی

طور پر کیا، اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) اس صورت میں نقولِ فتاویٰ کے یہ رجسٹر کس کی ملکیت ہیں، زید ان کا مالک ہے یا مدرسہ؟

(۲) اگر زید مالک ہے، تو کیا شرعاً اس پر یہ لازم ہے کہ مدرسہ سے علیحدگی کی صورت میں اصل رجسٹر یا ان کی نقول مدرسہ کے حوالے کر دے؟

(۳) زید کی ذمہ داری کیا تھی صرف فتاویٰ کا جواب لکھنا، یا جواب لکھنے کے ساتھ مدرسہ کے لیے نقول کا مہیا رکھنا بھی اس پر لازم تھا، اور کیا اس کے فرائضِ منصبی میں یہ بھی شامل تھا یا کہ ذاتی اخراجات کے ساتھ مدرسہ کے لیے نقل مہیا کرتا۔ بینوا توجروا.

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) جب صورتِ حال یہ ہے کہ زید نے ذاتی طور پر رجسٹر خرید کر اپنے لیے نقل محفوظ رکھنے کی غرض سے خود ہی ناقل کا انتظام کیا، اور اس کی تنخواہ بھی خود ادا کی تو اب نقل فتاویٰ کے رجسٹر زید کی ملک ہیں۔

(۲) جب زید ان کا مالک ہے تو اب اس پر یہ لازم نہیں کہ اپنی علیحدگی کی صورت میں یہ رجسٹر مدرسہ کے حوالہ کرے، ان کی نقول حوالہ کرنے کی بھی ذمہ داری اس پر نہیں ہے؛ البتہ اگر مدرسہ ان کی نقول اپنے مصارف سے کروانا چاہے تو کرا سکتا ہے۔

(۳) جس وقت فتاویٰ نویسی کا کام زید کے حوالہ کیا گیا تھا، اس وقت زید کو اس کا پابند نہیں کیا گیا تھا کہ فتاویٰ کی نقول بھی مدرسہ کے لیے مہیا کرے، تو یہ کام اس پر لازم نہیں تھا، فرائضِ منصبی میں وہی کام داخل ہوتا ہے جس کی بوقتِ عقد تصریح کی گئی ہو، یا

جس کا عرف ہو، نقولِ فتاویٰ مدرسہ کے لیے مہیا کرنے کی بوقتِ عقد تصریح نہیں کی گئی، اوراس کا عرف بھی نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ٹال مٹول کرنے والے مدیون کے مال سے چوری کرنا

سوال: زید کا عمر پر سو روپیہ قرض ہے، عمر گنجائش ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہے، آیا زید غصب کر کے یا چوری کر کے اس سے وصول کرسکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر مدیون منکر ہے، اور دائن کے پاس گواہ بھی موجود نہیں، اور دائن بواسطۂ حاکم اپنا حق وصول کرنے سے قاصر ہے، تو ایسا کرسکتا ہے ورنہ نہیں۔ (تکملہ فتح الملہم ۲/ ۵۷۹۔ شامی ۳/ ۲۱۹) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

مرتد بعد اسلام مرا کیا وہ معصوم ہے؟

سوال: ایک مسلمان مرد فاسق وفاجر کو معلوم ہوا کہ کفر کے بعد ایمان لانے سے گناہ ختم ہوجاتے ہیں، تو کیا وہ مرتد ہوکر پھر مسلمان ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تا کہ اس کے تمام گناہ معاف ہوجاوے، اور اگر نہیں ہوسکتا ہے، اس کے باوجود اس نے یہ فعل انجام دیا (یعنی مرتد ہوکر پھر مسلمان ہوگیا) اس کے بعد فوراً موت واقع ہوگئی، تو اس کو معصوم کہہ سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

﴿ومن یرتد د منکم عن دینه فیمت وهو کافر فاولٰئك حبطت اعمالهم

فی الدنیا والآخرۃ﴾(سورہ بقرہ) ایسے لوگوں کے اعمال دنیا وآخرت میں سب غارت ہوجائیں گے، دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اس کی بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے، اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالتِ اسلام میں نماز روزہ جو کچھ کیا تھا سب کالعدم ہوجاتا ہے وغیرہ؛ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہوجائے تو آخرت میں دوزخ سے بچنے اور دنیا میں آئندہ کے لیے احکام اسلام کا جاری ہونا یقینی ہے؛ لیکن دنیا میں اگر حج کرچکا تو بشرطِ وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں، مرتد کی حالت کافرِ اصلی سے بدتر ہے، اسی واسطے کافرِ اصلی سے جزیہ قبول ہوسکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لاوے اگر مرد ہے تو قتل کردیا جاتا ہے، اور اگر عورت ہے تو دوامِ حبس کی سزاء دی جاتی ہے۔(از معارف القرآن ملخصاً)

اسلام کے بعد ارتداد کی کسی صورت میں اجازت نہیں، بڑے سے بڑے گناہ کے لیے توبہ علاج ہے، شریعت کے بتلائے ہوئے طریقۂ علاج کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس کے باوجود اگر اس نے ایسا کیا اور دوبارہ مسلمان ہوا تب بھی اس کو معصوم نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ معصوم تو وہ ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گناہوں کی حفاظت کا نظم کیا گیا ہو ”المعصوم من لہ العصمۃ من الذنوب“ (قواعد الفقہ ٤٩٦) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

جماعتِ اسلامی کا رکن شریعت کی نظر میں

سوال: جماعت اسلامی کے رکن پر شریعت کا کیا فتویٰ ہے؟ ہمارے علماء ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اوران کی جماعت کے لیٹریچر میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اہل سنت والجماعت کے خلاف ہیں، کچھ باتیں معتزلہ کی ہیں، کچھ خوارج کی ہیں، کچھ روافض کی ہیں، کچھ غیر مقلدین کی ہیں، کچھ منکرین حدیث کی ہیں۔ دین اسلام، ایمان، توحید، رسالت، تقویٰ، عبادت، سنت، اسوہ، بدعت، وغیرہ کی تشریح وہ سب سے الگ کرتے ہیں، اوراب تک ان کا جو کچھ مفہوم امت میں شائع ہے اس کو غلط اور دین میں تحریف قرار دیتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ ان کا پیش کردہ دین اسلام گویا ایک جدید قسم کا دین اسلام ہے، اور وہ اس پر اپنے اجتہاد کے ذریعہ استدلال بھی کرتے ہیں، استدلال میں بھی کسی مجتہد و محدث وغیرہ کے پابند نہیں، جس دلیل کو چاہیں رد کردیں، جس کو چاہیں اختیار کریں۔ (فتاویٰ محمودیہ ا/ ۲۴۹، ۲۵۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۸ھ

دھوکہ بازی سے سرکاری راحت حاصل کرنا حرام ہے

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ان مسئلوں کے بارے میں کہ ایک انسان کے پاس اپنی آمدنی سے اپنا گزارا ہوتا ہے، پھر ایک اسکیم ہے کہ سرکاری راحت یعنی سبسڈی مل رہی ہے، اس میں رشوت دینا ہوتا ہے، یعنی کم آمدنی بتا کر رشوت دے کر اس سبسڈی کو حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب تحریر فرماویں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): یہ ایک طرح کی دھوکہ بازی ہے کہ اپنی آمدنی کم بتلا کر ناحق طریقہ سے اپنے

آپ کو مستحقِ امداد ثابت کیا جائے، یہ حرام ہے؛ مزید برآں اپنے اس فریب اور دھوکہ بازی کو درست ظاہر کرنے کے لیے رشوت کا بھی ارتکاب کیا جارہا ہے، وہ بھی حرام ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

خوش عیش زندگی بسر کرنا جبکہ غرباء کا بمشکل گزارہ ہوتا ہو

سوال: (۲) اللہ کے حکموں کو ماننے والے اور جاننے والے، اچھا کپڑا یعنی سوٹ بنوانا اور اچھا پہننا اور اچھا کھانا دوسروں کا خیال نہ کرنا، اچھا مکان بنوانا، اپنی راحتوں کا پورا انتظام بنوانا، سوٹ بنوانا یعنی اپنے گھر والوں کو ایک کلر کے کپڑے بنوا کر پہنوانا، یہ سب صورتیں کرنے سے غریبوں کے لیے خراب اثرات سے اس کو ادھر سے ادھر قرضہ لے کر ماحول کے موافق زندگی کو پورا کرنا ہوتا ہے، تو یہ صورتیں جائز بن سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب تحریر فرماویں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۲) کوئی آدمی حلال اور جائز طریقے سے رقم حاصل کر کے شریعت کے مقرر کردہ حدود میں رہ کر خود اچھا لباس پہنتا ہے یا اپنے متعلقین کو پہناتا ہے، اچھا پاکیزہ کھانا کھاتا ہے، اپنی ضروریات وسہولیات کی رعایت والا مکان تیار کرتا ہے تو یہ جائز ہے؛ البتہ اس کا خیال ضروری ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دوسروں کو کم نہ سمجھے، اور فضول خرچی واسراف سے بچے، بخاری شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "کلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا فی غیر اسراف ولا مخیلة" یعنی کھاؤ، پیو اور پہنو (جو اچھا اور حلال و پاکیزہ ہو) بغیر اسراف اور بڑائی کئے ہوئے۔ (بخاری شریف ۸۶۰/۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

تعویذ باندھنا

سوال: تعویذ کا باندھنا اپنے جسم کے کسی بھی حصہ پر کیسا ہے؟ منع ہے یا جائز ہے؟ مدلل جواب مطلوب ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

تعویذات وگنڈے جو آیات وادعیۂ ماثورہ سے کیے جائیں فی نفسہ جائز ہیں، اگر اس میں کراہت یا حرمت آئے گی تو کسی عارض کی وجہ سے آئے گی، مثلاً عوام کا عقیدہ خراب ہو جاوے کہ وہ تعویذات وگنڈے کو مؤثر بالذات سمجھنے لگیں تو اس سے منع کیا جائے گا، اور ترک بہر حال اولیٰ ہے، مسنون یہ ہے کہ ادعیہ وآیات کو پڑھ کر دم کیا جائے۔ (امداد الاحکام ۱/ ۲۳۸) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ڈاڑھی مونڈنے والے حجام کو دودھ بیچنا

سوال: (۱) ہمارے یہاں ایک مسلمان نائی (حجام) داڑھی مونڈتا ہے، اور غیر شرعی بال بناتا ہے، اور اس کی پوری آمدنی اسی میں سے ہے، اور اب وہ آدمی ہمارے ہاں دودھ لینے کے لیے آتا ہے تو اس کو دودھ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور جائز نہیں تو جتنے دن دودھ آیا اس کے پیسہ لے کر کسی غریب کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱): اگر وہ شخص دودھ کی قیمت داڑھی مونڈنے کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم

سے ادا کرتا ہے تو یہ رقم صدقہ کردی جائے۔ لا تصح الاجارة لعسب التیس، وھو نزوہ علی الاناث، ولا لاجل المعاصی، مثل الغناء والنوح والملاھی. (درمختار) واما الاخذ منھا وھی دون ذلک کما یفعلہ بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحہ احد، واخذ کلھا فعل یھود الھند ومجوس الاعاجم. (درمختار) وفی حظر الاشباہ: والحرمة تتعدد مع العلم. (درمختار) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سوال: (۲) ایک ہندونائی اگر اس طرح کام کرتا ہے، تو اس کے ساتھ دودھ وغیرہ کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۲): اس سلسلہ میں صراحت کہیں نہیں ملی؛ البتہ اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا بھی وہی حکم ہونا چاہئے۔

وقال ط: وفیہ انہ لا یظھر الا علی قول من قال ان الکفار غیر مخاطبین بفروع الشریعة والاصح خطابھم. (شامی ۲۷۷/۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

درزی کا غیر شرعی لباس بنانا

سوال: (۳) اگر کوئی مسلمان درزی ہندوؤں کے غیر شرعی کپڑے بناتا ہے تو اس درزی کو اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۳) درست ہے؛ البتہ احتیاط اولیٰ ہے۔

وفی المحیط لا یکرہ بیع الزنانیز من النصرانی، والقلنسوة من

المجوسی؛ لان ذلك اذ لا ل لهما الخ (شامی ٥/٢٧٧) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ذاکرین کے مجمع میں زور سے تلاوت کرنا

سوال: صبح کی نماز کے بعد اکثر لوگ ذکر اللہ میں بیٹھتے ہیں جو خاموشی سے ذکر کرتے ہیں، ایسی جگہ پر اگر کوئی شخص زور سے قرآن شریف پڑھے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اگر وہاں کوئی نماز میں مشغول نہیں ہے تو درمیانی جہر سے پڑھ سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

سوئے ہوئے شخص کے پاس زور سے تلاوت کرنا

سوال: ایک صاحب سو رہے ہوں اور دوسرے صاحب زور سے قرآن شریف پڑھیں تو نیند اڑ جاتی ہے، ایسی حالت میں قرأت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

سونے کے اوقات میں جب لوگ اپنے گھروں میں سو رہے ہوں، اس وقت کسی کا اتنی زور سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا کہ ان کی نیند میں خلل ہو درست نہیں ہے۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار ۱/ ۴۸۸ کوئٹہ) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نومولود کے کان میں نہلا کر اذان کہے

سوال: نوزائیدہ بچہ کو کان میں اذان پیدائش کے فوراً بعد کہی جائے یا بعد الغسل؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

نہلا کر۔ (اختری بہشتی زیور ۶/۱۲) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا

سوال: اگر شرعی احکام کی پابندی اور نماز وغیرہ کا اہتمام کیا جائے تو انٹرنیشنل اور آئی-پی-ایل میچ میں شریک ہو کر کرکیٹ کھیلنے کے بارے میں اصول شرعیہ جواز فراہم کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اس پر ملنے والی آمدنی کے سلسلہ میں حکم شرعی کیا ہے؟ نیز فی زمانناکرکٹ کو تشبہ بالکفار کا مصداق قرار دیا جائیگا یا نہیں، جبکہ یہ ان کی خصوصیت اور شعار باقی نہیں رہا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

کرکٹ کی ممانعت کی بنیاد صرف تشبہ بالکفار ہی نہیں ہے، اس سلسلہ میں احقر کا ایک تفصیلی جواب محمود الفتاوی، جلد سوم از صفحہ ۱۲۲ تا ۱۳۵ میں مطبوع ہے، بغور ملاحظہ فرمالیں۔

جو لوگ انٹرنیشنل اور آئی-پی-ایل میچ میں شریک ہو کر کرکٹ کھیلتے ہیں وہ بطور اجرت ہوتا ہے، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، اور کرکٹ کو عقد اجارہ میں معقود علیہ قرار دینے کے سلسلہ میں محمود الفتاوی میں لکھا ہے کہ "کھیل کر تو آدمی پیٹ بھر نہیں سکتا، اس میں اجارہ ہی کرنا ہوگا، اب وہ کس بات پر اجارہ منعقد کرے گا؟ معقود علیہ مجہول ہے، اس لیے کہ کھلاڑی کے عمل کو ضبط کرنا مشکل ہے، وقت کی تعیین بھی دشوار ہے، اس لیے کہ کبھی مقررہ وقت سے پہلے ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے؛ نیز فقہاء نے تصریح فرمائی ہے: ولا لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی. (درمختار) (اور گناہ کے کاموں کے لیے اجارہ

درست نہیں، مثلاً گانا، نوحہ کرنا اور کھیل) اور اگر مقصود تماشائیوں کی تفریح ہے تو یہ غیر مقدور التسلیم ہے؛ کما علل وافی عسب التیس (شامی ۳۸/۵)(گابھن کرانے کی اجرت کے ممنوع ہونے کی جو علت بتلائی گئی ہے) اس لیے اس کو کسب معاش کا ذریعہ قرار دینا شرعاً درست نہیں'' (محمود الفتاوی ۱۳۴/۳)

اور جس طرح تشبہ بالکفار ممنوع اور ناجائز ہے، اسی طرح تشبہ بالفساق والفجار بھی ممنوع اور ناجائز ہے جو اس میں پایا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں: موجودہ زمانہ میں کرکٹ ایک ایسا کھیل بن گیا ہے کہ عموماً اس میں خلاف شرع امور پائے جاتے ہیں: نمازوں کا قضا کر دینا، اس پر ہار جیت اور قمار کھیلنا، فساق وفجار اور غافل قسم کے لوگوں کا اسے اختیار کرنا۔ غفلت کی حد یہ ہو چکی ہے کہ دن تو دن اب تو راتوں میں بھی اس میں انہماک رہتا ہے، کرکٹ کے میچ کے وقت نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کا میدان میں جمع ہونا، اور نہ معلوم کون کون سی اخلاقی اور شرعی خرابیاں اس میں آچکی ہیں، اور تجربہ ہے کہ جس قدر اس کا شوق اور انہماک بڑھتا ہے غفلت میں اسی قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے، رات دن بس اسی کی فکر سوار رہتی ہے؛ حتی کہ مسجد میں آنے کے بعد وضو کرتے ہوئے، وضو سے فارغ ہو کر اور بہت سے شوقین تو جماعت خانہ میں بھی اسی کے چرچہ میں مشغول رہتے ہیں، حد یہ ہے کہ اگر کسی موقع میں رمضان المبارک میں تراویح کے وقت میچ کی کومینٹری آرہی ہو تو اس کے بہت سے شوقین تو اس پر تراویح قربان کر دیتے ہیں، اور جو شوقین مسجد میں آتے ہیں ان کی توجہ اور دھیان بس اسی طرف، تراویح میں تسبیح پڑھنے کے بجائے یہی فکر سوار

رہتی ہے کہ میچ کا حال معلوم کیا جائے ، ہار جیت پر پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں، جس میں غیر قوم سے مشابہت کے ساتھ ساتھ اضاعت مال بھی ہے اور بسا اوقات یہ حرکت قومی فساد کا سبب بن جاتی ہے، اور مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان بھی ہوتا ہے، ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے ایسے کھیل کو اب کس طرح جائز کہا جاسکتا ہے؟ (فتاوی رحیمیہ ۲۷۷/۷، ۲۷۸)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ سے ورزش کی نیت سے فٹ بال کھیلنے کے جواز اور عدم جواز کے متعلق پوچھا گیا، جس کا انہوں نے تفصیلی جواب دیا ہے اور جواب میں کرکٹ کا بھی حکم بتلا دیا ہے، وہ نقل کیا جاتا ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

ورزش کی دو قسمیں ہیں: (۱) جس کا تعلق براہ راست جہاد سے ہو، اس کے جواز کے لیے یہ شرط ہے کہ مقام ایسا منتخب کیا جائے ، جس میں جہاد کی مشق کرنے سے گرد ونواح میں کسی قسم کا جانی یا مالی نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو، خود ورزش کرنے والوں کا خطرہ سے محفوظ ہونا ضروری نہیں، اگر کوئی مر بھی گیا تو شہید ہوگا۔

(۲) جس کا براہ راست جہاد کی تربیت سے تعلق نہیں، ایسی ورزش تحفظ صحت اور دینی و دنیوی امور میں معین ہونے کی وجہ سے فی نفسہٖ جائز؛ بلکہ کسی قدر ضروری ہے؛ مگر اس کے لیے یہ شرائط ہیں:

(۱) شرط مذکور یعنی گرد ونواح میں کسی قسم کے جانی و مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

(۲) خود ورزش کرنے والے کو یا اس کے ساتھ شرکاء میں سے کسی کو کسی قسم کے جسمانی یا مالی نقصان یا ایذا پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

(۳) اس میں ورزش کے مفہوم پر کھیل کود، لہو ولعب اور تماشا کا پہلو غالب نہ

ہو۔قال رسول اللہ ﷺ کل شئی یلهو به، الرجل با طل الا رمیه بقوسه وتأدیبه فرسه وملاعبته امرأته فانهن من الحق. رواه الترمذی. (مشکوۃ۲/۳۳۷)

عن سعید بن الجبیر رضی اللہ عنہ أن قریبا لعبد الله بن المغفل رضی اللہ عنہ خذف، قال: فنهاه، وقال ان رسول اللّٰه رضی اللہ عنہ نهی عن الخذف، وقال انها لا تصید صیدا ولا تنکأ عدوا؛ ولکنها تکسر السن وتفقأ العین، قال: فعاد، فقال: احدثك ان رسول اللّٰه ﷺ نهی عنه ثم تخذف لا اکلمك ابدا. (صحیح مسلم، ج/۲ ص،۱۵۲)

گینداورفٹ بال:

یہ درج ذیل فسادات کی بنا پر جائز نہیں:

(۱)اس میں کھیل کے شرکاء کو سخت جسمانی نقصان پہنچتا ہے، اس کی بے شمار مثالیں ہیں، بعض کی ٹانگیں ٹوٹنا اور بعض کے پیٹ میں چوٹ لگنے سے برلب مرگ ہو جانا ہم نے خود دیکھا ہے۔

(۲) قریب سے گذرنے والوں کو نقصان پہنچتا ہے، بعض کی آنکھیں پھوٹنے اور بعض کے چہرے مسخ ہونے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اس شیطانی تماشے کے نواح میں شارع عام پر کوئی انسان؛ بلکہ کوئی حیوان بھی اطمینان سے نہیں گذر سکتا۔

(۳) مالی نقصان، جب یہ کسی عمارت کے قریب کھیلتے ہیں تو کتنے لوگوں کے مکانوں کی کھڑکیاں توڑ دیتے ہیں، اس کے بے شمار واقعات ہیں، دو بار تو ہمارے ساتھ یہ حادثہ ہو چکا ہے۔

(۴) بسا اوقات دنگا وفساد:

اس شیطانی گولے کے مالی، جسمانی، جانی اور دینی وایمانی نقصانات پوری دنیا میں مسلم، ہر شخص کے مشاہد، بدیہی؛ بلکہ روز روشن کی طرح اجلی البدیہیات سے ہیں، مجھے گوشہ نشینی کے باوجود اس شیطانی حرکت کی جن تباہ کاریوں کا مشاہدہ اور یقینی علم ہے، خیال تھا کہ ان میں سے مثال کے طور پر چشم عبرت کے لیے چند واقعات لکھ دوں؛ مگر اس سے دو امر مانع ہوئے:

(۱) ان کی فہرست بہت طویل ہے اور اگر انتخاب کروں تو کیسے؟ کیونکہ ایک سے بڑھ کر ایک۔

(۲) ایسی حقیقت بدیہیہ کی مثالیں لکھنا اس کو نظری یا غیر ظاہر قرار دینے کے مترادف ہے۔

اس مہلک شیطانی گولے کی تباہ کاریاں اللہ کی نافرمانیوں پر عذاب ہے، ﴿ولنذیقنهم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر لعلهم یرجعون﴾ پھر ایسے عذاب الیم کو بچشم خود دیکھنے؛ بلکہ اپنی جان پر بیتنے کے باوجود اللہ تعالی کے ان دشمنوں کو عبرت وہدایت کی توفیق نہ ملنا عذاب پر عذاب۔ضعف الحیوة وضعف الممات.

نفس وشیطان کے بندوں پر عذاب الٰہی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کو اپنے دنیوی نفع ونقصان کا بھی ہوش نہیں رہتا۔نسوا اللّٰہ فانسٰهم انفسهم.

(۳) اس میں ورزش کے مفہوم پر تماشے کا مفہوم غالب ہے، اس پر دلائل:

(۱) کسی ورزش کو پوری دنیا میں کوئی کھیل نہیں کہتا، پہلوان ورزشیں کرتے ہیں،

ڈاکٹر مختلف امراض کے لیے ورزشیں بتاتے ہیں، کوئی بھی اس کو کھیل نہیں کہتا، گیند اور فٹ بال کو کوئی بھی ورزش نہیں کہتا، کھیل کہتے ہیں۔

(۲) ورزش کو دیکھنے کے لیے دوسرے لوگ جمع نہیں ہوتے، کوئی ایک آدمی چلا گیا تو ایک الگ بات ہے، فٹ بال کو دیکھنے بہت لوگ آتے ہیں، مولوی لوگ بھی آتے ہیں، ایک شخص نے صرف فٹ بال کا مقابلہ دیکھنے کے لیے نیا ٹی-وی خریدا اور گھر والوں سے یوں جھوٹ بولا اور یوں فریب دیا کہ فٹ بال کا مقابلہ دیکھنے کے لیے ٹی-وی کے جواز کا میں نے فلاں سے فتوی لیا ہے۔

مجھ پر افتراء باندھا کہ اس نے جواز کا فتوی دیا ہے۔

(۳) فٹ بال وغیرہ کے مقابلہ کو دیکھنے کے لیے لوگ ٹی-وی پر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں، کسی ورزش کو دکھانے کے لیے کسی حکومت میں کسی ملک میں کوئی نظم نہیں۔

(۴) ورزش میں کوئی شخص ایسا مگن نہیں ہوتا کہ ضرورت سے زائد کرتا ہی چلا جائے، وقت متعین ہوتا ہے: آدھا گھنٹہ، گھنٹہ، جب وقت گذر جاتا ہے تو پھر اس کا شوق نہیں رہتا۔

اس شیطانی دھندے کا حال یہ ہے کہ اگر شروع کیا تو ہوش نہیں رہتا، کھیلتے ہی چلے جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ ورزش نہیں؛ بلکہ کھیل تماشا ہے۔ (احسن الفتاوی ۸/ ۲۵۸ تا ۲۶۱)

مندرجۂ بالا دونوں تحریریں اپنے وقت کے اکابر اہل فتوی کی ہیں، جن کا شمار اکابر اہل اللہ میں بھی ہے، اس کا بغور مطالعہ کریں اور اپنا جائزہ لیں، بات دراصل یہ ہے کہ کرکٹ کی محبت ایسی رچ بس گئی ہے کہ اس کو چھوڑنے کے لیے طبائع آمادہ نہیں ہوتیں، اس کو جائز بنانے کے لیے نئی نئی تاویلیں کر کے سوالات کیے جاتے ہیں، جو دراصل اس

کھیل کے ساتھ عشق و محبت کی وجہ سے قلوب میں پیدا شدہ زیغ کا اثر ہے، اللہ تعالی ہی اس مخمصہ سے امت مسلمہ کو نجات عطا فرمائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ   الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

سرکاری بیکار عمارت میں دینی تعلیم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ یہاں جونا گڈھ ضلع میں ایک بہت بڑا ایریا ہے، جو جنگل شمار ہوتا ہے، اندر جنگل میں چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی ہیں، اس میں حبشی مسلمانوں کے بھی گاؤں ہیں، ایسے ہی ایک گاؤں میں ان کے بچوں کو دنیاوی تعلیم دینے کے لیے سرکار نے ایک چھوٹی سی عمارت بنادی تھی، زلزلہ میں ٹوٹنے جیسی ہوگئی تھی تو سرکار نے اس کو توڑنے کا حکم دیدیا تھا، گاؤں والوں نے اس کو توڑا نہیں؛ بلکہ اس جیسی چھوٹی سی عمارت اس سے ذرا ہٹ کر بنائی، اور اس عمارت کو جنگل کھاتے کے ایک بڑے ادھیکاری نے گاؤں والوں کو اپنے استعمال میں لینے کی اجازت دیدی تھی، اس عمارت میں کئی سالوں سے مدرسہ چل رہا ہے، اب اس عمارت کے اندر ہم لوگ نیا کام کرانا چاہتے ہیں تو کیا شرعی لحاظ سے ایسا کر سکتے ہیں؟ اس لیے کہ وہاں پر اگر ہم لوگ الگ سے مدرسہ کے لیے کوئی زمین خریدنا چاہیں تو جنگل کے اصول کے اعتبار سے وہاں کی زمین خرید نہیں سکتے، ایسی حالت میں ہم لوگ کیا کریں؟ گاؤں چہار دیواری کے اندر ہی ہے، اور یہ عمارت بھی چہار دیواری کے اندر ہے، اور ہم لوگ چہار دیواری سے ہٹ کر کام نہیں کر سکتے ہیں؛ لیکن تمام زمین سرکاری ہے اور گاؤں والوں کو رہنے اور بسنے

کی اجازت ہے؛لہٰذا اتمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے جوابات سے آگاہ کریں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

دینی تعلیم پڑھانے کے لیے استعمال کی جانے والی عمارت کے لیے وقف ہونا بھی ضروری نہیں، کسی کی ذاتی ملکیت میں وہ اجازت دے دے تو یہ کام ہوسکتا ہے، جب حکومت کے ذمہ دار افسر نے اس عمارت کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی ہے، تو آپ کا اس کو مدرسہ کے طور پر استعمال کرنا درست ہے، اس میں اگر مرمت کی ضرورت ہو، تو وہ بھی کروائی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/صفر المظفر ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

معتوہ (کم فہم، ملی جلی باتیں کرنے والے شخص) کے تصرفات کا شرعی حکم

سوال: (۱) زید جن کی عمر ۹۰ سال سے تجاوز کرچکی ہے، اور ان کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے، زید کا صرف ایک لڑکا عمر ہے، زید کے لڑکے عمر کے تین لڑکے، سات لڑکیاں اور بیوی ہے، زید اپنے بیٹے عمر اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ ہی رہتے ہیں، درازیٔ عمر کی باعث دو تین سال سے زید کا ذہنی توازن مختل ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے بے شعوری والا معاملہ رہتا ہے، ایک وقت میں کسی قسم کی کوئی بات کرتے ہیں، اس کے چند لمحات کے بعد ہی ان باتوں سے صاف انکار کر دیتے ہیں، اکثر اپنے بیٹے کو اپنا بڑا بھائی گردانتے ہیں، اور اپنی بہو کو رشتہ داروں میں سے کسی کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ فلاں کی بیوی یہاں کیوں رہتی ہے؟ اسے گھر سے نکالو، اسی طرح زید

اپنے پوتے اور پوتیوں کو پہچاننے سے اکثر انکار کر دیتے ہیں، اجرت پر کام کرنے والی نوکرانیوں کی طرح اپنی پوتیوں کو نوکر کہہ کر کے گھر سے نکالنے کی بات کرتے رہتے ہیں، گھر سے کبھی ٹہلنے کی غرض سے باہر جانا ہوتا ہے تو واپسی میں کہتے ہوئے گھر میں داخل ہو تے ہیں کہ بھئی دہلی سے واپس آرہا ہوں بہت تھک گیا ہوں، اسی طرح کھانا کھا لیتے ہیں، اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ مجھے کسی نے کھانا نہیں دیا۔ بمبئی کے مضافاتی علاقوں کے متعلق اکثر کہتے ہیں کہ بمبئی سے آگے ہیں، صبح اگر تاخیر سے اٹھتے ہیں تو کہتے کہ آج رات بڑی طویل ہوگئی آج نو بجے سورج نکلا ہے، اپنے پیسوں کی اکثر چوری کی شکایت کرتے ہیں اور چوری کا الزام پوتے اور پوتیوں پر عائد کرتے ہیں، جب کہ وہ پیسے کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں، خرچ کر دیتے ہیں یا پھر باہر کسی کو دے دیتے ہیں۔

زید کا بمبئی میں مکان ہے، دکان ہے، اسی طرح آبائی وطن میں زمین جائیداد اور مکان ہے، زید کا اپنے ہوش حواس کے زمانہ میں یہ حال رہا ہے کہ کسی بھی فرد کو چاہے وہ اولاد ہو یا رشتہ دار جائیداد اور مکانوں کے بارے میں مالکانہ حقوق کے نظریے کے ساتھ انہیں اپنے قریب بھی نہیں آنے دیا، ہمیشہ زید اپنے منفرد مزاج کے ساتھ چلنے کے عادی رہے ہیں، زید کی مذکورہ بالا ذہنی اختلال اور عدم توازن کے پیش نظرِ مندرجہ ذیل باتیں معلوم کرنی ہیں کہ اس صورت حال میں شریعت کا کیا حکم ہے۔

(۱) زید کا ذہنی اختلال اور عدم توازن کی وجہ سے املاک کے بارے میں زید کے بیٹے عمر کو کیا بلا اذن حق واختیار منتقل ہو جاتا ہے، یا اس کے لیے اذن لازم ہے۔

(۲) مذکورہ بالا ذہنی اختلال اور عدم توازن کی وجہ سے املاک کے بارے میں

زید کا کسی کے حق میں کسی قسم کا فیصلہ نافذ کرنے سے نافذ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

(۳) عمر کا بڑا بیٹا اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل طور پر بمبئی کے مضافات میں رہتا ہے، وہ اپنے دادا زید کو تبدیلئ ہوا کے بہانے اپنے گھر لے جاتا ہے، اور وہاں جا کر اپنے دادا سے اپنے حق میں تمام ملکیت کے حقوق اور اختیار نامے بنوا کر اس پر دستخط لے لیتا ہے، جبکہ زید دستاویزی زبان سے ناواقف ہے، دوسرے یہ کہ سارا معاملہ زید کے بیٹے عمر سے چھپا کر کیا گیا ہے آیا یہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح یہ بھی واضح فرمادیں کہ زید جن کا صرف ایک لڑکا عمر ہے اس کے ہوتے ہوئے ملکیت پر حق جتانا اور ثابت کرنا اور ملکیت غصب کرنے کی کوشش کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ عمر کے حقوق کی پامالی نہیں؟ ملکیت پر قابض ہونا یا اسے بیچ کر رقم استعمال کرنا حلال ہوگا یا حرام؟

(۴) زید کے پوتے کا ملکیت کی کسی بھی شق سے انتفاع کیا حلال اور جائز ہوگا؟ اور اس کا یہ کہنا کہ میں نے دادا کو بتا کر دستخط لیے ہیں، ذہنی اختلال اور عدم توازن کے پیش نظر یہ بات کہ میں نے دادا کو بتا کر دستخط لیے ہیں کہاں تک صحیح ہے؟ اور کیا یہ اختیار نامہ ازروئے شریعت صحیح تسلیم کیا جائے گا؟

(۵) زید کے پوتے نے اپنے دادا سے یہ کہہ کر مضافات میں مکانات سستے ملتے ہیں، آپ بمبئی کا فلاں مکان بیچ دیجئے میں آپ کے لیے اس رقم سے مضافات میں آپ کے نام پر ایک مکان خرید لوں گا، آپ کو ماہانہ اس مکان سے دو ہزار روپیہ کرایہ ملتا رہے گا، اور مکان کی قیمت بھی رفتہ رفتہ بڑھتی رہے گی یہ دوسرا فائدہ ہوگا، دیگر نئے مکان کی خریدی کے بعد جو رقم بچے گی اسے بھی کسی تجارت میں لگا دوں گا، وہاں سے بھی آپ کو

ماہانہ نفع ملتا رہے گا، اس بات کے پیش نظر بمبئی کا ایک مکان آٹھ لاکھ روپے میں فروخت کیا گیا؛ لیکن آج تک پوتے نے کسی بھی نئے مکان کی خریداری کا کوئی بیع نامہ نہیں بتایا، نہ ہی یہ واضح کیا کہ باقی رقم کس تجارت میں لگائی ہے، جس کی وجہ سے زید اور اس کے لڑکے عمر کو شکایت ہے، زید کے بیٹے عمر نے جب اپنے لڑکے سے رقم کے بارے میں سوال کیا تو اس نے حقیقت حال بتانے کے بجائے برجستہ یہ جواب دیا کہ جاؤ میں رقم نہیں دوں گا، تم سے ہو سکے تو وصول کر کے بتاؤ، معلوم یہ کرنا ہے کہ زید کے پوتے کے لیے اس رقم کا دبالینا اور اس سے کسی طرح کا کوئی انتفاع اس کے لیے جائز ہے کہ نہیں؟ اور کیا زید کے پوتے کے لیے رقم واپس کرنا لازمی ہوگا یا نہیں؟

(۶) زید کے پوتے نے آبائی وطن کی ایک جائداد اختیارنامے کے بل بوتے پر زید کے بیٹے عمر کے علم میں لائے بغیر فروخت کردی، بیع کے وقت پوتا اپنے دادا کو وطن لے کر گیا، اور وہاں بیع نامے پر ان سے دستخط کروائے جب کہ زید کے ذہنی اختلال جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے اس مختل سوجھ بوجھ کے پیش نظر زید کا کسی بیع نامے اور دستاویز پر دستخط کرنا نافذ ہوگا یا نہیں؟ اور کیا یہ بیع فاسد شمار ہوگی یا قائم ہو جائے گی؟ اور اس بیع سے حاصل شدہ رقم جو رقم زید کے پوتے نے دبا رکھی ہے کیا یہ اس کے لیے جائز ہے؟ اور اس سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا شرعی نقطۂ نگاہ سے کیا حیثیت رکھتا ہے؟

(۷) زید کے مذکورہ بالا ذہنی اختلال اور عدم توازن کے پیش نظر زید کی موجودگی میں نیابت کا حق کیا عمر کو حاصل ہو جاتا ہے؟ اور کیا عمر کے علاوہ کوئی دوسرا بھی نیابت کا دعوی کرسکتا ہے؟

(۸) زید اور اس کا بیٹا عمر میونسپل بلڈنگ میں رہتے ہیں، جہاں ان کے چار کمرے ہیں، ایک زید کے نام پر ہے، دوسرے عمر کے نام پر ہے، تیسرا زید کی بیوی کے نام پر ہے، اور چوتھا عمر کی بیوی کے نام پر ہے، حکومت وقت کے قانون کے مطابق میونسپل بلڈنگ میں کسی ایک آدمی کے نام پر دو مکان نہیں لے سکتے، اس لیے مزید دو مکانوں کی خریداری کے وقت سرکاری قانون کے پیش نظر وہ مکانات زید اور عمر کی بیویوں کے نام پر لیے گئے، جنہوں نے مکانات کی خریداری میں کسی بھی قسم کی کوئی رقم نہیں لگائی، اور نہ ہی ان دونوں مکانات کی تملیک ان کے حق میں کی گئی صرف سرکاری قانون کے پیش نظر ان کے نام پر لیا گیا ہے، اب ان کے نام پر ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو کیا حق ملکیت حاصل ہو جاتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) آپ نے زید کے متعلق جو تفصیل اپنے سوال میں تحریر فرمائی ہے اس کے پیش نظر زید شرعی اعتبار سے معتوہ ٹھہرتا ہے، اور شرعاً معتوہ کے تصرفات قولیہ معتبر نہیں ہوتے، شرعی طور پر تصرفات قولیہ (یعنی نکاح وطلاق، بیع وشراء، اجارہ، رہن وغیرہ) کے انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا انجام دینے والا عاقل بالغ ہو، اگر وہ پاگل ہے یا معتوہ یعنی ایسا کم فہم ہے جو ملی جلی باتیں یعنی کچھ صحیح اور کچھ بہکی باتیں کرتا ہے اور کام صحیح تدبیر اور طریقہ سے نہیں کرتا ہے، تو اس کے مذکورہ بالا تصرفات شرعاً معتبر نہیں۔

فتح القدیر میں ہے: لكن معلوم من كليات شرعية ان التصرفات لا تنفذ الا ممن له اهلية التصرف وادرناها بالعقل والبلوغ خصوصاماهو دائر بين الضرر والنفع. الخ (فتح القدير ۳/۴٦۹) (شائع كرده مكتبه زكريا ديوبند)

بحرالرائق میں ہے: واراد بالمجنون من فی عقله اختلال، فيد خل المعتوه واحسن الاقوال فی الفرق بينهماان المعتوه هو القليل الفهم المختلط الكلام الفاسد التدبير؛ لكن لايضرب ولايشتم بخلاف المجنون.(البحر الرائق۳/۲٦۸)

درمختارشامی میں ہے: والمعتوه من العته، وهو اختلال فی العقل (قوله وهو اختلال فی العقل) هذا ذكر ه فی البحر تعريفا للجنون، وقال: ويدخل فيه المعتوه، واحسن الاقوال فی الفرق بينهما ان المعتوه هو القليل الفهم المختلط الكلام الفاسد التدبير؛ لكن لايضرب ولايشتم بخلاف المجنون. اه وصرح الاصوليون بان حكمه كالصبی؛ إلا ان الدبوسی قال: تجب عليه العبادات احتياطا، ورده صدر الاسلام؛ بان العته نوع جنون، فيمنع وجوب اداء الحقوق جميعا كمابسطه فی شرح التحرير.(درمختارمع الشامی ۲/٤٦۲)

بدائع میں ہے: أماالذی يرجع الی الزوج فمنها: أن يكون عاقلاحقيقة أوتقديرا فلايقع طلاق المجنون والصبی الذی لايعقل؛ لان العقل شرط اهلية التصرف لان به يعرف كون التصرف مصلحة، وهذه التصرفات ماشرعت الالمصالح العباد. (بدائع الصنائع۳/۹۹)

شامی میں ہے: انا لم نعتبر أقوال المعتوه مع أنه لايلزم فيه ان يصل الی حالة لايعلم فيهامايقول ولايريده، وقديجاب: بان المعتوه لماكان مستمراً علی حالة واحدة، يمكن ضبطها اعتبرت فيه، واكتفی فيه بمجرد نقص العقل؛ بخلاف الغضب، فانه عارض فی بعض الأقوال؛ لٰكن يردعليه

الـدهش، فانه كذلك، والذى يظهرلى ان كلامن المدهوش والغضبان لايلزم فيـه ان يـكـون بحيث لايعلم مايقول؛ بل يكتفى فيه بغلبة الهذيان، واختلاط الـجـد بـالهـزل، كـمـا هوالمفتى به فى السكران على مامر ولاينافيه تعريف الدهش بذهاب العقل، فإنّ الجنون فنون، ولذا فسره فى البحرباختلال العقل وأدخل فيه العته والبرسام والإغماء والدهش. (شامی۲/٤٦٣)"دررالحكام شرح مجلةالاحكام" میں ہے: الـمـعتوه لغةً ناقص العقل. وشرعاً: هوالذى اختلّ شعـوره بـان كـان قـليـل الـفهم مختلط الكلام فاسد التدبير؛ ولٰكنه لايشتم ولايـضرب كالمجنون؛ بل يكون كلامه مختلطاً فبعضه يشبه كلام العقلاء، وبـعـضـه يشبـه الـفـاظ الـمـجـانيـن، وان وقع اختلاف فى تفسيرالمعتوه فالمختارهذا التعريف. (ردالمحتار،التنقيح،دررالحكام رقم الماده ٩٤٥،الكتاب التاسع ٢/٥٨٦)

اب آپ کےاٹھائے ہوئےسوالات کے جوابات بالترتیب پیش خدمت ہیں۔

(۱)اس حالت میں زید کی املاک پر نہ تواس کے بیٹے عمرکوکوئی حق اوراختیار حاصل ہوتا ہے، نہ ہی پوتوں میں سے کسی کو؛ بلکہ اس کی تمام جائیداداوراملاک بطورامانت محفوظ رکھی جائیں، اس میں سے صرف زید کے ضروری مصارف کے بقدر لے کراس کی ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں، یہ بھی یادرہے کہ زید کی اجازت کا بھی اعتبارنہیں۔

(۲)نہیں۔

(۳)زید کے بڑے پوتے کا اپنے دادازیدکوتبدیلی آب وہواکے بہانہ اپنے گھرلے آنا، اوروہاں اپنے داداسے اپنے حق میں تمام ملکیت کے حقوق واختیارنامے

بنوا کر اس پر دستخط لے لینا شرعاً معتبر نہیں ؛ اس لیے کہ جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے اپنے ذہنی عدم توازن کی وجہ سے زید معتوہ ہے، اور اس کا کوئی تصرف شرعاً درست نہیں۔

(۴) زید کے پوتے کا ملکیت کی کسی بھی شق سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں، اس نے اس حالت میں اختیار نامے پر جو دستخط لیے ہیں، اس کا بھی شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔

(۵) زید کے پوتے کا اپنے دادا سے اس طرح مکان بکوانا ہی شرعاً معتبر اور درست نہیں، تو پھر اس سے حاصل شدہ رقم کو اپنی تحویل میں لینا یا اس سے کسی نوع کا فائدہ اٹھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۶) زید کے پوتے کا یہ اقدام بھی درست نہیں، نہ ہی یہ خرید وفروخت درست ہے۔

(۷) زید کی موجودہ صورت حال میں اس کی املاک میں تصرف کا کسی کو حق حاصل نہیں، نہ تو اس کے بیٹے عمر کو، نہ ہی کسی اور کو۔

(۸) کسی قانونی پیچیدگی کی وجہ سے کسی مکان کو خریدنے والے نے وہ مکان اپنے نام کے بجائے دوسرے کے نام لیا تو ایسا کرنے کی وجہ سے وہ دوسرا اس مکان کا مالک نہیں بن جاتا؛ بلکہ جس نے خریدا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۹/ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ   الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

تقلید کیوں ضروری ہے؟

سوال: کیا کسی ایک امام کی اتباع ضروری ہے؟ حالانکہ قرآن میں ہے ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ الخ تو کیا ہر حدیث پر عمل نہیں

کر سکتے ؟ ایک ہی امام کی اتباع کیوں ضروری ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

ہر مسلمان پر اطاعت دراصل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرض؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی اس لیے کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تشریح فرمائی، ورنہ مطاع بالذات سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کوئی نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہم کلام ہو کر اس کی مرضی معلوم کر سکے اور نہ یہ ممکن ہے کہ رسول کریم ﷺ سے براہِ راست رجوع کر کے اللہ کے احکام کا علم حاصل کر سکے؛ لہذا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا راستہ اب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے کلام، یعنی: قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال، یعنی: سنت کی طرف رجوع کیا جائے، اب قرآن وسنت کے بعض احکام تو ایسے ہیں، جو قطعی الثبوت بھی ہیں اور قطعی الدلالۃ بھی، اور ان میں نہ کوئی ابہام واجمال ہے اور نہ کوئی تعارض ادلہ، مثلاً: زنا کی حرمت، صلوات خمسہ کی فرضیت، صوم، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت، محرمات سے نکاح کا عدم جواز وغیرہ. اس قسم کے احکام کو ہر شخص قرآن وسنت سے سمجھ سکتا ہے، (بشرطیکہ علوم عربیہ پر عبور رکھتا ہو) لہذا یہ مسائل نہ تو اجتہاد کا محل ہیں اور نہ تقلید کا؛ البتہ قرآن وسنت کے احکام کی دوسری قسم وہ ہے جس میں کوئی ابہام یا اجمال یا تعارض ادلہ پایا جاتا ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾ اس میں ﴿قروء﴾ لغوی اعتبار سے مشترک ہے، جس کے حیض کے معنی بھی آتے ہیں اور طہر کے بھی، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کونسے معنی پر عمل کیا جائے؟ اسی طرح حدیث میں ارشاد ہے:

من لم يذر المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله. اس میں مخابرہ یعنی مزارعت کی ممانعت کی گئی ہے، اب مزارعت کی کئی صورتیں ہوتی ہیں اور حدیث میں اس کا بیان نہیں کہ کونسی صورت جائز اور کونسی ناجائز؟ اس قسم کے مسائل قرآن وسنت کی تشریح میں بکثرت پیدا ہوتے رہتے ہیں، ایسے مواقع پر عقلاً دو ہی صورتیں ممکن ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ ان جیسے معاملات میں ہم خود اپنی عقل اور اپنے علم پر اعتماد کر کے کسی ایک جانب کو متعین کر دیں اور اس پر عمل کریں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی عقل وعلم پر اعتماد کرنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف نے ان معاملات میں کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور اسلاف میں سے جس عالم مجتہد کے علم پر ہمیں زیادہ اعتماد ہو، ان کے قول پر عمل کریں، یہ دوسرا طریقۂ کار اصطلاحاً تقلید کہلاتا ہے، اور انصاف کے ساتھ دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ان طریقوں میں سے پہلا طریقۂ کار زیادہ خطرناک ہے اور اس میں گمراہی کے زیادہ امکانات ہیں، اس لیے کہ اس حقیقت سے کوئی بدترین جاہل ہی انکار کرسکتا ہے کہ ہمارے علم اور تقویٰ کو اسلاف کے علم اور تقوی سے کوئی نسبت نہیں، ائمۂ مجتہدین اول تو ہمارے مقابلہ میں عہدِ رسالت سے کہیں زیادہ قریب تھے، اس لیے ان کے لیے نزول قرآن کے ماحول اور قرآن وسنت کے ارشادات کے پورے پس منظر سے واقف ہونا ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسان تھا، دوسرے ان حضرات کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو قوت حافظہ اور جو علم وفضل عطا فرمایا تھا، ہمارے علم اور حافظہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں، جس کا امتحان ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔ تیسرے اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول پاک ﷺ کے کلام کے حقائق ومعارف اس شخص پر نہیں کھولتا ہے، جو اس کی نافرمانیوں پر کمربستہ ہو۔

لہذا قرآن وسنت کی صحیح مراد سمجھنے کے لیے علم کے ساتھ ساتھ تقویٰ کی شدید ضرورت ہے، اس لحاظ سے بھی ہم اپنے حالات کا موازنہ ائمۂ مجتہدین سے کرتے ہیں، تو بلاشبہ خاک اور عالم پاک کی نسبت نظر آتی ہے، اس لیے انصاف پسند آدمی مذکورہ دوراستوں میں سے لازماً اسی راستہ کو محتاط قرار دے گا کہ اپنی عقل وعلم پر اعتماد کے بجائے ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی عقل وعلم پر اعتماد کر کے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ (درس ترمذی ۱/۱۱۱) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ ۵/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

جس دعوت میں ناچ گانا ہو اس میں شرکت

سوال: کسی شخص نے دعوت دی، اور اس کے یہاں ناچ گانا ہے تو اس کی دعوت قبول کریں گے یا نہیں؟ اس کی دعوت کو قبول کرنا کیسا ہے؟ اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر پہلے سے معلوم ہے کہ وہاں ناچ گانا ہے، تو اس کی دعوت میں شرکت جائز نہیں۔

وإن علم أولا باللعب، لا يحضر أصلا سواء كان ممن يقتدى به أو لا. (درمختار)

البتہ اگر اس کو یہ یقین ہو کہ میرے جانے سے میرے احترام میں ناچ گانا بند کردیں گے، تو اس کو چاہئے کہ شرکت کرلے۔ (قوله لا يحضر أصلا) إلا إذا علم أنهم يتركون ذلك احتراما له، فعليه أن يذهب. (شامی ۵/۲۴۵) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

بس اور ریلوے کے ٹکٹ فروخت کرنا

مسئلہ ٹکٹ اور پاس (PASS) کا ہے، جو ریلوے یا دوسرے محکمے جاری کرتے ہیں، تو کیا اس کو آپس میں منتقل کرنا درست ہے؟

(الف) جو لوگ اس انتقال کو درست کہتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ ٹکٹ یا پاس کے ہم نے جب پیسے بھر دیئے، اب ہم اس کے مالک ہیں، جہاں چاہے استعمال کریں۔

(ب) جبکہ بندہ کا خیال یہ ہے کہ: (۱) چونکہ ان اشیاء پر باقاعدہ طور پر لکھا ہوتا ہے "THIS TICKETIS NOT TRANFERABLE" یعنی یہ ٹکٹ اور پاس منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ پاس کے ساتھ ایک آئی کارڈ (شناختی کارڈ) دیا جاتا ہے، ظاہر ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ پاس دوسرا کوئی شخص استعمال نہ کرے۔

اور پھر اس انتقال میں دھوکہ بھی لازم آتا ہے، اور پکڑے جانے پر بے عزتی اور جرمانہ بھی۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عقد اجارہ کے ذریعہ سے جس چیز سے فائدہ اٹھانے کا معاملہ کیا جاتا ہے، وہ فائدہ اس نوع کا ہے کہ استعمال کرنے والوں کے بدلنے سے صورت حال میں تبدیلی کا اندیشہ نہیں، تو اس میں اجرت پر دینے والے کا اجرت پر لینے والے کے ساتھ یہ قید اور شرط لگانا کہ وہی یعنی اجرت پر لینے والا ہی استعمال کرے، درست نہیں، مثلاً کسی نے اپنے لیے مکان اجرت پر لیا، تو اسے حق حاصل ہوگا کہ کسی اور شخص کو اس میں رہنے دے۔

درمختار میں ہے: وان قيد براكب أو لابس فخالف ضمن اذاعطبت ومثله في الحكم كل مايختلف بالمستعمل كالفسطاط و فيما .... لاختلاف فيه بطل تقييده به، كمالوشرط سكنى واحد له ان يسكن غيره لما مر أن التقييد غير مفيد. (درعلی هامش الشامی ٥/٢٤)

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے: المادة: (٤٢٨) كل مالايختلف باختلاف المستعملين فالتقييدفيه لغو مثلاً: لو استأجر احد دارعلى ان يسكنهاله أن يسكن غيره فيهايعني انه لواستأجراحد داراً بشرط ان يسكنها هو، فله ايجارها من غيره، واعارتهالاستيفاء المنفعة التي له ان يستوفيها بموجب المادة: ٤٢٦ لان السكنى لم تكن متفاوتة فلم يعتبرذلك القيد؛ لأنه غير مفيد. (دررالحكام شرح مجلة الأحكام ١/٤٦٣)

ریل اور بس وغیرہ دورِ حاضر کی سواریوں میں ٹکٹ خرید کر اس سے فائدہ اٹھانے کا جو اجارہ کیا جاتا ہے وہ بھی اسی اصول کے ماتحت آنے کی وجہ سے اصالۃً وہ ٹکٹ دوسرے کو فروخت کر کے اس کو اپنی جگہ بھیج دینا جائز ہے؛ مگر زیادہ داموں میں فروخت نہ کرے؛ بلکہ مثل اجر مسمی یا اس سے کم میں فروخت کرے۔ (مأخوذ از امداد الاحکام ۴/۴۲۳)

اس لیے اس اصول کے پیش نظر ٹرین یا بس یا ہوائی جہاز کا ٹکٹ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا علی الاطلاق درست ہونا چاہئے؛ لیکن اس میں مندرجۂ ذیل تفصیل ہے:

ٹرین اور بس کے بعض ٹکٹ تو وہ ہوتے ہیں جو کسی معین شخص کے لیے جاری نہیں کئے جاتے، اور کسی مخصوص آدمی کے لیے نامزد نہیں ہوتے۔ اور بعض ٹکٹ وہ ہوتے

ہیں جو کسی مخصوص شخص کے لیے جاری کئے جاتے ہیں اور کسی معین آدمی کے نامزد ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے ٹکٹ کو فروخت کرنے میں شرعی یا قانونی کسی محظور کا ارتکاب لازم نہیں آتا، اس لیے اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ جب کہ دوسری قسم کے ٹکٹ کسی معین شخص کے نامزد ہونے کی وجہ سے ان کو فروخت کرنے کی صورت میں جب وہ اس کو استعمال کرے گا، تو جھوٹ اور دھوکہ کا ارتکاب لازم آتا ہے، اس لیے کہ استعمال کرنے والا اپنے آپ کو اسی نامزد شخص کی حیثیت سے پیش کرے گا، اس لیے اس کا فروخت کرنا درست نہیں۔

ایک بات یاد رہے کہ پہلی قسم کے ٹکٹ بھی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا اسی وقت درست ہوگا جب کہ محکمۂ ریل اور بس کی طرف سے اس خریدنے والے کو کسی خاص بنیاد پر رعایت نہ دی گئی ہو، ورنہ اس کا فروخت کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

املاہ: احمد خانپوری، ۱۴/ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

سالگرہ منانا

سوال: بچہ پیدا ہونے کے بعد جب ایک سال کا ہوتا ہے اس وقت جو سالگرہ مناتے ہیں، وہ جائز ہے یا ناجائز؟ لہٰذا جلد از جلد جواب مرحمت فرمادیجئے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

سالگرہ منانے کا جو طریقہ رائج ہے، وہ قابل ترک ہے، غیروں کے ساتھ تشبہ لازم آتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۶/۳۲۰) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نماز میں قدم سے قدم ملانا

سوال: (۱) غیر مقلد کہتے ہیں کہ قدم سے قدم ملانا نماز کے وقت ضروری ہے، اس کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی ہے، اور دلیل میں بخاری کا حوالہ دیتے ہیں۔

ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا

سوال: (۲) ایک ہاتھ سے مصافحہ کو سنت قرار دے کر دو ہاتھ سے بدعت کہتے ہیں، اور بخاری میں جو "أخذ باليدين" آیا ہے، فرماتے ہیں اس سے ایک ہاتھ کا مصافحہ ثابت ہے دو ہاتھ کا نہیں، اس کی مدلل تشریح چاہئے۔

تراویح کی بیس رکعات کے ثبوت پر رسائلِ علماء

سوال (۳) تراویح کی بیس رکعت کے ثبوت میں مدلل بیان فرمائیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث ہے اس کی صحیح سند کے ساتھ تفصیل بیان فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً:

(۱) آپ نے جن مسائل کو دریافت فرمایا ہے وہ معروف ہیں اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے خصوصاً تراویح کے بیس رکعت ہونے پر مستقل رسائل موجود ہیں؛ البتہ پہلے دو مسئلوں پر کوئی مستقل رسالہ نظروں سے نہیں گزرا اس کی مختصر وضاحت کرتا ہوں اور تیسرے مسئلہ پر مستقل رسائل کی نشان دہی کر دوں گا۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ کا ایک فتویٰ - جو جامع ہے - وہ پیشِ خدمت ہے: ''حضرت نعمان بن بشیرؓ کی جو روایت ابوداؤد اور صحیح ابن خزیمہ کے حوالہ سے فتح الباری سے نقل کی گئی ہے، وہ صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ جب حضور ﷺ

نے نماز شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو صف سیدھی کرنے کا حکم فرمایا، اس وقت ہر شخص اپنے کندھے کو دوسرے کے کندھے سے اور ٹخنے کو دوسرے کے ٹخنے سے ملاتا تھا، اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ نماز شروع ہو جانے کے بعد نماز کے اندر بھی ٹخنوں کو ٹخنوں سے چپکانا چاہئے؟ کیونکہ حدیث میں یہ نہیں ہے "فرأیت الرجل منا یلزق منکبه بمنکب صاحبه و کعبه بکعبه فی الصلوٰة" اگر فی الصلوٰة کا لفظ حدیث میں ہوتا تو اس وقت غیر مقلدین کا استدلال تام ہوسکتا تھا، اور اس کے بغیر استدلال تام نہیں، مطلب یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے تسویہ صف کا امر فرمایا، اس وقت محاذات اور برابری حاصل کرنے کے لیے کندھے کو کندھے اور ٹخنے کو ٹخنے سے ملا کر دیکھ لیا کرتے تھے کہ محاذات ہوگئی یا نہیں، باقی اس کا نماز میں باقی رکھنا کسی دلیل سے ثابت نہیں، دوسرے ہمارے نزدیک الزاق سے مجازاً محاذات مراد ہے، امام شوکانیؒ نے "نیل الأوطار" میں حدیث تسویۃ الصفوف کا یہی مطلب بیان کیا ہے: أي إجعلوا بعضها حذاء بعض بحیث یکون منکب کل واحد من المصلین موازیا لمنکب الآخر، ومسامتاً له فتکون المناکب والأعناق والأقدام علی سمت واحد.اھ. (۶۵/۳) امام شوکانیؒ کے اس قول سے ظاہر ہے کہ صف برابر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گردن اور قدم اور کندھا ہر نمازی کا دوسرے کے محاذی اور مقابل ایک سمت میں ہو، ٹخنوں کا چپکانا اس کے لیے ضروری نہیں، اس لیے حافظ ابن حجرؒ نے بخاریؒ کے قول "الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم" کو مبالغہ پر محمول فرمایا ہے۔ قال الحافظ: المراد بذلك المبالغة فی تعدیل الصف (وتسویته) وسد خلله، اھ. (فتح الباری ۱۷۶/۲) جس سے صاف ظاہر

ہے کہ اصل مقصود صف کا برابر کرنا اور درمیانی فرجات کو بند کرنا ہے، جس کو مبالغۃً الزاق القدم بالقدم سے تعبیر کردیا گیا۔

علاوہ بریں اگر مان لیا جائے کہ الزاق قدم بالقدم شرعاً مطلوب ہے، تو سوال یہ ہے کہ یہ نماز کی ابتداء سے انتہاء تک ہر رکن میں مطلوب ہے یا بعض ارکان میں، صورتِ اولیٰ میں بتلایا جائے کہ بحالتِ قعود الزاق کی کیا صورت ہوگی؟ اور صورتِ ثانیہ میں بعض ارکان کی تخصیص کس دلیل سے کی جائے گی؟ اگر یہ کہا جائے کہ بحالتِ قعود الزاق متعذر ہے اس لیے یہ حالت مستثنیٰ ہے، تو ہم کہیں گے کہ بحالتِ قیام بھی یہ الزاق آسان نہیں، اس سے نمازیوں کو قیام میں بہت دشواری ہوتی ہے چنانچہ تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے، پس اس الزاق کو ابتداءِ صلوۃ کے ساتھ خاص کرنا چاہئے؛ نیز فتح الباری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی کا یہ قول نقل کیا ہے، وزاد معمر فی روایته: ولو فعلت ذلك بأحدهم اليوم لنفر كانه بغل شموس، اھ. (۱۷۶/۲) ترجمہ: معمرؒ نے اپنی روایت میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ اگر میں آج کل کسی کے ساتھ ایسا کروں (یعنی ٹخنے سے ٹخنا ملاؤں) تو وہ ایسا بھاگے گا جیسا سرکش خچر، اھ۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بعد وصالِ نبوی کے الزاق کعب بالکعب نہ کرتے تھے، اور یہ اس کی دلیل ہے کہ الزاق سنتِ مقصودہ نہیں ہے، ورنہ صحابہ کسی کی نفرت کی وجہ سے اس کو ہرگز ترک نہ کرسکتے تھے، اور نیز نفرت اس فعل سے ہوا کرتی ہے جو عام طور پر نماز میں نہ کیا جاتا ہو، اور جو فعل عام طور پر سب کرتے ہیں اس سے نفرت نہیں ہوا کرتی، پس اگر یہ الزاق سنتِ مقصودہ ہوتا تو سب صحابہ عام طور سے اس

پر عمل کرتے، اور تابعین ان کے عملِ دائم وعام کو دیکھ کر سمجھ جاتے کہ یہ سنتِ صلوٰۃ ہے، پھر کسی کو کسی کے الزاق کعب سے نفرت ہونے کی کیا وجہ تھی؟ پس حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے جیسا یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگوں کی نفرت کے خیال سے الزاق نہ کرتے تھے، ایسے ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ فعل صحابہ اور تابعین میں عموماً متروک تھا، اور یہ دلیل ہے اس فعل کے سنتِ مقصودہ نہ ہونے کی، یہی وجہ ہے کہ احادیث قولیہ میں الزاق کعب کا امر کہیں وارد نہیں۔ (کما أدّی الیه نظری) بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں "حاذوا بالمناکب وسدوا الخلل وتراصوا" وأمثالها. وارد ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محاذات وفرجات بند کرنے اور مل کر کھڑے ہونے کا امر فرمایا، الزاق کعب وغیرہ یہ صرف صحابہ سے فعلاً منقول ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرنے کے لیے بعض دفعہ الزاق کیا، اور وہ بھی نماز شروع کرنے سے پہلے جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔" (امداد الاحکام ۱/ ۱۹۷ تا ۱۹۹)

(۲) اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کا ایک جامع فتویٰ پیش کرتا ہوں: "مصافحہ دو ہاتھ سے مسنون ہے، اور غیر مقلدین جس حدیث کو پیش کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہاتھ سے مصافحہ فرمایا، تب ہی تو صحابی کا ہاتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں مبارک ہاتھوں کے درمیان ہو گیا، اور صحابی نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا ہو، یہ حدیث اس بارے میں قطعی نہیں ہے؛ اس لیے کہ جب دونوں طرف سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ ہوگا تو لامحالہ ایک ہاتھ دو ہاتھوں کے درمیان ہوگا، اور یہاں صحابی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اپنی سعادت مندی بیان فرما رہے

ہیں کہ میرا ایک ہاتھ حضور ﷺ کے دونوں مبارک ہاتھوں کے درمیان تھا، یہ بتلانا مقصود نہیں ہے کہ میں نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا، اور صحابہ سے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ حضور ﷺ تو مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائیں، اور صحابی ایک ہاتھ سے مصافحہ کریں۔ (ایسی بےادبی و بےتہذیبی تو غیر مقلدین ہی کرسکتے ہیں) اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اسی طرح کا ایک اثر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نقل فرمایا ہے اور اس کے بعد اسی اثر سے مصافحہ کے دو ہاتھ سے ہونے پر استدلال فرمایا ہے، اور ساتھ ساتھ حضرت حمادؒ کا عمل بھی پیش کیا کہ انھوں نے محدث کبیر امیر المومنین فی الحدیث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دو ہاتھ سے مصافحہ فرمایا، اگر ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ مسنون ہوتا تو یہ حضرات محدثین ضرور اس پر نکیر فرماتے۔ ملاحظہ ہو امام بخاریؒ فرماتے ہیں "باب المصافحة" قال ابن مسعود: علمنی رسول اللہ ﷺ التشهد و كفی بين كفيه" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے تشہد کی تعلیم فرمائی اس حالت میں کہ میرا ہاتھ حضور ﷺ کے دونوں مبارک ہاتھوں کے درمیان تھا۔ (خیال رہے کہ یہ تعلیم کا موقعہ ہے، جس طرح بیعت کے وقت ہوتا ہے) اس کے بعد امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے "باب الأخذ باليدين" (دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا) اور اس کے ثبوت میں ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا یہی اثر اور حضرت حمادؒ کا عمل پیش کیا ہے، فرماتے ہیں: "باب الأخذ باليدين" وصافح حماد بن زيد ابن مبارك بيديه، حدثنا أبونعيم، قال: حدثنا سيف بن سليمان، قال: سمعت مجاهدا يقول: حدثني عبدالله بن مخبرة أبومعمر،

قال: سمعت ابن مسعود يقول: علمني النبي ﷺ وكفي بين كفيه التشهد كما يعلمني السورة. (بخاری شریف ۹۲۶/۲) **امام بخاریؒ کے اس طرز سے بین طور پر ثابت ہوا کہ مصافحہ دونوں ہاتھوں سے ہو۔**

شامی میں ہے: والسنة أن تكون بكلتي يديه. (درمختار والشامی ۳۳۶/۵)

مجالس الابرار میں ہے: والسنة فيها ان تكون بكلتا اليدين. **مصافحہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے ہو۔** (مجالس الابرار ۲۹۸م ۵۰)

ابوالحسنات علامہ عبدالحی لکھنویؒ تحریر فرماتے ہیں (یہاں بغرضِ اختصار فارسی عبارت حذف کر کے صرف ترجمہ لکھا جاتا ہے): تمام فقہاء دو ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو مسنون کہتے ہیں۔ مجالس الابرار میں ہے: "والسنة ان تكون بكلتي يديه" **مصافحہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سے ہو۔ انتہی۔** "درمختار" اور "جامع الرموز" **میں بھی ایسا ہی ہے، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،** قال: قال رسول الله ﷺ: اذا تصافح المسلمان الخ. **جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے ہاتھوں کے علیحدہ ہونے سے پہلے ان کے گناہوں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ انتہی۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ مصافحہ دو ہاتھ سے ہونا چاہئے اس لیے کہ اگر ایک ہاتھ سے مصافحہ ہوتا تو حدیث میں لفظ** "اکفهما" (اکف کف **کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ہاتھوں) کی جگہ** "کفاهما" **ہوتا، اور اس کی دلیل صحیح بخاری کی وہ تعلیق ہے جو** "باب الأخذ باليدين" **میں ہے** "وصافح حماد بن زيد ابن المبارك بيديه" **حماد بن زیدؒ نے ابن مبارکؒ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ انتہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے دور میں**

بھی یہی طریقہ مروج تھا، اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کا ذکر جو بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھ کو نبی ﷺ نے سورت قرآن کی تعلیم کی طرح تشہد یعنی التحیات للہ الخ کی تعلیم دی اس حال میں کہ میرا ہاتھ آپ ﷺ کے دونوں مبارک ہاتھوں کے درمیان تھا، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذکورہ مصافحہ ملاقات کے وقت ہونے والا مسنون مصافحہ نہ تھا؛ بلکہ یہ تعلیم کے لیے تھا، کیونکہ اکابر کسی خاص چیز کی تعلیم کے اہتمام کے لیے اپنے چھوٹوں کا ایک یا دونوں ہاتھ پکڑ کر تعلیم دیا کرتے ہیں، اور اگر اس مصافحہ کو ملاقات کا تسلیم کرلیا جائے تو اس کا ثبوت آنحضرت ﷺ کے دونوں مبارک ہاتھوں سے ہو رہا ہے، اور ابن مسعود کی جانب سے فقط ایک ہاتھ کا ہونا یقینی اور قطعی نہیں ہے؛ بلکہ دونوں ہاتھوں سے ہونے کا امکان ہے، کیونکہ ''کف'' واحد کے لیے نہیں؛ بلکہ جنس کے معنی میں ہے، اور اسی طرح لفظ ''ید'' کا استعمال محاورات عرب، آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں بمعنی جنس ثابت ہے، تو اس صورت میں لفظ ''ید'' ایک اور دو ہاتھ کو متضمن اور شامل ہوگا، اور اکثر مقامات میں دو ید کے موقعہ پر لفظ ید آیا ہے، اس اعتبار سے جس حدیث میں اخذ بالید وارد ہے، اس کی مراد ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا نہیں؛ بلکہ وہاں دونوں صورتوں کا احتمال ہے کہ ایک ہاتھ سے ہو یا دو ہاتھ سے؛ البتہ اگر کسی جگہ حدیث صحیح اور صریح سے یہ بات معلوم ہو کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ مسنون ہے، تو فقہاء کے اقوال کو چھوڑنا پڑے گا، اور اس تصریح صریح کے بغیر فقہاء کے اقوال پر عمل کرنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم. (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی اردو مبوب ص ۱۷ مطبوعہ پاکستان)

اس حدیث کے متعلق محدثِ جلیل حضرت مولانا خلیل احمد مہاجر مدنیؒ کا ایک

واقعہ تذکرۃ الخلیل میں ہے: ایک بار آپ ٹونک تشریف لے گئے، اور بندہ ہمراہ تھا، چند اہلِ حدیث ملنے آئے، اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا، حضرت نے حسبِ عادت دونوں ہاتھ بڑھائے اور مسکرا کر فرمایا کہ مصافحہ اس طرح ہونا چاہئے، وہ بولے حدیث میں ہے صحابی کہتے ہیں: "وکان یدي في یدیه ﷺ" میرا ہاتھ حضور ﷺ کے دونوں ہاتھوں میں تھا، آپ نے بے ساختہ فرمایا، پھر متبع سنت (نبوی) ہم ہوئے یا تم؟ (تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۴) لہذا مصافحہ دو ہاتھ سے ہی مسنون ہے نہ کہ ایک ہاتھ سے۔ فقط۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۳۰۸ تا ۳۱۳)

حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں: ثم المصافحة بالید الواحدة من شعار أهل الباطل في زماننا، فلاینبغی التشبه بهم بترك ماهو المتوارث المتعارف بین المسلمین. (یعنی ہمارے زمانہ میں ایک ہاتھ سے مصافحہ اہلِ باطل کا شعار بن چکا ہے؛ اس لیے جو طریقہ مسلمانوں میں بطریقِ توارث معروف ہے، اس کو چھوڑ کر اہلِ باطل کا تشبہ اختیار کرنا درست نہیں) (اعلاء السنن ۱۷/ ۴۳۳)

(۳) بیس رکعات تراویح کا مسئلہ بہت طویل ہے، اور اس موضوع پر مستقل رسائل موجود ہیں، ان کی نشان دہی کر دیتا ہوں، ان کا مطالعہ کر لیا جائے: "الرأی النجیح فی عدد رکعات التراویح" (اردو) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، "مصابیح التراویح" (فارسی) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، "رکعات التراویح" (اردو) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہم، (یہ رسالہ عام طور پر دستیاب ہے اس میں حضرت عمرؓ والی روایت پر تحقیقی بحث موجود ہے) "تحقیق التراویح" (اردو مطبوعہ پاکستان) شیخ مقری رعایت اللہ صاحب، "تصحیح حدیث صلوٰۃ

التراویح عشرین رکعة والرد علی الالباني في تضعیفه" شیخ اسماعیل بن محمد الانصاري "الهدی النبوي الصحیح في صلوة التراویح" (عربی) الشیخ محمد علی الصابونی (استاذ کلیة شرعیة جامعة ام القریٰ مکة المکرمة) **ان کے علاوہ فتاویٰ رحیمیہ جلد اول از ص ۲۸۲ تا ۳۴۳ (تفصیلی بحث اس موضوع پر ہے جس میں غیر مقلدین کے جوابات بھی ہیں) امداد الاحکام جلد اول از ص ۵۴۴ تا ص ۵۶۱، اعلاء السنن (عربی) جلد سابع از ص ۶۱ تا ص ۷۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.**

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

ممبران بلڈنگ سے لیٹ فیس لینا جائز نہیں

سوال: ایک بلڈنگ میں ۳۰۰/ سے زیادہ ممبر ہیں، جن سے ہر ماہ مینٹیننس لیا جاتا ہے، رقم بلڈنگ کے اجتماعی کاموں مثلاً: لفٹ، پانی، صفائی، حفاظتی عَملے کی تنخواہ، اسٹیٹ لائٹ بل، پانی کے ٹیکس اور زمین کے ٹیکس وغیرہ میں خرچ کی جاتی ہے۔ اگر ۳۰۰/ممبروں میں سے ۲۵۰/ممبر اپنا مینٹیننس ادا کرتے ہیں اور پچاس ممبر ادا نہیں کرتے، تو اِن ادا نہ کرنے والوں سے سوسائٹی کی کمیٹی تاخیر کرنے پر "لیٹ فیس" کے نام سے کچھ زائد رقم لیتی ہے، کیا یہ لیٹ فیس لینا صحیح ہے؟

اگر یہ لیٹ فیس لینا صحیح نہیں ہے تو کیا یہ مینٹیننس ادا نہ کرنے والے ممبروں کے لیے سوسائٹی کی اجتماعی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا شرعاً صحیح ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

لیٹ فیس درحقیقت مالی جرمانہ ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں۔

درمختار میں ہے: لا بأخذ مال في المذهب.

شامی میں ہے: قال في الفتح: وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال، وعندهما وباقي الأئمة لايجوز. اه ومثله في المعراج، وظاهره أن ذلك رواية ضعيفة عن أبي يوسف. قال في الشرنبلالية: ولا يفتىٰ بهذا؛ لما فيه من تسليط الظلمة علىٰ أخذ مال الناس فيأكلونه. اه (در مختار مع الشامي ۱۹۵/۳)

البتہ مینٹیننس ادا نہ کرنے والے ممبروں سے انتظامیہ جبراً مینٹیننس وصول کرسکتی ہے۔

درمختار میں ہے: ليس لذي الحق أن يأخذ غير جنس حقه، وجوزه الشافعي وهو الأوسع.

شامی میں ہے: (قوله: وجوزه الشافعي) قدمنا في كتاب الحجر: أن عدم الجواز كان في زمانهم، أما اليوم فالفتوىٰ على الجواز. (درمختار مع الشامي ۳۰۰/۵)

اور پچھلا مینٹیننس ادا نہ کرنے پر آئندہ کے لیے اجتماعی سہولتوں سے فائدہ اُٹھانے سے اُن کو روک دے، اِس کے باوجود اُن کا اِن سے فائدہ اُٹھانا شرعاً جائز اور درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

املاہ: احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

کتاب الفرائض

میراث سے جہیز کا سامان وضع کرنا

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے پیچھے زوجہ اور ایک لڑکی اور ایک لڑکا، کل تین وارث چھوڑے اور اس ورثہ میں سے لڑکی کو شادی میں جہیز دیا، تو اس ورثہ میں سے اس جہیز کی رقم باد کی جائے گی یا نہیں؟ اور برتن وغیرہ سب دیئے لڑکی کو جہیز میں، زوجہ لڑکا لڑکی ہر ایک کو کتنا کتنا حصہ تقسیم ہوگا؟ اور ورثہ میں دو مکان مرحوم نے چھوڑے ہیں اور کچھ برتن، جواب مفصل ومدلل تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

بعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث (مرنے والے کی تجہیز وتکفین متوسط طریقہ سے، اس کے بعد ادائے دیون اور پھر ایک تہائی میں سے وصیت شرعیہ ہو، تو اس کو نافذ کرنے کے بعد) مرنے والے کے کل ترکہ کو چوبیس سہام پر تقسیم کیا جائے گا: جن میں سے تین سہام اس کی بیوی کو، چودہ سہام لڑکے کو اور سات سہام اس کی لڑکی کو دیئے جائیں، اگر جہیز کا سامان دیتے وقت تصریح کردی گئی تھی کہ تمھارے حصۂ میراث میں سے دیا جارہا ہے، تو اس کو وضع کریں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

دین مہر ترکہ کو محیط ہو تو میراث تقسیم نہ ہوگی

سوال: غلام احمد کا انتقال ہوا، اس نے دو وارث زوجہ زہرہ بی بی اور بھتیجا غلام محی الدین چھوڑے، زوجہ زہرہ بی بی کی مہر ۵۰ مثقال باقی تھی اور جائداد فروخت کرنے پر

۲۰ ہزار روپئے حاصل ہوئے اور ۵۰ مثقال سونے کی قیمت ۵۰/ ہزار روپیہ سے بھی زائد ہوتی ہے، تو اس صورت میں بھتیجا غلام محی الدین کو فروخت کردہ جائداد کے ثمن و قیمت سے وراثت میں کیا ملے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ترکۂ میت میں سے اولاً اس کی تجہیز وتکفین کی جاوے گی، اس کے بعد اگر مال بچا ہے، تو اس میں سے اس کے دیون ادا کیئے جائیں گے، اس کے بعد اگر مال بچا ہے، تو اس کے تہائی میں سے اس کی وصیت نافذ کی جاوے گی اور پھر باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ تتعلق بتركة الميت حقوق أربعة مرتبة: الأول يبدأ بتكفينه وتجهيزه من غير تبذير وتقتير، ثم تقضى ديونه من جميع مابقي من ماله، ثم تنفذ وصاياه من ثلث مابقي بعد الدَين، ثم يقسم الباقي بين ورثته بالكتاب والسنة الخ. (سراجي ۳) يبدأ من تركة الميت بمؤنة تجهيزه، ثم تقضى ديونه، ثم تنفذ وصاياه من ثلث الباقي، ثم يقسم الباقي بين الورثة. (تحفة المحتاج بشرح المنهاج كتاب الفرائض ٦/٣٨٢تا ٣٨٥) صورتِ مسئولہ میں غلام احمد پر اس کی زوجہ زہرہ بی بی کا مہر باقی ہے، جس کی مقدار پچاس مثقال ہے، اس لیے تقسیمِ وراثت سے پہلے غلام احمد کی متروکہ جائداد میں سے وہ ادا کیا جائے، جائداد فروخت کرنے سے جو ثمن حاصل ہوا، اس کی مقدار چونکہ پچاس مثقال کی قیمت سے کم ہے، اس لیے وہ تمام ثمن مرحوم غلام احمد کی زوجہ کے دین مہر میں دیدی جاوے گی، پھر بھی دین مہر پورا ادا ہوتا نہیں ہے، اس لیے تقسیم میراث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لہذا مرحوم غلام احمد کے بھتیجے غلام محمد محی الدین کو کچھ بھی

نہیں ملے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

والد کے ساتھ رہنے سے ترکہ کا استحقاق

سوال: سعید کے چار لڑکے ہیں: زید، عمرو، بکر، خالد۔ انھوں نے اپنی زمین میں پانچ حصے کئے، چار حصے بھائیوں کے، اور ایک حصہ والد کا والد کی موجودگی میں، والد کا انتقال ہوگیا تو پھر تین بھائیوں نے کہا کہ والد کے حصہ کی زمین تقسیم ہوگی، اور چوتھا جس کے ساتھ والد صاحب رہا کرتے تھے وہ منع کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ وہ میری ہے؛ اس لیے کہ والد صاحب میرے ساتھ رہتے تھے، تو اب اس زمین کے متعلق کیا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

باپ نے اگر زمین کے پانچ حصے کر کے ان میں سے چار حصے اپنے چار بیٹوں کو دے کر قبضہ بھی کرا دیا تھا، تو ان میں سے ہر بیٹے کو جو حصہ دیا تھا وہ اس کا مالک ہے، پانچواں حصہ باپ نے اپنی ذات کے لیے رہنے دیا تھا؛ یہاں تک کہ باپ کا انتقال ہوگیا تو اب اس حصہ میں تمام ورثاء کا حق ہے، کوئی ایک بیٹا تنہا اس کا مالک نہیں ہے، جس بیٹے کے ساتھ باپ رہتا تھا اس بیٹے کا یہ دعویٰ کہ میں اس کا مالک ہوں درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

اپنے حصۂ میراث سے دستبردار ہوجانا

سوال: کوئی شخص اپنے مرحوم والد کی جائیداد میں سے اپنے ورثاء کا حصہ نہ

دیتے ہوئے انہیں کچھ رقم دے کر اس بات پر راضی کرلے کہ تم تمھارا حصہ معاف کردو، اور وہ اس پر راضی ہوجائیں، کیا اس طریقہ سے کرنا جائز ہے؟ اگر کیا تو میراث کی واپسی ضروری ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اگر دیگر ورثاء اپنا حصۂ میراث لینے پر قادر ہونے کے باوجود برضاء ورغبت کچھ رقم لے کر اپنے حصۂ میراث سے دستبردار ہوجاتے ہیں، تو یہ تخارج کی صورت ہے، اور جائز ہے، اس کی مختلف شقیں ہیں جو کتب فقہ میں مفصلاً موجود ہیں، جن صورتوں میں صلح درست ہوگئی ان صورتوں میں میراث کی واپسی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

وحكمه وقوع البراءة عن الدعوىٰ ووقوع الملك في مصالح عليه.

(درمختار مع الشامي۸/۴۰۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

تقسیمِ میراث کا رواج نہ ہوتو جائیداد استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اکثر وبیشتر شریعت کے مطابق تقسیمِ میراث کا رواج نہیں ہے، تو اب تک ہمارے آباء واجداد کی طرف سے ہم تک جو جائداد پہنچی ہے، بلاشبہ وہ شرعی تقسیم کے مطابق نہیں پہنچی ہے؛ کیونکہ اس میں بہنوں کا حصہ دینے کا معمول ہی نہیں ہے، تو ہمارے لیے اس جائیداد کا استعمال کرنا کیسا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے، تو دریافت طلب یہ ہے کہ کیا اس کے جائز کرنے کا اب کوئی طریقہ بھی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

ہر چند بعض فقہاء نے مطلقاً مال حرام کو وارث کے لیے حلال کہا ہے؛ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے، مفتی بہ اور معتمد یہ ہے کہ ان کے لیے بھی حرام ہے، پس اگر ارباب حقوق ورثا کو معلوم ہیں تو اگر بعینہ ان کی چیز محفوظ ہو تو اس کو، ورنہ اس کی قیمت واپس کر دیں، اور اگر معلوم نہیں تو اگر مال حرام متعین ومتمیز ہے تو اس کو مالک کی نیت سے تصدق کر دیں، اور اگر مخلوط غیر متمیز ہے تو اگر اس کی مقدار قیمت معلوم ہے اس کو تصدق کر دیں، ورنہ تخمینہ کر کے تصدق کر دے، ان شاء اللہ تعالیٰ آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

(امداد الفتاویٰ ۴/۳۵۰) علامہ شامیؒ نے "رد المحتار" (٤/١٤٦،١٤٧ باب البيع الفاسد مطبوعہ كراچی) میں بحث فرمائی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

ورثاء میں نابالغ ہوں تو متروکہ جائیداد میں کون کونسی اشیاء استعمال کر سکتے ہیں؟

سوال: دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میت اپنے پیچھے بالغ ونابالغ دونوں قسم کے ورثاء چھوڑ جائے، تو تقسیم میراث کے بغیر بالغ ورثاء کا نابالغ ورثاء کے ساتھ رہنا؛ نیز متروکہ جائیداد میں سے خود بھی کھانا؛ نیز اس کے بال بچے بھی ہیں وہ اسی متروکہ جائیداد کی آمدنی کو تصرف میں لا رہے ہیں، تو ان کا بھی ساتھ رہ کر کھانا جائز ہے؟ جبکہ اس میں نابالغ کا حصہ بھی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جائیداد کی آمدنی، پیداوار کا حساب رکھنا ضروری ہے، ہر شخص اپنے حصہ کے موافق لے سکتا ہے، اس سے زائد لینا جائز نہیں، اور اس میں تعدی کرنا حرام ہے، اسی طرح اشیاءِ مستعملہ میں جو چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں ہر شخص کے استعمال کا اثر متفاوت ہے، یعنی بعض کے استعمال سے چیز کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور بعض سے نہیں،

جیسے: سواری کا جانور، تو ایسی مشترکہ چیزوں کا استعمال بھی جائز نہیں؛ البتہ جو اشیاء ایسی نہیں بلکہ سب کا استعمال اس میں یکساں ہوتا ہے، مثلاً: مکان میں رہنا یا ایسے برتن وغیرہ کا استعمال کرنا جس کے استعمال کا اثر یکساں ہو اس میں گنجائش ہے، ہر شریک ان کو پورا پورا استعمال کرے یا اپنے حصہ کے برابر یا زائد، اصل حکم یہی ہے؛ لیکن اس کی حدود کی حفاظت اور پھر اس میں عدل کرنا چونکہ عادۃً مشکل ہے؛ اس لیے اب یہی ضروری ہے کہ تقسیم کر کے ہر ایک کا حصہ ممتاز کر دیا جائے اور ہر شخص اپنے حصہ کو استعمال کرے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۲/۸۲۴، ۸۲۵ مطبوعہ کراچی) فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

خدمت کرنے والوں کے لیے رکھے ہوئے حصہ میں میراث

سوال: ایک آدمی نے اپنی حیاتی میں مال کو اولاد میں تقسیم کر دیا، اور زمین کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھا، اور کہہ دیا کہ میرے مرنے تک جو میری خدمت کرے وہ میرے مرنے کے بعد وہ زمین لے لے، تو کیا اس آدمی کے مرنے کے بعد وہ زمین جس نے خدمت کی ہے اس کو ملے گی یا اس میں وراثت جاری ہوگی اور اولاد میں تقسیم ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

اس میں وراثت جاری ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

مرحوم کے حقیقی بھائی کی موجودگی میں بہن کی اولاد میراث نہیں پاتی

سوال: میرے چھ ماموں تھے، جس میں سے ایک کا انتقال ہو چکا، باقی پانچ میں سے میرے ایک ماموں بچپن سے بہرے گونگے اور توتلے تھے، جو بچپن سے میرے نانا کے ساتھ میرے گھر رہتے تھے، میرے نانا نے ایک کھیت میری اماں کو لکھ دیا تھا، اور یہ

ماموں کے نبھاؤ خرچ کے لیے تھا، نانا اور میری اماں کے انتقال کے بعد ہمارے ماموں کو ہم پالتے تھے، اور ہماری طرف سے خرچ کرتے تھے، اب ماموں کا بھی انتقال ہو چکا ہے، ماموں کے مرنے کے بعد ان کے پاس سے کچھ رقم نکلی ہے، یہ رقم وہ مزدوری کرتے تھے، اس کی ان کے پاس جمع ہوتی تھی، یا لوگ چائے ناشتہ کے لیے دیتے تھے، اس کی جمع ہوتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے اب چار ماموں زندہ ہیں، تو مرحوم ماموں جان کی میراث ان کے بھائی یہ چار ماموں ہیں کیا ان کو ملے گی؟ اگر ملے گی تو ہر ایک کو کتنی ملے گی؟

بچپن سے یہ مرحوم ماموں ہمارے یہاں رہتے تھے، اور ہر طرح کا نان نفقہ، کپڑا، بیماری وغیرہ کا خرچ ہماری طرف سے ہوتا تھا؛ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی تجہیز و تکفین ہمارے ہی گھر سے ہوئی، اور ہم تین بھائی اور تین بہنیں ہیں، بچی ہوئی رقم ۳۸۹۰/ روپئے ہیں، تو یہ رقم ہم تمام بھائی بہنوں کو ملے گی؟ اگر ملے گی تو کتنا کتنا حصہ ہر ایک کو ملے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

وفات پانے والے ماموں کی ملکیت میں بوقتِ وفات جو کچھ تھا - چاہے وہ زمین ہو یا نقد - وہ سب ان کا ترکہ ہے، جس میں ان کے شرعی ورثاء کو حق وراثت ملتا ہے، اس لیے کہ وراثت ایک حق شرعی ہے، جو صرف انہی حضرات کو حاصل ہوتا ہے، جن کو شریعت نے وارث قرار دیا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں مرحوم ماموں کے حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں ان کے بھانجے، بھانجیوں یعنی آپ بھائیوں بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا، اب اگر ان کے صرف چار بھائی ہی ہیں بیوی بچے ماں باپ بہن یا اور کوئی بھائی نہیں ہے تو تمام ترکہ کو چار سہام پر تقسیم فرما کر ہر ایک بھائی کو ایک ایک حصہ دیدیا جائے۔

ان کی تجہیز وتکفین اگر آپ نے اس نیت سے کی تھی کہ ان کے ترکہ میں سے ہم وصول کرلیں گے، تو آپ وہ مصارف ان کے ترکہ میں سے وصول فرما سکتے ہیں، اور اگر اپنی طرف سے کی تھی تو وصول نہیں کرسکتے۔(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ۲/ ۳۲۸۔درر الحکام ۲/ ۱۳۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

حرمتِ مصاہرت سے محرّمہ کی عدتِ وفات ومیراث کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ کی بالغہ لڑکی کو ہندہ سمجھ کر شہوت سے پکڑ لیا، جس کے نتیجہ میں ہندہ زید پر حرام ہوگئی؛ مگر چونکہ دونوں معمر اور صاحبِ اولاد تھے، اس لیے حسبِ معمول اپنے بچوں کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے رہے؛ البتہ زن وشوئی کا تعلق ختم کردیا، اور مثل بھائی بہن کے رہنے لگے، دو تین سال کے بعد زید کا انتقال ہوگیا، اب مندرجۂ ذیل باتیں دریافت طلب ہیں:

(۱) ہندہ زید متوفی کے ترکہ میں حصہ پائے گی یا نہیں؟

(۲) ہندہ پر عدتِ وفاتِ شوہر ہوگی یا نہیں؟

(۳) ہندہ زید کی حیات میں زید پر حرام ہوچکی تھی، تو کیا زید کے طلاق دیئے بغیر وہ دوسرا نکاح کرسکتی تھی؟ یعنی حرمت مصاہرت سے نکاح ہی ختم ہوجاتا ہے یا صرف میاں بیوی کی مباشرت ہی حرام ہوتی ہے اور نکاح باقی رہتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

نفسِ حرمتِ مصاہرت سے نکاح مرتفع نہیں ہوتا؛ جب تک کہ شوہر زید اپنی بیوی ہندہ کو زبانی طور پر یوں نہ کہہ دے کہ میں تجھے چھوڑ چکا، یا حاکم مسلم دونوں کے درمیان تفریق نہ کردے۔

درمختار میں ہے: وبحرمة المصاهرة لایرتفع النكاح حتى لا يحل لها التزوج بآخر؛ إلا بعد المتاركة وانقضاء العدة. (درمختار) (قوله الا بعد المتاركة) اى وان مضى عليها سنون كما فى البزازية، وعبارة الحاوى: إلا بعد تفريق القاضى او بعد المتاركة.اه. وقد علمت ان النكاح لا يرتفع؛ بل يفسد وقد صرحوا فى النكاح الفاسد بان المتاركة لا تتحقق؛ إلا بالقول الخ. (شامی ۲/۳۰۷)

بنابریں:

(۱): اگر زید نے ہندہ سے متارکت بالقول کرلی تھی، تو اسی وقت نکاح ختم ہو چکا تھا، ترکہ میں حصہ پانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور اگر متارکت بالقول نہیں کی تھی، تب بھی ہندہ کو زید کے ترکہ میں سے حصہ نہیں ملے گا؛ اس لیے کہ اس صورت میں اگرچہ نکاح مرتفع نہیں ہوتا؛ لیکن فاسد ہو جاتا ہے، اور نکاح فاسد میں زوجین میں توارث نہیں ہوتا۔

شامی میں ہے: (قوله ويثبت النسب) اما الارث فلا يثبت فيه وكذا النكاح الموقوف عن ابى السعود. (شامی ۲/۳۸۲)

(۲) اگر زید نے متارکت بالقول نہیں کی تھی، تو زید کے انتقال کے بعد ہندہ پر عدت واجب ہے؛ لیکن طلاق والی عدت واجب ہے، یعنی تین حیض۔ والمراد أن الموطوئة بنكاح فاسد سواء فارقها او مات عنها تجب عليها العدة التى هى عدة طلاق

وهي ثلاث حيض، لا عدة موت وهي اربعة اشهر وعشر الخ. (شامی ۳۸۱/۲)

(۳) زید کے متارکت بالقول یا حاکمِ مسلم کی تفریق کے بعد وہ دوسرا نکاح کرسکتی تھی، اس کے بغیر نہیں۔ (شامی ۲/ ۳۰۷) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ شوال ۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مرحوم کے بیمہ کا روپیہ کہاں خرچ کرے؟

سوال: ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا، اور اس کے ہاتھ کا جمع کردہ بیمہ پاس ہوا ہے، اور وہ بیمہ کا روپیہ کس کام میں خرچ کر سکتے ہیں؟ اور اس لڑکے کے ماں باپ بھائی پیشہ والے ہیں، غریب نہیں، اور جس لڑکے کا انتقال ہوا ہے اس کی عورت اور ایک لڑکا ہے، اور اب بیمہ کا روپیہ کہاں خرچ کرنا جائز ہے؟ اور اس روپیہ کو کہاں خرچ کر سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً:

جان کا بیمہ ہر حالت میں حرام وناجائز ہے، اب جو رقم ملی ہے اس میں سے اتنی رقم جو اس نے بیمہ کمپنی کو ادا کی تھی، وہ تو اس کے ورثاء میں (بعد ادائے دین ونفاذ وصیت از ثلث) بقدر حصص تقسیم کردی جائے، (یعنی کل چوبیس سہام بنا کر زوجہ کو تین، باپ کو چار، ماں کو چار اور لڑکے کو تیرہ سہام دیئے جائیں) اور جو رقم زائد ملی ہے، یعنی اس کی دی ہوئی رقم سے زائد رقم کا صدقہ کردیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

بفضلہ تعالیٰ جلد چہارم مکمل ہوئی، جلد پنجم زیرِ ترتیب ہے۔

مرتب کی مساعیٔ جمیلہ ایک نظر میں

نمبر	اسمائے کتب	ناشر
۱	فہرست فتاویٰ رحیمیہ	مکتبۂ رحیمیہ راندیر سورت
۲	فہرست فتاویٰ محمودیہ	دار الافتاء جامعہ ڈابھیل
۳	فہرست افادات فقیہ الامت	جامعہ محمودیہ میرٹھ یوپی
۴	فہرست کفایت المفتی	شعبۂ فیض محمود سورت
۵	ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا تعارف (تعلیق)	مکتبۂ انور، محمود نگر ڈابھیل
۶	نقوش بزرگاں (دو جلدیں)	دار النشر العلمیہ سملک۔ مکتبۂ انور، ڈابھیل
۷	مکتوبات فقیہ الامت (ترتیب وتقدیم)	ادارۂ صدیق ڈابھیل
۸	مکتوبات فقیہ الزمن (ترتیب وتقدیم)	جامعۃ القراءات کفلیتہ سورت
۹	فضلائے جامعہ (تعارف وخدمات)	جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل
۱۰	اجلاس صد سالہ (ڈابھیل)	//
۱۱	تعارف جامعہ (اردو)	//
۱۲	تعارف جامعہ (گجراتی)	//
۱۳	عورتوں کا طریقۂ نماز	دار الافتاء جامعہ ڈابھیل
۱۴	ڈاکٹروں کے مسائل کا حل (گجراتی)	جوہاپورا میڈیکل ایسوسیئشن احمد آباد
۱۵	فقہائے گجرات اور ان کی فقہی خدمات	جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ گجرات

۱۶	محمود الفتاویٰ (اردو) (۱/ تا ۴/) (ترتیب وتقدیم)	مکتبۂ انور، محمودنگر، ڈابھیل
۱۷	محمود الفتاویٰ (گجراتی) (اول دوم)	//
۱۸	محمود الفتاویٰ گجراتی (سوم) زیر ترتیب	//
۱۹	نقوش بسم اللہ (دو جلدیں)	جامعۃ القراءات کفلیۃ سورت

مطبوعات ادارۂ صدیق ڈابھیل، نوساری، گجرات

M:99133,19190 \ 99048,86188

نمبر	اسمائے کتب
۱	حدیث کے اصلاحی مضامین (اول تا پنجم)
۲	تسہیل السراجی (افادات: حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ)
۳	مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی عظمت ومقبولیت کا راز
۴	مکتوبات فقیہ الامت
۵	نسبت واحسان
۶	دلائل الخیرات
۷	چہل درود وسلام
۸	الحزب الاعظم مع تصحیح وتخریج (رنگین) خورد
۹	الحزب الاعظم مع تصحیح وتخریج (رنگین،) کلاں
۱۰	اردو زبان کی کتاب (پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی) تسہیل شدہ (رنگین)
۱۱	عربی صفوۃ المصادر مع لغات جدیدہ
۱۲	آدھی رات کا سورج
۱۳	پانچ کلمے اور نماز کے اذکار
۱۴	علم الصیغہ (فارسی مع تصحیح وعناوین)

۱۵	علم الصیغہ (عربی)
۱۶	ختم بخاری شریف (مفتی محمد تقی صاحب عثمانی)
۱۷	توضیح القرآن آسان ترجمۂ قرآن (مفتی محمد تقی صاحب عثمانی)
۱۸	صفوۃ البیان
۱۹	آمدن سی لفظی (تصحیح شدہ)
۲۰	الخلاصة البهية في مذهب الحنفية
۲۱	حج میں قصر واتمام کی تحقیق
۲۲	فتاویٰ محمودیہ
۲۳	ہدیۂ خواتین
۲۴	کتاب النحو مع تحقیق وتعلیق
۲۵	اجراءِ نحو وصرف
۲۶	معین السراجی
۲۷	انوار المَطالع فی ہدایات المُطالع
۲۸	ظہور مہدی (گجراتی، اردو)
۲۹	مختصر نفحة العرب (رنگین)
۳۰	اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟
۳۱	سیرت سید البشر ﷺ
۳۲	الشمائل المحمدية المعروف بہ شمائل ترمذی

۳۳	قواعد ہجاء القرآن مع طریقۃ تعلیم الصبیان
۳۴	الجداول المقربة لطرق الطيبة
۳۵	متن الشاطبية (رنگین)
۳۶	جهد المقل
۳۷	تیسیر القراءات
۳۸	القرۃ المرضیۃ
۳۹	التيسير للداني
۴۰	کاشف العسر
۴۱	الرعایۃ
۴۲	فوائد مکیہ معنون
۴۳	قرآن مجید (متشابہات کی نشان دہی کے ساتھ)
۴۴	سیرت خاتم الانبیاء (زیر طبع)
۴۵	النبی الخاتم (زیر طبع)
۴۶	حدیث کے اصلاحی مضامین (ششم) (زیر طبع)